قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

قدرت کی کاری گری پر غور وفکر کیا جائے تو نئے ایجادات کا سامنے آنا یقینی ہے۔ پرندوں کے ہوا میں اڑنے پر غور کیا گیا تو ہوائی جہاز ایجاد ہوا اسی طرح بے شمار ایجادات ہیں جو قدرت کی کاری گری سے اخذ ہوئے۔ جاپان کی ریل گاڑیاں خاصی تیز رفتار ہیں۔ جاپان میں تیز رفتار ٹرین کا آغاز **1964**ء میں ہوا۔ اوساکا اور ٹوکیو دو بڑے شہر ہیں۔ ان کے درمیان پانچ سو پندرہ کلومیٹر کا ٹریک ہے جس پر بلٹ ٹرینیں چلا کرتی ہیں۔ روزانہ ان ٹرینوں پر چودہ ملین لوگ سفر کرتے ہیں۔ مسافروں نے شکایت کی کہ جب ٹرین سرنگوں سے باہر نکلتی ہیں تو ہوا کے دباؤ کی وجہ سے زوردار دھماکا ہوتا ہے جس سے عوام پریشان ہے۔ لوگوں کی نیند خراب ہوتی۔ دل کی دھڑکن بڑھ جاتی ہے۔ ہوا کے ارتعاش سے دروازے کھڑکیاں تک کھل جاتی ہیں۔ حکومت نے ایجی نکاتسو نامی شخص کو تحقیق کرنے کا حکم دیا۔ وہ بلٹ ٹرین کا ٹیکنیکل جی ایم تھا۔ اس کا ایک شوق اور تھا کہ وہ پرندوں پر بھی غور وخوض کرتا تھا۔ اس نے کنگ فشر پر غور کیا کہ وہ کس چابکدستی سے مچھلی کا شکار کرتا ہے کہ ذرا بھی آواز نہیں ہوتی۔ اس نے مسلسل تحقیق کے بعد نتیجہ نکالا کہ پرندے کی چونچ کافی لمبی ہوتی ہے وہ پہلے پانی میں چونچ داخل کرتا ہے۔ چونچ اتنی جگہ بنا لیتی ہے کہ جب پرندہ ڈبکی لگائے تو آواز بھی پیدا نہ ہو۔ اسی نکتے پر اس نے جب انجن بنایا تو ہوا کا دھماکا ختم ہو گیا۔

فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ○

جلد 32 ❖ شمارہ 07 ❖ نومبر 2022ء

ماہنامہ ... کراچی

مدیرۂ اعلیٰ : عذرا رسول

مدیر : پرویز بلگرامی

نائب مدیرہ : نبیلہ اظہر

◈◈◈

منیجر اشتہارات

محمد شہزاد خان

0333-2256789

◈◈◈

سرکولیشن منیجر

سید منیر حسین

0333-3285269

◈◈◈

قیمت فی پرچہ 150 روپے ❖ زرِ سالانہ 2000 روپے
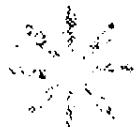
پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقامِ اشاعت: C-63، فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط وکتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200

E-mail: jdpgroup@hotmail.com

قلم کار نواب

سلطان بہلول لودھی کے وزیر اعظم عمر خان شروانی جو مسند عالی کے خطاب یافتہ تھے ان کا خاندان ہند آ کر یہاں رچ بس گیا۔ سلاطین لودیہ کی وزارت عظمیٰ کئی پشت تک اسی خاندان میں رہی۔ شیر شاہ سوری کا عہد آیا تو بھی اقتدار حاصل رہا لیکن جب ہمایوں واپس اقتدار میں آیا تو اس نے شیر شاہ سوری کا ساتھ دینے کے جرم میں پٹھانوں کو فوج سے خارج کر دیا۔ جس کا دل جدھر چاہا وہ ادھر چل دیا، خاندان شروانیہ بھی دہلی سے نکل آیا اور علی گڑھ سے کافی اندر کی طرف زمینداری قائم کر لی۔ صاحب محمد باز خان نے زمینداری شروع کی تھی۔ ان کے تین صاحبزادے تھے۔ حاجی محمد داؤد خان بڑے، منجھلے محمد خان زماں خان تھے۔ وہ انتظام ریاست اور کاغذات ریاست کے ماہر تھے اس لیے زمینداری بہتر انداز میں قائم کر لی۔ زماں خان کے تین فرزند تھے حاجی محمد ہدایت اللہ عابد و زاہد تھے مگر انتظام ریاست میں ماہر تھے لیکن دور شباب میں ہی انتقال کر گئے۔ ان سے چھوٹے حاجی عبدالشکور خان تھے جو عربی کے عالم تھے۔ 75 برس کی عمر پائی۔ مدرسہ لطفیہ علی گڑھ، دارالعلوم دیو بند، مدرسہ امدادیہ مراد آباد کی خوب خدمت کی طلبہ کو وظائف، دیگر قسم کی امداد دینا وتیرہ تھا، ان سے چھوٹے محمد تقی تھے۔ وہ تمام مردانہ فنون بنوٹ، ورزش، کشتی، شکار میں ماہر تھے۔ اردو ادب سے بھی شغف تھا۔ انہوں نے ایک کتاب ''سراپائے معشوق'' چھپوائی تھی۔ اس میں سرتاپا ہر اعضا پر اساتذہ کے اشعار جمع کیے تھے وہ وقتاً فوقتاً دہلی آتے جاتے رہتے تھے۔ اس لیے ان کے نشست و برخواست کا انداز دہلی والوں جیسا تھا۔ ان کے ہاں 1865ء میں ایک بچے نے جنم لیا۔ نام حبیب الرحمن رکھا گیا۔ بچہ کچھ بڑا ہوا تو اسے مولوی سید حسن شاہ رامپوری کے پاس بٹھا دیا گیا۔ انہوں نے ہی رسم بسم اللہ کرائی۔ گزرتے وقت کے ساتھ اساتذہ بھی تبدیل ہوتے رہے تعلیمی مدارج بھی بدلتا رہا۔ حدیث، فقہ بھی گھر پر ہی اساتذہ آ کر پڑھاتے رہے، خصوصی طور پر اسے مکہ مکرمہ بھیجا گیا وہاں قاری سید عبدالرحیم کو کلام مجید سنایا پھر مدینہ آ کر قاری حسن شاعر سے ان کا رسالہ قرأت پڑھا اور مسجد نبوی میں جا کر سند قرأت حاصل کی۔ زمینداری قائم رکھنے کے لیے انگریزی پڑھنا ضروری تھا۔ 1883ء میں ماسٹر عبدالرشید خان سے انگریزی کی تعلیم حاصل کرنا شروع کیا جو 1885ء تک جاری رہی۔ 1887ء میں آگرہ جا کر باقاعدہ آگرہ کالج کے ہائی اسکول میں آٹھویں میں داخلہ لیا۔ 1888ء تک یہ تعلیم جاری رہی پھر مسٹر ورٹن، مسٹر کاکی سے انگریزی ادب پڑھا، 1893ء میں تعلیم کا سلسلہ ختم کر دیا اور ریاستی امور میں دلچسپی لینے لگے۔ جولائی 1907ء میں عم محترم کا سفر حج کے دوران انتقال ہو گیا اور ریاست کے تمام کام اس کے ذمے آ گئے۔ عم محترم نیک کاموں میں فیاضی سے کام لیتے تھے۔ تعلیم گاہوں کی کھلے ہاتھ سے مدد کرتے تھے۔ دینی کاموں کے علاوہ معاشرتی کاموں مثلاً کسی بھی مسلمان کی تدفین ہو، بیٹیوں کی رخصتی ہو، یتیم یسیر کی پرورش ہو اس کے لیے بھرپور امداد دیتے تھے یہی وجہ تھی کہ ان پر قرض کا بوجھ بڑھ گیا تھا۔ تقریباً پانچ لاکھ روپے سودی ادا کرنا تھا۔ وکلاء نے مشورہ دیا کہ انکار کر دیں لیکن انہوں نے ہامی بھر لی۔ اسی اثنا میں عزیزوں نے وراثت میں حصہ مانگ لیا، خاندان کے بڑے نواب مزمل اللہ خان کو درمیان میں ڈالا انہوں نے پوری دیانت داری سے وراثت تقسیم کرا دی۔ تقسیم کے بعد بھی قرضہ باقی تھا اس لیے شرکا نے اکثر حصہ ان ہی کے پاس چھوڑ دیا کہ قرض ادا کر دیں۔ اس کار خیر کو بھی اس نے انجام دیا۔ سود کی لعنت سے خاندان کو نجات دلا دی پھر اپنے خاص شوق کتاب کا ذخیرہ کی جانب توجہ دی۔ نئی نئی کتابیں خریدی جاتیں، پڑھی جاتیں جو آہستہ آہستہ جیب گنج کا کتب خانہ میں تبدیل ہو گیا۔ اکتوبر 1931ء تک کتب خانے میں 4173 کتابیں جمع ہو چکی تھیں 1897ء میں انہیں علی گڑھ کالج کا ٹرسٹی بنا دیا گیا۔ ریاستی امور انجام دینے کے ساتھ تصنیف و تالیف بھی جاری رہا۔ تقریباً 30 کتابیں لکھیں، علامہ شبلی نعمانی کے بعد رسالہ ندوا بھی جاری رکھا، ادارت کی۔ 83 سال کی عمر میں 11 اگست 1950ء میں انتقال کیا۔ حبیب الرحمن خان شروانی والی ریاست ہوتے ہوئے بھی قلمکار کی حیثیت سے اپنا ایک مقام بنا گئے۔

......☆......☆......☆......

☆ اعجاز حسین سٹھار، نور پور تھل سے لکھتے ہیں۔ ''بارشوں سے تباہی، املاک کی بربادی، لوگوں کی بے بسی، موسمی بیماریاں، مہنگائی، کاروباری افراد کی لوٹ مار، سیاست دانوں کے کھوکھلے دعوے، وعدے اور غیر یقینی حالات کا سامنا کرنا اور حالات کا جبر سہنا کم تھا کہ پیارے سرگزشت کی جدائی برداشت کرنا پڑی۔ تنہائی، مایوسی اور ٹینشن میں اسی نے دلاسہ دینا اور بہلانا تھا، جان لیوا انتظار کے بعد آج 16 اکتوبر کو رونمائی ہوئی ہے تو دل قدرے سکون میں آیا ہے لیکن دل پسند مضامین، سلسلے دیکھ کر سارے گلے شکوے بھول کر ورق گردانی شروع کردی ہے۔ ''نوائے آدمیت'' میں احمد ندیم قاسمی صاحب ضلع کے ساتھ پورے پاکستان کا فخر ہیں جہاں ان کا نام دیکھتے، پڑھتے ہیں تو آنکھیں عقیدت سے جھک جاتی ہیں۔ میں گرمیوں میں علاقہ وادی سون میں کئی بار فیملی کے ساتھ سیر کرنے جاتا رہا، ان لوگوں سے ایک گلہ ہر بار سنا کہ قاسمی صاحب اپنے علاقہ کے لیے کچھ کر کے نہ گئے یوں ان کا نام زندہ رہتا۔ اسکول، کالج، پلے گراؤنڈ کا سنگ بنیاد رکھتے تو احسان تا قیامت رہتا. اس شکوہ سے قطع نظر میں اور اہلِ علاقہ ان کی عظمت، نبی کریمؐ سے محبت وعقیدت کو سلام پیش کرتے ہیں۔ ''بقلم خود'' بڑی دلچسپی، تجسس اور ذاتی معلومات پڑھنے کے لالچ میں توجہ سے پڑھی ہے۔ منظر امام بچپن، لڑکپن اور نوعمری کا زمانہ مسافروں کی طرح گزار آئے اور کراچی مستقل ٹھکانا بنا تو شعور نے محفوظ ماضی ان کے حوالے کردیا، قدم ایک منزل پر رکے ہیں تو ساری یادداشتوں نے حقیقی شکل میں ساتھ دیا، زندگی کا سفر شروع ہوا، کئی شخصیات سے سامنا رہا، کئی رازوں کے امین اور عمر بھر کے ساتھی ٹھہرے اور آج خود بیتی کا حصہ ہیں۔ جب نوجوانی کی عمر کو پہنچے، خوابوں، خیالوں میں رہنے، تاک جھانک، وعدوں اور ایڈونچر کے دن آئے تو اگلی نشست کے لیے تیس دن کا انتظار مسلط کردیا گیا ہے، انہیں سمجھنے کے لیے یہ اذیت سہنا مجبوری ہے، صحت کے ساتھ زندگی باوفا رہی تو تازہ حالات سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے بھاگتے قدموں سے آئیں گے، بس منظر بھائی کو ہاتھ میں رکھیں گے۔ ''جگا ٹیکس'' میں اگر یہ اصلی تصویر ہے (جی ہاں اصلی تصویر ہے) تو صحت مندی، خوبصورتی اور متاثر کن شخصیت ہونے میں کیا شک ہے۔ وہ تو بذات خود فلموں کا حقیقی ہیرو بننے کے قابل تھا، غلط راستے پر چل کر منزل کھو بیٹھا، میں ان پولیس افسروں، جوانوں کی ہمت، منصوبہ بندی اور بہادری کو سلام کرتا ہوں کہ اپنے فرض کو دیانت داری سے نبھا کر لوگوں کو خوف کے حصار سے نکالا اور وقت کے دہشت گردوں کو ٹھکانے لگا کر شہر کو زبردستی لگان کے ماحول سے نکالا لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ آج ہر شہر، گاؤں، گلی محلے میں ایسے سیاہ کردار اور منفی سوچ رکھنے والے مختلف حلیے میں لوگ موجود ہیں۔ اب نہ کوئی ڈنڈا بردار، ہٹ دھرم اور اناڑی گورنر موجود ہے تو کیا معاشرہ کو ایسے غلیظ چہروں سے پاک صاف کیا جاسکتا ہے تاکہ خلق خدا اپنی مرضی اور منشا سے آزادی سے سکھ کا سانس لے سکے۔ ''حسینہ بنت حسینہ'' میں نشو بیگم کی ذاتی زندگی سے متعلق معلومات مزہ دے گئیں۔ دراصل وہ خوش بخت شخصیت تھی۔ زندگی میں ہر خوشی، سکھ اور نعمت پائی، شادیاں کرنا جرم نہیں، تنہائی کے عذاب سے گھبرا کر غلط راہ کا انتخاب گناہ اور گمراہی کی طرف لے جاتا ہے لیکن اس نے شادی

کے کوڑے سے ہمیشہ کے لیے برائی کا سر کچل دیا، افضل ریمبو نے اس گھرانے سے تعلقات استوار کر کے شہرت، عزت اور زندگی کا خوبصورت، ہم سفر حاصل کرلیا اور کامیاب زندگی گزار رہا ہے، کم از کم دنیاوی سہولتوں کی کمی نہیں۔ ''روسیاہ'' کو مصنف کے مزاج، مشاہدہ، معلومات اور تجربات کے مطابق چلنے دیا جائے تو بہتر ہوگا۔ ہم جلد بازی کا شکار ہیں یوں ساری محنت، ریاضت اور منصوبہ بندی ضائع ہو جائے گی۔ عاطر شاہین عرق ریزی سے واقعات ترتیب دے رہے ہیں، تسلسل، روانی عروج پر ہے اس کے بعد بھی جو سلسلہ شروع ہوگا وہ طویل مدتی ہوگا، محترم قارئین کو تھوڑے صبر، حوصلے کا مظاہرہ کرنا چاہیے تاکہ پورے اسباب کے ساتھ منزل تک پہنچا جاسکے، کبھی مجھے بھی شکایت پیدا ہوتی ہے لیکن اس کا اظہار شدید احتجاج نہیں ہونا چاہیے بلکہ راستے دکھانا بہترین حل ہے۔ اب سچ بیانوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ ''غم کے مارے'' آہوں، سسکیوں، غموں اور محرومیوں سے گندھی تحریر ہے۔ معاشرے میں کیسے عجیب دکھ ہیں، کہیں نرم تو کہیں پتھر جیسے ٹھوس دل ہیں، ہمارے قریب شقی القلب، درندہ صفت اور دوسروں کی تکلیف پر قہقہے لگانے والوں کا شمار نہیں، ایک ارمان صاحب تھے جس نے اپنے دکھوں کو دفن کر کے فلاح انسانیت کے لیے ساری دولت، صلاحیتیں استعمال کیں۔ پرکھنے کی راہ دکھائی اور نیک نیتی اور خلوص سے قادر نے دیا سے دیا جلانا شروع کر کے دنیا کے ساتھ آخرت بھی سنوار لی۔ کنیز زہرہ مبارک باد قبول کریں۔ ''بے غیرت لوگ'' میں قصور تو قیر چوہدری کا نہیں ہے، میں، آپ یا دوسرا کوئی ہو، جب بھی موقع ملے ہم پرائی عورت پر ریجھ جاتے ہیں اور وہ ہاتھ آجائے تو اس کی عمر، شکل، مقام و مرتبہ دیکھے بغیر خوشی سے پھولے نہیں سماتے جیسے کوئی معرکہ سر کرلیا ہو۔ جب ہم ساٹھ سال کی عمر میں سٹھیا جائیں اور ساری خفیہ مصروفیات اور کارنامے معاشرہ میں باعزت بیوی بچوں کے سامنے آجائیں گے تو شرمندگی سے پتھر سے بنا وجود بھی پاش پاش ہو جائے گا۔ دولت کا جائز کاموں پر خرچ کرنا اللہ، رسول کو پسند اور مقبول عمل ہے لیکن ایسی خفیہ مہم جوئی ساری خوشیاں، سکون اور راحتیں چھین لیتی ہے کہ زندگی اور موت میں فرق نہیں رہتا، فاطمہ جیسی شکاری عورتوں کا انجام ذلالت، رسوائی اور بدبودار، جان لیوا بیماریاں ہوتی ہیں۔ سید شاہدہ شاہ ہر بار سبق آموز واقعات کے ساتھ آکر اصلاح معاشرہ کا حق ادا کر رہی ہیں۔ اللہ انہیں نیک اجر دے، آمین! ''حال قسمت کے'' میں اجالا نے فہم و فراست کا ثبوت دیا وہ نئی نویلی دلہن کی بجائے جہاندیدہ عورت بن کر حالات کا مقابلہ کرنے پر تل گئی، قسمت اچھی تھی ساس، سسر اور نند معاملات کو سمجھنے والے اور انصاف کا دامن بھرنے والے تھے، ذیشان کو بھی جلد عقل آگئی۔ اجالا واقعی پوری چار دیواری کے اندر اجالا بن کر آئی اور ہر کونا روشن ہوگیا، ایسی بہویں، بیویاں اور بیٹیاں اللہ کے پیارے لوگوں کو ملتی ہیں اس لیے دعا کے ساتھ دامن پھیلا کر رکھیے تاکہ کوئی کمی نہ رہ جائے۔ ''کیسے کیسے سازشی'' میں ڈاکٹر نے اپنے پیشے سے بددیانتی کی اور کیا خطرناک منصوبہ ترتیب دیا، ایک عورت اجڑ کر در بدر رل جاتی، کیسے لوگوں اور حالات سے سامنا ہوتا، کچھ کہا نہیں جاسکتا جس کی ساری ذمہ داری اور گناہ ڈاکٹر اور شوہر کے سر رہتا۔ شکر ہے غلط فہمی دور ہوگئی شوہر گناہ کے عذاب اور بیوی گھر اجڑنے کے صدمے سے بچ گئی۔ میرے تبصرے، کرداروں کی کھوج اور مایوسی میں مبتلا لوگوں کو حوصلہ دے کر سیدھی راہ دکھانے پر محمد بن کریم نے انوکھے انداز میں سراہا، پسند کیا، خلوص دل سے شکریہ قبول کیجیے۔''

☆ سید امتیاز حسین بخاری، سرگودھا سے رقمطراز ہیں۔ ''اپنی ایک ادبی کاوش دبستان سرگودھا محنت شاقہ اور عرق ریزی سے لکھ کر آپ کی خدمت عالیہ میں بھیج رہا ہوں۔ ماہنامہ سرگزشت کراچی کی کسی قریبی اشاعت میں جگہ دے کر شکریہ کا موقع دیں اور ممنون احسان فرمائیں۔ سرگزشت میں اس طرح کے مضامین وقت کا اہم تقاضا ہیں لہٰذا اس کی شاعت کو یقینی بنائیں۔ دبستان سرگودھا کو ہر دور میں نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ میں نے اس نظر اندازی کو محسوس کرتے ہوئے یہ مقالہ قلم برداشتہ لکھا ہے اس لیے بہت سے نام اور باتیں لکھنے سے رہ گئی ہیں۔ اچھا ہوا ورنہ مقالہ طویل ترین ہوتا۔ مختصر لکھا گیا ہے۔ اہم اور ضروری باتوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ کیا میں آپ سے اُمید رکھ سکتا ہوں کہ میرا یہ مختصر مقالہ سرگزشت میں نمایاں جگہ پر اشاعت پذیر ہوگا (آپ سرگزشت کے پرانے قاری ہیں۔ آپ نے اپنی تحریر میں اس بات کو نظر انداز کر دیا کہ سرگزشت کی تحریر کا انداز جداگانہ ہے۔ اسے آپ کسی اخبار میں بھیج دیں کیونکہ یہ اخباری انداز میں لکھا گیا ہے۔ ہمیں کسی شاعر ادیب کی مکمل حالات زندگی بھیج دیں جس کا اندازِ تحریر رواں

ہو۔ جس قسم کی تحریر سرگزشت میں لگتی ہے) اکتوبر کا شمارہ زیرِ مطالعہ ہے، آدھا پڑھا ہے اور آدھا رہ گیا ہے۔ ان شاء اللہ آدھا بھی پڑھ لوں گا۔ اداکارہ نشو صاحبہ، افضل ریمبو پر اعجاز احمد نواب کی تحریر خوب سے خوب تر اور معلومات کا خزانہ لیے ہوئے ہیں۔ ماں بیٹی اور داماد تینوں نے پہچان بنائی اور خوب دولت و شہرت کمائی۔ اب اجازت چاہتا ہوں، ان شاء اللہ پھر حاضر ہوں گا۔‘‘

☆ ظفر ندیم وہرہ کی آمد، فیصل آباد سے۔ ’’زندگی کی تلخیوں کو کم کرنے کے لیے ہر انسان کی یہ دلی خواہش ہوتی ہے کہ اسے کوئی اپنے جیسا مل جائے۔ کوئی ایسا رازداں مل جائے جو دل کی بات زبان پر آنے سے پہلے سمجھ جائے لیکن ہوتا کیا ہے۔ ایک عکس ان کا جو دوراہوں کے راہی تھے لیکن وقت قدم قدم پر ان کا امتحان لیتا رہا ہے۔ اُمید ہے کہ میری یہ کہانی آپ کو اور قارئین کرام کو پسند آئے گی۔ آپ کی گرانقدر رائے کا انتظار رہے گا (نئے پرچے سے نمٹ کر کہانی دیکھ لیتا ہوں)‘‘

☆ رانا محمد شاہد، بورے والا سے لکھتے ہیں۔ ’’اداریہ بحیثیت مجموعی ہماری قومی نفسیات کا احاطہ کررہا تھا۔ عجیب انسان ہیں مصیبت زدہ لوگوں سے بھی فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ویسے قیصر خان کے خط میں یہ پڑھ کر اس ایم این اے پر افسوس ہوا جو سیلاب متاثرین کے سامنے منرل واٹر سے اپنے پاؤں دھور ہا تھا۔ اس سے زیادہ افسوس کا مقام کیا ہوگا۔ دراصل ایسا اس لیے ہے کہ ہم بے حسی سے بڑھ کر سفّاکیت میں داخل ہوچکے ہیں۔ شہرِ خیال کے پرانے ساتھی نظر نہیں آرہے۔ ناصر حسین رند، وحید ریاست بھٹی، آفتاب نصیر اشرفی اور بشریٰ افضل جو اس محفل کی جان ہوتے تھے۔ آج کل کہاں ہیں (واقعی یہ سب غیر حاضر ہیں) زویا صفوان اس دفعہ ہمارے پسندیدہ ادیب احمد ندیم قاسمی کی زندگی کی کہانی لے کر آئیں۔ احمد ندیم قاسمی کا شمار ہمارے ان ادیبوں میں ہوتا ہے جنہوں نے نوجوان لکھنے والوں کی بہت حوصلہ افزائی کی بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ جتنی حوصلہ افزائی انہوں نے کی، ویسی کسی نے نہیں کی، کہتے ہیں کہ ’’فنون‘‘ کے لیے آنے والی کسی غزل یا نظم میں کوئی سقم نظر آتا تو خط لکھ کر شاعر سے پوچھتے کہ میرے خیال میں اس لفظ کی بجائے یہ لفظ زیادہ موزوں ہوگا، آپ کی اجازت ہو تو بدل دوں۔ ایسے لکھنے والے کہاں ملیں گے۔ احمد ندیم قاسمی کی آخری خواہش پڑھ کر دل ملول ہوا اور کافی دیر تک رہا۔ ’’اس آخری عمر میں ایک منصوبہ میرے ذہن میں ہے کہ اپنے گاؤں چلا جاؤں۔ وہاں پُرسکون مکان کی کھڑکی کے پاس بیٹھ کر کم سے کم ناول، ایک طویل نظم اور اپنی سوانح ضرور لکھوں گا۔ ملک الموت سے مجھے بس اتنی ہی مہلت درکار ہے مگر وہ کسی کی کہاں سنتا ہے؟‘‘ منظر امام کی آپ بیتی ’’بقلم خود‘‘ بہت دلچسپ رہی۔ سب سے پہلے یہ کہیں گے کہ آپ بیتیوں کا یہ سلسلہ بہت اچھا اور خوش آیند ہے۔ کوشش کیجیے گا کہ جاسوسی پبلشر کے تمام بڑے لکھنے والوں سے ان کی زندگی کی کہانیاں لکھوائی جائیں۔ خصوصاً ادب کے حوالے سے ان کی جدوجہد اور اس راہ میں حائل مشکلات (جی ہاں کئی قلمکاروں نے لکھنا شروع کردیا ہے) منظر امام نے آپ بیتی لکھنے کی مجموعی نفسیات کے حوالے سے جو باتیں بتائیں، وہ بھی حقیقت پر مبنی ہیں۔ خاص طور پر یہ جملہ کہ ’’میرا تو عقیدہ ہے کہ جو شخص اپنی اچھائیوں کی تشہیر کرتا ہو اور جو اپنی بیماریوں کا ڈھنڈورا پیٹتا ہو، دونوں ہی منافق ہوتے ہیں۔‘‘ عقیل عباس جعفری ’’جگا ٹیکس‘‘ کی صورت ایک مختصر منفرد تحریر کے ساتھ موجود تھے۔ ایسے موضوعات پر بہت کم لکھا گیا ہے اور یہی ایک بڑے مصنف کی انفرادیت ہوتی ہے کہ وہ ایسے موضوعات کا چناؤ کرتا ہے۔ ایسی ہی ایک تحریر پرویز بلگرامی کی ’’فخرِ سندھ‘‘ ہے۔ میرے خیال میں سندھی ادب کے فخر محمد عثمان ڈیپلائی پر بھی یہ نایاب تحریر ہی ہوگی (جی ہاں، اردو میں اتنے عظیم قلمکار پر بہت کم لکھا گیا ہے) اعجاز احمد نواب نے ریمبو صاحبہ اور نشو کے فلمی کیریئر پر دلچسپ لکھا۔ گیسٹ ہاؤس کے حوالے سے پڑھتے ہوئے بچپن کے وہ ایام یاد آگئے جب ہم بھی اس ڈرامے کا بے چینی سے انتظار کیا کرتے تھے۔‘‘

☆ ایم حسن نظامی، قبولہ شریف، ضلع پاک پتن سے لکھتے ہیں۔ ’’اُمید ہے آپ اور سرگزشت سے وابستہ پوری ٹیم خیریت سے ہوگی عرصہ سے آپ کے پرچوں سے واسطہ ہے۔ اچھی ہائنڈنگ، عمدہ پروف ریڈنگ اور معیاری سلیکشن بلاشبہ آپ جیسے کامیاب ایڈیٹر کے مرہونِ منت ہے۔ فلمی دنیا، آسیب، تاریخ، اسلامی سبھی کچھ پرچے کی زینت ہوا کرتا ہے۔ شہر خیال جیسی پُرمسرت اور مسحور کن محفل جس میں ملک بھر سے رنگا رنگ پھول اکٹھے بیٹھ کر دور تک اپنی خوشبو کے سحر میں جکڑ لیتے

ہیں۔تاریخی نوعیت کے بادشاہ، وزیر، سپہ سالار، ہیرو، شاعر، مصنف اور سیاستدان۔ سبھی کچھ پرچے کے قیمتی صفحات پر سجا ہوتا ہے۔دل بیکراں مسرتوں سے جھوم اٹھتا ہے۔ پھر ملک کے طول وعرض سے نامور لکھاریوں کی سبق آموز تحریریں پڑھتے ہوئے آپ کی لاتعداد ذہانت کی داد دینا ضروری ہوا کرتا ہے۔ پہلی بار نپے تلے قدموں سے ڈرتے ڈرتے آپ تک پہنچا ہوں۔ میں گمنام سا لکھاری سہی مگر تحریر آپ اور قارئین کو ضرور محظوظ کرے گی۔ اتنا عرصہ حوصلہ اس لیے نہ ہوسکا کہ کہیں ٹھکرا نہ دیا جاؤں۔ بہرحال ذرہ نوازی ہے کہ آپ کی کہ ہر چھوٹے بڑے لکھاری کو آپ جگہ ضرور دیتے ہیں اور حوصلہ افزائی بھی فرماتے ہیں۔ میں نے معاشرے کے بہت ہی حساس سے پہلو کو اجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔ اور اسے میں نے ''ہوس کی آگ'' کا نام دیا ہے۔ یہ تحریر ہی نہیں بلکہ ہمارے معاشرے کا بہت بڑا المیہ بھی ہے۔ اس سچ بیانی کو میرے گوش گزار میرے بہت ہی دیرینہ عزیز نے لاہور سے کیا۔ اور پھر میں نے اسے لفظوں کا ہار پہنا کر آپ تک پہنچایا۔ (سچ بیانی شاملِ اشاعت ہے)''

☆عیشل مطاہر خان، ڈیرہ اسماعیل خان سے۔''ماہ ستمبر کے آخری ایام سے ہی سرگزشت کا انتظار ہونے لگا تھا مگر اس بار انتظار طویل ہی ہوتا گیا۔ بے چینی تھی کہ بڑھتی چلی جارہی تھی مگر سرگزشت کا دیدار نصیب نہیں ہورہا تھا اور آخر کار نو اکتوبر کو سرگزشت میرے ہاتھوں میں آ ہی گیا۔ (ہم سب خود بھی فکر مند رہے کہ ڈائجسٹ کے بنڈل مختلف ریلوے اسٹیشنوں پر بے یارو مددگار پڑے تھے اور قارئین منتظر رہے) سرورق کی خوب صورت حسینہ مجھ سے کچھ کہتی ہوئی محسوس ہوئی۔ دوشیزہ نخرے دکھا رہی تھی دوسری جانب تاریخ ساز شخصیات بھی سرورق پر موجود تھیں، سرورق اچھا لگا۔ اس کے بعد فہرست پر نظر دوڑائی تو ایک نیا نام نگاہ سے گزرا ''زرمینہ شاہ'' مصنفہ نئی لکھاریہ معلوم ہوئیں جن کے تبصرے بھی سرگزشت کی زینت بنتے رہے ہیں تو تجسس بھی سر اٹھانے لگا کہ سب سے پہلے انہی کو پڑھنا چاہیے۔ اداریہ کی باتوں سے متفق ہونے کے بعد خطوط پر نگاہ ڈالی کرسی صدارت محمد بن کریم کے حصہ میں آئی تو مصنفہ بینا راجپوت کا تبصرہ بھی شمارے میں موجود تھا اس کے بعد زرمینہ شاہ کی کہانی ''جہنم زدہ زندگی'' کو پڑھا۔ کہانی کا پلاٹ، اسلوب اور روانی کسی منجھے ہوئے مصنف کی مانند تھی۔ یقین نہیں ہوا یہ ان کی پہلی تحریر ہے۔ زرمینہ شاہ کو پہلی بار پڑھا اور یہ پسندیدہ لکھاری بن گئیں۔ بہت دل سوز موضوع پر قلم اٹھایا۔ پانی کے لیے ترستے ہوئے لوگوں کی حسرت اور حالت زار کو پڑھ کر میری آنکھیں بھر آئیں۔ کس طرح گاؤں کے لوگ پانی کی قلت کا شکار ہو کر گاؤں کو خیر باد کہنے کا کٹھن فیصلہ کرتے ہیں۔ کہانی کا مرکزی کردار شنکر کی امید کہانی کی جان تھی آخری لمحات تک شنکر کا پُرامید رہنا ہمارے لیے سوچنے کی راہ کھولتا ہے کہ اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ کہانی سبق آموز رہی۔ ''موت کی گھڑی'' بہت ہی پُرتجسس اور سحر طاری کر دینے والی کہانی رہی۔ برطانوی انٹیلی جنس رینڈ کی ریٹائرمنٹ کے دوران پیش آنے والے بم دھماکے کی روداد کو سسپنس سے بھرپور مقدس بھٹی نے بہت عمدہ انداز میں قلمبند کیا۔ رینڈ جلد شادی کے بندھن میں بندھنے والا تھا مگر اس سے قبل ہی بم دھماکے کے کیس میں الجھ کر رہ گیا۔ بم دھماکے میں مرنے والا ایک ادیب دیگر جس کے بریف کیس میں بم چھپا تھا۔ آیا وہ بم خود لایا تھا؟ یا کسی سازش کا شکار ہوا؟ یہ جوابات آخری سطر تک دماغ میں کلبلاتے رہے۔ بہت ہی اچھی کہانی رہی۔ مجرم وہی نکلا جس پر مجھے شک تھا۔ لکھاریہ نے روانی سے تمام واقعات کو صفحہ قرطاس پر اتارا۔ کہانی ''ہماری غلطیاں'' حفصہ محمد فیصل کے قلم سے ہلکے پھلکے اسلوب کی معاشرے میں پنپتی برائی کو بہت اچھے انداز میں قلم سے صفحات پر اتارا۔ ماں باپ کا اولاد کے رشتے میں تاخیر کرنا، داماد اور بہو لانے میں دیر کرنا اولاد کو کس آزمائش میں مبتلا کرتا ہے، مصنفہ نے عمدہ انداز میں خرابیوں کو بیان کیا اور سوچ کے در وا کیے۔ کہانی مہربان سایہ ''خلیل جبار'' کے قلم سے۔ پیسے کی لالچ میں ڈوبے ہوئے مختلف لوگوں کی بد فطرت کو منفرد انداز میں قلمبند کیا۔ کہانی کا خوشگوار انجام مجھے بہت پسند آیا۔ کہانی ''جنات کی شادی'' بہت اچھی لگی۔ ایسی کہانی مجھے بچپن ہی سے کافی پسند رہی ہیں۔ تنزیلہ یوسف نے کہانی کے تمام واقعات کو اور منظر نگاری کو بہت جاندار انداز میں لکھا ایسا محسوس ہوا ہم بھی اس تقریب میں پیش پیش ہیں۔ اس طرح کا واقعہ پہلی بار نگاہ سے گزرا ہے۔ ''کیسے کیسے سازشی'' ایک عام سی کہانی کو محمد عارف قریشی نے تجسس قائم رکھتے ہوئے بہت ہی زبردست انداز میں تحریر کیا۔ بھابی کے ظلم کی شکار دوشیزہ جب بیاہ کر سسرال گئی وہاں بھی غم کے پہاڑ اس کے منتظر رہے۔ کہانی کا اختتام جلد بازی کا شکار نظر آیا مگر کہانی اچھی رہی۔ تاریخ سے مجھے بہت دلچسپی رہی ہے۔ نوائے آدمیت احمد ندیم قاسمی کی داستان زویا صفوان نے کیا خوب

قلمبند کیا۔ منظر نگاری کا عالم ایسا تھا جیسے تمام مناظر کی میں چشم دید گواہ ہوں ایک فلم کی مانند دماغ کی اسکرین میں چلتے واقعات روانی لیے ہوئے تھے۔ یہ تحریر رسالے کی جان رہی۔ زویا صفوان تعریف و توصیف کی مستحق ہیں۔ ''بقلم خود'' ڈائجسٹ کا ایک نیا سلسلہ بہت شاندار ہے۔ اگلی قسط کا بے چینی سے ابھی سے انتظار رہنے لگا ہے۔ جگا ٹیکس ایک انسان کی ڈاکو بننے کی کہانی بیان کی گئی۔ جگا کا خوف لاہور شہر میں پھیلا ہوا تھا اور ایک دن ڈی آئی جی کی گولی کا شکار ہوا۔ برائی کا انجام برا ہی ہوتا ہے۔ کہانی کو منفرد انداز میں بیان کیا گیا۔ حسینہ بنت حسینہ میرے پسندیدہ اداکاروں پر لکھی گئی میری پسندیدہ تحریر تھی۔ کہانی پڑھنا اور فلمیں دیکھنا میرا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ جان ریمبو اور صاحبہ پاکستانی فلمی صنعت کے بہترین اداکار ہیں شاید ہی کوئی ان دو ناموں سے آشنا نہ ہو۔ ان کے فلمی آغاز اور زندگی کے واقعات کو پڑھ کر انوکھی سی خوشی میسر آئی۔ فخر سندھ جناب ڈیپلائی صاحب کے بارے میں پڑھ کر اچھا لگا۔ ان کا فلمی سفر اور تن تنہا زمینی خدا بننے والے لوگوں سے لڑتے رہے اور آخر کار ان کی وفات ہوئی۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ بہت بہادر شخصیت کے مالک تھے۔ پرویز بلگرامی صاحب نے بہت معلوماتی تحریر ہم تک پہنچائی ان کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ تحریر ''وقت آخر'' تاریخی شخصیات کے بارے میں جان کر اچھا لگا۔ خالد بن ولید، عمر بن عبدالعزیز، سید محمد نظام الدین اور امیر خسرو جیسی تاریخ ساز شخصیات کے بارے میں اتنی معلومات اکٹھی کرنا اور خوبصورت انداز میں تحریر کرنا کہ پڑھنے والے داد دیئے بنا نہیں رہ سکتے۔ عنایشہ چوہدری نے مفصل معلومات فراہم کیں۔ کہانی غم کے مارے نے میری آنکھوں کو اشکبار کیا۔ دنیا میں کیسے کیسے غم کے مارے اور پریشان حال لوگ موجود ہیں جب دوسروں کے غم کو دیکھتے ہیں تو اپنے غم معمولی لگتے ہیں اور اللہ کا شکر بجا لیتے ہیں۔ عمیر کا ''ڈولی'' بننے کا سفر بہت اداس کر دینے والا تھا، وہیں قادر گھر کی ذمے داریوں کو نبھانے کے غرض سے چہرے پر نقاب چڑھا لیتا ہے۔ غربت بھی انسان سے کیسے کیسے کام کرواتی ہے۔ ارمان صاحب کا بے لوث مدد کرنا دل کو چھو گیا۔ دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو انسانیت کی خدمت بغیر کسی لالچ کے کیا کرتے ہیں۔ کنیز زہرہ نے کہانی کے ذریعے بہت مثبت پیغام قارئین تک پہنچایا ہے۔ ''چال قسمت کی'' اجالا ذیشان کی سچی آپ بیتی بہت سبق آموز تھی۔ بیوی کی وفا شعاری اور خدمت گزاری شوہر کے دل پر کیسے راسخ ہوتی ہے اجالا ذیشان کی آپ بیتی نے سوچ کی نئی راہوں سے ہمکنار کیا۔ ''بے غیرت لوگ'' سید شاہدہ شاہ کے قلم سے لکھی گئی معاشرے کے ناسور کو بے نقاب کرتی اچھی کہانی تھی۔ آخر میں سرگزشت کے لیے دعا گو ہوں اللہ دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے آمین۔''

☆ فرزانہ نکہت کا خط لاہور سے۔ ''اُمید ہے بفضل خدا تعالیٰ بخیریت ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ پر بے پناہ رحمتوں اور برکتوں کا نزول فرمائے۔ (آمین) ''برفیلا جہنم'' کی اشاعت پر دلی شکریہ ادا کرتی ہوں۔ خوشی ہے کہ میری کہانیاں آپ کو پسند آرہی ہیں۔ قارئین بھی پسند کر رہے ہیں۔ یہ تین مزید ترجم کہانیاں حاضرِ خدمت ہیں۔ اُمید ہے شرف قبولیت حاصل کریں گی۔''

☆ حبا علی کی آمد حیدر آباد سے۔ ''سرگزشت کی ہر تحریر دل کو چھو جاتی ہے۔ معلومات کی ترسیل اتنے عمدہ طریقے سے بہت کم دیکھا ہے۔ معلومات کا خزانہ کہانی کے انداز میں پسند آتا ہے۔ نوائے آدمیت ایک لاجواب تحریر تھی۔ بقلم خود نے تو اسیر کر لیا ہے۔ منظر امام ہمارے پسندیدہ قلم کار ہیں۔ ان کے ڈرامے پی ٹی وی پر شوق سے دیکھتی تھی۔ عید ٹرین کا ایک ایک منظر آج بھی ذہن میں محفوظ ہے۔ ان کی سوانح پڑھ کر مزہ آرہا ہے۔ اگلی قسط کا انتظار ہے۔ وقت آخر خالص معلوماتی تحریر ہے کہ بستر مرگ پر نمایاں شخصیات نے کیا کہا۔ جگا ٹیکس چھوٹی سی مگر قابلِ تعریف تحریر ہے۔ حسینہ بنت حسینہ، پاکستانی فلم نگری پر اچھی تحریر ہے۔ فخر سندھ کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ عثمان ڈیپلائی بہت بڑے فلکار تھے۔ ان کا صرف ایک ناول سانگھڑ ہر ادب پر بھاری ہے۔ ایسا ناول کسی اور ادب میں لکھا ہی نہیں گیا۔ روسیاہ اپنی قدر کھو رہا ہے۔ کہانی کہاں سے شروع ہوئی تھی اور کہاں پہنچ گئی۔ علی اپنے باپ کے قتل کا بدلا لینے نکلا تھا اور اب کہانی کہاں پہنچا دی گئی ہے۔''

☆ مہرین خان کا ای میل ڈیرا غازی خان سے۔ ''اس بار کا شمارہ کافی لیٹ پہنچا۔ انتظار کا بھرپور لطف اٹھایا۔ غم کے مارے جیسی سچ بیانی نے بہت لطف دیا۔ ہماری غلطیاں اور بے غیرت لوگ بھی اچھی لگی لیکن منظر امام کی بقلم خود کا

جواب نہیں۔ کس خوبصورتی سے اپنی سفرِ زندگی سنا رہے ہیں، جیسے ہم ان کا کوئی ڈراما دیکھ رہے ہیں۔ کوئی کہانی پڑھ رہے ہیں۔ جگا ٹیکس بھی پسند آیا۔ نوائے آدمیت نے تو جادو کر دیا ہے۔ میرے پسندیدہ کہانی کار احمد ندیم قاسمی کی سوانح حیات مزہ آ گیا۔ کل ملا کر پورا شمارہ محفوظ رکھنے والا ہے۔''

☆ اعجاز احمد اعجاز بھٹی، کوٹ اردو سے لکھتے۔ ''زبردست شمارہ تھا معلومات کی بہار، ہر کہانی اپنی جگہ مکمل، دلچسپ سچ کو اتنے بہتر انداز میں لکھا جا سکتا ہے یہ اب جانا ہے، میری بدقسمتی کہ اتنے اچھے ڈائجسٹ سے اب تک دور کیوں تھا۔ پہلی بار میں ہی سرگزشت نے دل جیت لیا ہے۔''

☆ ارشد ابرار سکھر سے رقمطراز ہیں۔ ''اب مجھے غصہ آنے لگا ہے لیٹ پر لیٹ، لیٹ پر لیٹ، ایڈیٹر صاحب یہ کیا ہو رہا ہے؟ اس بار کے انتظار نے کوفت پیدا کر دیا تھا لیکن یہ کوفت جناب عثمان ڈیپلائی کی سوانح حیات نے دور کر دی۔ قسم سے مزہ آ گیا۔ سائیں عثمان بہت بڑے آدمی تھے۔ بہت لکھا۔ اتنا لکھا کہ اسے بھلایا بھی نہیں جا سکتا ہے۔ آپ نے ان کی خودنوشت خود لکھی یہ بھی ایک خوشی کی بات ہے۔ زبردست تحریر، زبردست انداز بیان صرف اس ایک تحریر کے لیے میں نے ڈبل سرگزشت خریدا کہ اس تحریر کو جلد باندھ کر محفوظ کرلوں۔ احمد ندیم قاسمی کی سوانح حیات بھی اچھی لگی۔''

☆ قیصر خان کا خلوص نامہ بھکر سے۔ ''اداریہ میں ملک کی آزمائشوں پر بات کی گئی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارا کوئی ضابطہ اخلاق نہیں رہا۔ عذاب کو ہم دعوت نہیں دیتے بلکہ عذاب کا مذاق بنا رہے ہیں۔ سیلاب کی امداد کی لوٹ مار، گندم کی ذخیرہ اندوزی، آٹا حکومت سے لے کر آگے مہنگا سیل کرنا عام سی بات بن گئی ہے۔ مزدوری نہ ملے تو آٹے کی لائن میں لگ کر وہ حلال حرام کما لیتا ہے۔ اب تو پیشہ بنا لیا ہے لوگوں نے۔ میرے ضلع میں کچھ لوگ خیمہ لگا کر امداد لے رہے تھے۔ معلوم کرنے پر وہ تھل کے باسی نکلے، جہاں سیلاب بھی نہیں جا سکتا، زمینی حساب سے۔ یک صفحہ میں ماہر لسانیات شوکت سبزواری کے نام کو پہلی بار پڑھا ہے۔ اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے (آمین)۔ شہر خیال میں محمد بن کریم طویل تبصرے کے ساتھ کرسی صدارت پر تھے۔ بہترین تبصرہ پڑھنے کو ملا ہے۔ تمام رسالے کا خلاصہ کیا جائے تو بہترین ہوگا۔ ملک اعجاز حسین، بینا راجپوت، سیدہ صاحبہ، وکیل اثر حسن، نعمت قریشی، زاہد الحسن، یاسمین ناز تمام تبصرے اچھے تھے۔ نوائے آدمیت میں احمد ندیم قاسمی کے بارے میں بہت مفصل پڑھنے کو ملا۔ واقعی وہ بہت بڑے آدمی تھے۔ بقلم خود، بہترین سلسلہ شروع ہوا ہے اور بہت بڑی ادبی کاوش ہوگی۔ آنے والے سالوں میں بہت سے قلم کاروں کی آپ بیتی زندہ پڑھنے کو ملے گی۔ ہم تہ دل سے شکر گزار ہیں ایسا سلسلہ شروع کرنے پر ادارے اور ٹیم کا۔ وقت آخر، جگا ٹیکس، حسینہ بنت حسینہ، فخر سندھ، موت کی گھڑی بہت اچھے مضامین تھے۔ پہلی سچ بیانی میں انسانی نفسیات پر بہترین تحریر تھی۔ غم کی حالت میں ماں جیسی ہستی بھی پھسل گئی تھی، وہ بھی اپنے بیٹے کو ذمے دار ٹھہرا رہی تھی۔ ماں جیسی ہستی بھی غم میں ممتا کو بھول گئی۔ بہت دکھی اور دردناک کہانی تھی۔ بے غیرت لوگ۔ ایسے کم ظرف لوگ ہر محلہ۔ گلی میں موجود ہیں بس ان کے انداز الگ الگ ہیں۔ چال قسمت کی۔ اتنے نصیب والی عورت ذات بہت کم ملی ہیں کہانیوں میں صرف عورت کے ظلم بیان کیے جاتے ہیں۔ کیسے کیسے سازشی میں مسیحا کا اپنے پروفیشن کے ساتھ وعدہ ہوتا ہے لیکن اس نے اپنی بہن کے لیے حلف اٹھانے کو بھی قربان کر دیا۔ اللہ تعالیٰ عدل کرنے والی ذات ہے۔ جنات کی شادی، ایسی کہانی کچھ زیادہ ہی عجیب ہے۔''

☆ مسز پرویز خان سواتی کی آمد مانسہرہ سے۔ ''سب سے پہلے ایک صفحے پر مشتمل سوانح پڑھا۔ ادارہ مبارک باد کا مستحق ہے کہ ایک سے بڑھ کر ایک لاجواب شخصیت سے متعارف کروا رہا ہے۔ شہر خیال میں داخل ہوئے کرسی صدارت پر اعجاز احمد سیٹھار صاحب کو دیکھ کر خوشی ہوئی ہمیشہ کی طرح بہت اچھا تبصرہ۔ وہ واقعی میں کرسی صدارت کے مستحق ہیں۔ سب تبصرے بہت اچھے تھے۔ اگلے صفحے پر اپنا نام دیکھ کر خوشی ہوئی۔ شکر ہے میرا خط بھی سرگزشت کی زینت بنا۔''

تاخیر سے موصول خطوط:

دلشاد اختر، لیہ۔ افسر حسین، راولپنڈی۔ سلطان خان، بنوں۔ حسنین میمن، حیدرآباد۔ رضوانہ شاہنواز، ایبٹ آباد۔

عندلیبِ قفس

زویا صفوان

اس وقت جب برصغیر کا عجب عالم تھا لڑکیوں کی تعلیم کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ہر طرف مسلط جہالت کی گھٹا تھی۔ کاروانِ زندگی بہکا ہوا بھٹکا ہوا تھا۔ اہلِ دانش بھی فریب جہل میں تھے۔ بے یقینی کے اندھیرے ذہن پر ثبت تھے۔ ایسے وقت میں اس نے قلم اٹھایا۔ لکھا اور خوب لکھا، ادبی دنیا پر چھاگئی لیکن اس دور کے اہلِ علم ماننے پر تیار ہی نہ تھے کہ یہ تحریر کسی دوشیزہ کی ہے۔

اردو کی ایک بدقسمت شاعرہ کا عکسِ زندگی

امیراں باورچی خانے میں آئی تو اسے اپنے سامنے ایک تھالی میں مٹھائی رکھی دکھائی دی۔ اس کے منہ میں پانی بھر آیا لیکن نوکر ذات تھی۔ ضبط کیے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اس نے سبزی کا سامان مقررہ مقام پر رکھا اور تھالی سے نظریں چراتی ہوئی باہر چلی گئی جہاں اسے اپنے مقرر کردہ فرائض کے مطابق صفائی کرنی تھی۔ ملازمت پر اس کا پہلا روز تھا۔ وہ جلدی جلدی ہاتھ چلاتی ہوئی صفائی تو کرنے لگی لیکن پردہ تصور پر ابھی بھی خوش رنگ مٹھائی کا منظر دل للچا رہا تھا۔

ایک کمرے کی صفائی مکمل کرتے ہی وہ دوسرے کمرے میں چلی آئی اور اندر داخل ہوتے ہی ٹھٹک کر رک گئی۔

''کیا بات ہے امیراں؟ اتنی سستی کا مظاہرہ کیوں کر رہی ہو؟ اس وقت تک تو تمہیں دو کمروں کی صفائی کر لینی چاہیے تھی۔'' ملازماؤں کی نگران سکینہ نے اسے سختی سے کہا۔

''جی! میں بس ابھی کر دیتی ہوں۔'' امیراں کے انداز میں پھرتی در آئی۔ نگاہیں ہنوز مٹھائی پر تھیں۔

سکینہ نے اس کی نظروں کا رخ بھانپ لیا اور گویا ہوئی۔

''لو بھلا! مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ تم اپنا حصہ لیتی جانا مٹھائی سے۔ بلکہ میں ہاجرہ سے کہہ کر خود تمہارے لیے بڑا تھیلا تیار کروا دیتی ہوں۔''

''بہت شکریہ جی! لیکن پورے گھر میں ہر جگہ مٹھائی کیوں دکھائی دے رہی ہے؟'' اس نے بالآخر اپنی الجھن بیان کر ہی دی۔

''ارے ہاں بھئی! تمہیں کیسے علم ہوگا؟ تم آج ہی تو آئی ہو۔'' سکینہ نے پیشانی پر ہاتھ مارا اور سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''نواب صاحب کے ہاں دو روز پہلے بیٹی کی ولادت ہوئی ہے۔ اسی خوشی میں انہوں نے منوں کے حساب سے مٹھائی تقسیم کی ہے۔''

پپیا (زرخ ش)
دلِ فسردہ کو اب طاقتِ قرار نہیں
نگاہِ شوق کو اب تابِ انتظار نہیں
نہیں نہیں مجھے برداشت اب نہیں کی نہیں
خدا کے واسطے کہنا نہ اب کی بار "نہیں"
ہمیشہ وعدے کیے اب کے مل ہی جا آ کر
حیات و وعدہ و دنیا کا اعتبار نہیں
دکھائی اپنی محبت کو چیر کر سینہ
مگر نمود مرا شیوہ و شعار نہیں
مری بہن مری محبوبہ حب عجب شے ہے
جہاں خاک نہیں کچھ جو دوست دار نہیں
زرخ ش
فردوسِ تخیل
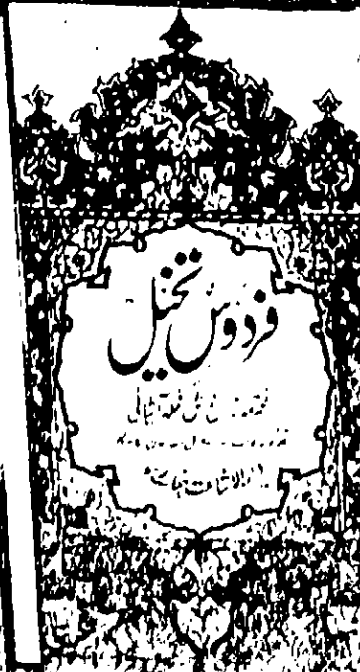
''بیٹی کی پیدائش پر مٹھائی؟'' امیراں کی آنکھیں حیرت سے پھٹنے کے قریب تھیں۔ ''ایسا تو کبھی دیکھا نہ سنا۔''

''یہاں تم ایسی ہی باتیں دیکھو اور سنو گی جو کبھی کہیں نہ ہوتی ہوں۔'' سکینہ کو اس کی حیرت نے محظوظ کیا۔ ''ہمارے نواب صاحب ڈاکٹر سر حاجی محمد مزمل اللہ خان بہادر ایک منفرد انسان ہیں۔ ان کا تعلق شروانی قبیلہ سے ہے۔ نواب صاحب کی شادی اپنے چچا عنایت اللہ خاں صاحب کی بیٹی 'حجاجی بیگم' سے ہوئی ہے۔ عنایت اللہ صاحب بھیکم پور کے رئیس ہیں۔'' سکینہ نے اپنی دیرینہ ملازمت میں حاصل شدہ معلومات کا بڑے فخر سے اظہار کیا۔

''لیکن بیٹی کی پیدائش پر مٹھائی۔ میں نے واقعی ایسا پہلی بار دیکھا ہے اپنی زندگی میں۔'' امیراں کی سوچ اب بھی وہیں اٹکی تھی۔

''یہاں رہ کر تم ایسا بہت کچھ دیکھو اور سنو گی۔'' سکینہ نے متانت سے بتایا۔ ''میں نے کہا ناں کہ ہمارے نواب صاحب بہت مختلف انسان ہیں۔ سر سید احمد خان کے ہم صحبت رہ چکے ہیں اس لیے روایتی سوچ و نظریات کی بجائے ترقی پسند رجحان کے مالک ہیں، دوسری جانب مذہبی عقائد میں بھی کسی سے کم نہیں۔ نماز روزے کے پابند ہیں۔ خوفِ خدا، عشقِ رسول ﷺ سے مالا مال ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے ان کا سب سے بڑا بیٹا وفات پا گیا تھا اس لیے اولاد کی تڑپ شدید ہے۔ میں نے انہیں 'زاہدہ بیگم' سے پہلے 'احمدی بیگم' کی پیدائش پر بھی بے انتہا خوش دیکھا ہے۔''

''پروردگار اس گھر کی خوشیاں ہمیشہ سلامت رکھے۔ نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کو اولاد کی ہر خوشی دیکھنی نصیب فرمائے۔'' امیراں نے صدقِ دل سے دعا کی۔

سکینہ نے بھی پورے خلوص سے آمین کہا۔ امیراں نے صفائی کے لیے جلدی جلدی ہاتھ چلانے شروع کر دیئے تھے۔ وہ نواب صاحب کے مبینہ کردار کے متعلق سوچتی ہوئی ہنوز دل ہی دل میں ان کے لیے دعا گو تھی۔ اس بے خبر کو خبر ہی کہاں تھی کہ وہ لمحات دعاؤں کی قبولیت کے نہیں بلکہ ان کے متضاد ثابت ہونے کے ہیں۔ گھر کی خوشیاں سلامت رہنی تھیں اور نہ ہی نواب مزمل، حجاجی بیگم کو اولاد کی کوئی خوشی دیکھنی نصیب ہوئی تھیں۔ ان دونوں کے ساتھ اولاد نے بھی نہایت حرماں نصیب ثابت ہونا تھا۔

☆☆☆

نواب مزمل خوابگاہ میں زاہدہ بیگم اور احمدی بیگم کے ساتھ اٹکھیلیوں میں مصروف تھے۔ احمدی بیگم نے ڈیڑھ سال تک خوب لاڈ پیار سمیٹا تھا۔ زاہدہ کی پیدائش کے بعد والدین اور عزیز و اقارب نے اس کی محبت اور چاؤ چونچلوں میں کسی قسم کی کوئی کمی کی تھی نہ ہی زاہدہ کے حقوق میں کوئی افراط و تفریط۔ دونوں بہنوں کی محبت و حقوق میں توازن برقرار رکھا گیا تھا۔

زاہدہ کی عمر اب پانچ ماہ ہو چکی تھی۔ وہ قدرے کمزور جسامت لیکن ایک پُرکشش اور دلکش بچی تھی۔

''زاہدہ بیگم کی صحت پھل پھول کیوں نہیں رہی؟'' نواب مزمل نے یکدم اہلیہ سے دریافت کیا۔

''مجھے بھی یہی تشویش رہتی ہے۔ جانے اس کی صحت معمول پر کیوں نہیں آ رہی؟'' حجاجی بیگم نے پریشانی سے جواب دیا۔

''آپ اپنی خوراک کا خاص خیال رکھا کریں۔ آپ صحت مند ہیں تو بچی بھی ٹھیک رہے گی۔'' انہوں نے محبت بھرے انداز میں کہا۔

''آپ کی بات بالکل بجا ہے لیکن اب زاہدہ کی رضاعت کے لیے کوئی نہ کوئی بندوبست کرنا پڑے گا۔'' حجاجی بیگم نے نچلا ہونٹ دباتے ہوئے سر جھکا لیا۔

''کیوں؟ اوہ...... کیا واقعی؟'' نواب مزمل بے دھیانی میں بات کرتے یکدم چونکے۔

''جی ہاں! اللہ نے چاہا تو ہمارے گلشن میں ایک اور پھول کا اضافہ ہونے والا ہے۔'' انہوں نے شرما کر بتایا۔

''پروردگار ہمیں صحت و سلامتی والی اولاد عطا فرمائے۔'' نواب مزمل نے گہری سانس بھری۔

اس کے بعد وہ دونوں آنے والے ننھے مہمان کی بابت گفتگو کرنے لگے۔ اگلے چند ماہ میں نواب مزمل نے اپنی اہلیہ کا بھرپور خیال رکھا۔ اس کے ساتھ بچیوں کی پرورش پر بھی مکمل توجہ دی جاتی رہی۔ وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرا اور ان کے ہاں 'احمد اللہ خاں' کی ولادت ہوئی۔ بیٹیوں کی پیدائش پر خوشی و جوش سے مٹھائیاں تقسیم کرنے والے نواب مزمل کے لیے بیٹے کی ولادت بھی بے بہا مسرت تھی۔ انہوں نے اپنے 'ننھے میاں' کے شایانِ شان خوب خوشیاں منائیں۔ حجاجی بیگم بھی فطری طور پر بہت سکون و آسودگی محسوس کر رہی تھیں لیکن جانے کیوں اس آسودگی میں ایک خلش بھی ہلکورے لیتی محسوس ہوا کرتی۔

ایک بے نام سا اضطراب ہمہ وقت قلب وروح کا احاطہ کیے رکھتا جو کبھی تو ایک گداز کی سی کیفیت پیدا کردیتا تو کبھی اپنے اردگرد ہر ایک منظر سے اجنبیت محسوس ہونے لگتی۔

یہ واہمے اور وسوسے بہت جلد ایک المناک روپ اختیار کرگئے۔ حجاجی بیگم کی سانسوں کی نقدی ختم ہوچکی تھی۔ وہ پندرہ جنوری 1896 کو داعی اجل کو لبیک کہہ کر اپنی گرہستی کا شیرازہ بکھیر گئیں۔ نواب مزمل کے لیے اہلیہ کا ارتحال کسی سانحہ سے کم نہیں تھا تاہم انہوں نے صبروتحمل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ انہیں اپنی اولاد کی پرورش وتربیت کی ذمہ داری کا مکمل احساس تھا۔ اس موقع پر کئی احباب نے حسبِ روایت انہیں دوسری شادی کا مشورہ دیا۔ نواب مزمل کی ہمشیرہ صغریٰ بیگم نے بھی انہیں سمجھانے کی بے حد کوشش کی۔

''بچے ابھی بہت چھوٹے ہیں میرے بھائی! تم اکیلے انہیں کیسے سنبھالو گے؟''

''اکیلا کہاں ہوں میں؟ آپ سب ہیں ناں میرے ساتھ۔'' وہ پژمردگی سے مسکرائے۔

''بے شک ہم سب تمہارے ساتھ ہیں لیکن زندگی ہم سفر کے بغیر کیسے گزاری جاسکتی ہے؟'' صغریٰ بیگم نے ایک جبلی حقیقت بیان کی۔

''آپ کی بات بالکل بجا لیکن اب میں عمر اور مرتبے کے اس موڑ پر ہوں کہ زندگی میں صرف ہم سفر نہیں بلکہ بچوں کے لیے ایسی ہستی کی ضرورت ہے جو انہیں ماں کی طرح شفقت ومحبت دے سکے۔'' انہوں نے متانت سے جواب دیا۔

''میں تمہاری بات سے متفق ہوں۔ یہ فیصلہ جلد بازی میں کرنا بالکل مناسب نہیں ہے۔ میری دعا ہے کہ تمہاری یہ تلاش جلد از جلد مثبت انداز میں انجام تک پہنچے۔'' وہ گہری سانس بھر کر بولیں۔ نواب مزمل نے زیرِلب آمین کہنے پر اکتفا کیا۔

اس کے بعد انہوں نے بھرپور حوصلہ مندی اور تحمل سے بچوں کی تربیت کا بیڑا اٹھالیا۔ نواب مزمل نے اہلیہ کی وفات کے بعد ان کے والدین کا بھی بھرپور خیال رکھا۔ نانا اور نانی مرحومہ بیٹی کی آخری نشانیوں سے ملاقات کے لیے اکثر قلعہ ظفر منزل چلے آتے۔ بچے بھی ان سے بہت انسیت رکھتے تھے۔ وہ سال میں ایک دوبار موضع بوڑھ گاؤں اپنے ننھیال چلے جایا کرتے۔

کچھ عرصہ گزرا تو حاجی کریم اللہ نے اپنی نصف جائیداد ان بچوں کے نام منتقل کرکے داماد کو ان بچوں کا ولی مقرر کردیا۔ بچوں کی تعلیم وتربیت پر بھی خصوصی توجہ دی جارہی تھی۔ نواب مزمل کی یوں بھی ابتداء سے ہی خواہش تھی کہ وہ اپنی اولاد کی تربیت اعلیٰ اور ترقی یافتہ پیمانے پر کریں۔ اس ضمن میں ابتدائی عمر سے ہی ان کی شدید نگرانی کی جانے لگی۔ ہر بچے کی پابندی اوقات اور آرام وآسائش پر خصوصی نگاہ رکھی جاتی۔ کھانے پینے' سونے جاگنے اور کھیل کود میں بھی وقت کا خیال رکھا جاتا۔ یہ سب نگرانی انہوں نے اپنے اختیار میں رکھی تھی۔ اس تعلیم وتربیت میں بچیوں کے لیے کوئی تخصیص نہ تھی۔ دونوں لڑکیاں بھی گھڑسواری میں حصہ لیتیں۔ سرسید کی صحبت اور نظریات سے محبت کے زیراثر نواب مزمل نے اولاد کو آغاز سے ہی قدیم الخیالی کے ساتھ جدیدیت سے بھی آشنا کروایا۔ وہ اکثر اپنے بچوں سے سرسید سے تعلقات کی بابت گفتگو کیا کرتے۔

''کیا آپ کو علم ہے کہ سرسید احمد خان نے آپ لوگوں کو بڑی محبت سے اپنی گود میں کھلایا ہے۔'' انہوں نے ایک روز بچوں کو بتایا۔

''کیا واقعی؟ وہ تو اتنے بڑے آدمی ہیں۔'' احمدی نے حیرانی سے دریافت کیا۔ وہ اپنے والد کی زبانی سرسید احمد خان کی عظمت اور کردار سے اس کم عمری میں ہی واقف ہوچکے تھے۔

''ہاں بالکل! بلکہ تمہارا تو نام بھی ان کے ایماء پر رکھا گیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ کئی بار تم لوگوں کے لیے نت نئے کھلونے اور تحفے بھی لائے تھے۔'' والد کے محبت بھرے لہجہ پر ان کی آنکھوں میں بھی خوابوں اور محبت کے جگنو چمکنے لگے۔

''کیا اس بار ہم زاہدہ کی بھی سالگرہ اسی طرح منائیں گے؟'' احمدی کو یکدم خیال آیا۔

''بالکل منائیں گے۔'' نواب مزمل نے اثبات میں سر ہلایا۔

شروانی خاندان میں یوں تو سالگرہ کی تقریبات منانے کا کوئی رواج نہیں تھا تاہم وہ اپنے ہر بچے کی سالگرہ پر فقراء ومساکین کو کھانا کھلا کر نقد وخیرات وغیرہ بھی تقسیم کردیا کرتے۔ بچے اپنی اس اہمیت اور والد کی محبت پر نہایت سرشاری محسوس کرتے۔

''لیکن اس بار ہم کچھ منفرد بھی کریں گے۔'' انہوں

نے لمحاتی توقف کے بعد زاہدہ کو محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہم ایسا کیا کریں گے ابویا جی؟'' چار سالہ زاہدہ نے والد کو مخصوص انداز تخاطب سے پکارتے ہوئے حیرت و جوش سے آنکھیں پٹپٹائیں۔

''ہماری بٹیارانی اب اپنی بڑی بہن کے ساتھ پڑھائی کیا کرے گی۔''

والد کے اس انکشاف نے زاہدہ کو مزید پُرجوش کر دیا۔ اسے احمدی کی طرح پڑھنے کا حقیقتاً بہت شوق تھا۔ نواب مزمل اس کے تاثرات پر مسکرانے لگے۔ اگلے روز اسے احمدی بیگم کے ساتھ پڑھنے کے لیے بٹھا دیا گیا۔ اس ضمن میں کسی خصوصی تقریب کا اہتمام بہرحال نہیں کیا گیا تھا کیونکہ ان تمام رسوم کا خاتمہ نواب مزمل کے دادا جناب داؤد خاں صاحب خاندان شروانی سے کر چکے تھے۔ اب عقیقہ، بسم اللہ خوانی وغیرہ کی تقاریب پر کسی قسم کی دھوم دھام یا اجتماع نہیں ہوتا تھا۔ زاہدہ کی تسمیہ خوانی بوڑھ گاؤں کے ایک رہائشی 'حافظ احمد علی صاحب' سے کروائی گئی اور اس کے بعد زاہدہ نے کلام پاک کی تعلیم کا آغاز کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اسے اردو نوشت و خواند سکھانے کے لیے ایک معلمہ مقرر کر دی گئی۔ یہ خاتون متھرا کی رہائشی تھی۔

اسی دور میں نواب مزمل نے بھیکم پور میں اپنی قدیم رہائش گاہ ترک کر کے ایک میل کے فاصلے پر قلعہ ظفر منزل تعمیر کروایا اور وہاں منتقل ہو گئے۔ یہاں ان ملانی صاحبہ کے قیام اور لڑکیوں کی تعلیم کے لیے الگ کمرا مقرر کیا گیا۔ نواب صاحب کی بھی بچوں پر شفقت و محبت اور توجہ کا عالم ہی نرالا تھا۔ وہ انہیں کسی بھی شرارت و شوخی سے نہیں ٹوکتے تھے ہاں البتہ کسی نقصان دہ کھیل سے بچنے کے لیے پیار سے تنبیہ کر دیا کرتے۔ اگر بچوں کو جھولا جھولتے ہوئے دیکھتے تو پاس آ کر نہ صرف خود جھولا جھلاتے بلکہ اپنے بچپن کے سنے ہوئے گیتوں کے بول بھی انہیں سنایا کرتے۔ بچیوں کو گڑیاؤں سے کھیلتا دیکھ کر گڑیوں کے کپڑے وغیرہ اٹھا اٹھا کر بغور دیکھتے۔ بچوں کو باہم دنگا فساد یا لڑائی جھگڑا کرتے دیکھتے تو اپنی طرف سے دخل در معقولات کی بجائے سنجیدگی سے آ کر خاموشی سے کھڑے ہو جاتے۔ بچے باپ کو دیکھتے ہی بالکل چپ ہو جایا کرتے۔ اگر کوئی اتفاقاً دوسرے کی شکایت کرتا تو وہ دوٹوک انداز میں اسے نصیحت کر دیتے۔ شام کے اوقات میں کبھی کبھی بندوق لا کر بچوں کے سامنے ہی نشانہ بازی کی مشق کیا کرتے۔ اپنے دوستانہ رویئے کے باوجود انہوں نے بچوں کے لیے ادب و احترام کی واضح حد فاصل مقرر کر رکھی تھی۔

پڑھائی لکھائی اور تربیت کے یہ مراحل رواں ہوتے ہی ان کی زندگی میں ایک اور تبدیلی بھی در آئی۔ نواب مزمل نے موضع ڈھولنہ ضلع ایٹہ میں حاجی بھیکن خاں شروانی کی چھوٹی صاحبزادی صالحہ بیگم سے شادی کر لی۔ صالحہ اسم بامسمیٰ ثابت ہوئیں۔ انہوں نے بچوں کے ساتھ گھریلو معاملات بھی خوش اسلوبی سے سنبھال لیے۔ وہ ہر معاملہ میں شوہر کے شانہ بشانہ رہا کرتیں۔

''بچیوں کی ابتدائی تعلیم کے مراحل اب اختتام پذیر ہونے والے ہیں۔ مستقبل کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے اب؟'' صالحہ نے دریافت کیا۔

''تلاش و جستجو تو بے حد کی ہے۔'' انہوں نے جواب دیا۔

''مجھے یقین ہے کہ بچیوں کی تعلیم و اتالیقی کے لیے کسی معمولی معلم کا انتخاب نہیں کریں گے۔'' صالحہ پُریقین تھیں۔

''تہران کی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور معزز خاندان سے تعلق رکھنے والی خاتون 'فرخندہ بیگم' ان دنوں بھوپال میں مقیم ہیں۔ انہی سے رابطہ کیا ہے۔ شنید یہی ہے کہ ان خاتون نے ایران میں شاہ ناصرالدین قاچار شہید کا زمانہ دیکھ رکھا ہے اور وہ وہاں کسی اعلیٰ عہدیدار کی صاحبزادی ہیں تاہم حکومت کے کسی عتاب کی وجہ سے اپنا اصل نام 'رخشندہ خانم' ترک کر کے یہاں رازداری سے رہائش پذیر ہیں۔'' نواب مزمل نے تفصیل بتائی۔

''خوب! بہت دلچسپ! ان کے زیر سایہ بچیاں بہت عمدہ فارسی سیکھ لیں گی۔'' وہ پُرجوش تھیں۔

صالحہ کا یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ فرخندہ بیگم نے بھرپور توجہ اور محنت سے بچیوں کو پڑھانے کا آغاز کر دیا۔ زاہدہ کی تعلیمی استعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہونے لگا۔ اس کے علاوہ گھریلو علمی ماحول بھی ان کے لیے تحریک ثابت ہو رہا تھا۔ شعر و شاعری کے تذکرے اور نواب مزمل کا اعلیٰ شعری ذوق بچوں کو مطالعہ کے لیے متحرک کیا کرتا۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ نواب مزمل خود اپنا کلام موقع بہ موقع لا کر انہیں سناتے اور ان سے معنی و مطلب دریافت کرتے۔ زاہدہ انہیں اشعار کے مطالب بتا کر اکثر حیران کر دیا کرتی۔ نواب

مزمل بچیوں کی اس استعداد سے اتنا متاثر ہوئے کہ فرخندہ بیگم کا مشاہرہ دوچند کردیا۔ انہیں اس بات کا اندازہ ہی نہیں تھا کہ زاہدہ نے خود بھی ٹوٹے پھوٹے انداز میں اشعار کہنے شروع کردیے ہیں۔ یہ انکشاف بھی جلد ہی سامنے آجاتا لیکن حالات نے ایک ایسا موڑ لیا کہ ان کی پُرسکون زندگیاں ایک بار پھر تلاطم کی نذر ہوگئیں۔ صالحہ بیگم نے ننھے میاں 'داؤد احمد خاں' کو جنم دیا اور دس روز بعد ہی اپنے آخری سفر پر روانہ ہوگئیں۔

نواب مزمل کی ہمت ایک بار پھر ڈھے گئی۔ پُرخلوص شریکِ حیات کی رفاقت سے دوسری مرتبہ محرومی برداشت کرنا آسان بھی نہیں تھا تاہم بچوں کے بہتر مستقبل اور پرورش کے لیے انہیں اپنی ہمت ازسرنو مجتمع کرنا پڑی۔ وہ بچوں کے ساتھ پہلے سے زیادہ وقت صرف کرنے لگے۔ بعد از مغرب ایک خصوصی نشست کا اہتمام ہوتا۔ اس موقع پر وہ اپنی کم گو بیٹی زاہدہ کو اکثر بغل میں دبائے رہتے۔ اس وقت ہر چھوٹی سے چھوٹی گھریلو بات اور بڑے سے بڑا قدیم و جدید ملکی و قومی معاملہ بھی زیرِ بحث رہتا۔ علمی باتیں' شعر و شاعری کے تذکرے' اخبار و رسائل کے مضامین' سیاست' ملازمین و متعلقین کے قصے' ریاست و رعایا' کوئی اہم مقدمہ' خصوصی خط و کتابت' بہن بھائیوں اور خاندان بھر کے باہمی معاملات اس گھنٹے بھر کی نشست میں زیرِ بحث رہتے۔ یہ معمول بچوں اور نواب مزمل میں بہترین ذہنی ہم آہنگی پروان چڑھانے لگا تھا۔

نواب صاحب دونوں بچیوں کی تعلیم سے بھی بالکل غافل نہیں تھے۔ انہوں نے صرف ونحو' حساب و فقہ کی تعلیم کے لیے علی گڑھ سے تعلق رکھنے والے مولوی محمد یعقوب صاحب کو مامور کردیا۔ ان کے مؤثر طرزِ تعلیم اور زاہدہ کی غیر معمولی ذکاوت و ذہانت کے باہم ملاپ نے کچھ ہی عرصہ میں بے حد مفید نتائج مرتب کیے۔ زاہدہ کو تعلیم سے غایت دل بستگی پیدا ہوچکی تھی۔ وہ نہایت ذوق و شوق اور توجہ سے پڑھائی میں مگن رہتی۔ بڑے بھائی احمد اللہ خاں کی مدد سے اوقات فرصت میں انگریزی کا مطالعہ بھی جاری رہتا۔ دھیرے دھیرے وہ شاعری و مضمون نویسی کی طرف مائل ہونے لگی۔ زاہدہ نے اپنے پاس ایک چھوٹی سی 'پاکٹ بک' رکھی ہوئی تھی۔ یہ جیبی کتاب اسے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ صفحہ اول پر نہایت خوش خطی سے 'کلیات' لکھا اور اپنے جذبات و احساسات شعری قالب میں ڈھالنا شروع

زاہدہ خاتون شروانیہ کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا۔

''ز۔ خ۔ ش جب میری عمر کو پہنچیں گی تو ان کا شمار ہندوستان کے چوٹی کے شعرا میں ہوگا۔''

اکبر الٰہ آبادی نے ز۔ خ۔ ش کے کلام کی داد دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر یہ اشعار کسی خاتون کے ہیں تو مردوں کو دعویٰ شاعری سے ہاتھ اٹھالینا چاہیے۔''

مولانا ظفر علی خاں نے لکھا۔ ''گو نور جہاں بیگم اور زیب النسا بیگم خود تو دنیا میں موجود نہیں لیکن ان کی ایک معنوی یادگار اب بھی ہندوستان کے عالم نسواں کا سرمہ بینش ہے۔''

☆☆☆

سوانحی خاکہ:۔

پیدائش...... 18 دسمبر 1894

جائے پیدائش...... بھیکم پور۔ علی گڑھ۔ ہندوستان

وفات...... 2 فروری 1922

پیشہ...... شاعرہ

پیشہ وارانہ زبان...... اردو

وجۂ شہرت...... شاعری۔ حقوق نسواں

کارہائے نمایاں...... ینگ شروانی لیگ

کردیے۔

''دائم مری مدد پہ اگر کبریا رہے
دنیا میں ثانی بھی مرا کوئی بھلا رہے
ایسی بنوں میں شاعرہ جیسی کوئی نہ ہو
سارا جہان نظم مری دیکھتا رہے
میں شاعری میں اتنی ہوں مشہور کبریا
سورج کی طرح نام چمکتا مرا رہے''

کسی دس سالہ بچی کی یہ کوشش اگرچہ اس وقت تک بندی ہی شمار ہوسکتی تھی لیکن کون جانتا تھا کہ ان الفاظ کی تخلیق کار بہت جلد ہندوستان کی مایہ ناز اور ہر دلعزیز شاعرہ بن جائے گی۔

☆☆☆

علمی گھریلو ماحول اور اساتذہ کی بھرپور محنت نے زاہدہ کا قلم اور تخیل مہمیز تر کردیا۔ اس کی شاعری کی دھن میں

حیران کن طور پر اضافہ ہو رہا تھا۔ نواب مزمل اپنے بچوں سے ملکی حالات و واقعات پر تبادلہ خیال کیا کرتے۔ زاہدہ کا ذہنی افق وسیع تر ہونے لگا تھا۔ اس کی تخلیقی صلاحیتیں ناقابلِ یقین رفتار سے پروان چڑھ رہی تھیں۔

کچھ عرصہ مزید گزرا تو اس کے معلم مولوی محمد یعقوب بھی ان اثر آفرینیوں سے محفوظ نہ رہ سکے۔ وہ اس سے قبل اعلیٰ درجے کے انشاء پرداز تھے تاہم اب اشعار بھی کہنے لگے تھے۔ ان اشعار کی اصلاح کے لیے وہ زاہدہ سے رجوع کیا کرتے جو نہایت متانت، سنجیدگی و خلوص سے یہ فریضہ سرانجام دے دیتی۔ زاہدہ کی ان صلاحیتوں کے اعتراف میں مولوی یعقوب نے لکھا۔

''میری شاگردہ زاہدہ بیگم
شعر گوئی میں ہے مری استاد''

وقت کی ندی دھیمی رفتار سے بہتی رہی۔ ظفر منزل میں شب و روز علمی گفتگو ہوا کرتی۔ نواب مزمل دونوں بیٹیوں سے علم و فن اور شعر و سخن ہی نہیں بلکہ ملکی سیاسی اور مجموعی قومی حالات جیسے موضوعات پر بھی سیر حاصل گفتگو کیا کرتے۔ زاہدہ کے نظریات پختہ ہونے لگے تھے۔ ابتدا اس نے اپنا تخلص 'گل' منتخب کیا، قدیم رنگ میں چند غزلیات بھی کہیں لیکن پھر کچھ ہی عرصہ بعد تخلص تبدیل کر کے 'نزہت' رکھ لیا۔ اسے نزہت کی لفظی و معنوی شگفتگی بے حد پسند تھی۔ احساسات و کیفیات 'کلیات' میں منتقل کرتے زاہدہ نے ایک اور انقلابی قدم اٹھایا۔ اس نے اپنے بھائی بہنوں اور ہم عمر رشتہ داروں کی تائید و اعانت سے 'انجمن معین نسواں' نامی ایک مجلس قائم کر لی۔ اس مجلس کے شرکاء میں ان سب بہن بھائیوں کے علاوہ دو چچا زاد بہنیں بھی شامل تھیں۔ انجمن کی سیکریٹری زاہدہ خود تھی۔ جوائنٹ سیکریٹری احمد اللہ اور پریذیڈنٹ احمدی بیگم تھی۔ انجمن کے لیے زاہدہ کی کارگزاری بے مثال تھی۔ وہ ہمہ وقت اپنی توجہ صرف اسی امر پر مرکوز رکھتی تھی کہ سب کی تحریر و تقریر پر زور طریقوں سے انجمن کی امداد و اعانت پر مائل رکھے۔

کچھ عرصہ بعد زاہدہ نے مجلس کا نام تبدیل کر کے 'ینگ شروانیز لیگ' رکھ لیا۔ دیگر اراکین اس فیصلہ پر خاصے معترض تھے۔

''یہ نام قطعی مناسب نہیں ہے۔'' احمد نے کہا۔

''کیا مسئلہ ہے اس نام میں؟'' زاہدہ نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

''یہ انگریزی نام ہے اس لیے۔'' احمدی نے کہا۔

''یہ تو کوئی دلیل نہیں ہوئی۔'' زاہدہ نے کندھے اچکائے۔ ''اگر ہم اردو میں نام رکھیں تو 'شروانیوں کی مجلس' یا 'لڑکیوں کی انجمن' پر ہی اتفاق رائے ہو سکتا ہے۔ ایسے اچھوتے الفاظ بہت نامناسب ہوں گے۔ کیا آپ نے کبھی کسی مجلس کا ٹھیٹ اردو نام سنا ہے؟''

''انجمن شروانیہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' احمد نے سوال کیا۔

''یہ 'ضمیر' ہے۔ انجمن یا مجلس کی طرف سے کارکنان مجلس کی تانیث ظاہر نہیں ہوتی۔'' وہ مزید سنجیدگی سے گویا ہوئی۔ ''مجلس شروانیہ میں نصف اوّل فارسی ہے اور نصف آخری عربی۔ یہ گڈمڈ مجھے تو بالکل پسند نہیں ہے۔ باقی رہی بات انگریزی نام کی تو وہ مجالس کے ہوا ہی کرتے ہیں۔ اس میں کوئی حرج بھی نہیں بلکہ فائدہ یہ بھی ہے کہ عمر معلوم ہو سکتی ہے۔ 'ینگ گرلز' یا 'نیو ینگ شروانیز لیگ' ہی موزوں رہے گا۔''

''مجھے انگریزی سے سخت نفرت ہے۔'' احمدی نے منہ بنایا۔

''پیاری بہن! خفا ہونے کی بات نہیں۔ انگریز کے محکوم رہ کر انگریزی سے نفرت اور اس سے احتراز دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر ہے۔ یہ تو وہی حساب ہو گیا کہ گڑ کھائیں اور گلگلوں سے پرہیز کریں۔ عربی نام ہمارے سر آنکھوں پر مگر یہ کچھ مذہبی مجالس پر ہی پھبتا ہے۔ عربی ہو یا اردو، فارسی ہو یا انگریزی، نام بہر حال ایسا ہونا چاہیے کہ عمر خاندان سب کچھ آ جائے۔ اگر آپ سب ٹھنڈے دل سے غور کریں تو اس نام میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہوگی۔''

زاہدہ کے ان دلائل کا کسی کے پاس بھی جواب نہیں تھا۔ اس کے بعد زاہدہ نے جلسے کا شاندار اور ناقابل یقین متاثر کن ایجنڈا وضع کر کے انجمن کے اغراض و مقاصد بھی متعین کر دیے۔

☆ نہایت مفید اور ضروری کاموں میں 'فرقہ نسواں' کی شرکت اور اس کی مالی مدد کرنا۔

☆ تبادلہ خیالات

☆ 'اردوئے معلیٰ' کی حمایت جو بذریعہ لیکچر/اسپیچ وغیرہ کی جاتی ہے اور یہ سب لیکچر سیکریٹری صاحبہ کے پاس بحفاظت تمام جمع ہوتے رہتے ہیں۔

☆ مستورات میں چھوٹے چھوٹے جلسوں میں

شریک ہوتے ہوتے بڑے قومی اور ضروری جلسوں میں شریک ہونے کی قابلیت پیدا کرنا۔

☆بی بیوں کو ممبری پریسیڈنٹی شپ کے فرائض سکھانا۔

☆مستعدی اور گرم جوشی کی عادت دلانا۔

☆قومی کاموں میں دل چسپی لینے کا شوق دلانا۔

☆لائق اور گرم جوش ممبروں کی شہرت کر کے انہیں خدمت قومی کی ترغیب دلانا۔

زاہدہ کی یہ حکمت عملیاں اور پختہ سوچ جان کر کسی کے لیے بھی یقین کرنا دشوار ہی تھا کہ ان کے عقب میں ایک چودہ سالہ ذہن کارفرما ہے۔ اس مجلس کے معاملات رواں رکھنے میں سب ہی زاہدہ کے کردار اور کوششوں کے معترف ہو چکے تھے۔ اس کم عمر وجود میں ایک پختہ کار نظریات کی حامل قلم کار کی بھرپور افزائش ہو چکی تھی۔

☆☆☆

زاہدہ کی عمر اب پندرہ برس ہو چکی تھی۔ شروانی خاندان کی روایات واقتدار کے زیر سایہ پرورش پانے والی زاہدہ بیگم اب 'زاہدہ خاتون نزہت شروانیہ' بن گئی تھی۔ اس کا قلم تعلیم یافتگی' روشن خیالی' بالغ نظری اور خوش فکری کا بھرپور تاثر دیا کرتا۔ اس کی ذہانت وذکاوت روز افزوں ترقی پر تھی۔ تعلیم و تربیت کے پڑاؤ مکمل ہو چکے تھے اور اب اس کا بیشتر وقت مطالعہ کتب میں صرف ہوتا۔ کتب کی فراہمی کا بھی قطعی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ گھر میں درجنوں ہفتہ وار' ماہوار رسائل میسر ہوتے تھے۔ ملک میں شائع ہونے والی کوئی بھی عمدہ کتاب یا مفید رسالہ فوری طور پر ظفر منزل منگوا لیا جاتا۔ اس ضمن میں کوئی بھی رکاوٹ خاطر میں نہیں لائی جاتی تھی۔

اس مطالعہ کے ساتھ گھر میں علمی وسیاسی مباحثے بھی خوب رواں رہتے۔ نواب مزمل بچوں کو ملکی وغیر ملکی' سیاسی و دینی معاملات سے مکمل طور پر باخبر رکھتے۔ ہندو مسلم یونیورسٹیوں کا قیام' استرداد تقسیم بنگال' ہندو مسلم اتحاد کے ہر معاملہ پر باہمی تبادلہ خیال ہوتا۔ سیاست اور دیگر بین الاقوامی معاملات میں زاہدہ کی دلچسپی مزید بڑھنے لگی تھی۔ اس نے ایک انقلابی قدم اٹھاتے ہوئے ان تمام مسائل پر اپنی نظمیں اور نثری مضامین مختلف اخبارات ورسائل میں بھیجنے شروع کر دیے۔ رازداری کے تقاضے پیش نظر رکھتے ہوئے زاہدہ نے اپنی شناخت خفیہ رکھی تھی۔ ان مردانہ و زنانہ رسائل اور اخبارات میں اس کی تخلیقات 'ز۔ خ۔ ش' کے نام سے شائع ہونے لگیں۔ یہ بلاشبہ ایک بہت بڑا اعزاز اور کامیابی تھی۔ اپنے تخلیق کردہ الفاظ کو مستند انداز میں صفحۂ قرطاس پر بکھرتے دیکھنے کی خوشی ابھی مکمل طور پر محسوس نہیں ہونے پائی تھی کہ اس کے شفیق نانا اور نانی یکے بعد دیگرے وفات پا گئے۔ ننھیال کی اس ویرانی نے اس کے مزاج میں سخت آزردگی اور شکستگی پیدا کر دی۔

''ہمت سے کام لو میری بہن!'' احمدی نے اسے دلاسہ دیا۔ ''جو فرد اس دنیا میں آیا ہے اسے لازماً ایک نہ ایک روز جانا بھی ہے۔''

''ہمارے اپنے ہمیں چھوڑ کر کیوں چلے جاتے ہیں آخر؟'' اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

نانا اور نانی کی اموات نے اس کے دل کو پہلی بار ایسے کسی غم سے آشنا کیا تھا۔ حاجی بیگم اور صالحہ کی وفات کے وقت وہ اس خسارے کے اصل مفہوم سے واقف ہی نہیں تھی۔ اس المناک اور تلخ آفاقی سچائی سے آشنائی نے زاہدہ کے کلام میں درد کا ایک مستقل دریچہ وا کر دیا۔ اس نے 'ہمارے بعد' 'عید کا چاند' 'نور کی آخری شعاع' جیسی نظمیں تخلیق کیں۔ یہ وہ دور تھا جب زاہدہ کو خانگی اور قومی زندگی دونوں صورتوں میں ہی بے قراری کا سامنا تھا۔ ایک جانب ننھیال کی ویرانی دل میں پنجے گاڑ کر رکھتی تو دوسری سمت مسلم یونیورسٹی یا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام کی پیچیدگیوں نے بھی اطمینان رخصت کر رکھا تھا۔ جنگ طرابلس اور سلطنت عثمانیہ کے ساتھ اس پر اٹلی کی فوج کشی نے اسے مضطرب تر کر دیا۔ اس نے 'عالم خواب' کے عنوان سے ایک معرکتہ الآراء مثنوی تحریر کی جس کے اشعار کی تعداد تقریباً' ستر' تھی۔ وہ اخبارات میں شائع ہونے والے سچے واقعات کو درد انگیز نظموں میں گوندھنے لگی۔ اس نے جنگ کے لیے اپنی جمع شدہ رقم سے 'سات روپے' چندے میں دیے۔ وہ بے شمار مسلمانوں' ضعیفوں' بچوں اور مرد و خواتین کی بے گناہ ہلاکتوں پر سخت آزردہ رہتی۔ طرابلس کے معاملہ میں ترکوں کو مغلوب ہو کر اٹلی سے صلح کر کے طرابلس سے الحاق منظور کرنا پڑا۔ اخبارات میں شرائط صلح کا اعلان ہوتے ہی پورے عالم اسلام کی طرح زاہدہ خاتون بھی بے پناہ رنج والم کا شکار ہو گئی۔ اس رات زاہدہ کے حلق سے ایک بھی لقمہ نیچے نہ اترا۔ پریشانی میں نیند نے بھی دغا دے دیا۔ بستر پر کسی کروٹ چین آ کے ہی نہ دے رہا تھا۔ دلی اضطراب سے مجبور ہو کر اس نے قلم تھاما' اس واقعہ کی

تاریخ نکالی اور اپنے کرب کو الفاظ کا روپ دے دیا۔

''کیا پوچھتے ہو آہ سراغ طرابلس
گل چیں ہوا ہے قابض باغ طرابلس
نزہت جو پوچھے حادثہ جاں گسل کا سال
کہہ دو بکا کے ساتھ ہے داغ طرابلس''

اس میں بکا کے اعداد داغ طرابلس کے ساتھ ملانے سے الحاق طرابلس کا سال 1330ھ برآمد ہوتا ہے۔ اس مذہبی المیہ کا درد ابھی کم نہ ہونے پایا تھا کہ یورپ کی عادتی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے جنگ بلقان شروع ہوگئی۔ اس بار سلطنت عثمانیہ کا مقابلہ اپنے قدیم غلاموں کی پانچ سلطنتوں سربیہ، بلغاریہ، یونان، رومانیہ اور جبل اسود سے تھا جن کی پشت پناہی یورپی اقوام کر رہی تھیں۔ ہندوستانی عوام کے لیے وہ بہت کڑا وقت تھا۔ وہ ترکوں کی ان پے در پے مشکلات پر کبیدہ تھے۔ جہاد میں عملی طور پر شریک بھی ہونا چاہتے تھے لیکن ان پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کی جانے لگیں۔ انہوں نے جہاد بالمال میں البتہ دل کھول کر حصہ لیا۔ زاہدہ بھی اس موقع پر بھلا کیسے پیچھے رہ سکتی تھی؟ اس نے 'زمیندار' لاہور کے لیے ایسے مضامین اور نظمیں تخلیق کیں کہ عوام وخواص اش اش کر اٹھے۔ 'عید کی خوشی میں شہدا کی یاد'، 'مرثیہ کنگ جارج والی یونان'، 'شہر آشوب اسلام'، 'زندہ باد انور پاشا' نے سبھی کو بہت متاثر کیا۔

قلمی سرگرمیوں کے علاوہ زاہدہ نے ذاتی سطح پر بھی انقلابی کوششوں کا آغاز کر رکھا تھا۔ وہ اس خبر پر بے حد مسرور تھی کہ محمڈن کالج علی گڑھ کے طلبہ نے اختتام جنگ تک اپنی ضروریاتِ زندگی کو احتیاج مذہبی کی بناء پر بالکل سادہ کرنے کا عہد کر لیا ہے تاکہ کھانے یا ناشتے میں سے بعض چیزوں کا استعمال متروک کر کے اس کی رقم انجمن ہلال احمر کو دیں۔ زاہدہ بھی اپنے بہن بھائیوں اور عزیز واقارب کو اسی روش پر عمل کرنے کے لیے قائل کرنے لگی۔ اس کی انہی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ کسی نے انڈا چھوڑا، کسی نے شیرینی ترک کر دی تو کوئی بسکٹ کھانے سے تائب ہو گیا۔ ان تمام چیزوں کی قیمت متعلقہ فرد سے وصول کر کے چندے میں دی جانے لگی۔ زاہدہ نے 'اپیل منظوم برائے امداد ہلال احمر' میں بہت پُرتاثر انداز میں ملک وقوم کی خواتین کو مخاطب کیا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

''شفق ارض کا جگر ہے گردوں کی چشم تر ہے
ہلتا ہے عرش اعظم جبریل نوحہ گر ہے
کیسی یہ ہائے وہو ہے کیسا یہ شور و شر ہے
کیا حشر ہو رہا ہے تم کو بھی کچھ خبر ہے
ہے دین پر مصیبت اے دین دار بہنو!
وہ دین پاک احمد کی یادگار عظمت
آفاق گیر ملت کی آخری حکومت
وہ جس کے زیب کو شک ہے مسند خلافت
وہ سلطنت کہ ٹرکی کہتی ہے جس کو خلقت
یورپ کی ڈپلومیسی کی ہے شکار بہنو!
ترکوں کو چاہتا ہے کرنا غلام یورپ
صدیوں سے کر رہا ہے یہ اہتمام یورپ
کیا کیا بچھا رہا ہے ترکوں پہ دام یورپ
اک سو ہیں ترک تنہا، اک سو تمام یورپ
تھے ترک چشم یورپ میں مثل خار بہنو!''

1912 میں مسجد کانپور کے وضوخانہ کا انہدام زخمی دل پر ایک اور کاری زخم ثابت ہوا۔ زاہدہ کے ملی جذبات کو بھی سخت ٹھیس پہنچی۔ اس نے خاصی سختی سے اپنی نظموں اور نثری مضامین کے ذریعہ حکومتی حکمت عملی پر نکتہ چینی کی۔ اس زمانہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار 'الہلال' کلکتہ کی اشاعتیں ملک گیر مقبولیت حاصل کر رہی تھیں۔ زاہدہ کو اس اخبار سے خصوصی انسیت تھی۔ الہلال کے اسلوب تحریر کے علاوہ اسے مولانا ابوالکلام سے خاصی غائبانہ عقیدت تھی۔ وہ اپنے جذبات کے زیر اثر انہیں 'اخی فی الدین' کہا کرتی تھی۔ گھر میں ہونے والے بحث ومباحثوں میں بھی وہ اپنے جذبات کا برملا اظہار کرتی۔

''کیا آپ نے اخبار ہمدرد دہلی میں آزاد بھائی پر پولیس کانپور کا ظلم دیکھا؟ کیا رئیس احرار سلمہ الرب بالا برار سے پولیس کی مخصوص اہانتیں مثلاً تمام پولیس وافسران پولیس کا ان کی شکل دیکھتے ہی پہچان لینا اور برادر ممدوح کا فوٹو ان لوگوں کے پاس نکلنا، ان کو کسی سے عام بات چیت کی اجازت نہ دینا، ٹائیلر کی سخت کلامی، جیل خانہ۔ ان کا لیفٹننٹ گورنر کو تار دینا، وہاں سے جواباً عدم مداخلت کا اعلان، کیا ان تمام باتوں کے بعد بھی عنان ضبط مضبوطی سے تھامی جا سکتی ہے؟''

''میرا تو یہی ماننا ہے کہ ان باتوں سے کچھ ذلت نہیں ہوئی بلکہ عزت میں اضافہ ہی ہوا ہے۔'' بنے میاں نے جواب دیا۔

''بالکل ایسا ہی ہے!'' وہ پُرزور انداز میں بولی۔

"ایسی پابندیاں اور جبر سہہ کر عزت میں کمی نہیں ہوتی بلکہ اسے چار چاند لگا کرتے ہیں۔"

"واقعہ کانپور بھی کم المناک نہیں ہے۔" احمدی نے سرد آہ بھری۔

زاہدہ تاسف سے سر ہلا کر رہ گئی۔ وہ والد کی موجودگی میں اس بات کا اظہار نہیں کر سکتی تھی کہ اس نے واقعہ کانپور پر 'زمیندار' اخبار لاہور میں کئی نظمیں ارسال کی ہیں۔ 'عید کی خوشی میں غم زدگان کانپور کی یاد' بے پناہ پسند بھی کی گئی تھی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

"حسرت فزا ہے اے مہ نو تیرا نور آج
ہے سنگ غم سے شیشہ دل چور آج
جنگ طرابلس نے کل آرام دل لیا
جاں لے رہا ہے معرکہ کانپور آج
چھلنی ہوئے قلوب رعائے شاہ جارج
چہروں میں ٹائیلر کے نہیں کچھ فتور آج
شملے سے رد ہوا جو ہمارا میموریل
سر جیمس و ٹائیلر کا فزوں ہے غرر آج
یاد آتا ہے غم والم بیوگاں ہمیں
جو ہو رہی ہیں زندگیوں سے نفور آج
یاد آ رہے ہیں بھوک سے فاقوں سے مضمحل
بچوں کے ننھے ننھے دل ناصبور آج
یاد آتے ہیں پولیس کے چھپائے ہوئے شہید
جن کے نہیں جہاں میں نشان قبور آج
یاد آ رہے ہیں ہم کو وہ مجروح سیف ظلم
جن کی نگہ میں تیغ ہے تیرا ظہور آج
یاد آتے ہیں سلاسل و زنداں کے وہ اسیر
مذہب کی پابندی ہے جن کا قصور آج
نزہت کچھ یہ نہیں کہ مرجع و مفر
مسلم کا غیر درگہ رب غفور آج"

☆☆☆

ان نظموں کی اشاعت میں زاہدہ کا لقب نزہت حذف کر دیا جاتا تھا۔ اس کی بجائے ز۔خ۔ش۔ نام درج ہوا کرتا۔ زاہدہ خاتون شروانی کے قلم کا جادو ہر سو اپنا سحر طاری کر رہا تھا۔ یہ اثر آفریں نظمیں عوام کو اس تجسس میں مبتلا کرنے لگی تھیں کہ 'ز۔خ۔ش' درحقیقت کون ہے۔ اس ضمن میں عوامی حلقوں میں مختلف چہ میگوئیاں گردش کرنے لگیں کہ یہ کسی مرد کا قلمی نام ہے جو کسی مصلحت کے تحت اس

1914 میں گرلز کالج کے سلطانیہ بورڈنگ ہاؤس کا افتتاح نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ والیہ بھوپال نے علی گڑھ آ کر فرمایا تو اس قومی تقریب پر زاہدہ نے 'قدوم میمنت لزوم' کے عنوان سے ایک نظم لکھ کر بھیجی جو افتتاحی جلسے میں بلا اظہار نام پڑھی گئی۔ بیگم صاحبہ نے نہایت تجسس سے پوچھا کہ یہ نظم کس کی لکھی ہوئی ہے؟ مگر اس وقت علم نہ ہو سکا۔

اسی طرح 1915 میں علی گڑھ میں مسلم لیڈیز کانفرنس کے دوسرے اجلاس ز۔خ۔ش کی طرف سے ایک نظم 'مہذب بہنوں سے خطاب' باخفائے شخصیت پڑھی گئی۔

☆☆☆

زاہدہ نے اپنے بھائی کی وفات کے بعد ذاتی زبوں حالی کا نقشہ یوں کھینچا۔

گھر نظر آتا ہے اب مقتل انساں دل کو
کاٹنے کے لیے دوڑے ہے بیاباں دل کو
داغ دیتی ہے نئے سیر گلستاں دل کو
کرتی ہے نکہت گل اور پریشاں دل کو
چوں تہ خاک شد آں تاجور کشور دل
نیست ہیچم غم دل، خاک سیہ بر سر دل
رات دن شغل ہے بے شغلی و غمگینی کا
ذوق علمی ہے نہ ہے شوق کتب بینی کا
اب سخن میں نہ رہا شائبہ شیرینی کا
شور ہے بزم حریفاں میں سخن چینی کا
ہوش کو کیوں نہ کرے دل کی پریشانی گم
نقش تسخیر ہے جوں مہر سلیمانی گم
طبع میں ولولہ نغز بیانی نہ رہا
زور آمد نہ رہا، شور روانی نہ رہا
الغرض خاک میں بھی جز سوز نہانی نہ رہا
جب کہ وہ عارف اسرار معانی نہ رہا
جوش اسی کا تھا جو میرے سر پرشور میں تھا
بل اسی کا یہ مرے خامہ پر زور میں تھا

☆☆☆

زاہدہ خاتون کے والد نواب مزمل نے زندگی بھر اولاد کے بہت سے دکھ سہے۔ احمد اللہ خاں اور زاہدہ کے بعد انہیں داؤد احمد خاں عرف ننھے میاں کی وفات کا صدمہ بھی سہنا پڑا۔ ننھے میاں بہن کی وفات کے دو سال بعد (1924) محض سترہ سال کی عمر میں مرض دق کا شکار ہو کر انتقال کر گیا تھا۔

نام سے لکھنے پر مجبور ہے۔ یہ چہ میگوئیاں اور خیال آرائیاں بنے میاں نے زاہدہ تک پہنچائیں۔

''میری بہن! تم نے تو عوام کو بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے۔''

''میں نے ایسا کیا کر دیا ہے حیران شروانی؟'' زاہدہ نے چھوٹے بھائی کو اس کے تخلص سے پکارا۔ بنے میاں بھی شاعری میں خوب طبع آزمائی کرنے لگا تھا۔

''ز۔خ۔ش کے مضامین نے اہل علی گڑھ کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی ہے۔ کئی اہلِ علم یہ پتا لگانے کے لیے کوشاں ہیں کہ نواب محمد مزمل اللہ خاں کی صاحبزادیوں کی تعلیمی استعداد کیا ہے۔'' اس نے انکشاف کیا۔

''ہائے اللہ! یہ کیا ہو گیا ہے؟'' اس نے مضطرب ہو کر کہا۔

''لوگ بے حد متجسس ہیں میری بہن! اس بات کا تمہیں بھی علم ہے کہ اسرار کی دھند میں لپٹے وجود تلاش کرنا ہر کسی کی ہی کمزوری ہوتی ہے۔'' بنے میاں نے متانت سے کہا۔

''میری تو بس یہی آرزو رہی ہے کہ میرے افکار سے لوگ بغیر تجسس و تحقیق کے لطف اندوز ہوا کریں۔ دشمن دوست سب کے منہ سے یکساں غائبانہ خراج تحسین حاصل کرنے کا لطف خاص گمنامی میں ہی مضمر ہوتا ہے۔ یہ جستجو مجھے ذہنی کوفت ہی دیا کرے گی۔'' وہ گہری سانس بھرتے ہوئے بولی۔

''خیر! میں نے تمہیں حقائق سے آگاہ کر دیا ہے۔ اب تم بہتر سمجھتی ہو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔''

بھائی کی اس بات پر وہ اثبات میں سر ہلا کر خاموش ہو گئی۔ اہلِ علی گڑھ کے تجسس میں مزید اضافہ ہوتا نظر آیا تو اس نے 1914 میں 'میرا آخری مضمون' نامی ایک تحریر اخبار 'شریف بی بی لاہور' میں ارسال کر دی۔ اس کا ارادہ یہی تھا کہ وہ کوئی اور قلمی نام اختیار کر کے اپنا یہ سفر رواں رکھے گی۔

زاہدہ نے کچھ عرصہ بعد اخبارات میں 'سخن گو خاتون' اور 'ایک مسلمان خاتون' کے نام سے نظمیں و نثری مضامین ارسال کرنے شروع کر دیے لیکن اپنے مخصوص اسلوب اور قلم کی کاٹ کیسے پوشیدہ رکھ پاتی؟ اس کی تحریر کی پختگی، سلاست اور روانی بابانگ دہل اعلان کرتی تھی کہ ان الفاظ کا اصل خالق کون ہے۔ اہل ذوق و بصیرت نے اصل صورتِ حال کا بہت جلد اندازہ لگا لیا۔

اس صورتِ حال کی کوفت ابھی کم ہونے نہ پائی تھی کہ ایک اور آزار سامنے آ گیا۔ بعض مدیران نے گمنام اور فرضی نظمیں ز۔خ۔ش کے نام سے شائع کرنی شروع کر دیں۔ وہ ناظرین اخبار کی نگاہ میں اس شاعرہ کے کلام کی مقبولیت سے استفادہ کرنا چاہتے تھے۔ اس تابوت میں آخری کیل چند احباب نے مشترکہ طور پر ٹھونک دی۔ وہ اس کی نظمیں مطالعہ کی غرض سے حاصل کرتے اور بعد ازاں اسی کے نام سے اخبارات میں شائع کروا دیتے۔ مقصد بہرحال یہی تھا کہ وہ ان نظموں کا اخفا ادب پر ظلم عظیم تصور کرتے تھے۔ یہ سرگرمیاں زاہدہ کی ذہنی اذیت میں اضافہ کے سوا کچھ بھی نہ تھیں اور برداشت و خاموشی کے سوا کوئی چارہ بھی کہاں تھا؟

☆☆☆

برصغیر میں سیاسی تلاطم خیزی عروج پر تھی۔ اس تلاطم کی ہر گونج زاہدہ کے گھر میں بھی مکمل طور پر سنائی دیا کرتی۔ ان دنوں سب اہلِ خانہ کی ذہنی ہم آہنگی بھی بے مثال ہو چکی تھی۔ وہ باہمی طور پر ہر خبر اور صورتِ حال کے متوقع موڑ پر تبادلہ خیال کیا کرتے۔ احمد کی سرگرمیاں ان سبھی سے مختلف تھیں۔ وہ کسی بھی انگریزی اخبار میں شائع ہونے والی خبر پڑھ کر فوراً بھاگا بھاگا بہنوں کے پاس چلا آتا۔ نواب مزمل کا بھی کم و بیش یہی عالم تھا۔ وہ ہر تازہ خبر پر اپنی اولاد سے تبادلہ خیال ضرور کرتے۔ زاہدہ اپنی دلی کیفیات کا برملا اظہار کر دیا کرتی تھی۔ 'تسخیر جتینا' پر وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔

''پینتیس ہزار ترکوں کی گرفتاری میرے دل پر خنجر زنی کر رہی ہے۔ خدا کی قسم! کلیجے پر چھری سی چل گئی ہے۔ ہماری زندگی بھی کیسی ذلیل زندگی ہے کہ گھر کی چار دیواری میں پڑے پڑے سڑ رہے ہیں اور ہمارے اسلامی بہن بھائی اپنے دین کی خاطر جانوں پر کھیل رہے ہیں۔ کبھی تو خدا ہماری بھی سنے گا ہی ناں۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو میری بہن! ہم بحیثیت قوم بے حد بھیانک زوال کا شکار ہیں۔'' بنے میاں نے سرد آہ بھری۔

''یہ اندھیرے ایک روز ضرور چھٹیں گے۔'' نواب مزمل نے کہا۔ وہ اس صورتِ حال میں بالکل ہی الگ کشمکش کا شکار تھے۔ اپنی سرکاری حیثیت اور ملازمت کے باعث وہ برطانوی حکومت اور اس کی حکمتِ عملیوں کے خلاف

خیال آرائی نہیں کر سکتے تھے۔
زاہدہ کے ذہن میں چند الفاظ کا تال میل رقص کرنے لگا۔

''دقفس تن میں نہ گھبرائیو اے طائر روح
جو گرفتار ہے اک روز رہا ہوتا ہے''

کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ عیدالاضحیٰ کی آمد ہوگئی۔ زاہدہ، احمری اور بنے میاں سخت آزردہ تھے۔
''عید کے لیے اہل علاقہ میں بہت جوش و خروش پایا جا رہا ہے۔'' بنے میاں نے انہیں بیرونی صورتِ حال سے آگاہ کیا۔
''آہ! کیا ستم ہے۔'' زاہدہ نے دکھ سے بوجھل سانس لی۔ ''ترکی میں خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔ مسلمانوں کے جگروں پر سنگینیں بھونکی جا رہی ہیں۔ حضرت محمد ﷺ کی امت کا تیرہ سو برس کا لہلہاتا ہوا باغ مسیحی شیاطین کے گھوڑوں کے سموں سے تاراج ہو رہا ہے اور ہم عید کے دن بن ٹھن کر خوشیاں منائیں۔ کس قدر شرم کی بات ہے!''
''میں تو خود حیران ہوں کہ اتنی بے حسی کا مظاہرہ آخر کوئی کیسے کر سکتا ہے؟'' احمری نے بھی تاسف سے سر ہلایا۔
''اگر خدانخواستہ ہم کسی عزیز کا داغ دیکھتے ہیں تو برسوں عید کی خوشی نہیں مناتے۔ اس سال لاکھوں خواتین بیوہ ہوئی ہیں۔ بچے یتیم ہوئے ہیں۔ ماؤں کی گودیں سونی ہوئی ہیں۔ ایسے میں عید کیونکر منا سکتے ہیں ہم؟'' زاہدہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔
عید کا روز ان کے لیے ایک لامتناہی کرب لے کر طلوع ہوا۔ گھر بھر میں ماتم کا سماں تھا۔ کسی نے کپڑے بدلے نہ ہی سر سنوارا۔ گھر میں صرف ننھے میاں نے نواب مزمل کے حکم پر لباس تبدیل کیا تھا۔ اس دوران وہ زار و قطار رو رہا تھا۔ عیدگاہ میں جا کر نواب مزمل نے اپنی طلائی اور ننھے میاں نے نقرئی گھڑی بطور چندہ دے دی۔ زاہدہ کا دلی کرب حسبِ سابق صفحۂ قرطاس کی زینت بن گیا۔

''مسلمانو! کہاں تک بے زباں حیواں کی قربانی
در جاں آفریں میں آؤ کر دیں جاں کی قربانی
سر میداں سبھوں نے سر کٹائے راہِ سرور میں
نہ کیوں ہو سر بہ گردوں ترکِ با ایماں کی قربانی''

☆☆☆

برصغیر میں سیاسی ہلچل ہر گزرتے دن کے ساتھ نئی جولانی اختیار کر رہی تھی۔ زاہدہ خاتون کے قلم کی شعلہ فشانی اور مزاج کی سنجیدگی و آہنی قوت ارادی بھی اسی تناسب سے بڑھتے رہے۔ ملکی آزادی کا مطالبہ، سودیشی تحریک، ہندو مسلم اتحاد، حمایت مزدور وغیرہ جیسی سیاسی تحریکیں جیسے ہی جوبن پر آئیں زاہدہ خاتون کے تخیل کو گویا ایندھن مل گیا۔ اس نے 'ترانہ اتحاد' جیسی کئی شاندار نظمیں اور نثری مضامین بھی تخلیق کیے۔

''جنت کی دید سے ہے دل شادماں ہمارا
شکر خدا وطن ہے ہندوستاں ہمارا
کہتے ہیں ہم کو ہندی، حب وطن ہے ایماں
کیا پوچھتے ہو دین و نام و نشاں ہمارا
درد نفاق 'دم الاخوین' چاہتا تھا
شاکر ہے قاتلوں کا آرام جاں ہمارا
روتے ہیں ہم جو مل کر گنگ و جمن کی صورت
شاداب ہو کے ہنستا ہے گلستاں ہمارا
جاں سے بدن سے خوں سے ہندوستاں کے ہیں ہم
حیرت ہے کیوں نہیں ہے ہندوستاں ہمارا''

(ترانہ اتحاد)

اسی دور میں زاہدہ کے پسندیدہ اخبار 'زمیندار' کو اپنی پالیسی کی بدولت درپیش رہنے والے مصائب و آفات کے تناسب میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ زاہدہ اکثر اس کے ضمانتی چندوں میں حصہ لینے لگی۔
قومی اخبارات کے علاوہ آزاد خیال قوم پرست افراد کے اطوار و اقوال میں بھی اس کی دلچسپی بڑھنے لگی۔ وہ علامہ اقبال، مولانا شوکت علی، اکبرالہٰ آبادی، مولانا ابو الکلام آزاد، مسٹر مظہرالحق، شبلی، حالی، غازی انور پاشا جیسے اکابرین کی دلی طور پر اتنی عزت کرتی تھی کہ انہیں اپنا 'اخی فی الدین' کہا کرتی۔ اقبال کے لیے جذبات سے گندھی نظم لکھی تو مولوی محمد حسین آزاد، مولانا شبلی، مولانا حالی اور مسٹر گوکھلے کی وفات کے قومی حادثات پر بھی خوب اشک زنی کی۔ علی برادران کی نظربندی پر ایک پُراثر نظم لکھی۔

''کمند غم سے یہ دل کو کبھی رہا نہ ہوا
ہزار شکر کہ شرمندہ بکا نہ ہوا
فغاں ہے آج اسی لب پہ مہر تھی جس پر
وہ عقدہ آج کھلا ہے کبھی جو وا نہ ہوا
مسز بسنٹ نے صد شکر پائی آزادی
ہزار حیف 'محمد علی' رہا نہ ہوا

ہمارے راہنماؤں کو چھوڑ و صاحب
کہ پیش چشم ہے تاریک کل زمانہ ہوا
فروغ طالع ملت سے ان کا پاک وجود
شب سیاہ میں ثابت چراغ خانہ ہوا
بری شرو رفتن سے رہے وہ باطن میں
نہ ظاہران کا کوئی فعل باغیانہ ہوا

زمیندار کی ضبطی پریس پر تو وہ اپنے قلم کی روانی روک ہی نہ سکی۔اس نے اپنی ایک تحریر میں لکھا۔

''آج کل میری غیر معمولی پریشانی کا باعث وہ آفت ناگہانی ہے جو عزیز زمیندار کی 'ضبطی پریس' کی شکل میں نازل ہوئی ہے۔ میں سچ کہتی ہوں مجھے اس واقعہ ہائلہ سے ایسا شدید صدمہ ہوا ہے کہ میں خود سخت متحیر ہوں۔ دفورغم کے باعث شاید یہ ہوا کہ باوجود یکہ 'الہلال'، 'میری جان' اور 'ہمدرد' مجھے بے حد عزیز ہے لیکن جو خصوصیت مجھے اس مرحوم (آہ مرحوم) اخبار سے تھی وہ کسی اور سے نہیں۔اور یہ تخصیص اس کی مظلومیت ومحسودیت کی وجہ سے تھی۔ کوئی اخبار شاید دنیا میں ایسا محبوب عالم نہ ہوا ہوگا جیسا کہ یہ میرا 'زمیندار' تھا۔ افسوس! بھائی ظفر کے دل پر عالم غربت میں کیا گزرتی ہوگی۔ بارہ ہزار کی نقد ضمانت کا قرض ابھی ادا ہوا ہی نہ تھا کہ تقریباً بیس ہزار روپیا کا یہ دھکا اور لگا۔کل 'پیسا اخبار' نے یہ جدید خبر سنائی کہ 'زمیندار پریس' پہلے ہی قرضہ میں مکفول تھا۔اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ قرض خواہ اپنے فوائد کے لیے کیا کارروائیاں کریں گے۔''

زاہدہ کی ان تخلیقات نے عوام وخواص کے دل پر بے پناہ مثبت وتعمیری اثرات مرتب کیے۔ ایک روز زاہدہ کے پاس اس کی ہم راز سہیلی لیلیٰ خواجہ بانو چلی آئی۔اس کا چہرہ خوشی وجوش سے تمتمار ہا تھا۔

''لگتا ہے کوئی خاص خبر ہے تمہارے پاس؟'' زاہدہ نے اس کا چہرہ بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں! بالکل ہے لیکن تمہارے لیے نہیں بلکہ ز۔خ۔ش کے لیے ہے۔ تمہیں کیوں بتاؤں بھلا؟'' لیلیٰ نے دانستہ پرشوخی کا مظاہرہ کیا۔

''ز۔خ۔ش تک رسائی بھی میرے بغیر کیسے ممکن ہے؟'' اس نے ہلکی سی مسکراہٹ سے جواب دیا۔اس نام کی حقیقت سے چنیدہ افراد ہی واقف تھے۔

''حضرت اکبرالہٰ آبادی کو تو تم جانتی ہی ہوگی؟'' لیلیٰ نے ایک بار پھر دانستہ طور پر تجاہل برتا۔

''کیسی احمقانہ باتیں کررہی ہو تم؟'' زاہدہ نے اسے آنکھیں دکھائیں۔ ''ان کے نام سے بھلا کون واقف نہیں ہوگا؟ مجھے تو ان سے خصوصی طور پر عقیدت ہے۔ شدید عقیدت۔'' وہ جذب کے عالم میں کہنے لگی۔ ''لیکن تمہیں ان کا خیال یونہی تو نہیں آیا ہوگا؟''

''ہاں! یونہی تو نہیں آیا۔ مجھے مصدقہ اطلاع ملی ہے کہ حضرت صاحب نے خواجہ حسن نظامی دہلوی کے مکان میں کسی مجلس کے دوران تمہارا......اوہ! میرا مطلب ہے ز۔خ۔ش کا کلام دیکھا ہے...اور جانتی ہو انہوں نے کیا رائے دی؟'' اس نے ڈرامائی انداز اختیار کیا۔

''کیا کہا انہوں نے؟'' زاہدہ کو اپنی سانسیں رکتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

''کہنے لگے کہ اگر یہ اشعار کسی خاتون نے کہے ہیں تو مردوں کو دعویٰ شاعری سے ہاتھ اٹھالینا چاہیے۔'' لیلیٰ نے جوش سے بتایا اور پھر کسی سوچ کے تحت کہنے لگی۔ ''تمہیں اپنی شناخت ظاہر کردینی چاہیے زاہدہ!''

''نہیں! ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ میں جانتی ہوں کہ ابھی تو تجسس اور اسرار کی دھند میں لپٹے ز۔خ۔ش کے نام اور تخلیقات کو بے حد پسند کیا جاتا ہے لیکن ان تحریروں کے اصل تخلیق کار کا نام اور شناخت سامنے آتے ہی تعصب وصنف پرستی کی لہر بھی عود آئے گی۔ ایسی بے باک اور کاٹ دار تحریریں کسی عورت کی جانب سے برداشت نہیں کی جائے گی۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''یہ بھی عجیب سی تلخ حقیقت ہے اس معاشرے کی۔ عجیب دہرا معیار ہے کہ عورت ذہانت اور تخلیق نگاری میں مردوں کی ہم سری نہیں کرسکتی۔'' لیلیٰ نے سر جھٹکا۔

''جانے ہمیں کب یہ بات سمجھ آئے گی کہ مذہب کی طرح سیاست سے بے خبری بھی تمام قوم کو قعر مذلت کی طرف لے جائے گی اسی لیے لڑکیوں کو مذہبی تعلیم دینے کے بعد انہیں اصول سیاست سے آگاہ کرکے صحیح وجدان پیدا کرتے رہنا چاہیے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ تمام بڑے آدمیوں کی مائیں خاص دل ودماغ والی خواتین تھیں۔ فاتح کی ماں بہادر، مصلح کی جدت طراز اور ولی کی فنااللہ۔ جس طرح انفرادی طور پر ایک مرد کا اخلاق عورت ہی کا بنایا بگاڑا ہوتا ہے ٹھیک اسی طرح اجتماعی حیثیت سے ایک قوم کی اخلاقی ومادی ترقی قومی ماؤں کی دماغی حالت سے وابستہ ہوتی ہے۔ اگر ہم سیاسی عظمت کی ٹھیکے دار قوموں پر نظر ڈالیں گے

تو ملاحظہ کریں گے کہ ان کی عورتیں سیاست کا کیسا صحیح مذاق رکھتی ہیں اور حب وطن کے پاک جذبہ سے کس قدر سرشار ہیں۔ ان کا وجود ماں کی حیثیت سے نہیں بلکہ فلاح عامہ کے ہر ایک شعبہ میں کارکن کی حیثیت سے ملک وقوم کے لیے رحمت الٰہی ثابت ہو رہا ہے۔'' زاہدہ میں بھی تلخی عود آئی۔

''لیکن ہمارے معاشرے میں ہر معاملہ اس کے برعکس ہے۔'' لیلیٰ افسردہ ہوئی اور پھر ایک توقف سے کہنے لگی۔ ''تمہیں کم از کم نواب صاحب کو تو اس حقیقت سے آگاہ کر دینا چاہیے۔ کب تک پوشیدہ رکھو گی یہ سب ان سے؟''

''ہمت ہی نہیں پڑتی۔'' وہ مضطرب ہوئی۔ ''ابو یاجی ہم سے بہت دوستانہ انداز میں بات چیت کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے آج تک ہمارے سامنے عورتوں کی آزادانہ مضمون نویسی کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ وہ حضرت اکبرالٰہ آبادی کی طرح آزادیٔ نسواں کے خلاف ہیں۔ ان کی خاندانیت پرستی اور وضع داری میرا اخباری دنیا میں آنا گوارا نہیں کرے گی۔ یہ ہمارے خاندانی رواج کی خلاف ورزی ہے۔ بھیکم پور میں بھی کسی لڑکی نے ایسی جسارت نہیں کی۔ اگر انہوں نے ایک مرتبہ بھی میرے سامنے اظہار ناراضی کر دیا تو پھر میرا قلمی سفر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ میں ان کے صریح حکم کی خلاف ورزی کر ہی نہیں سکوں گی۔''

''میں تمہارے جذبات واحساسات اور خدشات اچھی طرح سمجھ سکتی ہوں۔'' لیلیٰ نے اس کا ہاتھ نرمی سے تھپکا۔ ''لیکن مجھے یہ بات ناقابل یقین لگتی ہے کہ انہیں تمہاری قلمی صلاحیتوں کا بالکل کوئی اندازہ ہی نہ ہو۔ ان جیسے تجربہ کار اور معاملہ فہم انسان کی ایسی بے خبری سمجھ سے بالاتر ہے۔''

''تم بالکل درست کہہ رہی ہو۔'' زاہدہ نے اپنے ہونٹ کچلتے ہوئے جواب دیا۔ ''میرا وجدان بھی یہی کہتا ہے کہ وہ اس معاملہ سے آگاہ ہیں۔ کچھ عرصہ قبل انہوں نے راحیل خاتون آپا صاحبہ کا ایک خط کھول کر دیکھ لیا تھا۔ ایسا سہواً ہوا یا قصداً یہ مجھے علم نہیں۔ آپا نے اس خط میں 'عید کی خوشی میں غمزدہ گاں کان پور کی یاد' کا ذکر کیا تھا۔ اس کے ساتھ زمیندار اخبار بھی تھا جو بغرض مطالعہ مجھے بھیجا گیا تھا۔ ان دنوں میں بوڑھے گاؤں میں تھی۔ میں بے حد گھبرا گئی تھی کہ جانے اب کیا ردعمل سامنے آئے گا لیکن میری واپسی کے بعد ابو یاجی کی محبت اور شفقت میں غیر معمولی اضافہ ہی نظر آیا۔ پھر جب انہیں بذریعہ تار خاص اس بات کا علم ہوا کہ حضور وائسرائے نے ماخوذین کانپور کو رہا کر کے مسجد کو بحال رکھنے کا اعلان کیا ہے تو جانتی ہو میرے پاس تشریف لا کر کیا کہنے لگے؟''

لیلیٰ نے نفی میں سر ہلایا تو اس نے سلسلہ کلام کا دوبارہ آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''اب بھی تمہارا دل خوش ہوا یا نہیں؟ اب تو حکومت کو گالیاں نہ دو گی؟''

''اوہ.....تو تم نے کیا جواب دیا پھر؟'' لیلیٰ نے اضطراب سے پہلو بدلا۔

''میں نے کہا کہ میں حکومت کو کب گالیاں دیتی ہوں تو فرمانے لگے تم اکثر شدت پسندی کی طرف مائل ہو جاتی ہو۔ میں تم سے اس معاملہ پر پھر کسی وقت گفتگو کروں گا۔ اس کے بعد انہوں نے دوبارہ کبھی مجھ سے اس موضوع پر بات نہیں کی۔ ان کی عنایت وشفقت میں البتہ کہیں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔'' اس نے تفصیل بتائی۔

''میری دلی دعا ہے کہ تمہارا یہ بھرم اور شناخت ہمیشہ قائم رہے اور یہ قلمی سفر ہمیشہ یونہی کامیابیوں سے ہمکنار رہے۔'' لیلیٰ نے خلوص سے کہا۔

''پروردگار سب بہتر ہی رکھے۔'' زاہدہ نے بھی دعا کی اور موضوع گفتگو تبدیل کر دیا۔

☆☆☆

قلم کی جولانیاں بکھیرتی زاہدہ خاتون کی عمر اب 'بیس' برس ہونے والی تھی۔ اس کی سرگرمیوں اور دلچسپیوں کا دائرہ کار ہنوز وہی تھا۔ وہ مطالعہ کتب اور سیاسی مدوجزر میں مکمل طور پر مگن رہتی۔ گزشتہ ایک برس سے عالمی افق جنگِ عظیم کے ہولناک بادلوں کی لپیٹ میں تھا۔ مسلمانان برصغیر کے لیے یہ صورتِ حال اس وقت مخدوش ہوئی جب نومبر 1915ء میں سلطنت عثمانیہ بھی اس آتش کا حصہ بن گئی۔

دیگر مسلمانوں کی طرح زاہدہ خاتون کی حب قومی اور اخوت اسلامی بھی کرب کا شکار ہوگئی۔ ان دنوں وہ سب بہن بھائی موضع رفیع پورناہ میں اپنے تایا حاجی احمد سعید خاں کے ہاں مقیم تھے۔ کچھ روز بعد بنے میاں نے سب بھائی بہنوں کو اپنے پاس طلب کر لیا۔ اس کا چہرہ سخت تشویش اور سنجیدگی کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

''کیا بات ہے بنے میاں؟ سب خیریت تو ہے؟'' احمدی نے دریافت کیا۔

''ابو یا جان کا خط موصول ہوا ہے۔'' اس نے مختصراً کہا۔

''مجھے علم تھا کہ وہ اس کٹھن ترین صورتِ حال میں ہم سے کسی نہ کسی طور رابطہ ضرور کرلیں گے۔'' زاہدہ نے افسردگی سے سر ہلایا۔

''کیا لکھا ہے ابو یا جان نے؟'' احمدی نے استفسار کیا۔

''جنگ میں ترکی کی شمولیت پر شدید رنج و فکر اور غم و غصہ کا اظہار کیا ہے۔ شائستگی و محبت کے ساتھ وقار و صبر سے کام لے کر مسلمانوں کی ہدایت اور توفیق خیر کے لیے دعا گو ہیں۔'' بنے میاں نے مختصراً بتایا۔

''ہمارے لیے کیا نصائح ہیں ان کے؟'' زاہدہ نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

''لکھا ہے کہ اس نہایت نازک موقع پر اگر از راہِ نادانی ہم سے حسبِ سابق جوشیلی حرکات سرزد ہوئیں تو سنگین نتائج کے علاوہ بھی کوئی بڑا وبال کھڑا ہو سکتا ہے۔ ہم لوگوں کے خیالات کا اتباع ان پر تو کسی طرح لازم نہیں تاہم ہمیں خاموش رہ کر ان کی موافقت کرنی چاہیے۔ اس نازک صورتِ حال میں بہت سے افراد ہمارے گھریلو ماحول اور اہلِ خانہ کے خیالات و سرگرمیوں پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ ہمیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔'' وہ نظریں چراتے ہوئے بولا۔

''یعنی ہم اس معاملہ میں بالکل گنگ ہو جائیں۔'' زاہدہ نے دکھ سے کہا۔

احمدی اور بنے میاں کی خاموشی اس کی تائید ہی تھی۔ زاہدہ کو اپنے وجود میں شدید گھٹن محسوس ہونے لگی۔ اسے علم تھا کہ اب وہ اپنا قلم رواں نہیں رکھ پائے گی... اور ہوا بھی یہی۔ زاہدہ اس دور میں دو تین نظمیں ہی تخلیق کر پائی تھی۔ اس کی توجہ زیادہ تر نسوانی مسائل پر ہی مبذول رہی۔ اس نے اپنی گھٹن و اضطراب 'آئینۂ حرم' میں منتقل کر دی۔ یہ مسدس اپنی معنویت و سلاست کی بناء پر بے پناہ پسند کی گئی۔ چند بند ملاحظہ ہوں۔

''کرۂ ارض کا وہ خطہ محکوم و غلام
دونوں ہاتھوں سے ترقی نے کیا جس کو سلام
جس کو کہتے تھے کبھی منزلِ وحی والہام
گونجتا تھا کبھی توحید کا جس میں پیام
جس پہ اب قہرِ خداوند ہے رحمت کی جگہ
جس کو اب لوگ کہا کرتے ہیں عبرت کی جگہ
صنفِ نازک کے ستانے سے ہوئی اس کی گت
کہ نہ عزت ہے نہ دولت ہے نہ علم و حکمت
عملِ زشت کا گردن میں ہے طوقِ لعنت
پاؤں ہیں بستۂ تارِ رسنِ عبدیت
یوں تو مشرق کی ہر اک قوم ہے ادبار میں فرد
حالِ مسلم ہے مگر سب سے زیادہ پر درد
اب وہ محکوم ہے' تھا خیر امم کس کا لقب
امر بالعرف نہ وہ نہی عن المنکر اب
مجھ سے پوچھے جو کوئی اس کی غلامی کا سبب
سلبِ آزادیِ عورت کہوں گی بہ ادب
چین تجھ کو نہ ملا میرے ستانے والے
تو بھی ٹھنڈا نہ رہا جی کے جلانے والے''

☆☆☆

زاہدہ اپنے کمرے میں تنہا بیٹھی کھڑکی سے نظر آتے چاند کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ سپاٹ اور وجود ساکن تھا۔ بظاہر دیکھنے میں ایسا گمان ہوتا تھا کہ وہ خالی الذہنی کے عالم میں بیٹھی ہے لیکن حقیقت بالکل برعکس تھی۔ اس کے ذہن میں لامتناہی سوچوں کا سلسلہ رواں تھا۔ ایک سوچ کے بعد دوسری' دوسری کے بعد تیسری اور پھر یکے بعد دیگرے ایک قافلہ ہی نکل پڑا۔ پھر یہ سلسلہ نواب مزمل کے تصور پر آرکا۔ وہ لاشعوری اور غیر ارادی طور پر ان کی بابت غیر جانبدارانہ انداز میں تجزیہ کرتی رہی۔

گزشتہ کئی برسوں سے نواب مزمل کی اقبال مندی اور رعب داب میں کئی گنا اضافہ ہو چکا تھا۔ ایک سمت انہیں برطانوی حکومت کا مکمل اعتماد حاصل تھا۔ سرکاری سطح پر کئی خطابات و اعزازات تفویض کیے جا چکے تھے۔ دوسری جانب قومی و خاندانی خدمات میں بھی کسی طور پیچھے نہ تھے۔ نواب مزمل کی انتظامی قابلیت بے مثال تھی۔ وہ سرکاری ذمہ داریاں بہترین انداز میں سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ اپنے حاجت مند اہلِ خاندان کی بھرپور مدد کرتے تھے۔ انہیں اغیار کے قرضہ جات اور سود در سود کی لعنت سے آزاد کرنے کے علاوہ قومی معاملات میں بھی نہایت فراخدلی کا مظاہرہ کرتے۔ اس وقت ان کی ذات ملک و قوم اور خاندان کے لیے مرکزِ پناہ بن چکی تھی۔ مردانے میں پیچیدہ معاملات کی گتھیاں سلجھاتے' ملکی و قومی اور ریاستی امور کے انتظامات سنبھالتے وہ اعلیٰ عہدیدار گھر میں اپنے بچوں کے

سامنے بالکل منفرد چولہ اوڑھ لیتے تھے۔ انہوں نے ملازمات کو منع کر رکھا تھا کہ وہ ان کی آمد کا غلغلہ کبھی بلند نہ کریں۔ مقصد بہرحال یہی تھا کہ بچوں کے اطوار و مشاغل فطری انداز میں دیکھ سکیں۔ اس کا ردِعمل آج بھی یہی تھا کہ نوکر چاکر اور سب اہلِ خانہ ہمہ وقت چوکنے رہا کرتے۔ دونوں لڑکیوں میں والد کے متعلق کوئی وحشت یا غیر فطری خوف نہ تھا۔ نواب مزمل نے انہیں بے حد دوستانہ ماحول فراہم کیا ہوا تھا۔ لڑکیوں کے سن شعور میں پہنچنے کے بعد بھی سب کو یہی تاکید تھی کہ کسی کو پھانس بھی لگ جائے تو انہیں فی الفور مطلع کیا جائے۔

والد کی ان عنایات اور محبت و شفقت کے متعلق سوچتے اس کے ساکت وجود میں بالآخر جنبش پیدا ہوئی۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی باڑ امڈ آئی تھی۔

"آہ ابوجی! کاش آپ کو اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کی مجبوریاں یوں نہ جکڑے ہوتیں۔ کاش میں اپنی ہر تحریر کے بارے میں آپ کی بے لاگ اور برملا رائے جان سکتی۔ یہ خلش عمر بھر مجھے یونہی بے چین رکھے گی۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ خلش میری روح کا آزار بن جائے گی۔"

اس کے ان بہتے آنسوؤں اور خودکلامی پر تقدیر سفاکی سے خندہ زن تھی۔ اپنی شناخت بے مول ہونے پر اشک بہانے والی زاہدہ لاعلم تھی کہ اس کی قسمت میں مختصر عرصہ میں ہی دو ایسے رشتوں سے دائمی محرومی کا دکھ لکھا ہے جس کے بعد اس کی زندگی کا مفہوم ہی تبدیل ہوتے ہوئے وہ عدم کی وادی کا راہی بن جائے گی۔

☆☆☆

"ابوجان! کیسی طبیعت ہے اب بنے میاں کی؟" زاہدہ نے بے تابی سے نواب مزمل کو مخاطب کیا۔

"بس دعا کرو میری بچی! اس کا بخار کسی بھی طرح ٹوٹ کے ہی نہ دے رہا ہے۔" انہوں نے بوجھل سے انداز میں بتایا۔

وہ اپریل 1916ء کا دوسرا عشرہ تھا۔ احمد اللہ خاں عرف بنے میاں معیادی بخار میں مبتلا ہو چکا تھا۔ گھر بھر اس کے لیے سخت تشویش زدہ تھا۔ بیس سالہ بنے میاں اس کم عمری میں بھی علم و فنون اور ورزشی کھیلوں میں بے حد طاق تھا۔ وہ ایک پاکیزہ اطوار، با اخلاق اور خوش باش انسان تھا۔ گھریلو علمی ماحول کی بدولت بچپن ہی سے شعر کہنے لگا تھا۔ زاہدہ اپنے بھائی سے فطری طور پر بے حد محبت کرتی تھی۔

اسے بنے میاں کا تخلص 'حیران شروانی' بہت پسند تھا۔ بنے میاں بھی نواب مزمل کے حسب الحکم بہنوں کو انگریزی پڑھا دیا کرتا۔ ان کی باہمی محبت ایسی لاجواب تھی کہ وہ خیالات میں بھی ایک دوسرے کے آئینہ دار تھے۔ قومی اور سیاسی مسائل میں بنے میاں کے خیالات کا زاہدہ پر بہت گہرا اثر تھا اور وہ بھی زاہدہ کی ادبیت، ذوق شعر، ذہانت و بلند خیالی سے شب و روز کسب فیض کیا کرتا۔

"ڈاکٹر نے کیا کہا ہے ابو یا جی؟ ہمارا بنے میاں ٹھیک تو ہو جائے گا ناں؟ ایک ہفتہ ہونے والا ہے۔ بخار اتر کیوں نہیں رہا؟ وہ سخت نڈھال ہو کر رہ گیا ہے۔ بنے میاں کی ایسی حالت پہلے کبھی بھی نہیں ہوئی۔" زاہدہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

"تم دعا کرو بس!" نواب صاحب نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

"الٰہی! میرے بھائی کو شفائے کاملہ عطا فرمانا۔ اسے ہر مشکل، پریشانی سے محفوظ رکھنا۔ صحت و سلامتی کے ساتھ طویل عمر عطا فرمانا۔ اس کی ہر تکلیف مجھے دے دینا۔ میری ہر خوشی اور راحت میرے بھائی کے نام کر دینا۔ اسے بس سلامت و صحت مند رکھنا۔" زاہدہ گڑگڑانے لگی لیکن قبولیت کی گھڑیاں ختم ہو چکی تھیں۔

انیس اپریل کو بنے میاں ٹائیفائیڈ میں مبتلا رہ کر ان سب کو تنہا چھوڑ گیا۔ زاہدہ کا قلم ایک گہرے کرب و اذیت کا عکس بن گیا...... زاہدہ نے اس المیے پر ایک مثنوی 'اللہ الصمد' تحریر کی۔

"تھا مرا بھائی مرا احمد محمود خیال
مرکز آرزو و نقطۂ پرکار خیال
بسکہ دونوں کا وفا خوئی میں تھا ایک ہی حال
درمیاں میں من و تو کا نہ رہا کوئی سوال
دو مکانات تھے اک روح کے گویا دونوں
جیسے یک دل تھے، یوں ہی رہتے تھے یکجا دونوں
اتفاقاً جو پس ہجر ملا کرتے تھے
پہلے گھنٹوں غم فرقت کا گلا کرتے تھے
دیکھنے والے تعجب سے سنا کرتے تھے
ہو کے پر، متفق اللفظ کہا کرتے تھے
ایسی الفت کہیں دیکھی نہ سنی مشفق من
ہم نے ان آنکھوں سے کیا دیکھے نہیں بھائی بہن
دین کا پابند بھی تھا، طبع کا آزاد بھی تھا

فخر احباب بھی تھا' نازش اجداد بھی تھا
ہم دم وہم نفس نزہت ناشاد بھی تھا
بھائی بھی' دوست بھی' شاگرد بھی' استاد بھی تھا
رشتہ دل سے ہویوں رشتہ خوں محکم تر
ایسی الفت کی ہیں دنیا میں مثالیں کم تر''

بنے میاں کے انتقال نے زاہدہ کو بے حد تنہا کردیا۔ اسے دنیاوی دلچسپیاں اور اسباب نامانوس سے معلوم ہوا کرتے۔ جس بنے میاں کا ایک لمحہ کے لیے بھی آنکھوں سے اوجھل ہونا اسے قیامت محسوس ہوتا تھا اب اسے دیکھنا ہی نصیب نہیں ہوتا تھا۔ ذی الحس طبیعت نے اپنی ہر اذیت شعری قالب میں ڈھال دی۔ مثنوی کے علاوہ اپنے مجموعہ کلام 'فردوس تخیل' میں 'گرم گرم آنسو'، 'تیرے بعد'، 'حادثہ حائلہ'، 'تضمین اشعار غالب نمبر 1 اور 2' بھی تخلیق کیں۔ آخری دونوں نظمیں غالب مرحوم کے ان مشہور اشعار کی تضمینیں ہیں جو انہوں نے اپنے جواں مرگ بھائی عارف کی وفات پر بطور مرثیہ لکھے تھے۔

بھائی کی بھولی صورت ہر روز آنکھوں کے سامنے گردش کرتی۔ نوک زبان پر اکثر مچل اٹھتا کہ

''بہت حیرت ہے اپنی سخت جانی پر مجھے نزہت
مہینوں سے نہیں دیکھا ہے میں نے اپنے حیراں کو''

یہ کرب حد سے سوا ہوتا تو وہ بے اختیار تڑپ کر کہنے لگتی۔

''اے پیاری صورت! دل سے نکل جا! میرے پروردگار! اپنے اور حبیب پاک ﷺ کے سوا دنیا میں کسی کی محبت اب مجھے نہ دے۔''

ایک طویل عرصہ تک اس کے خطوط' اشعار اور تحریریں اسی غم سے معمور رہیں۔ خطوط کے خاتمے پر اپنے نام کے ساتھ 'ناکام محبت'، 'خون کردہ حسرت'، 'برادر گم کردہ' اور 'بے دل' وغیرہ لکھا کرتی۔

کسی بھی عزیز از جان کی رحلت کے ساتھ دکھ اور کرب کی کیفیات اپنی جگہ مسلم لیکن یہ بات بھی ایک آفاقی حقیقت ہے کہ کسی بھی مرنے والے کے ساتھ کوئی نہیں مرتا۔ ایک مخصوص وقت گزرتے ہی قدرت کے خودکار نظام اور اصولوں کے تحت طبیعت میں ٹھہراؤ اور سکون پیدا ہونے لگتا ہے۔ زاہدہ بھی اب بتدریج انہی مراحل سے گزر رہی تھی۔ اس نے مرحوم بھائی کے کلام کا جائزہ لیا اور اسے مرتب کرنے کا آغاز کردیا۔ اس کام میں ایک دقت البتہ یہ بھی درپیش تھی کہ بنے میاں کے سکونتی کمرے کے ساتھ سب کاغذات بھی مقفل ہوگئے تھے۔ اسباب کی منتقلی اب نواب مزمل کی ایماء کے بغیر ناممکن تھی۔ زاہدہ میں والد کے سامنے لب کشائی کی تاب نہیں تھی۔ اس نے ممکنہ طور پر دستیاب کاغذات سے ہی کام چلانے کا فیصلہ کرلیا۔

بنے میاں نے اپنے افکار کو کبھی ترتیبی شکل نہیں دی تھی۔ اس کی طویل نظموں کا کلام بھی زیادہ تر بے ترتیب اوراق کی صورت میں ہی تھا۔ زاہدہ دلجمعی سے اس کی چھان بین اور ترتیب کرتی رہی۔ یہ کلام اس کی نظر سے اصلاحی مراحل کے دوران پہلے بھی گزرتا رہا تھا۔ اس نے ایک طویل قومی مسدس اشاعت کے لیے منتخب کی اور مولوی محمد انس خاں (ابدشروانی) کے توسط بغرض اصلاح اکبرالہٰ آبادی کی خدمت میں بھجوادیا۔ انس زاہدہ کا پھپی زاد بھائی اور بنے میاں کا گہرا دوست تھا۔ اس کے علاوہ خاندان کے بزرگوں میں زاہدہ اور انس کو رشتہ ازدواج میں منسلک کرنے کی صلاح بھی طے پا چکی ہوئی تھی۔

اکبرالہٰ آبادی نے اس کلام کا نہایت توجہ و مہربانی سے جائزہ لیا اور بعض جگہ اصلاح دے کر حوصلہ افزاء اظہار خیال کے ساتھ واپس بھیج دیا۔ زاہدہ ان تمام مراحل میں کچھ بہل گئی تھی۔ وہ احمدی اور انس سے اس ضمن میں خوب صلاح مشورے بھی کرتی۔ تینوں ہی اس کار کی تکمیل کے لیے مکمل خلوص اور تندہی سے کوشاں تھے۔ زاہدہ ان کی کوششوں سے بہت خوش و مطمئن تھی۔ انس کی شمولیت تو فطری طور پر ہی اسے بہت سرشار کیے ہوئے تھی۔ انس اس کے بچپن کا رفیق تھا۔ وہ دونوں ایک ساتھ کھیل کود کر ہی بڑے ہوئے تھے۔ غیررسمی منگنی طے پاتے ہی بچپن کی یہ انسیت انوکھے اور دل آویز جذبات میں ڈھل گئی تھی۔ ہر مشرقی لڑکی کی طرح زاہدہ کے جذبات بھی کلی طور پر انس سے وابستہ تھے۔ ان جذبات اور اس رشتے میں ایک خوش آئند بات یہ بھی تھی کہ انس خاں ابدشروانی اس کا ہم خیال اور ہم مزاج بھی تھا۔ مستقبل میں باہمی رفاقت کے نرم گرم جذبات پر مشتمل خواب بنتے وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے شدید محبت کرنے لگے تھے۔

اپنے بھائی کی ادھوری کاوش مرتب کرنے کا خواب مکمل کرنے میں انس کا عملی تعاون زاہدہ کے دل میں اس کی محبت واحترام میں مزید اضافہ کرنے لگا۔ یہ احساسات ہر گزرتے دن کے ساتھ ایک نئی شدت اختیار کررہے تھے۔

ان کی مستقل باہمی رفاقت بھی اب بہت جلد طے پانے والی تھی لیکن تقدیر کو یہاں بھی کچھ اور ہی منظور تھا۔ اک وبا کی صورت میں بخار پہلے یورپ پھر ایشیا میں پھیلنے لگا۔ ہند میں بھی پہنچ گیا۔ پھر دنیا نے دیکھا کہ نومبر 1918 میں انس بھی اس عالم گیر جنگی بخار کا ہدف بن گیا اور اپنے لواحقین کو داغ مفارقت دے گیا۔

زاہدہ خاتون کے قلب و روح پر گویا قیامت ہی گزر گئی۔ اوّلین محبت سے یہ دائمی محرومی برداشت ہو کے ہی نہیں دے رہی تھی۔ احمدی بیگم اور ننھے میاں بھی اس سانحہ پر شدید رنجیدہ تھے۔ انہیں اس بات کا بھی بے انتہا قلق تھا کہ اب شروانی خاندان میں زاہدہ کے پایہ کا کوئی جوڑ موجود نہ تھا۔ ان کے قدیم الخیال بزرگ خاندان سے باہر رشتے داری کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے تھے۔ اس سے بھی المناک پہلو یہ تھا کہ اپنی تمام تر روشن خیالی اور اعلیٰ تعلیم کے باوجود نواب مزمل بھی ایسے ضوابط خاندان کی مکمل طور پر پاسداری کرتے تھے۔ وہ زاہدہ کا غیر خاندان میں رشتہ جوڑنے میں سخت متامل اور متردد تھے۔ احمدی بیگم اور ننھے میاں کی کوئی بھی دلیل یا منطق کارگر نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اس تلخ حقیقت پر شدید تڑپ محسوس کرتے کہ ان کی عزیز از جان بہن شادی کے ذریعے انقلاب حیات کی لذت سے آشنا نہیں ہو پائے گی۔

دوسری جانب اپنی محبت و رفاقت کی یہ مرگ برگ زاہدہ خاتون کے قلم کا ایندھن بن گئی تھی۔ اسے اپنی شادی کہیں اور نہ ہو پانے کے خیال سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ انس اس کے بھی احساسات، جذبات اور خواب ابدی طور پر اپنے ساتھ لیے مدفن ہو گیا تھا۔ زاہدہ نے 'وصل و فصل' کے عنوان سے 'فردوس تخیل' میں ایک شاندار تعزیت نامہ تحریر کیا۔ اس سانحہ کی اذیت ابھی جواں ہی تھی کہ زاہدہ کی ایک دیرینہ قلمی سہیلی 'رابعہ سلطان بیگم' بھی انتقال کر گئی۔ اس انشاء پرداز خاتون رابعہ کا تعلق حیدر آباد دکن سے تھا، اپنے قریبی اور عزیز از جان ان رشتوں سے دائمی جدائی اس کی روح پر نت نئے گھاؤ لگا رہی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ سب اس کی قسمت کا قصور ہے کہ وہ جس سے بھی محبت کرتی ہے وہی مبتلائے آفات و مصائب رہا کرتا ہے اور پھر اسے ہمیشہ کے لیے تنہائی کے بحر بیکراں میں دھکیل دیتا ہے۔ ان جذبات و احساسات سے مغلوب ہو کر زاہدہ نے رابعہ سلطان بیگم کے لیے ایک دلگداز مضمون اور پھر فارسی نظم 'واقعہ فاجعہ' بھی تخلیق کی۔ اس کا قلم اب افسردگی کی دھند میں لپٹا قارئین کو بھی آزردہ کیے رکھتا تھا۔

☆☆☆

بنے میاں، انس اور رابعہ کی اموات نے زاہدہ کی فطری خاموشی میں مزید کئی گنا اضافہ کر دیا۔ اس کے حساس اور نازک دل پر غم کے گہرے نقوش ثبت ہو چکے تھے۔ ذہنی تناؤ، قلبی آزردگی اور روح کے اس آزار نے زاہدہ کو صحت کے مسائل سے دوچار کر دیا۔ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ وہ جون 1919ء میں روزے رکھنے کے قابل بھی نہ رہی۔ ابتدائی دو روزے رکھنے کے بعد سخت خرابی شکم نے گھیر لیا۔ اس مرض سے روزے قضا ہونے کا دکھ اسے بلک بلک کر رونے پر مجبور کر گیا لیکن یہ آنسو بھی صرف تنہائی کے ہی رفیق تھے۔ وہ نواب مزمل کی پریشانی کے خیال سے ان کے سامنے خود کو حتی الامکان سنبھالے ہی رکھتی۔ روبہ زوال صحت نے اسے یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ

''میری جاں لے کے ہی آئے گا طبیعت کو قرار
کہ یہ کم بخت کسی وقت سنبھلتی ہی نہیں''

نواب صاحب بھی بیٹی کی صحت کے باعث بہت تشویش زدہ رہتے۔ انہوں نے ڈاکٹر بٹ کو خصوصی طور پر زاہدہ کے معالجہ کے لیے بلوایا۔ ڈاکٹر نے اسے چھ ہفتے کے عرصہ میں چھ ٹیکے لگوانے کی تجویز دی۔ اس کے بعد بلغم اور خون کا معائنہ بھی ضروری قرار دیا۔ زاہدہ ان تمام مراحل پر خالی الذہنی کے عالم میں رہتی۔ وہ جانتی تھی کہ اپنوں کی جدائی ہی اس مرض کا اصل سبب ہے۔ اسے اب شاعری اور دیگر تخلیقات کے سوا کسی بھی شے میں دلچسپی نہیں تھی۔ دیگر دنیاوی دلچسپیاں اپنی اہمیت یک لخت ہی کھو بیٹھی تھیں۔ فکر سخن بھی حیران کن طور پر تیز تر ہو رہا تھا۔ وہ اپنے تخلیقی خیالات میں ہی مستغرق رہا کرتی۔ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اشعار کی آمد ہوا کرتی۔ کبھی کبھی حمام سے باہر آ کر اس اثناء میں کہی گئی پوری نظم زبانی سنا دیتی۔ کبھی رات بھر عالم خواب میں دماغ شعر گوئی میں مصروف رہتا جنہیں وہ صبح اٹھتے ہی صفحہ قرطاس پر منتقل کر دیتی۔ اسی زمانے میں زاہدہ نے ایک یادگار نظم 'ماہِ مبارک کے مناظر' تخلیق کی۔ زاہدہ کے مضامین اور نظمیں اب ایک تواتر سے مختلف زنانہ و مردانہ اخبارات اور رسائل میں شائع ہو رہے تھے۔ وہ اخبار تہذیب نسواں کی سرگرم مضمون نگار بن گئی تھی۔ مدیر شمس العلماء مولوی ممتاز علی، زاہدہ کے افکار و

مضامین سے بہت متاثر تھے۔ وہ ذاتی طور پر بھی زاہدہ سے خط وکتابت سے رابطے میں رہتے۔

کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ زاہدہ کو اخبار کی جانب سے مضمون نگاری کا مقررہ سالانہ انعام مبلغ پندرہ روپیا ارسال کیا گیا۔ ایسے کسی بھی موقع پر زاہدہ کا شاہانہ مزاج عود آتا تھا۔ وہ کسی کی بھی ممنونیت اور احسان گوارا نہیں کرتی تھی۔ اس نے ممتاز علی سے دیرینہ شناسائی کی بدولت یہ رقم قبول تو کرلی لیکن اس کی اپنے پاس موجودگی سخت گراں محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اسے فوراً انہیں مثبت انداز میں خرچ کر دینا چاہتی تھی۔ قدرت نے اسے یہ موقع بھی جلد ہی فراہم کر دیا۔ اسے اپنی ایک طویل مسدس 'آئینہ حرم منظومہ' کی کتابی شکل میں اشاعت کا خیال سوجھا۔ وہ اس کے حقوق اشاعت اخبار تہذیب نسواں کو ہی دینا چاہتی تھی۔ اب اتفاق یہ ہوا کہ اسی اثناء میں مدیر صاحب نے ایک خط میں اخبار کی مالی مشکلات کا تذکرہ کر دیا۔ زاہدہ نے فوری طور پر وہ مسدس اور چند مزید نظمیں انہیں بہ عطائے حقوق ارسال کر دیں۔ 1921ء کے آغاز میں یہ کلام شائع ہو کر ہاتھوں ہاتھ ملک کے گوشے گوشے میں پہنچ گیا تھا۔ ز۔خ۔ش کے لیے دفتر سے کتاب کے پچاس نسخے بھی ہدیتاً بھیجے گئے لیکن زاہدہ نے یہ رسمی کارروائی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے کتب کی قیمت ادا کر کے 'سوا دو روپے' اپنی جیب خاص سے مزید ادا کر دیے۔ مقصد بہر حال یہی تھا کہ اس رقم سے غریب تاہم باذوق مستورات کو کتاب بلا قیمت نذر کر دی جائے۔

ان سرگرمیوں کے علاوہ اس کے تخلیقی سفر میں نئی جہتوں کا آغاز ہو گیا تھا۔ اس نے مشہور فرانسیسی مصنف 'پی اریلوتی' کی تصنیف 'دیزاں شانتے' کو 'پری رویان ناکام' کے عنوان سے فارسی قالب میں دیکھ کر یہ اسے اردو ترجمہ میں منتقل کا آغاز کر دیا۔ ناول کے ادبی محاسن نے اسے بے طرح اپنا گرویدہ بنا لیا ہوا تھا، ناول کی ہیروئن کے بعض عمومی جذبات حیرت انگیز طور پر زاہدہ کے احساسات سے مشابہ تھے۔ اس کتاب کی تکمیل کے دوران اسے ترکی زبان سیکھنے کا شوق بھی چرایا۔ وہ ترکی بول چال کی کتابیں منگوا کر یہ زبان سیکھنے کی کوشش میں جت گئی۔

ان تمام سرگرمیوں میں وہ اپنے دلی گھاؤ کا کرب نہاں رکھنے کی کوششوں میں بھی ہلکان تھی لیکن اس کی زندگی تلاطم خیز حادثات وسانحات کا مجموعہ بن چکی تھی۔ ایک مصیبت کے اثرات واذیت ابھی ختم نہ ہو پاتی تھی کہ اگلا الم کسی عفریت کی طرح منہ پھاڑے اس کے استقبال کے لیے تیار ہوتا۔ زاہدہ کی زندگی اس کے اپنے ہی شعر کی عملی تفسیر بن چکی تھی۔

"اس نے راحت بھی جو پائی تو بس اک آن کی طرح"

اپنوں سے جدائی اور قومی حالات کی ابتری میں بالآخر خوشی کے ایک لمحہ کی آمد ہوئی۔ احمدی بیگم نکہت شروانیہ کی شادی ان کے ایک ننھیالی رشتہ دار محمد عبدالمقیت خان شروانی سے طے پا گئی تھی۔ عبدالمقیت ضلع علی گڑھ کے بوڑھ گاؤں کا رہائشی تھا۔ شادی کی ہر تقریب میں وہ سبھی بہن بھائی بنے میاں کو یاد کر کے آزردہ ہوتے رہے لیکن اب وہ جس منزل کا راہی بن چکا تھا وہاں سے واپسی کسی بھی صورت ممکن ہی نہ تھی۔

شادی کی تقریبات کے مراحل اور ماں جیسی شفیق بڑی بہن کو ملنے والی ازدواجی خوشیوں نے زاہدہ کا دل قدرے بہلا دیا لیکن یہ صورتِ حال عارضی ہی ثابت ہوئی۔ غم نے ایک بار پھر خوشی کا شکار کر لیا تھا۔ زاہدہ کو بوقت پیدائش 'نادر خاتون' کا نام دینے والے شفیق تایا نے بھی عدم کی راہ لے لی۔

یہ زخم ابھی تازہ ہی تھا کہ زاہدہ کی ایک بے حد مہربان خالہ بھی موت کی گرفت میں آگئیں۔ یہ خالہ کافی عرصہ سے مختلف النوع امراض کا شکار تھیں۔ انہوں نے اپنی بھانجیوں کو بچپن ہی سے بے پناہ پیار دیا تھا۔ نانی کی وفات کے بعد تو یہ محبت اور بھی شدید ہو گئی تھی۔ بے اولاد ہونے کے باعث ان کی توجہ ومحبت کا مرکز صرف بھانجیاں تھیں۔ اس مرگ نے زاہدہ کی روح کے ریشے کچھ اور ادھیڑ دیئے۔ اس نے خالہ کو ہمیشہ ماں کی مانند ہی محبت کی تھی۔ ننھیالی رہائش گاہ 'اماکن مقدسہ' کے بعد دنیا کی ہر عمارت سے زیادہ پیاری محسوس ہوتی اور اب اس عمارت کا ایک اور رنگین داغ مفارقت دے گیا تھا۔

غم کی یہ بھاری سل سینے پر دھرے وہ کسی نہ کسی طور زندگی گزارتی رہی۔ طبیعت پر ہمہ وقت بے زاری اور بے کلی طاری رہتی۔ علمی سرگرمیوں میں بھی پہلے جیسی روانی نہ رہی تھی۔ یہ تعطل دیگر مصائب سے زیادہ کوہ گراں تھا۔ اس بار میں اس وقت مزید اضافہ ہو گیا جب اس کی شاگرد لڑکی 'بانو' مرض دق میں مبتلا ہو گئی۔ بانو لکھنے پڑھنے کے مراحل میں اس کی مددگار اعلیٰ تھی۔ بانو کا بخار اور کھانسی صرف اس کے لیے ہی نہیں مقابل کے لیے بھی سخت اذیت ناک مرحلہ

ہوتی اس لیے اسے رخصت دیتے ہی بنی۔ بانو ایک محنتی اور پُرخلوص لڑکی تھی۔ اس کی غیر حاضری زاہدہ کے لیے کئی مشکلات کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اس کے علاوہ بانو کی زندگی وسلامتی کی تشویش اعصاب کے لیے الگ امتحان تھی۔

ان پُرآشوب لمحات میں قدرت نے اسے ایک پُرمسرت موقع عطا کیا۔ احمدی بیگم کے وجود میں ایک نئی زندگی نمو پا چکی تھی۔ اپنے تمام تر آلام، مسائل اور خرابی صحت کے باوجود زاہدہ کسی تجربہ کار خاتون کی طرح احمدی بیگم کی متوقع اولاد کے لیے مختلف النوع تیاریاں کرتی رہی۔ نومولود کی رضاعت کے لیے بھی اس نے ایک عورت نامزد کر لی تھی۔ ان دنوں اس کی واحد دلچسپی سودیشی تحریک تھی۔ اس نے ننھے میاں سے تفصیلی تبادلہ خیال کیا۔

''ترک موالات کا رجحان بہت سے لوگوں میں بڑھنے لگا ہے۔''

''ترک موالات کے طریق عمل سے مجھے بعض صورتوں میں اختلاف ہے۔ نظام تحریک میں تعلیمی مقاطعہ کسی بھی صورت مناسب نہیں۔''

''اور سودیشی تحریک کے بارے میں کیا کہیں گی آپ؟'' ننھے میاں نے دریافت کیا۔

''اس پر تو میں آج سے نہیں شروع سے ہی فدا ہوں۔'' زاہدہ نے عزم سے جواب دیا۔

''اب تازہ ترین واقعات نے لوگوں میں بدیسی مال سے ناقابل برداشت نفرت پیدا کر دی ہے۔'' اس نے مزید بتایا۔

''میں نے بھی یہی فیصلہ کر رکھا ہے۔'' وہ مسکرائی۔ ''میں ہر ممکن طور پر کھدر کا استعمال کروں گی۔ ہر قسم کا بدیسی مال کم سے کم استعمال کروں گی۔''

''لیکن سرتاپا کھدر کا استعمال ہماری خاندانی قیود اور ابو یاجی کے مرتبے سے متصادم ہے۔'' ننھے میاں نے اسے یاددہانی کروائی۔

''ہاں! مجھے علم ہے۔ میں سردست لباس کے استر وغیرہ اور تمام استعمالی کپڑوں مثلاً لحاف، میز پوش میں کھدر استعمال کروں گی۔ پہننے کے باریک کپڑے بھی دیسی ساختہ ہوا کریں گے۔''

''تو کیا آپ پرانے کپڑے نہیں جلائیں گی؟'' وہ حیران ہوا۔

''نہیں! بلکہ جبراً..... کراہتاً اور حقارتاً اپنے ذخیرہ

لباس کو ختم ہونے تک استعمال کروں گی۔ یہ نفرت ہی ان کا اصل مقام ہے۔ میں حتی الامکان گھر کو اس ناپاک چیز سے جلد تر پاک کرنے کی کوئی نہ کوئی صورت نکال لوں گی۔ دیسی کپڑے کی خرید اور استعمال آج ہی سے شروع کردوں گی۔ چرخے کا پیشہ بھی گھر میں رائج کروں گی۔'' وہ پُرعزم تھی۔

''لیکن ابویاجی......؟ وہ کچھ......'' ننھے میاں بات کرتے ہوئے خاموش ہوگیا۔

زاہدہ گہری سانس بھر کر آسمان کی جانب دیکھنے لگی۔ اس کے دل سے ایک ہی صدا برآمد ہو رہی تھی۔

''اے میرے مولا! اس نیک ارادہ میں میری مدد فرما۔ تو جانتا ہے کہ اس عہد نے میری مشکلات میں ایک عظیم اضافہ کردیا ہے۔ اے میرے مہربان مولا! میرے پیارے باپ کو مجھ سے متفق الرائے کردے یا کم سے کم انہیں حکم دے کہ اس معاملے میں میری مخالفت نہ کریں تاکہ دیسی مال کی بہم رسانی اور استعمال آسان ہوجائے۔ اے میرے بہت ہی مہربان مولا! تو یہ بھی جانتا ہے کہ باپ کی محبت جو تیری ہی پیدا کی ہوئی ہے اور باپ کی اطاعت جو تیرے ہی حکم پر مبنی ہے حائل نہ ہوتی تو میں سادہ زندگی بسر کرنے کا ارمان ضرور پورا کرتی اور کسی دشواری کو خاطر میں نہ لاتی۔''

''کیا سوچ رہی ہیں؟'' ننھے میاں نے محبت پاش نظروں سے بہن کو دیکھا۔

''ابویاجی کے لیے کچھ الفاظ ذہن میں رقص کر رہے ہیں۔'' اس نے کھوئے کھوئے سے لہجہ میں کہا اور ایک توقف کے بعد گویا ہوئی۔

آہ میں ہرگز نہ بھولوں گی وہ ایام طرب
جب مجھے حاصل تھا 'بچہ' کا محبت زا لقب
جب مجھے آتے تھے دنیا میں یہی دو چار کام
کھیلنا' کھانا' پہننا' شادماں رہنا مدام
جب نشاط و عیش فزوں تھا' خردکم' عقل کم
جب پہیلی تھیں' معما تھیں لغات فکر و غم
آہ میرا عہد طفلی تو بہ عہد سلطنت
کس قدر رشک آفریں تھا' کس قدر پر تمکنت
تیرا گھر وہ سرزمیں تھی جس میں میرا راج تھا
تیرا زانو تخت گہ تھا' دست شفقت تاج تھا
تھی نظر سے دور اک معصومہ اک حور جناں
میں سمجھتی تھی کہ میرا باپ ہی ہے میری ماں

شب کو اکثر تجھ کو سرہانے کھڑا پاتی تھی میں
پیار کی نظروں سے جھک کر دیکھتا پاتی تھی میں

ننھے میاں ان الفاظ کے سحر میں مکمل طور پر کھو چکا تھا۔ کچھ لمحوں بعد وہ کہنے لگا۔

''دعا ہے کہ ابویاجی اپنی ذمہ داریوں کی ان بیڑیوں سے آزاد ہوجائیں۔''

''اللہ تمہاری زبان مبارک کرے۔'' زاہدہ اتنا کہہ کر خاموش ہوگئی۔

ان سرگرمیوں اور احمدی بیگم کے لیے کی جانے والی مخصوص تیاریوں میں کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ اسے تیز بخار نے آلیا جو آناً فاناً 106 ڈگری تک پہنچا اور پھر دوسرے ہی روز سرسامی صورت اختیار کرگیا۔

نواب مزمل سخت تشویش زدہ ہوچکے تھے۔ انہیں بنے میاں کی کیفیت یاد آنے لگی۔ وہ بھی اسی جان لیوا مرض کا شکار ہوا تھا۔ انہوں نے ڈاکٹری علاج کی بجائے یونانی تدابیر اختیار کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ دہلی سے فی الفور ایک نامور طبیب 'غلام کبریا خاں عرف بھورے میاں' کو بلایا گیا لیکن بے سود۔ مرض کی شدت لحہ بہ لحہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ تیز بخار' شدید غفلت' بے چینی اور ہذیا سرائی کی تکالیف میں ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اضافہ ہو رہا تھا۔

نواب مزمل کا ہر ایک پل گویا کانٹوں پر بیت رہا تھا۔ وہ رات بھر مردانے سے بیٹی کے پاس چکر کاٹتے رہتے۔ خیر خیرات' صدقات' دعا' دوا سبھی کچھ جاری تھا لیکن افاقہ کی کہیں کوئی صورت نظر نہ آرہی تھی۔

دوروز اسی اذیت بھری کشمکش میں بیت گئے۔ تیسرے دن احمدی بیگم کے ہاں ایک بیٹی مولود ہوئی۔ نواب مزمل کو سمجھ ہی نہیں آرہی تھی کہ وہ اس موقع پر خوشی کا اظہار کریں یا عزیز از جان بیٹی کی حالت پر بلک بلک کر دعائیں مانگیں۔

اگلے روز حیران کن طور پر زاہدہ ہوش میں آگئی۔ حواس کسی قدر بحال ہوئے اور بخار بھی ہلکا ہوگیا۔ نواب صاحب نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہنے لگے۔

''جلدی سے ٹھیک ہوجاؤ میری بچی! اپنی ننھی بھانجی کا استقبال نہیں کرنا ہے کیا؟''

زاہدہ کے چہرے پر چھائی مردنی ایک ہی پل میں مسرت میں تبدیل ہوگئی۔

''ارے لڑکی؟ ابو یاجی! لڑکی پیدا ہوئی ہے؟ پروردگار کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔'' اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

اگلے ہی لمحے نقاہت سے آنکھیں دوبارہ بند ہو گئیں۔ نواب مزمل کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ چند ثانیوں بعد اس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں اور کہنے لگی۔

''میرا دل ننھی منی کو دیکھنے کے لیے بہت چاہتا ہے لیکن اس بیماری و ناتوانی نے ساری ہمت ہی نچوڑ لی ہے۔''

''فکر نہ کرو میری بچی! سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ تم بہت جلد اپنی بہن اور بھانجی سے ملاقات کرو گی۔'' انہوں نے ضبط کرتے ہوئے اسے دلاسہ دیا۔

زاہدہ کی آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے۔ کچھ دیر بعد بانو بھی اس سے ملاقات کے لیے چلی آئی۔ زاہدہ کا چہرہ مسرت سے جھلملانے لگا۔ وہ بے ترتیب تنفس میں کہنے لگی۔

''آج کا دن بہت مبارک ہے۔ تین خوشی کی باتیں بیک وقت پیش آئی ہیں۔ ایک ننھی منی کی ولادت' تمہارا بستر علالت چھوڑ کر میرے پاس آنا اور میرا بخار ہلکا ہونا۔''

''پروردگار یہ خوشیاں یونہی سلامت رکھے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ بہت جلد بھلی چنگی ہو کر اپنا قلمی سفر دوبارہ شروع کریں گی۔''

بانو کے اس خلوص و محبت پر زاہدہ کی آنکھیں ایک بار پھر بھیگ گئیں۔

''ابھی کچھ الفاظ ذہن کے دریچوں پر زوردار دستک دے رہے ہیں۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔

''تو کواڑ کھول دیجیے ناں! الفاظ کو اخراج کا راستہ عطا کیجیے۔'' بانو نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

زاہدہ اسی دھیمے انداز میں کہنے لگی۔

''واہ کیا جاں بخش ہے جنگل کے منظر وقت شام
کھل گیا دل اے ہوا کے سرد جھونکو' مرحبا
چھوڑ کام' اے بے وفا دولت کے شائق چھوڑ کام
جلد آ' اے عاشق قدرت کے عاشق جلد آ
عازم مغرب شہ خاور ہے یاں بھی زرفشاں
ریت کے ذروں میں ہے جس کی چمک الماس کی
طائر خوش رنگ و خوش گو بھی' شجر بھی' گل بھی یاں
دیکھ یہ لالہ ہے' یہ ٹیسو ہے' یہ بن مالتی
خستہ بار قدم ہیں یاں وہ اقسام نبات
جن کا حسرت کش ہے تیر آتشنہ علم کیمیا
جن کے تابع تن' نظر' جاں' عقل' اقوال و صفات
جن کے ممنوں معجزہ' اکسیر' جادو سیمیا
مجتمع ہیں اس عجائب گھر میں صدہا جانور
جھاڑیوں کی آڑ میں جو کھیلتے ہیں دھوپ چھاؤں
سبزہ ساحل پہ بعض افتادہ آتے ہیں نظر
سیمگوں موجیں اچھل کر چومتی ہیں جن کے پاؤں
نزہت اس اونچے شجر کے نیچے ہے ششدر کھڑی
ہو گئی ہے زرد ہر شے دیکھتے ہی دیکھتے
مٹ رہی ہے شام کی سرخی سے تیزی دھوپ کی
ہو فنا جس طرز غصہ نرم و شیریں وعظ سے
زاہدہ جب حسن قدرت کی ہو تو رمز آشنا
ہاں' مئے صدق و حقیقت سے ہو تیری روح مست
اس دم آنکھیں بند کر' گردن جھکا اور بھول جا
ہاں' بہ سرعت بھول جا کیفیت بالا و پست''

اس طویل نظم کی معنویت نے بانو کو ششدر کر دیا۔ وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے کچھ اثناء کے بعد کہنے لگی۔

''عنوان کیا تجویز کیا ہے اس نظم کا؟''

''جنگل۔'' اس نے مختصراً جواب دیا۔

''میں یہ نظم آپ کے کاغذات میں لکھ دوں گی۔'' بانو نے ملائمت سے کہا۔

زاہدہ نے آنکھیں موند لیں۔ اس میں مزید کچھ بھی کہنے کی تاب نہیں تھی۔ اس کی طبیعت کا اتار چڑھاؤ ایک بار پھر عود آیا تھا۔ اپنی پروردہ شاگرد لڑکیوں کی آمد پر وہ نقاہت سے کہنے لگتی۔ ''دیکھو! میرے کاغذات کو پوری احتیاط سے سنبھال کر رکھنا۔ ان کا ایک پرزہ بھی ہرگز ضائع نہ ہونے پائے۔''

''آپ ایسی باتیں کیوں کر رہی ہیں؟ سب کچھ ٹھیک ہو کر پہلے جیسا ہو جائے گا۔''

زاہدہ ان کا دلاسہ سن کر تھکاوٹ سے مسکرا دیتی۔ ہوش کے یہ لمحات عارضی ہی ثابت ہوتے تھے۔ نیم مدہوشی میں بھی وہ انگلی اٹھائے یہی تاکیدی اشارہ کرتی رہتی۔ اس کشمکش میں جنوری کا اختتام ہو گیا۔ یکم فروری کو اس کے حواس قدرے بحال ہو گئے تھے۔ اسی دوران ایک قریبی عزیز اس کی عیادت کے لیے چلے آئے۔ زاہدہ اپنی زبان کی لکنت کے باوجود مخصوص جبلی خوش اخلاقی سے ان کا احوال اور خانگی معاملات دریافت کرنے کی کوشش کرنے لگی لیکن زبان میں ایک آدھ لفظ سے زیادہ کی ادائیگی کی سکت

ہی نہ تھی۔ بے چینی اس قدر شدید تھی کہ وہ بے اختیار سر اٹھانے اور بیٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ نواب مزمل نے فوراً آگے بڑھ کر اپنے سینے سے بیٹی کے سر کو سہارا دیا اور سیال غذا کے دو تین چمچے بڑی دقت سے اسے کھلا دیئے۔ غذا حلق سے اتر کے ہی نہ دے رہی تھی۔ ان کا دل بیٹی کی اس حالت پر کٹ کر رہ گیا۔ اس پر مستزاد پچھلے کئی روز سے نیند بھی اس سے روٹھی ہوئی تھی۔ انہوں نے مردہ دلی سے بیٹی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''بی بی! میرا ایک کہنا مانو!''

''آپ کا؟ آپ کا کہنا نہ مانوں گی تو کس کا مانوں گی؟'' اس نے لڑکھڑاتی اور تھرتھراتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''ذرا دیر آنکھیں بند کر کے آرام کرو'' انہوں نے حسرت سے بیٹی کو دیکھا۔

''اچھا جی!'' زاہدہ نے اتنا کہہ کر والد کے حکم کی تعمیل کر دی۔

نواب مزمل نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور سب کو خاموشی و نگہداشت کی تاکید کر کے باہر چلے آئے۔ کچھ لمحوں کے بعد زاہدہ کی طبیعت مزید بگڑ گئی۔ جمعرات دو فروری کی صبح ننھے میاں اپنے آنسو ضبط کرتا اس کے سرہانے کھڑے ہو کر یٰسین خوانی کرنے لگا۔ زاہدہ کے لب ایک دوبار 'اللہ' کہنے کے لیے بے آواز کھلے اور پھر اس کی زندگی کا چراغ گل ہو گیا۔ مدھم سانسوں کا زیروبم ساکت ہوتے ہی ننھے میاں پھوٹ پھوٹ کر رو دیا اور دل کڑا کر کے اس دیسی کپڑے کی چادر بہن کے بے جان تن پر ڈال دی جسے اس نے گزشتہ ماہ ہی سودیشی تحریک پر عملی اقدام کا فیصلہ کرتے ہوئے بڑے اہتمام سے اپنے لباس کے لیے خریدا تھا۔ ننھے میاں کے ذہن میں بہن کا ہی ایک شعر گونجنے لگا۔

''جب میں کہوں خیر باد اس عالم حق پوش کو
روح چل دے چھوڑ کر قالب تری آغوش کو''

''آہ میری بہن! آپ کی قسمت میں اس گھر سے دلہن بن کر رخصت ہونا لکھا ہی نہ تھا۔ کیا کیا خواب نہ دیکھے تھے آپ کے لیے۔ لیکن آپ کو کفن کا جوڑا پہنا کر اس دنیا سے الوداع کیا جائے گا۔ آج آپ کے ساتھ شعر و سخن، علم و ادب، اخلاص اور لیاقت و فراست کی بہاریں بھی قلعہ منزل سے رخصت ہو جائیں گی۔ آہ میری بہن! آپ کی کمی مرتے دم تک محسوس ہو گی۔'' وہ گھٹنوں کے بل وہیں ڈھے گیا۔

زاہدہ کی موت نواب مزمل پر بھی بجلی بن کر گری تاہم ان کے صبر و استقلال کا آج بھی بنے میاں کی وفات جیسا ہی عالم تھا۔ وہ بالکل خاموش اور حیرت و حسرت کی تصویر بنے رہے۔ زاہدہ خاتون کی آخری آرام گاہ قبرستان موضع بھموری ضلع علی گڑھ میں اپنے اجداد و اعزہ اور والدہ کے جوار میں بنائی گئی۔ بہن کو خاک نشیں کرتے ہوئے ننھے میاں کی نوک زبان پر اسی کا ایک شعر مچلنے لگا۔

مرے رخ کو چھپا کر خاک سے جب اقربا پلٹے
پکاری معنوی صورت کی زندہ ہوں، سلامت ہوں میں

☆☆☆

ز۔ خ۔ ش کی رحلت کے بعد ادبی دنیا میں صف ماتم بچھ گئی۔ نواب مزمل سے شناسا، غیر شناسا کثیر التعداد لوگ ملاقات کے لیے آئے۔ خطوط و تار کا تانتا بھی بندھا رہا۔ اخبار تہذیب نسواں لاہور کے کالم زمانہ دراز تک ماتم کدہ بنے رہے۔ نامور اردو ادیب سید سجاد حیدر یلدرم نے تہذیب نسواں میں ز۔ خ۔ ش کے لیے تاریخی الفاظ ادا کرتے ہوئے لکھا۔

''وہ عندلیب خوش الحان جس کے عرفان پاشے نغمے قفس کی تیلیوں سے نکل نکل کر ایک عالم کو مسحور کر رہے تھے، یکا یک خاموش ہو گئی۔ نغمے فضا میں متلاطم ہیں مگر عندلیب ہمیشہ کے لیے ساکت۔ وہ حقیقت طراز مگر شیریں آواز سرا پردہ دولت کے پیچھے سے (جہاں سے بے معنی خندہ اور فضول مکالمہ کے سوا کچھ کم سنائی دیتا ہے) سنا رہی تھی کہ صدق و صفاء علم و عرفاں سوز و التہاب، درد و گداز سوگوار ہیں کہ ان کی مشاطہ ان کو دل آویز آرائشوں میں اب پیش نہ کرے گی۔ وہ ایک عندلیب تھی جو قفس میں پیدا ہوئی، قفس میں ہی جی اور قفس میں ہی دم توڑا۔ اس چند گز نیلگوں آسمان کے سوا جو اس کے صحن خانے پر حسرت بار رہا۔ اس نے فطرت کی زیبائش، آفریدہ دست انساں کی آرائش نہ دیکھی؟ آفتاب جو دنیا کو زندگی اور حرارت بخشتا ہے، قفس کی تیلیوں سے لپٹے ہوئے کپڑے سے نہ گزر سکا لیکن خود اس کے قلب منور نے ایک شمع روشن کی جس نے اسے باہر کے نور سے بے نیاز کر دیا۔''

ماخذات:

حیات ز۔ خ۔ ش...... انیسہ ہارون بیگم شروانیہ
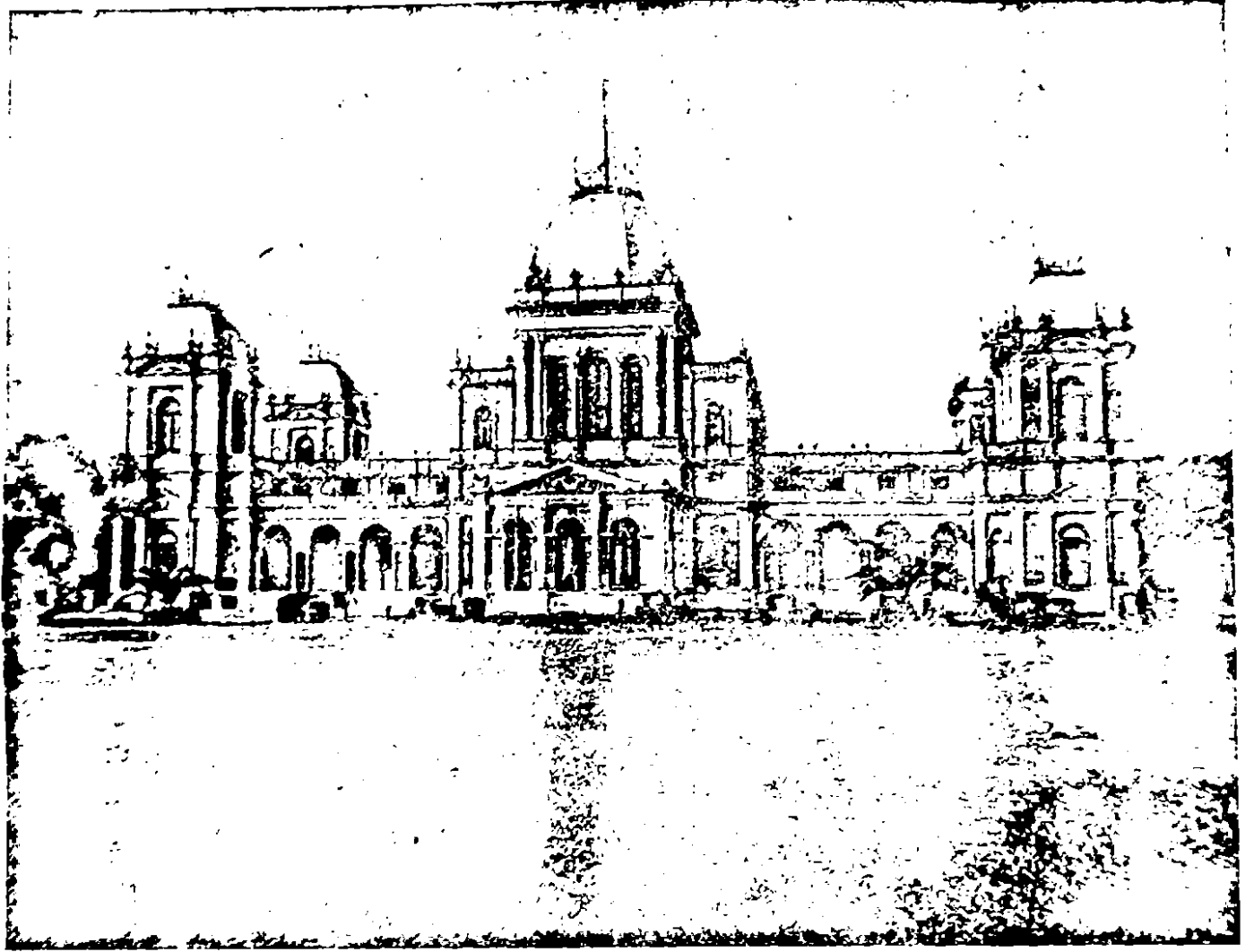
نور محل

محمد فاروق طاہر

لوگ تاج محل کو محبت کی نشانی قرار دیتے ہیں لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ ہمارے وطنِ عزیز میں بھی ایک ایسا محل ہے جو والیٔ ریاست نے اپنی ملکہ کے لیے بنوایا تھا۔ تاج محل ملکہ کی قبر کے لیے تعمیر ہوا اور یہ محل بطور تحفہ ملکہ کو عطا ہوا تھا

سیرِ وطن کے حوالے سے دلچسپ تحریر

آپ نے نور محل دیکھا ہے؟ نہیں؟ تو گویا آپ نے کچھ نہیں دیکھا۔ یہ نور محل کئی معنوں میں تاج محل کا ہم پلہ ہے۔ تاج محل اگر محبت کی یادگار ہے تو نور محل بھی محبت کی نشانی ہے۔ تاج محل 1653ء میں شاہ جہاں نے اپنی چہیتی بیگم ممتاز محل کے لیے بنوایا تھا تو یہ محل بھی ایک محبوب نے اپنی چہیتی بیگم کے لیے بنوایا تھا۔ یہ کہیں اور نہیں اپنے پاکستان میں ہی ہے لیکن بہت سے لوگ اس فنِ تعمیر کے شہکار سے ناواقف ہیں۔ یہ محل ہے کہاں اس بارے میں آپ بھی آگاہ ہو جائیں۔

جنوبی پنجاب کا تاریخی شہر ملتان، اس سے آگے بہاولپور کا صحرائے چولستان، وہاں کا خوب صورت علاقہ جو

سیاحتی اہمیت کا حامل ہے۔ ملتان جو اولیاؤں کا شہر کے نام سے پہچان رکھتا ہے، وہیں بہاولپور ریاست کا اپنا ایک منفرد تاریخی مقام ہے۔ ایک خود مختار ریاست کے طور پر بہاولپور کی تاریخ دو سو برس سے زائد عرصے پر محیط ہے۔ قیام پاکستان سے قبل ریاستِ بہاولپور کے امورِ خارجہ، دفاع اور کرنسی برصغیر کے حاکم راجِ برطانیہ کے سپرد تھے جبکہ دیگر معاملات ریاست کے بانی عباسی خاندان کے نواب چلاتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد یہ ریاست پاکستان میں شامل ہوئی۔ اسی ریاست میں واقع ایک محل کا ذکر ہے۔ یہ محل دال ماش اور چاول کی آمیزش والے گارے سے بنا ہے۔ والیِ ریاست نے یہ شاندار محل اپنی جس ملکہ کے لیے بنایا تھا انھوں نے اس میں صرف ایک رات... ... بسر کی اور صبح ہوتے ہی اعلان کر دیا کہ ہم اس محل میں نہیں رہیں گے۔

ایک بہت بڑی لاگت اور کئی سال کی محنت سے بنا یہ محل جو بطور تحفہ ملا تھا اسے ٹھکرانے کی عجیب وغریب توجیح ملکہ نے پیش کی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ پہلی رات ملکہ کے لیے شب زفاف جیسا تھا۔ بادشاہ و ملکہ نے خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولتے ہوئے وہ رات گزاری تھی۔

ملکہ کو سحر خیزی کی عادت تھی۔ اگلی صبح ملکہ ٹہلنے کے لیے محل کی چھت پر گئی تو محل کے باغات سے ملحق ایک قبرستان دیکھا۔ محل کے بالکل عقب میں وہ قبرستان تھا۔ گو کہ اس قبرستان میں گنتی کی قبریں تھیں پھر بھی ملکہ بدک گئی۔ اس نے بادشاہ کو کہا کہ آپ نے میرے لیے قبرستان میں گھر بنوادیا میں یہاں نہیں رہوں گی۔

وسیع وعریض سبزہ زاروں میں کھڑی یہ عمارت مغربی اور اسلامی طرز تعمیر کا ایک خوبصورت امتزاج ہے۔ اس کی آب وتاب اور طمطراق دور ہی سے آپ کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔

بہاولپور کا یہ محل، نور محل کے نام سے مشہور ہے۔ یہ محل زندگی کے تقریباً 150 سال دیکھ چکا ہے۔

ریاست بہاولپور کے نوابوں کے پاس بہت دولت تھی۔ انھوں نے اپنے علاقے کی ترقی کے لیے دل کھول کر اسے استعمال کیا اور ساتھ ساتھ اپنے شایانِ شان محلات بھی تعمیر کروائے۔

ریاست تو نہیں رہی مگر اس کی کہانی سنانے کے لیے نوابوں کی تعمیر کردہ عمارتیں ضرور موجود ہیں۔ یہ ایک شاندار کہانی ہے اور سننے سے زیادہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ جب آپ بہاولپور کا رخ کریں تو آپ کو صرف ’دیکھنے والی آنکھ‘ چاہیے اور کچھ نہیں۔

وکٹوریا اسپتال، لائبریری، میوزیم، ڈرنگ اسٹیڈیم، ایجرٹن کالج جیسی تاریخی عمارتوں سے ہوتے ہوئے اگر آپ نور محل پہنچیں تو آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ریاست کے دور میں بننے والی سہولیات خطے کے اعتبار سے اپنے وقت میں کافی جدید تھیں۔

نور محل نواب صادق محمد خان عباسی چہارم نے سنہ 1872ء میں تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ انھوں نے یہ محل اپنی بیگم کے لیے بنوایا تھا جو تین سال کے عرصے میں مکمل ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ان ہی کے نام سے منسوب ہے۔

تاہم ان کی بیگم نے اس محل میں صرف ایک رات قیام کیا کیونکہ انھیں یہ بات پسند نہیں آئی تھی کہ محل کے قرب میں ہی ایک قبرستان موجود ہے۔ مجھے یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ اگر یہ بات درست ہے کہ صرف قبرستان کی وجہ سے ملکہ نے محل چھوڑا تو یہ نواب صاحب کے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہے۔ مجھے جو سمجھ آتی ہے اس کی بڑی وجہ خوف تھا۔ بچپن ہی سے ہم قبرستانوں کے متعلق خوف ناک کہانیاں سنتے آتے ہیں۔ گھر کے بڑے قبرستانوں کے متعلق ایک عجیب خوف ناک فضا تخلیق کرتے ہیں۔ کہانیوں میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے بچوں کو بدروحیں دکھانا چاہ رہے ہوتے ہیں۔ بچے تو پھر بچے ہوتے ہیں وہ اسی خوف میں بڑے ہو جاتے ہیں۔ مگر جب کوئی اپنا پیارا مرتا ہے تو پھر یہ خوف ایک دم غائب ہو جاتا ہے۔ اب بھلا کسی کا باپ یا ماں قبرستان میں پڑی ہو تو کیسے یقین کر لیا جائے کہ قبرستانوں میں چڑیلیں اور بھوت ہوتے ہیں۔

نور بیگم کے جانے کے بعد یہ محل ویران نہیں ہوا بلکہ نوابوں کے دور میں نور محل میں ریاستی اور سرکاری تقریبات منعقد کی جاتیں۔ ریاست بہاولپور کے آخری تین نواب اسی ہال کے اندر تخت نشین ہوئے تھے۔ یعنی اس میں ان کی دستار بندی کی گئی تھی۔

نواب صادق صاحب تعمیرات کے ماہر تھے، انہوں نے اپنے ذوق کا جگہ جگہ مظاہرہ کیا۔ اسی وجہ سے انہیں بہاولپور کا شاہجہان بھی کہا جاتا ہے۔ نواب صادق محمد خان چہارم نے اپنے وقت میں اس قدر عمارتیں اور محل بنوائے، باغات لگوائے کہ کسی حکمران نے اتنے کام نہیں کیے۔ انہوں نے اپنا پایۂ تخت احمد پور شرقیہ سے بہاولپور منتقل کرنے کا سوچا

اور رہائش کے لیے بہاولپور بسانے کی ٹھان لی۔ رہائش کے لیے محل ضروری تھا اس لیے یہاں ایک محل بنوانے کی تجویز زیرِ غور ہوئی۔ انہوں نے خود شہر بہاولپور کے اندر باہر چکر لگائے، خوب دیکھا بھالا کہ کون سی جگہ مناسب و متناسب ہے، آخر بستی ملوک شاہ کے قریب باون ایکڑ قطعہ اراضی حاصل کی گئی اور نور محل کی بنیاد رکھی گئی۔ بنیاد کا رکھنا بھی کوئی آسان کام نہیں تھا اس کام کے لیے جمعتہ المبارک کا دن مقرر کیا گیا۔ جھولداریاں اور شامیانے لگائے گئے۔ راستے درست کیے گئے خیرات کے لیے دیگیں پکائی گئیں۔ بڑی دھوم دھام ہوئی۔ نواب صاحب بمعہ امراء و وزراء ایک گورا انجینئر مسٹر ہیلسن تمام نقشہ جات لیے تیار کھڑا تھا۔ نواب صاحب کی سواری آتے ہی فوج نے سلامی دی، فوجی بینڈ بجایا گیا اور نواب صاحب نے بعد ملاحظہ موقع رؤسا شہر، علمائے دین، صاحبزادگان کی موجودگی میں بسم اللہ پڑھ کر نور محل کی بنیاد رکھی۔ اس کی بنیاد میں ریاست بہاولپور کے سکوں کی ایک تھیلی، نقشہ جات عمارت و سن تعمیر بحفاظت تمام دفن کردیے تاآنکہ ہزار دو ہزار سال کے بعد حوادث زمانہ سے اگر عمارت موہن جودڑو کے مانند ڈھیر بن جائے تو اس زمانے کے ماہرین آثار قدیمہ کو نور محل کی تلاش میں آسانی پیدا ہو سکے۔

نور محل کی تعمیر 1872ء میں شروع ہوئی تو جا کر 1875ء میں مکمل ہوئی۔ یہ محل 12 لاکھ روپے کی لاگت سے مکمل ہوا جس کا نقشہ مسٹر ہیلسن نے ترتیب دیا۔ محل کو اطالوی طرز میں بنایا گیا جو 44 ہزار 6 سو مربع فٹ تک پھیلا ہوا ہے۔ محل کیا تھا لق و دق صحرا میں بہشت بریں کا ٹکڑا تھا۔ درمیان میں نور محل کی عمارت، چار اطراف درخت ہائے ثمر بار اور قطعات سر سبز و گل ہائے رنگا رنگ کی دلفریبی سے ذوق تمکنت حزیں کارفرما تھا۔

صادق گڑھ پیلس صرف تیس برس پہلے تک رنگ و نور کی ایک بہار تھا لیکن اب ایک اجڑے دیار کا منظر پیش کرتا ہے، محل کے باغات اجڑ چکے ہیں۔

ریاست بہاولپور کے والی نواب صادق محمد خان عباسی ایک ایسی عظیم شخصیت تھے جنہیں حقیقی معنوں میں محسن پاکستان کہا جاسکتا ہے۔

آپ تین سال کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ حج پر تشریف لے گئے۔ واپسی پر آپ کے والد نواب بہاول خان کا انتقال ہوگیا اور والد کے انتقال کے بعد آپ کو نئے والی ریاست کے طور پر مسند نشیں کرنے کا اعلان کیا گیا، لیکن آپ کی کم عمری کے باعث ریاست کے اختیارات آپ کو تفویض نہیں کیے گئے۔

بہاولپور کا حکمران عباسی خاندان پہلے قلعہ دراوڑ میں رہائش پذیر تھا لیکن بہاولپور کے قیام اور سلطنت کی توسیع کے بعد انہوں نے درمیان کا علاقہ یعنی احمد پور شرقیہ ڈیرہ نواب کو اپنی رہائش کے لیے منتخب کیا۔

آپ ایک علم دوست اور ادب پرور شخصیت تھے۔ اس لیے آپ نے ریاست کے انتظامی امور سنبھالتے ہی تعلیمی اصلاحات کا آغاز کردیا۔ آپ نے سب سے پہلے ایک تعلیمی کمیشن قائم کیا اور علما کو ریاست کے تمام تعلیمی اداروں کے لیے وقت کے تقاضوں کے مطابق جدید خطوط پر ایک شان دار نصاب مرتب کرنے کی ذمہ داری سونپی۔ اس کے بعد 1925ء میں آپ نے جامعہ الازہر کی طرز پر ریاست بہاولپور میں جامعہ عباسیہ کی بنیاد رکھی اور 1926ء میں جامعہ عباسیہ کا ایک اور ذیلی ادارہ طبیہ کالج بہاولپور کے نام سے قائم کیا۔ جامعہ عباسیہ وقت کے ساتھ ساتھ ترقی کی منازل طے کرتے کرتے اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور میں تبدیل ہوگیا، جس کا شمار آج پاکستان کی بہترین یونیورسٹیوں میں ہوتا ہے۔

آپ نے تخلیق پاکستان کے وقت مہاجرین کی آباد کاری کے لیے بھی گراں قدر خدمات سرانجام دیں اور حکومت پاکستان کا مہاجرین کی آباد کاری کے لیے بہت ساتھ دیا۔ آپ نے ریاست بہاولپور میں وزارت بحالی مہاجرین قائم کی اور ایک بہت ہی خدا ترس اور غریب پرور شخصیت جناب مخدوم الملک غلام میراں شاہ کو اس کا وزیر مقرر کیا۔ جناب غلام میراں شاہ نے وزیر مہاجرین کے طور پر بے پناہ خدمات سرانجام دیں اور مہاجرین کی آباد کاری اور بحالی کے لیے ہر ممکن قدم اٹھایا۔ غلام میراں شاہ صاحب نے اپنی زمینوں سے سیکڑوں من گندم مہاجرین کے لیے عطیہ کی اور نواب صاحب نے 22 ہزار من گندم کا عطیہ مہاجرین کے لیے پیش کیا۔ اس کے علاوہ آپ نے مہاجرین کی امداد کے لیے امیر بہاولپور فنڈ برائے بحالی مہاجرین بھی قائم کیا جس میں اس وقت ایک خطیر رقم جمع ہوئی جو مہاجرین کی مرحلہ وار بحالی کے لیے خرچ کی گئی۔

نواب صاحب نرم اور خاموش طبیعت کے مالک تھے مگر پیسا خرچ کرنے اور چیزوں پر لگانے میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا آپ کے بارے میں ایک مشہور واقع جو زبان زد عام ہے۔

ایک بار نواب صاحب لندن گئے تو انہیں مشہور مہنگی ترین گاڑی ''رولز رائس'' کا شوروم نظر آیا، وہ اندر گئے، وہاں انہیں ایک گاڑی پسند آ گئی، انہوں نے گاڑی کی قیمت پوچھی، تو سیلز مین نے سادہ اور عام لباس میں ملبوس ایشیائی باشندہ سمجھ کر کہا۔ ''یہ گاڑی امیروں کے لیئے ہے، آپ کی قوتِ خرید سے باہر ہے، آپ یہ نہیں لے سکتے۔'' گویا اس نے ایک طرح سے نواب صاحب کو دھتکار دیا۔ نواب صاحب واپس ہوٹل آئے اور اگلے دن اپنے ملازمین کا ایک جتھا لے کر شاہی ٹھاٹھ باٹ کے ساتھ شوروم پہنچے اور چھ رولز رائس گاڑیاں خرید کر اپنے ملازمین کو حکم دیا کہ ان گاڑیوں کو فوراً بہاول پور پہنچا کر وہاں کی بلدیہ کے حوالے کر کے کہو کہ ان گاڑیوں سے شہر کی سڑکیں صاف کرنے اور کوڑا اٹھانے کا کام لیا جائے۔

نواب صاحب کے حکم پر ایسا ہی کیا گیا، کچھ عرصے بعد یہ بات مشہور ہو گئی کہ رولز رائس گاڑیاں تو شہر کی صفائی پر مامور ہیں۔ اس طرح رولز رائس کمپنی کی کافی جگ ہنسائی ہوئی اور اس کا کاروبار ٹھپ ہونا شروع ہو گیا، بالآخر کمپنی کا مالک خود چل کر بہاول پور نواب صاحب کے پاس آیا اور معذرت کے بعد درخواست کی کہ کمپنی کی گاڑیوں کو صفائی اور کوڑے اٹھانے کے کام سے ہٹا لیا جائے، ساتھ ہی تحفے میں مزید چھ گاڑیاں بھی پیش کیں۔

پاکستان کا وائٹ ہاؤس صادق گڑھ پیلس ریاست بہاولپور کے جاہ وجلال کا منہ بولتا ثبوت ہے جو کہ آج خستہ حالی اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ صادق گڑھ پیلس تھا جس میں اس دور کا بجلی گھر بھی بنایا گیا جو کہ نا صرف محل کو برقی توانائی فراہم کرتا تھا بلکہ سابق ریاست بہاولپور کے دارالحکومت ڈیرہ نواب کو بھی روشن رکھتا تھا۔

صادق گڑھ پیلس چوبیس مربعوں پر مشتمل ہے، اس کی پچاس فٹ اونچی فصیلیں ایک کلومیٹر سے بھی لمبی ہیں جس کے ہر کونے پر فوجی بیرک بھی تعمیر کی گئی تھی۔

محل کی تعمیر اس طرح کی گئی ہے کہ اس میں سورج کی روشنی کے داخل ہونے کے لیے خاص طور پر راستے رکھے گئے ہیں۔ محل کے مرکزی ہال میں نواب کے بیٹھنے کی جگہ دربار کے عین اوپر شیشوں کی دیوار نظر آتی ہے۔

اس میں شیشوں کا استعمال اس طرح کیا گیا ہے کہ عمارت کے ہر کونے میں قدرتی روشنی رہتی۔ اس کا اندازہ اس شیشے سے لگایا جا سکتا ہے جو نواب کے دربار کے عقب میں نصب ہے۔

شام کو غروب ہوتے سورج کی روشنی برآمدے کی محرابوں سے چھنتی محل میں داخل ہوتی ہے۔ صبح سے لے کر شام اور پھر چاند کی راتوں میں بھی نور محل میں روشنی ضرور رہتی ہے۔

ٹھنڈک اور ہوا کے لیے اونچی چھتوں اور روشن دانوں کے علاوہ محل کی بنیادوں میں کچھ سرنگیں بھی ہیں، جن میں اُس دور میں پانی چھوڑا جاتا تھا پانی سے ٹکرا کر ہوا اوپر اٹھتی پھر مخصوص سمتوں پر بنے روشن دانوں سے گزر کے فرش میں نصب جالیوں کے ذریعے محل کے اندر تک پہنچتی تھی۔ یہ ہوا بہت ٹھنڈی ہوتی۔ سرنگیں آج بھی موجود ہیں، البتہ اب ان میں پانی نہیں چھوڑا جاتا، بلکہ ائر کنڈیشنرز لگا دیئے گئے ہیں۔

نور محل کی تعمیر میں مغربی اور اسلامی دونوں طرز کی تعمیرات کا امتزاج ہر جگہ نظر آتا ہے آپ جیسے ہی اس میں داخل ہوں اور نیچے فرش پر دیکھیں، سر اٹھا کر چھت کو دیکھیں تو ان میں بنے نقوش ان دونوں طرزِ تعمیر کی عکاسی کرتے نظر آئیں گے۔

مرکزی دروازے کے سامنے اور محل کے درمیان ایک بارہ دری ہے جس کے اطراف میں کبھی رنگ رنگ کے پھولوں سے مزین لان ہوا کرتے ہوں گے۔ محل کے برآمدے سے سفید سنگ مرمر کی سیڑھیاں پہلی بالکونی کی طرف لے جاتی ہیں۔ آگے سفید سنگ مرمر کا بنا ہوا انتہائی خوبصورت فوارہ ہے اور اس کے آگے مرکزی دربار ہے۔ جس کی شان وشوکت کا اندازہ یہاں ایک بہت بڑے شیشے سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ جس کو نواب صاحب نے خصوصی طور پر انگلینڈ سے منگوایا تھا۔ کہتے ہیں کہ جب یہ آئینہ بحری جہاز سے کراچی کی بندرگاہ پر اتارا گیا تو اسے ریلوے کے ذریعے بہاولپور لایا گیا جس کے لیے کئی پلیٹ فارم چوڑے کرنے پڑ گئے۔ اس شیشے کے آگے شاہی چبوترہ ہے جہاں نواب صاحب اپنے مشیران کے ساتھ بیٹھ کر امور ریاست سرانجام دیا کرتے تھے مگر اب اس چبوترے میں استعمال ہونے والی لکڑیاں بھی اکھڑ رہی ہیں اور اس پر موجود ایرانی قالین گل سڑ چکا ہے۔ اس ہال نما شاہی دربار کی چھت پر کی گئی کندہ کاری اور اس میں کھلنے والی بالکونیوں کی شان وشوکت کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ قدیم روم اور ہندوستانی طرزِ تعمیر کو اس میں یکجا کر دیا گیا ہے۔

مرکزی ہال کے دونوں اطراف رہائشی کمرے تھے ان میں زیادہ تر اب مقفل ہیں۔ ایک کمرا اور اس میں لگا بیڈ اور دیگر فرنیچر سیاحوں کے لیے کھولا گیا ہے۔ محل کے مختلف دالانوں میں ریاست بہاولپور کے دور کی اشیا، لباس، ہتھیار

اور دیگر اشیا رکھی گئی ہیں۔
محل کا فرنیچر برطانیہ، اٹلی، فرانس اور جرمنی وغیرہ سے درآمد کیا گیا تھا۔ یہ فرنیچر آپ کو مرکزی ہال میں بھی ملے گا اور بیڈ روم میں بھی، آج بھی اس کی چمک دمک قائم ہے۔
اس کی چھت کے سامنے والے ایک حصے میں کسی مصور نے ان حالات کی منظر کشی کرنے کی کوشش کی ہے، جب بنو عباس کا خاندان بغداد سے سمندر کے راستے برِصغیر پہنچا اور بہاولپور ریاست قائم کی۔
دیواروں پر تصویروں کی مدد سے نواب سر صادق محمد خان عباسی پنجم اور ان کے دور کی تاریخ آویزاں ہے بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح اور برطانیہ کے شاہی خاندان سمیت دیگر اہم شخصیات کے ساتھ بھی کچھ یادگار تصاویر آویزاں ہیں جب کہ مختلف دیواروں پر تلواریں اور دیگر قدیم اسلحہ بھی قرینے سے سجا کر رکھا گیا ہے۔ محل میں ایک بلیئرڈ روم بھی موجود ہے جس میں اسنوکر کی میز اور ضروری لوازمات آج بھی موجود ہے نور محل کی عمارت میں ایک پیانو بھی رکھا گیا ہے۔ اس کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ یہ نواب صادق محمد خان چہارم جنہیں صبح صادق کا لقب بھی دیا گیا تھا نے جرمنی سے سنہ 1875ء میں درآمد کیا اور اپنی بیگم کو تحفے میں دیا۔ یہ پیانو درحقیقت نواب صادق محمد خان پنجم کا تھا جو اسے بجانا بھی جانتے تھے۔
1906ء میں نواب بہاول خان نے اس محل کے اندر ایک مسجد تعمیر کروائی، جس پر 20 ہزار روپے لاگت آئی۔
نواب صادق محمد خان پنجم سنہ 1935ء میں حج کے لیے سعودی عرب گئے تھے۔ اس سفر کے دوران انہوں نے جو گاڑی استعمال کی وہ بھی آپ کو محل کے باہر کھڑی ملے گی۔
نور محل میں نواب صاحب کے قیام کا زمانہ اگرچہ بہت مختصر تھا، تاہم اس کے باوجود محل میں بہت سی اہم سرکاری تقریبات منعقد ہوئیں۔ یہیں نواب بہاول خان کی دستار بندی کے علاوہ نومبر 1903ء کو وائسرائے اور گورنر جنرل ہند، لارڈ برن کرزن نے نواب بہاول خان پنجم کو اختیارات تفویض کرنے کا اعلان کیا۔ جس میں ہندوستان کی اہم شخصیات کے علاوہ 100 سے زائد برطانوی افسران نے شرکت کی۔ یہ محل، ریاست کے آخری دور تک بطور سرکاری مہمان خانہ بھی استعمال ہوتا رہا۔
صادق گڑھ پیلس کو دیکھنے کے لیے ملک کے کونے کونے سے لوگ آتے ہیں جو کہ اس عظیم الشان محل کی موجودہ حالت زار کو دیکھ کر افسوس کیے بنا نہیں رہ سکتے۔
صادق گڑھ پیلس کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ پاکستان بننے کے بعد نواب آف بہاولپور کی دعوت پر قائداعظم محمد علی جناح یہاں آئے تھے۔ اس کے علاوہ دیگر کئی ملکوں کے سربراہان اس محل میں قیام کر چکے ہیں۔
صادق گڑھ پیلس کو دیکھنے آئے سیاحوں کا کہنا ہے کہ اگر اس پیلس کو اس کی اصلی حالت میں بحال کر دیا جائے تو یہ پاکستان کا بہترین سیاحتی مرکز بن سکتا ہے۔
تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھیں تو نظر آتا ہے کہ پنڈت نہرو لندن میں ریاست بہاول پور کے امیر نواب صادق خان عباسی کو ہندوستان میں شمولیت پر اکساتے ہوئے اقتدار اور مراعات کی ترغیب دے رہا ہے۔ مؤرخ سانس روکے نواب آف بہاول پور کے فیصلے کا منتظر ہے۔ ایک طرف ذاتی مفاد ہے اور دوسری طرف عوام کی خواہش۔ نواب صاحب ذاتی مفاد کو پس پشت ڈال کر مذہبی رشتے اور عوامی رائے کو ترجیح دیتے ہوئے پاکستان میں شمولیت کا اعلان کرتے ہیں۔ مؤرخ نے ان کی عظمت کو سلام پیش کیا اور تاریخ کے اوراق پر ان لمحات کو محفوظ کر لیا۔
چڑیا گھر بہاولپور کا واقعہ تو آج بھی بہاولپور کے لوگوں کو اچھی طرح یاد ہے۔ 1964ء میں ایک شیر چڑیا گھر میں موجود اپنے پنجرے سے باہر نکل گیا، شیر کے نکلتے ہی شہر میں خوف و ہراس پھیل گیا اور لوگ اپنے گھروں میں بند ہو گئے۔ اس واقعے کی اطلاع نواب سر صادق محمد خان عباسی کو اُن کے محل صادق گڑھ پیلس ڈیرہ نواب صاحب تک پہنچائی گئی، تو وہ فوراً اپنی کار میں سوار ہو کر بہاولپور پہنچ گئے۔
وہ بہاول پور شہر سے دریائے ستلج کی طرف روانہ ہوئے تو دور سے دیکھا کہ شیر ستلج کی طرف سڑک پر چلا جا رہا تھا، کار کی آواز سن کر شیر نے مڑ کر دیکھا، نواب صاحب گاڑی سے نیچے اترے، اسے آواز دے کر سرائیکی زبان میں کہا کہ 'تجھے شرم نہیں آتی، اپنے مالک سے اجازت لیے بغیر ہی چوروں کی طرح بھاگ کر جا رہا ہے۔' شیر واپس مڑا اور وہیں رک گیا۔ نواب صاحب شیر کے پاس چلے گئے شیر نے اپنا سر ان کے قدموں پر رکھ دیا۔ نواب صاحب اسے پکڑ کر واپس چڑیا گھر لے آئے اور دوبارہ پنجرے میں بند کر دیا۔ نواب صادق عباسی کو چرند و پرند سے بہت محبت تھی اور وہ وقتاً فوقتاً چڑیا گھر تشریف لاتے رہتے تھے۔

++

روئے ارض پر ازل ہی سے مقدس ترین پیشہ 'معلمی' ٹھہرا۔ حضرت آدمؑ کو علم ہی کی بناء پر فرشتوں پر فضیلت ملی۔ انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ نصیب ہوا اور ہمارے نبی کریم ﷺ نے یہ فرما کر اس پیشے پر دائمی شرف ثبت کر دیا کہ ''انما بعثت معلما'' (بے شک مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے)

تاریخ میں ان گنت بہترین اساتذہ کا ذکر ملتا ہے لیکن وہ تو خیر ماضی کی بات تھی۔ موجودہ وقت میں مادیت

چارہ گر

ابراهیم عبدالهادی

معلمی ایک مقدس پیشہ ہے۔ معلم پر ذمّے داری ہوتی ہے کہ وہ طلبا کی زندگی سنوار دے۔ کچھ معلم ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس پیشے کو عبادت سمجھ لیتے ہیں۔ ایسا ہی وہ شخص تھا، اس کے طریقۂ تعلیم نے اسے ممتاز بنادیا، عالمی شہرت کا حامل کہلایا۔

ایک مشہور معلم کا تذکرہ

پرستی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ یہ مقدس پیشہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔اس کے باوجود آج بھی کئی ایسے افراد موجود ہیں جو رنگ ونسل اور سود وزیاں سے مبرا ہو کر اپنے پیشہ وارانہ فرائض نہایت ایمانداری اور خلوص سے نبھا رہے ہیں۔سرگزشت ڈائجسٹ کے انہی اوراق میں قارئین ایسے چند کرداروں سے متعارف ہو چکے ہیں۔آصفہ عقیلی، حنان الحروب، اینڈریا جیسے افراد کی داستان حیات اور جدوجہد قارئین کی نذر ہوئی ہے۔ان کی خدمات کے عوض انہیں عالمی طور پر بہترین معلم کا خطاب بھی ملا۔خوش آئند بات یہ ہے کہ خلوص و لگن کا یہ سلسلہ ہنوز دنیا کے ہر خطے میں کسی نہ کسی طور جاری ہے۔اس تحریر میں بھی ایسے ہی چند کرداروں کی داستان سموئی ہے۔

پیٹر 1982 میں براعظم افریقا کے ملک کینیا میں 'ناکورو کاؤنٹی' میں پیدا ہوا۔ناکورو کینیا کا تیسرا بڑا گنجان آباد علاقہ ہے تاہم دیگر علاقوں کی طرح یہاں بھی غربت' پسماندگی اور افلاس نے ہر سو ڈیرے جمار کھے ہیں۔

پیٹر نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے اردگرد انہی عوامل کو رقصاں دیکھا۔علاقے میں ہر سو مسائل کا غلبہ تھا۔یہ مسائل اگر صرف معاشی ہوتے تو کسی نہ کسی طور ان سے نمٹ لیا جاتا لیکن وہاں تو قبائلی خونریزی بھی عام تھی۔شعور کی وادی میں قدم رکھنے کے بعد پیٹر کو اپنے خاندان اور علاقے کے دیگر افراد میں نمایاں تفاوت محسوس ہونے لگا۔اس کے والد 'لارنس ٹابیچی' کے علاوہ کئی رشتہ دار شعبہ تدریس سے منسلک تھے۔ان سبھی نے اپنے خاندان کے بچوں کی پڑھائی پر مکمل توجہ مرکوز رکھی تھی۔آغاز میں پیٹر نے قدرے سست روی سے پڑھائی کی مسافت اختیار کی لیکن پھر ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے اس کی مسافت مہمیز تر کر دی۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ ایک روز علاقے کا بااثر ترین شخص لارنس سے ملاقات کے لیے چلا آیا۔پیٹر بھی اتفاق سے اس وقت وہیں موجود تھا۔

''کہیے کیسے آنا ہوا جوزف صاحب؟'' لارنس نے قدرے خوش خلقی سے دریافت کیا۔

''بس آپ کی یاد یہاں کھینچ لائی ہے۔'' جوابی طور پر جوزف نے بھی اسی خوش خلقی کا مظاہرہ کیا۔

''یونہی تو نہیں آئی ہوگی یاد۔کوئی نہ کوئی وجہ بھی ضرور رہی ہوگی۔'' لارنس نے لطیف طنز کیا۔

پیٹر کو لحہ بھر کے لیے محسوس ہوا کہ جوزف کہیں اس بات کا برا ہی نہ منالے لیکن حیران کن طور پر جوزف کی پیشانی بے شکن ہی رہی۔

''جی ہاں! وہ میں دراصل شون کے متعلق بات کرنا چاہتا تھا۔'' جوزف نے اپنے بارہ سالہ بیٹے کا ذکر کیا۔

''شون کے بارے میں ایسی کیا بات کرنی ہے؟'' لارنس نے دانستہ طور پر بے نیازی جتائی۔

شون اس کے اسکول میں درمیانے درجے سے بھی کمتر طالب علم تھا۔اس کی توجہ زیادہ تر شرارتوں اور تخریبی سرگرمیوں کی جانب مائل تھی۔

''اس کے پرچے کچھ اچھے نہیں ہوئے۔'' جوزف ہچکچا کر بولا۔

''تو یہ کون سی نئی بات ہے؟ وہ ہمیشہ ہی پرچوں میں غیر سنجیدگی کا مظاہرہ کرتا ہے۔اس بار تو نتائج آپ کے تصور سے بھی زیادہ خراب سامنے آئیں گے۔'' لارنس نے دوٹوک جواب دیا۔

جوزف کا چہرہ متغیر ہونے لگا۔پیٹر اتنا تو سمجھ ہی گیا تھا کہ شون کے فیل ہو جانے کی صورت میں جوزف کے شخصی وقار اور علاقے بھر میں قائم دبدبہ پر خاصہ اثر پڑے گا۔

''ہم کوئی درمیانی راہ نہیں نکال سکتے۔ اگر اسے رازداری سے پرچے دوبارہ دلوا دیئے جائیں۔میں اس کام کے لیے آپ کی ہر خدمت کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' جوزف نے ملتجی انداز میں کہا۔

پیٹر اس کا ہر ایک انداز دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔اسے اس لحہ والد کی اہمیت و وقار بھرپور انداز میں محسوس ہو رہا تھا۔

''شون ریس کا وہ گھوڑا ہے جو اکیلا بھی دوڑے تو منزل پر پہنچنے میں مدتوں صرف کر دے۔دوسری بات یہ کہ میں اس طرح غیر اخلاقی اور غیر قانونی کام کر کے اپنے پیشے سے خیانت نہیں کر سکتا۔''

لارنس کی اس بات کے بعد جوزف سے ایک طویل بحث کا آغاز ہو گیا۔لارنس کسی بھی صورت اپنے مؤقف سے پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھا۔اس بحث کا انجام یہ ہوا کہ جوزف نے لارنس کو آیندہ برس کے لیے شون پر سختی کرنے کی بھرپور اجازت دے دی تا کہ وہ خاطر خواہ انداز میں کامیاب ہو سکے۔وہ ایک انقلابی لحہ تھا۔علاقے کی ایک معزز شخصیت کو اپنے والد کے سامنے یوں دست بستہ

دیکھ کر پیٹر کے دل میں پہلی بار ان کی حقیقی عظمت اور وقار کا احساس پیدا ہوا اور اسی پل اس نے بھی مستقبل میں یہی پیشہ اختیار کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

اس کے بعد پیٹر نے نہایت دلجمعی سے پڑھائی کا آغاز کردیا۔ اس کی ذہنی سطح بے حد مختلف تھی۔ وہ فراغت کے اوقات میں جب کھیل کود کے لیے باہر جاتا تو اس وقت بھی ذہن میں مختلف خیالات ہی گردش کررہے ہوتے۔ اپنے علاقے کی صورتِ حال دیکھ کر دل میں بارہا یہ احساس پیدا ہوتا کہ یہاں حقیقی تبدیلی لانے کا ذریعہ صرف اور صرف تعلیم ہی ہے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے تعلیمی اداروں میں طالبات کی کم تعداد پر بھی خاصہ تشویش زدہ رہتا۔ پندرہ برس کی عمر تک پہنچتے وہ اس حقیقت سے تو بخوبی آشنا ہوچکا تھا کہ حقیقی ترقی اور کامیابی حاصل کرنے کے لیے ان لڑکیوں کی تعلیم بھی بہت ضروری ہے کیونکہ تعلیم سے محرومی کے بعد انہیں کم عمری میں ہی شادی کے بندھن میں باندھ دیا جاتا تھا۔ اکثریت کے ساتھ تو ایسا بھی ہوتا کہ وہ اگلے چند برسوں میں ہی مختلف جسمانی عوارض کا شکار ہوکر اپنی زندگی سے محروم ہوجاتیں۔

اس ذہنی کشمکش اور حساس سوچوں کا بار اٹھائے پیٹر نے اپنا ہر تعلیمی پڑاؤ نہایت کامیابی سے عبور کیا اور اپنے علاقہ سے جنوب مغرب میں تقریباً پچیس کلومیٹر کی مسافت پر واقع ایک سرکاری ادارہ 'ایگرٹن یونیورسٹی' میں داخلہ لے لیا۔ اس وقت تک پیٹر کا جھکاؤ 'فرانسسکن فریئرز' کی جانب ہوچکا تھا۔ فرانسسکنز بنیادی طور پر کیتھولک چرچ کے اندر متعلقہ منڈیکنٹ عیسائی مذہبی احکامات کا ایک گروپ ہے جو 1209 میں قائم کیا گیا۔ یہ افراد روحانی احکامات کی پابندی کرتے ہیں۔ یہ پرانے خانقاہی احکامات کی وفاداری سے لے کر ان کے استحکام کے عہد کے ذریعے باقاعدہ طور پر ایک خانقاہ سے بیعت کرتے ہیں۔ فریئرز راہبوں سے اس لحاظ سے مختلف ہیں کہ انہیں انجیلی مشوروں (غربت' عفت اور فرمانبرداری کی قسمیں) کو معاشرے کی خدمت میں گذارنے کے لیے بلایا جاتا ہے۔ ان کا دائرہ عمل محض بندگی اور عقیدت نہیں ہوا کرتا۔ فریئرز ایک وسیع تر جغرافیائی علاقے میں پھیلی ہوئی کمیونٹی سے وابستگی رکھتے ہیں جسے صوبے کے نام سے جانا جاتا ہے۔

پڑھائی سے فراغت ملتے ہی اس نے وقت کا ذرا بھی ضیاع کیے بغیر ایک نجی اسکول میں ریاضی اور طبیعات کی تدریس کا آغاز کردیا۔ اسے کوئی مخصوص انداز تدریس اختیار کرنے یا طلبہ کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے کرتلاشنے کا بالکل بھی تناؤ نہیں تھا۔ یہ سب تو گویا اس کی 'جینز' میں شامل تھا۔ اس پر مستزاد نرم خوئی' متانت' ٹھہراؤ اور پُراعتماد لب ولہجے نے کامیابی کا پہلا در بہ آسانی وا کردیا۔

بہترین سہولیات اور مختلف آسائشوں کے حامل اس اسکول میں پیٹر نے اپنی صلاحیتوں اور محبت سے طلبہ کو ہی نہیں بلکہ انتظامیہ کو بھی اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ تدریسی سفر نہایت کامیابی سے رواں ہوگیا۔ وہ دن بھر اسکول میں طلبہ کے ساتھ مصروف رہتا۔ بعدازاں انہیں مزید مؤثر انداز میں پڑھانے کے لیے اپنے اسباق ایک بار خود بھی دہراتا۔

رات کو تھکا ہوا بدن لیے جب وہ بستر پر لیٹتا تو ذہن میں ایک خلش سی بیدار ہوجاتی۔ یہ خلش درحقیقت اپنے اہلِ علاقہ میں سے ان غریب بچوں کی دید سے پیدا ہوتی تھی جن کے پاس پڑھائی جاری رکھنے کے لیے وسائل ہی نہیں تھے۔ لڑکے دن بھر گلی کوچوں میں آوارہ گردی کرتے اور کم عمری میں ہی جرائم کی راہیں اختیار کرلیتے۔ لڑکیاں جنسی استحصال کا نشانہ بن جاتیں یا بے جوڑ شادیوں کے بندھن میں بندھ کر اپنی زندگیوں سے محروم ہوجایا کرتیں۔

دھیرے دھیرے یہ خلش جب آزار بننے لگی تو پیٹر نے اسکول سے استعفیٰ دے دیا۔ اسکول پرنسپل نے اپنے اس بہترین کارکن کو ادارے کے ساتھ نتھی رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن پیٹر کے دل و دماغ میں ایک ہی سودا سما چکا تھا۔ وہ اپنے ہم وطنوں کے لیے 'چارہ گر' بننا چاہتا تھا۔ اس نے ہر ترغیب کا جال توڑتے ہوئے 2016 میں 'کیریکو مکسڈ ڈے سیکنڈری اسکول' میں شمولیت اختیار کرلی۔ یہ ادارہ 'رفٹ ویلی صوبہ' میں واقع تھا۔ یوگنڈا کی سرحد سے متصل کینیا کا رفٹ ویلی صوبہ اقتصادی لحاظ سے اہم ترین صوبوں میں ایک ہونے کے باوجود تعلیمی میدان میں خاطر خواہ کامیابیاں سمیٹنے سے قاصر تھا۔

یہ ملازمت اس کی صلاحیتوں' ہمت اور عزم کا ایک نیا امتحان ثابت ہوئی۔ اسکول کے طلبہ اپنی پیدائش کے روزِ اوّل سے ہی مختلف مسائل کا شکار تھے۔ ان طلبہ میں پچانوے فیصد شدید غربت کا شکار تھے جبکہ بقیہ ماندہ تناسب میں سے کچھ والدین سے محروم اور کچھ ماں یا باپ کسی ایک سے محروم تھے۔ ان محرومیوں اور افلاس نے ان کی ذہنی

صلاحیتیں بری طرح شکستہ کر رکھی تھیں۔ وہ کم عمری میں ہی منشیات کی علت میں مبتلا ہو جاتے۔ نہایت کم سن لڑکیاں جنسی استحصال کے نتیجے میں اولاد کو جنم دینے لگیں۔ اس کے علاوہ کم عمری میں شادی بھی اسکول چھوڑ دینے کا سبب بن جاتی۔

ان مسائل کے علاوہ ایک اور اہم پہلو یہ بھی تھا کہ اسکول بہت دور دراز علاقہ میں تھا۔ طلبہ اپنی غربت کے باعث معمولی سے معمولی ترین سواری حاصل کرنے سے بھی قاصر تھے۔ کئی ایک کمرۂ جماعت میں بے طرح اونگھتے اور شدید نقاہت کا شکار نظر آتے۔ استفسار پر علم ہوتا کہ وہ گزشتہ رات سے فاقہ میں مبتلا ہیں۔ والدین کے پاس انہیں ناشتا فراہم کرنے کے وسائل ہی کہاں تھے۔

پیٹر کا دل دکھ سے لبریز ہو جاتا۔ بھوک جیسی جبلی ضرورت سے لڑتے وہ طلبہ پڑھائی کی طرف کبھی بھی راغب نہیں ہو سکتے تھے۔ اس نے سوچ بچار کے بعد اپنے ذاتی اخراجات سے اسکول کینٹین میں روزانہ طعام کی فراہمی کا بندوبست کروایا تاکہ طلبہ پیٹ بھر کر کھانا کھا سکیں۔ اسے علاقے کی جغرافیائی حالت سے بخوبی آگاہی تھی۔ یہ اسکول نیم بنجر 'پوانی' گاؤں میں واقع اور قحط و خشک سالی سے متاثر تھا۔

کچھ وقت اور گزرا تو اس نے اپنی تنخواہ کا ایک مخصوص حصہ ان طلبہ کو بطور عطیہ دینا شروع کر دیا۔ طلبہ کی ضروریات پوری کر کے اسے دلی و روحانی طور پر بہت سکون میسر آتا تھا۔ یہ طلبہ اسکول میں بھی سہولیات کی شدید کمی کا شکار تھے۔ کمپیوٹر کی تعلیم کے لیے سہولیات تشویش ناک حد تک کم تھیں۔ انٹرنیٹ کی سہولت آئے روز تعطل کا شکار رہتی۔ ایک کمپیوٹر پر ایک استاد تقریباً اٹھاون بچوں کو پڑھانے پر مجبور ہوتا۔ کمپیوٹر بھی سال خوردہ تھے۔

اس کے بعد پیٹر طلبہ کی انفرادی فلاح و بہبود کی جانب متوجہ ہو گیا۔ طلبہ اس کی جادوئی شخصیت اور سحر انگیز گفتگو سے متاثر ہو کر باقاعدگی سے اسکول آنے لگے۔ مختصر عرصہ میں ہی طلبہ کی حاضری کا تناسب گزشتہ تین سال کی نسبت 'چار سو' کی مجموعی تعداد تک جا پہنچی۔ طلبہ کا درشت رویہ اساتذہ سے بدگوئی اور باہمی جھگڑوں میں بھی حیران کن حد تک تبدیلی آئی۔ اسکول کے اعداد و شمار کے مطابق ایک ہفتے میں 'تیس' سے بھی زائد رپورٹ ہونے والے یہ واقعات تنزلی کا شکار ہوتے ہوتے محض 'تین' عدد رہ گئے۔

طلبہ کی حاضری اور برتاؤ میں بہتری کے بعد پیٹر اپنے ایک اور دیرینہ خواب کی جانب متوجہ ہوا۔ وہ علاقے میں لڑکیوں کی تعلیم میں انقلاب پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اس نے Talent Nurturing Club اور Science Club کی بنیاد رکھ کر انہیں ذاتی کوششوں اور اخراجات سے پروان چڑھایا۔ پیٹر کی لگن ایک بار پھر رنگ لائی اور قلیل دورانیہ میں ہی اسکول میں لڑکوں اور لڑکیوں کی تعداد یکساں ہو گئی۔ ان طلبہ نے بھی اپنے 'چارہ گر' کی خدمات کا بھرپور صلہ ادا کیا۔ انہوں نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا جس کی مدد سے بصارت اور سماعت سے محروم افراد بھی قابل تجدید توانائی کے آلات استعمال کر سکتے تھے۔ اس کامیابی کے بعد ان طلبہ نے 'رائل سوسائٹی آف کیمسٹری' کی جانب سے نباتات سے بجلی پیدا کرنے پر ایک خصوصی انعام اور عالمی شہرت حاصل کی۔ 'انٹیل انٹرنیشنل سائنس اور انجینئرنگ میلے' کے فائنل تک رسائی حاصل کی۔ محبت و شفقت سے مغلوب ہو کر پیٹر اپنے طلبہ سے کہنے لگا۔

''مجھے آپ لوگوں کی ہمت 'محنت اور لگن پر فخر ہے میرے بچو! ہمارے پاس سہولیات کی شدید کمی ہے تو کیا ہوا۔ ہم ذہانت 'محنت اور لگن کی دولت سے تو مالا مال ہیں ناں! ہمیں اسی دولت کے ذریعے کینیا کو عالمی سطح پر وہ عزت اور مقام دلوانا ہے جس کا وہ اصل حقدار ہے۔ ہمارا ملک محنت و ذہانت میں کسی سے کم نہیں ہے اور ہم یہ بات ثابت کر کے رہیں گے۔''

پیٹر کے ان الفاظ و انداز نے ان طلبہ میں محنت کی ایک تحریک پیدا کر دی۔ اگلے چند برسوں میں ہی یونیورسٹی جانے والے طلبہ کی تعداد دگنا ہو چکی تھی۔

طلبہ کی ان کامیابیوں کے ساتھ پیٹر بھی ذاتی سطح پر اپنی کاوشیں جاری رکھے ہوئے تھا۔ اس نے مقامی افراد کو قحط سے نمٹنے اور سائنسی انداز میں خوراک اگانے کے طریقے سکھائے جس کے بعد علاقہ بھر میں سینکڑوں اموات کا سبب بن جانے والی اس قحط سالی میں نمایاں کمی آئی۔

خوراک کے مسئلہ سے قدرے آسودگی میسر آئی تو پیٹر نے اس علاقہ کے اہم اور خونخوار ترین پہلو کی اصلاح شروع کر دی۔ کینیا کا یہ علاقہ ناکورو 2007 سے قبائلی تصادم کا شکار تھا۔ صدارتی انتخابات کے دوران تو یہ تصادم کئی سو افراد کی ہلاکت کا سبب بن چکا تھا۔ پیٹر نے اپنی ذاتی کوششوں

مراسلات:

☆ گلوبل ٹیچر پرائز 'ورکی فاؤنڈیشن' کی جانب سے شعبہ تدریس میں نمایاں خدمات انجام دینے والے معلم کے لیے سالانہ ایک ملین کا ایوارڈ ہے۔ مخصوص معیار پر پورا اترنے والے اساتذہ کی نامزدگی دنیا بھر کے عوام کے لیے کھلی ہوتی ہے۔ اساتذہ ذاتی طور پر بھی خود کو نامزد کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد عالمی ٹیچر پرائز اکیڈمی کی طرف سے فائنل فیصلہ کیا جاتا ہے جس میں ہیڈ ٹیچرز' ماہرین تعلیم' مبصرین' صحافی' سرکاری حکام' ٹیک انٹرپرینیورز' کمپنی ڈائریکٹرز اور دنیا بھر کے سائنسدان شامل ہوتے ہیں۔

☆ گلوبل ٹیچر پرائز کو شعبہ تدریس کا 'نوبیل انعام' بھی کہا جاتا ہے۔

☆ ورکی فاؤنڈیشن کے سربراہ کا کہنا ہے۔

''ہم اساتذہ کو ستاروں کے طور پر فروغ دینا چاہتے ہیں۔ انسانی زندگیوں پر اساتذہ کے مثبت اثرات کو اجاگر کرنے کے لیے تعلیمی معیار کی حمایت ہمارا اوّلین مقصد ہے۔ تدریس عالمی طور پر اہم ترین پیشہ ہے۔ اساتذہ کو ان کی صلاحیتوں کے مطابق مناسب احترام دے کر ہی یہ کائنات پُرامن اور پُرسکون بنائی جا سکتی ہے۔''

سے علاقے میں 'پیس (امن) کلب' کھولا۔ مقامی افراد کو مذہبی اور روحانی تعلیمات سے روشناس کروا کے ان کے انتقامی جذبات سرد کیے۔ اسکول میں پڑھنے والے سات مختلف قبائل کے بچے خصّص پیٹر کی کوششوں سے اپنی خونریزی بھول کر باہم شیر و شکر ہو کر رہنے لگے۔

اپنی آمدن کا اسّی فیصد حصہ طلبہ کی بہبود کے لیے خرچ کرنے والے پیٹر کو اندازہ ہی نہ ہوا کہ اس کے احباب اور طلبہ نے 'گلوبل ٹیچرز پرائز' کے لیے اس کی نامزدگی کروادی ہے۔

''خوامخواہ وقت ضائع کر رہے ہو بھئی! اس مقابلے میں دنیا بھر سے ہزاروں اساتذہ اپنی نامزدگی کی درخواست بھیجتے ہیں۔ وہ یقیناً بہت محنتی اور قابل بھی ہوتے ہیں۔ ان کے تناظر سے دیکھا جائے تو میں نے کیا تیر مار لیا ہے؟ میں نے تو ابھی اپنے خوابوں اور ارادوں کا عشرِعشیر بھی حاصل نہیں کیا۔'' اس نے احباب کو سمجھانا چاہا۔

''یہ تو اپنے طلبہ و طالبات سے پوچھ کر دیکھو بھئی!'' ایک دوست نے اسی کے انداز میں جواب دیا۔ ''تم مانو یا نہ مانو لیکن حقیقت یہی ہے کہ تم نے کینیا کے اس پسماندہ علاقے میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ تمہاری کوششوں اور لگن نے طلبہ کو عالمی شناخت دی ہے۔''

''اتنی سی کوششوں سے کیا ہو جاتا ہے؟ میں نے گلوبل ٹیچرز پرائز کا گذشتہ تمام ریکارڈ اور فاتحین کا مکمل تعارف پڑھا ہے۔ وہ اپنی ذات میں ایک مکمل جہان تھے۔ میں تو ان کا عشرِعشیر بھی نہیں ہوں۔'' وہ صاف گوئی سے کہنے لگا۔

''تم جو بھی کہتے رہو۔ ہمیں بہرحال تمہاری لگن اور کاوشوں پر مکمل بھروسا ہے۔ خداوند تمہیں اس کا اجر ضرور دے گا۔'' دوسرا دوست کہنے لگا۔

پیٹر متانت سے مسکرا کر خاموش ہو گیا۔ کچھ ہی عرصہ بعد اسے خوشگوار حیرت کا جھٹکا تو اس وقت لگا جب 'ورکی فاؤنڈیشن' کی جانب سے اس کی نامزدگی قبول کرتے ہوئے پہلے پچاس بہترین اساتذہ اور 'ٹاپ ٹین' میں شامل کر کے اسے متحدہ عرب امارات مدعو کر لیا۔ پیٹر کو یہ سبھی معاملات خواب کا سا تاثر دے رہے تھے۔ کینیا کے بین الاقوامی ہوائی اڈّے سے ہوائی جہاز کا پہلا سفر اس کے لیے زندگی کا انوکھا ترین تجربہ تھا۔

''خداوند! مجھے اتنی ہمت ضرور دینا کہ میں اپنے ہر طالب علم کو ایسی ہی بلندیوں پر لے جانے میں کامیاب ہو سکوں۔ مجھے اتنی ہمت اور وسائل دینا کہ میری قوم کے یہ بچے صنعت و حرفت میں خود کفیل ہو سکیں۔ میرا ملک عالمی سطح پر اپنی تابناک شناخت برقرار رکھ سکے۔''

وہ لمحہ شاید قبولیت کا ہی تھا۔ پیٹر کے اس سفر کا اختتام دبئی کے ایک عالی شان ہوٹل میں ہوا۔ پیٹر خاموشی اور وقار سے ہر ایک شے کا جائزہ لیتا رہا۔ اس نے مقابلہ کے باقی نو افراد سے بھی خوش خلقی سے ملاقات کی۔ وہ سبھی اپنے شعبہ سے مخلص اور ڈھیروں ڈھیر کارنامے انجام دے چکے تھے۔

مقابلہ کا روز پیٹر کے لیے خاص کٹھن تھا۔ تناؤ اور

سنسنی ذہن سے جھٹکتے رہنے کے باوجود دل ودماغ عجیب بوجھل کیفیات کا شکار تھے۔ وہ زیرِلب مناجات پڑھتا اپنی اور قوم کی بہتری کے لیے دعائیں مانگتا رہا۔ اس کا ذہنی ارتکاز دیگر شرکاء کی جانب سے ہٹ چکا تھا۔ دبئی کے اس عالی شان مقام پر بیٹھے وہ اپنے وطن کی کچی پکی گلیاں' وسائل سے عاری سرکاری تعلیمی ادارے اور کسی خاک کی طرح راہوں میں بھٹکتے وہ بچے یاد کرتا رہا جو بنیادی سہولیات سے محرومی کے باعث اسکول پڑھنے سے قاصر تھے۔

وقت کسی بھاری سل کی طرح سرکتا رہا۔ میزبان 'ہیو جیک مین' نے مسکراتے ہوئے اپنے ہاتھ میں پکڑے کارڈ پر نگاہ دوڑائی اور کھنکتی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔

''خواتین وحضرات! 2019 کے بہترین عالمی معلم کا اعلان کرتے ہوئے میں نہایت خوشی اور سنسنی محسوس کر رہا ہے۔ اس سال ایوارڈ کا حقدار......'' جیک مین اتنا کہہ کر ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے خاموش ہوگیا۔

پیٹر کا دل گویا کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ بھورے مخصوص لباس میں اسے اپنے بدن کا ہر مسام پسینا اگلتا محسوس ہونے لگا۔ سماعت میں اب ہیو جیک مین کے بقیہ الفاظ گونجنے لگے۔

''ایوارڈ کا حقدار 'پیٹر تابیچی' کو ٹھہرایا گیا ہے۔''

کائنات کی گردش اس لمحہ تھم سی گئی۔ سماعت میں شدید سنسناہٹ در آئی تھی۔ پیٹر بے یقینی میں مبتلا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی سماعت نے غلط الفاظ سن لیے ہیں۔ اتنے بہترین اساتذہ کے درمیان اس سیاہ فام' پسماندہ ترین ملک کے معمولی سے رہائشی کا نام کوئی کیسے پکار سکتا ہے؟

''یہ کیفیات صرف لمحاتی تھیں۔ اگلے ہی پل اس کے ساتھ بیٹھے دیگر شرکاء خوشی وجوش سے اس کے پاس آئے اور گرم جوشی سے بغلگیر ہونے لگے۔

''کیا واقعی؟ یہ میدان میں نے مار لیا ہے؟'' اس نے بے یقینی سے خود کلامی کی۔

ہیو جیک مین نے اسے اسٹیج پر آنے کی دعوت دی اور ایک ملین ڈالرز کا انعام جیتنے پر مبارکباد دیتے ہوئے کہنے لگا۔

''پیٹر! آپ کی کہانی افریقا کی کہانی ہے۔ ایک نوجوان برِاعظم جو ہنر سے بھرا ہوا ہے۔ آپ کے طلباء نے دکھایا ہے کہ وہ سائنس' ٹیکنالوجی اور انسانی کوششوں کے تمام شعبوں میں دنیا کے بہترین لوگوں میں مقابلہ کر سکتے ہیں۔''

پیٹر کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو بھر آئے۔ غربت' پسماندگی' افلاس' جرائم اور تعلیمی تنزلی کے شکار کے لیے مشہور اس کے ملک کی ایسی توقیر و پذیرائی پر پیٹر کا رواں رواں شکرانہ ادا کر رہا تھا۔ اس نے مائیک ہاتھ میں لیتے ہوئے ورکی فاؤنڈیشن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہنے لگا۔

''افریقا ایسے سائنس دان' انجینئر' کاروباری افراد پیدا کرے گا جن کے نام ایک دن دنیا کے کونے کونے میں مشہور ہوں گے۔ اس برِاعظم کی لڑکیاں اس کہانی کا بہت بڑا حصہ ہوں گی۔''

آنکھوں میں آنسو اور چہرے پر چمک لیے جب پیٹر نے انعامی ٹرافی تھامی تو ایک لمحہ کے لیے اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس نے کینیا کا مستقبل ایک نئی رفعت پر پہنچانے کی کنجی تھام لی ہے۔ اخباری نمائندوں کے انٹرویو اور مختلف اہم شخصیات سے ملاقاتوں کے دوران وہ ہر پل اپنے وطن واپسی کے لیے تڑپ محسوس کرتا رہا۔ کینیا کے ہوائی اڈے پر اترتے ہی وہ تشکر اور محبت سے مغلوب ہو کر سجدہ ریز ہوا اور زمین کو بوسہ دینے لگا۔

وطن واپسی کے بعد بھی اس کے انٹرویوز اور اہم شخصیات سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ صدرِ مملکت نے بھی اسے شرف باریابی عطا کیا۔ صدر سے کینیا کے تعلیمی امور پر گفتگو کرتے وہ انعامی رقم طلبہ کی بنیادی سہولیات پر خرچ کرنے کے عزم کا اظہار کر چکا تھا۔ اس کے بعد پیٹر کو تنازعات اور بحران میں بچوں کے چیمپئن کا عہدہ بھی نوازا گیا۔ ہر گزرتا دن اس کی مقبولیت اور لگن میں یکساں طور پر اضافہ کر رہا تھا۔

اس شہرت اور نئی رفعت نے پیٹر کو مزید سنجیدہ اور پُرخلوص بنا دیا۔ وہ ہر رات سونے سے قبل آنکھوں میں ڈھیروں خواب سجا لیتا۔ کینیا کی ترقی کے خواب۔ طلبہ کے بہترین مستقبل کے خواب۔ تاریک برِاعظم کو علم کی روشنی سے منور کر دینے کے خواب۔ ان خوابوں کے جگنو آنکھوں میں سجائے وہ اگلی صبح مزید عزم وہمت سے تعبیر کے سفر کا آغاز کر دیتا۔

++

شمارہ اکتوبر 2022ء سے شروع ہونے والا یہ سلسلہ آپ کو بہت زیادہ پسند آئے گا

بقلم خود

منظر امام

ایک ایسا سلسلہ جو خود میں منفرد ہے۔ آپ جن قلمکاروں کی تحریریں پڑھتے ہیں ان کے قلم سے انہی کی سرگزشت۔ ایسے واقعات، سانحات جو آپ کو تحیّر میں ڈال دے۔ زندگی کے پیچ وخم کا تذکرہ، وہ باتیں جو عام طور سے بتائی نہیں جاتیں، جو آپ جاننا چاہتے ہیں۔ اور ایسی تحریریں صرف ''سرگزشت'' میں ہی شائع ہوسکتی ہیں۔ جسے آپ مجلد کراکر رکھنے پر مجبور ہوجائیں گے۔

اس بار معروف کہانی کار، ڈراما نگار منظر امام کی زندگی کے خفیہ گوشے ملاحظہ کریں

دوسرا حصہ

جیسے ہی میں نے دیوار پھلانگی دھپ سے اندر کودا اسی وقت کوئی اور بھی میری طرح دیوار سے کودا تھا۔ وہ سیدھا گھڑونچی پر گرا تھا۔ گھڑا ٹوٹنے کی آواز دور تک سنائی دی تھی۔ اسی کے ساتھ صفیہ نے چور چور کی آواز لگانا شروع کردیا تھا۔ صفیہ کی چیخ وپکار سن کر میرا تو برا حال ہوگیا تھا۔ بہرحال اس وقت ذہن بہت تیزی سے کام کررہا تھا۔ میں جس طرح کوارٹر میں داخل ہوا تھا۔ اس طرح دیوار پھاند کر کوارٹر سے باہر چلا گیا اور گندی گلی سے ہوتے ہوئے میدان کی طرف دوڑ لگادی۔ تماشا یہ تھا کہ وہ دوسرا بھی میرے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ میدان میں آنے کے بعد ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا وہ میرا دوست مبین خان تھا۔

''یار تم؟'' مبین نے حیرت سے پوچھا۔

''اور تم؟''

پھر ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹ پڑے۔ ہمیں صفیہ کی بے باکی اور اس کے عجیب وغریب منصوبے پر حیرت ہورہی تھی۔ اس نے ہم دونوں کو ایک ہی وقت میں اپنے گھر میں بلایا تھا۔ نہ جانے کیوں۔ اس کی یہ حرکت میرے ذہن میں گرہ بنی ہوئی ہے۔ خدا جانے وہ کیا چاہتی تھی۔ اس کے بعد ہم نے کبھی بھول کر بھی اس کی طرف رخ نہیں کیا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ لوگ محلہ چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے تھے۔ خدا جانے اب وہ کہاں ہے، اگر زندہ ہے اور شادی ہوگئی ہے تو اس کے شوہر کا کیا حال ہوتا ہوگا۔

صفیہ ہی کے حوالے سے میں اس کے والد کے کردار کا ایک پہلو دکھانا چاہتا ہوں۔ یہ بھی بہت دلچسپ بات تھی۔ وہ شخص شہر کے بہترین ہوٹلوں میں کھانا کھایا کرتا تھا لیکن

اکیلا نہیں بلکہ اردگرد کے پندرہ بیس بھکاریوں کو بھی اپنے ساتھ ہوٹل لے جاتا۔ ہوٹل والے اس کی اس حرکت پر بہت بجز اغ پا ہوا کرتے تھے لیکن اس بندے کو کسی کی پروا ہی نہیں تھی۔ وہ سارے بھکاریوں کے کھانے کے پیسے میز پر رکھ دیتا تھا۔ ''جب میں سب کی قیمت دے رہا ہوں تو پھر تم لوگ اعتراض کرنے والے کون ہوتے ہو۔''

اس کے بعد اعتراض کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی تھی۔

ملیر ہی میں ہمارے ایک متین صاحب بھی ہوا کرتے تھے۔ ان کی شخصیت بھی بہت عجیب تھی۔ وہ ایک تنہا انسان تھے۔ ان سے میری ملاقات رمضان صدیقی نے کروائی تھی (افسوس اب دونوں ہی مرحوم ہو چکے ہیں۔ متین صاحب کا انتقال بہت پہلے ہوا تھا)

ہماری دلچسپی مشترکہ کچھ یوں تھی کہ ہم تینوں کو ادب کا شوق تھا۔ ہم جب ایک ساتھ ہوتے تو کرشن چندر جی، بیدی اور منٹو وغیرہ کے افسانوں پر گفتگو کرتے رہتے۔ متین صاحب بیمار انسان تھے۔ ان کے سینے پر زخم کا ایک نشان تھا۔ ہر وقت کھانستے بھی رہتے۔ دبلے پتلے خوبصورت سے انسان۔ گفتگو بہت خوبصورت کرتے اسی لیے میں اور رمضان صدیقی تقریباً روزانہ ہی ان کے پاس جایا کرتے تھے۔

ان کا کوارٹر گلی کے درمیان میں تھا۔ جبکہ ان کی گلی کا پہلا مکان بہت خوبصورت بنا ہوا تھا۔ ایک دن متین صاحب نے اس مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''منظر، تمہیں معلوم ہے اس مکان میں میرے دشمن رہا کرتے ہیں۔''

''آپ کے دشمن؟'' میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ آپ کا کون دشمن ہوسکتا ہے؟''

''یہ لوگ ہیں، اور ان سے میری آج کی نہیں بلکہ بہت پرانی دشمنی ہے اور میں نے قسم کھا رکھی ہے کہ جس دن ان کے یہاں کوئی شادی ہوئی اس دن میں انہیں برباد کر کے رکھ دوں گا۔ میں نے ان لوگوں سے جنگ کی پوری تیاریاں کر رکھی ہیں۔''

متین صاحب چونکہ ایک ضدی آدمی تھے۔ مجھ سے بہت بڑے بھی تھے اسی لیے میں انہیں سمجھا نہیں سکتا تھا کہ دیکھیں اس قسم کی جنگ کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ آپ ایک کمزور آدمی ہیں۔ بہرحال میں نے رمضان صدیقی سے اس بات کا جب ذکر کیا تو وہ مجھے ایک قریبی ہوٹل میں لے آئے۔ یہ ہماری عادت تھی۔ جب ہمیں کسی مسئلے پر غور کرنا ہوتا یا کوئی ادبی گفتگو کرنی ہوتی تو ہم ہوٹل میں آ کر بیٹھ جاتے۔ یہ ہوٹل کھوکھرا پار کے بس اسٹینڈ پر تھا۔ یہاں ہم نے اس مسئلے پر بہت دیر تک غور کیا اور ہماری سمجھ میں یہی بات آسکی کہ متین صاحب نے اس جنگ کے لیے یقیناً کوئی اسلحہ وغیرہ خرید لیا ہوگا۔

بہرحال کچھ دنوں کے بعد ہم نے متین صاحب کے دشمن کے مکان کے سامنے ایک شامیانہ لگا دیکھا تو ہم سمجھ گئے کہ آج اس گھر میں شادی ہے۔ فوری طور پر ہمارا دھیان متین صاحب کی طرف چلا گیا۔ وہ یقیناً فیصلہ کن معرکے کے لیے تیار ہو گئے ہوں گے اور ہمیں اس خون خرابے کو روکنا تھا۔ ہم دونوں تقریباً دوڑتے ہوئے متین صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ وہ جنگ کے لیے تیار تھے۔ پورے آنگن میں غصے کے عالم میں ٹہلتے پھر رہے تھے۔ ان کے ایک ہاتھ میں ایک رومال تھا۔ جس میں ایک پتھر بندھا ہوا تھا۔

''بس۔ آج تو یہ لوگ نہیں یا پھر میں نہیں۔'' متین صاحب نے ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ارے۔ جانے دیں متین صاحب۔'' رمضان صدیقی نے انہیں سمجھایا۔ ''آپ ایک پڑھے لکھے انسان ہیں۔ آپ کہاں ان چکروں میں پڑیں گے۔''

بہرحال متین صاحب بہت دیر کے بعد ہماری بات مان کر ٹھنڈے پڑ گئے۔ اس موقع پر میں نے ان سے پوچھا۔ ''متین صاحب آپ نے جو جنگ کی تیاری کی تھی۔ وہ کیا ہے۔''

''یہ رومال۔'' متین صاحب نے وہ رومال دکھایا جس پر پتھر بندھا ہوا تھا۔

بعد میں ان کے گھر سے باہر آ کر رمضان صدیقی نے کہا۔ ''یار یہ بھی عجیب پاگل آدمی ہے۔ تین سال سے جنگ کی تیاری کر رہا ہے اور تیاری کیا ہوئی ہے۔ ایک رومال جس میں ایک پتھر اٹھا کر باندھ لیا ہے۔ حد ہوگئی۔''

تو اس قسم کے لوگ ہوا کرتے تھے۔ جن کی باتیں دلچسپ تھیں اور جن کے کردار دلچسپ تھے۔ افسوس کہ آج کی تیز رفتار زندگی، مشینوں، کمپیوٹر اور موبائل نے آپ لوگوں کو ہم سے جدا کر دیا ہے۔ اب لوگ ایک دوسرے کی خیریت معلوم کرنے کے لیے ایک دوسرے کے پاس نہیں جاتے بلکہ ایک دوسرے کی مالی حالت کا جائزہ لینے کے لیے

جاتے ہیں۔ جس سے جتنا زیادہ فائدہ اس سے اتنی زیادہ دوستی۔ ہم سب کمرشل ہو کر رہ گئے ہیں۔

خیر تو میں اپنے ابتدائی دنوں کی بات بتا رہا تھا۔ یعنی جب والد صاحب زندہ تھے۔ اس قسم کی کہانیوں میں ترتیب بہت مشکل سے پیدا ہوتی ہے۔ واقعات شرمیلی لڑکیوں کی طرح کھڑکیوں سے جھانک جھانک کر شور مچاتے ہیں کہ پہلے ان پر توجہ دی جائے۔ پہلے ان کو بیان کیا جائے۔

تو میں ان صاحب کے گھر رہنے لگا جن کے ساتھ والد صاحب نے گھاٹے کا کاروبار کیا تھا جس کے نتیجے میں ہم سب تباہ ہو کر رہ گئے تھے۔ وہاں رہتے ہوئے میں نے ایک عالم اور ایک کیفیت کا ایسا تجربہ کیا جو ابھی تک ذہن میں پوری توانائی کے ساتھ موجود ہے۔

اس تجربے میں ان صاحب کا یا ان کے گھر والوں کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ بلکہ برابر رہنے والی ایک لڑکی اس تجربے کی محرک تھی۔ اس کا نام یاسمین تھا۔ اس کے دیدہ زیب نقوش آج تک پوری تازگی کے ساتھ مجھے یاد ہیں۔ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی اور شاید میری ہم عمر ہی ہوگی۔ میری طرح ساتویں یا آٹھویں میں پڑھ رہی تھی۔ میں نے اس کے قرب کے چند اتفاقیہ لمحے گزارے اور وہ اتفاق بہت دنوں تک میرا ساتھ دیتا رہا۔

میں ڈرائنگ روم کے فرش پر سویا کرتا تھا۔ برابر میں ایک بڑا سا صوفہ تھا۔ ایک رات یاسمین کے گھر والے کہیں چلے گئے۔ مجھے یاد نہیں کہ کیا صورتِ حال ہوئی تھی۔ بہرحال یاسمین ان ہی صاحب کے یہاں رات گزارنے آ گئی اور اس کو اسی صوفے پر جگہ ملی جس کے برابر فرش پر میں سویا کرتا تھا۔ ہم دونوں بہت دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے تھے۔ معصوم اور کچھ شوخی بھری باتیں۔ ایسی باتیں جو پہلے پہل کی ہیجان اور سنسنی کی ہوا کرتی ہیں۔ جن میں رومان بند دروازے کے پیچھے چھپے ہوئے بھید کی طرح محسوس ہوتا ہے۔ ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر ہمیں نیند آ گئی۔ میری آنکھ اس وقت کھلی جب وہ صوفے سے لڑھک کر میرے اوپر آ گری تھی۔ میں فوراً ہی بے دار ہو گیا تھا لیکن ہم دونوں میں سے کسی نے بھی آواز نہیں نکالی۔ دونوں ہی خاموش رہے تھے پھر وہ مسکرا کر میرے اور قریب ہو گئی۔

بس اس رات کی یہی عنایتیں تھیں لیکن میرے لیے ان کی بہت اہمیت تھی۔ دوسری بار میں نے کسی کو خود سے اتنا قریب محسوس کیا تھا۔ کسی کے لمس سے آشنائی ہوئی تھی اور زندگی کا یہ تجربہ ہمیشہ یاد رہتا ہے۔ تنہائیوں میں اپنا احساس دلاتا رہتا ہے۔

میں ہفتے میں ایک دو دنوں کے لیے ملیر چلا جاتا جہاں دوستوں سے ملاقاتیں ہوا کرتیں۔ فلمیں دیکھی جاتیں اور ایک حیرت آمیز انداز میں ان فلموں کی کہانیاں سنائی جاتیں یا پھر ٹنکی کے ہوٹل جا کر گانے سنے جاتے۔ چائے پی جاتی۔ والد صاحب اس زمانے میں حیات تھے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جایا کرتے تھے۔ ان ہی کے ساتھ دو چار بار حیدرآباد جانے کا اتفاق ہوا۔ جہاں ابونصر صاحب کمشنر ہوا کرتے تھے۔ جن کا ذکر رنگپور کے حوالے سے کر چکا ہوں۔

کھوکھرا پار میں ہماری گلی کے سامنے ایک بہت بڑا میدان تھا جہاں دن بھر دھول اڑتی رہتی۔ ریت ہمارے لیے سب سے بڑی مصیبت تھی۔ دن بہت شدید ہوا کرتے لیکن راتیں بہت خوشگوار ہوتی تھیں۔ گرمیوں میں لوگ چارپائیاں کوارٹروں سے باہر نکال لیتے اور پوری گلی میں لوگ سوئے ہوئے دکھائی دیتے۔ اس وقت ہم دوست ایک تفریح کیا کرتے تھے۔ ہم چپکے سے کسی ایک سوئے ہوئے شخص کے پاس جاتے اور خاموشی سے اس سوئے ہوئے شخص کو چارپائی سمیت اٹھا کر کھلے میدان میں چھوڑ آتے۔ جب صبح وہ بے چارہ بیدار ہوتا تو اپنے آپ کو میدان میں دیکھ کر یقیناً چلاتا ہوا گلی کی طرف دوڑ لگا دیتا۔ وہ یہ سمجھتا کہ شاید یہ حرکت کسی بھوت وغیرہ نے کی ہے۔

اس گلی میں ایک رمضان نام کا آدمی رہا کرتا جو بے چارہ کہیں مزدوری کرتا تھا۔ اس نے اور اس کی بیوی نے ایک عجیب دستور بنا لیا تھا۔ دونوں ہی رات آپس میں جھگڑا کیا کرتے اور لڑتے لڑتے کوارٹر سے باہر نکل آتے۔ دونوں کے درمیان باقاعدہ ہاتھا پائی گلی کے درمیان ہوا کرتی۔ ایک سے ایک گالیاں دی جاتیں۔ ایسی نادر گالیاں جو ہماری معلومات میں اضافے کا سبب بن جاتی تھیں۔ ان گالیوں کا لطف اٹھانے کے لیے میں نے اور مبین خان نے اپنے اپنے حصے میں ایک ذمّے داری لے لی۔ مبین خان کو جب موقع ملتا وہ رمضان کو اس کی بیوی کی طرف سے بھڑکا دیا کرتا۔ اس طرح میں اس کی بیوی کو بھڑکاتا رہتا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ ہر رات عشاء کی نماز کے بعد دونوں کے درمیان جھگڑا شروع ہو جاتا اور ہمیں ایک تفریح ہاتھ آ جاتی۔

برابر والے مکان میں ستار نام کا ایک شخص رہا کرتا جو مزدور تھا لیکن بہت ساتھ دینے والا اور والد صاحب کا بے پناہ احترام کرنے والا...... وہ والد صاحب کو ابا کہا کرتا تھا۔ میرے چھوٹے بھائی نیاز میں ایک عادت یہ تھی کہ وہ ہر ایک کا نام رکھ دیا کرتا تھا اور وہ نام اتنا مشہور ہو جاتا کہ لوگ اس کے اصل نام کو بھول جاتے تھے اور نیاز میاں کے دیئے ہوئے نام سے یاد کیا کرتے۔

یہ ساری تفریح اس وقت ہوتی جب میں دو دنوں کے لیے ملیر آیا کرتا تھا۔ اس زمانے میں یہ اعلان ہوا کہ دو مہینوں کے بعد ہندوستانی فلمیں سینماؤں میں نہیں دکھائی جائیں گی پھر میں نے اور مبین خان نے یہ فیصلہ کرلیا کہ پابندی تو دو ماہ کے بعد لگنے والی ہے تو کیوں نہ ہم ابھی سے ہندوستانی فلمیں دیکھنا ترک کر دیں کیونکہ ہم اپنے آپ کو مکمل پاکستانی محسوس کرتے تھے۔

اب آپ اس جذبے کو کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ حب الوطنی معصومیت کی وجہ سے ہوتی ہے۔ یہ ایک فطری اور والہانہ جذبہ ہوا کرتا ہے۔ اس کو بے دار کرنے کے لیے کسی لیڈر کی تقریر یا کسی دانشور کے فلسفے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں یہ دیکھتا ہوں کہ ہماری نئی نسل آج بھی وطن سے محبت کرتی ہے۔ وہ قومی تقریبات کے مواقع پر جب اپنے اپنے ہاتھ میں جھنڈیاں اور جھنڈے لے کر قومی گیتوں کی دھنوں پر رقص کرتے ہیں تو حب الوطنی کی کرنیں ان کے چہرے سے ہویدا ہوتی ہیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ آگے چل کر ان لوگوں کو بددل نہ کیا جائے۔ انہیں زندگی کی دوڑ میں ساتھ ساتھ بھاگنے کے مواقع فراہم کیے جائیں۔ ان کو ملازمتیں کے باوقار اور منصفانہ مواقع فراہم ہوں تو پھر یہ نسل کہیں نہیں جائے گی۔ اس کے دل میں گرین کارڈ وغیرہ کی خواہش نہیں ہوگی ورنہ دوسری صورت میں جو کچھ ہو رہا ہے بس وہی ہوتا رہے گا۔

ایک بار مجھے والد صاحب کے سامنے بہت شرمندگی اٹھانا پڑی تھی۔ یہ شرمندگی آج تک میرے وجود کے ساتھ چپکی ہوئی ہے۔ ایک دن مبین خان نے مجھ سے کہا۔ ''منظر، تم یہ کہتے ہو کہ تمہاری یادداشت بہت اچھی ہے۔''

''اس میں کیا شک ہے۔'' میں نے اپنی گردن ہلادی۔ ''مجھے سب کچھ یاد رہتا ہے۔''

''تو پھر یہ رمضان اور اس کی بیوی جو گالیاں دیتے ہیں۔ وہ تمہیں یاد ہیں۔''

''بہت اچھی طرح۔''

''تو پھر ایسا کرو۔ وہ گالیاں ذرا لکھ کر دکھاؤ۔''

میں نے گھر آ کر وہ ساری گالیاں ایک بڑے سے کاغذ پر لکھ لیں۔ اتنا ہی نہیں۔ بلکہ اپنی طرف سے کچھ گالیوں کا اضافہ کر دیا تھا لیکن میری بدقسمتی یہ ہوئی کہ وہ کاغذ والد صاحب کے ہاتھ لگ گیا۔ اس کے بعد جو میری حالت ہوئی ہوگی۔ وہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

گھر میں مجھے ڈھیری محبتیں حاصل تھیں۔ امی، ابا، بھائی، بہن، دوست۔ سب ہی موجود تھے۔ اس کے باوجود مزاج کی ایک اکھڑی اکھڑی کیفیت تھی۔ کہیں دل ہی نہیں لگتا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ والد صاحب مجھ سے محبت تو بہت کرتے تھے لیکن جب ناراض ہوتے تو بہت تلخ باتیں کیا کرتے۔ یا شاید یہ وجہ نہ ہو۔ بہرحال میں اپنے ان دنوں کی ذہنی کیفیت کا تجزیہ کرنے سے قاصر ہوں۔ جو کچھ بھی تھا، بہت غلط تھا اور یہ سب کچھ میرے ان صاحب کے گھر جانے سے پہلے کی کہانی ہے۔ جن کے یہاں میں رہنے گیا تھا اور یاسمین سے ملاقات ہوئی تھی۔

خدا کی پناہ۔ زندگی کے وہ دن ایک آسیب کی طرح میرے اعصاب پر مسلط ہیں۔ وہ تین چار مہینے اتنے بھیانک، اتنے کربناک اور اتنے اذیت ناک ہوئے کہ جن کی کسک آج بھی سوتے سوتے مجھے بے دار کر دیتی ہے۔ وہ زندگی کے طویل اور بھیانک اندھیروں کے دن تھے۔ مجھے کیا ہوا تھا۔ یہ میں سمجھ نہیں سکا۔ میں شاید پاگل ہو گیا تھا' یا ایک غنودگی کے عالم میں تھا۔ ایسی غنودگی جو کئی مہینوں تک میرے اعصاب پر حاوی رہی تھی۔

میں نہ جانے کہاں سے پیسے لاتا اور فلمیں دیکھنے چلا جاتا۔ ملیر میں نہیں بلکہ شہر میں۔ ایک شو، دوسرا شو پھر تیسرا اور جب رات ہو جاتی تو بجائے گھر آنے کے میں اپنی کسی عزیز یا رشتے دار کے یہاں رات گزارنے کے لیے چلا جاتا۔ سینما ہال میں بیٹھے بیٹھے سو جایا کرتا اور جب فلم ختم ہوتی تو دوسرے شو کا ٹکٹ لے کر پھر بیٹھ جاتا۔ میرا ذہن جیسے بندھ کر رہ گیا تھا۔ کئی کئی دن گھر سے باہر رہتا۔ گھر والے یاد نہیں آتے تھے۔ آج یہاں تو کل وہاں۔

ذہن پر ہر وقت ایک دھندسی چھائی رہتی تھی۔ نہ کھانے کا ہوش۔ نہ اس بات کی پروا کہ میرے کپڑوں کا کیا حال ہو رہا ہے۔ جیسے کسی نے جادو کر دیا ہو۔ کئی کئی دنوں کے بعد گھر واپس جاتا۔ امی اور ابا سے معافیاں مانگتا۔ اپنی

غلطیوں کا احساس کرتا۔ اس کے بعد پھر وہی سلسلہ شروع ہو جاتا۔ طبیعت جیسے اچاٹ ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک وحشت کا عالم تھا اور اس وحشت کو سینما ہال جا کر تسکین ملتی تھی۔ اس وحشت کی انتہا یہ تھی کہ میں نے کئی راتیں شہر کے فٹ پاتھوں پر بسر کی ہیں۔ چار پائی ہوٹلوں میں جا کر سویا ہوں جن کے بستر انتہائی گندے اور غلیظ ہوتے تھے۔

ایسی ہی ایک رات ایک بوڑھے سے میری ملاقات ہوگئی۔

میں کینٹ اسٹیشن کے باہر سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا تھا کہ وہ بوڑھا میرے ساتھ آکر بیٹھ گیا۔

''کیا بات ہے۔ کیا آج گھر واپس نہیں جاؤ گے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''بہت رات ہوگئی ہے۔''

''کہاں رہتے ہو؟''

''ملیر۔'' میں نے بتایا۔

''اوہ۔ وہ تو بہت دور ہے۔ ایسا کرو۔ میرے ساتھ چلو۔'' اس نے کہا۔ ''میں قریب ہی رہتا ہوں۔''

اس وقت وہی دھند اور غنودگی کی سی کیفیت تھی۔ احساس ہی نہیں رہا تھا کہ میں کون ہوں۔ کس حالت میں ہوں اور کس کے ساتھ جا رہا ہوں۔ بس اس کے ساتھ ہو لیا۔ وہ مجھے کینٹ سے دور لے آیا۔ وہاں سے جیکب لائن جہاں ایک پرانا خستہ سا ایک کمرے اور ایک آنگن کے مکان میں وہ مجھے لے گیا تھا۔ اس کے گھر میں کبوتر ہی کبوتر بھرے ہوئے تھے۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ ایمپریس مارکیٹ میں کبوتر بیچا کرتا ہے۔ وہ بھی ایسا کردار تھا جو آج بھی میرے ذہن پر چپکا ہوا ہے۔ اس گھر میں اس کی ایک بیٹی تھی۔ جس کی عمر سترہ، اٹھارہ برس سے زیادہ نہیں ہوگی اور اچھی خاصی قبول صورت تھی۔

اس نے مجھے دیکھ کر کسی حیرت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ البتہ اس نے میرے سامنے کھانا لاکر رکھ دیا۔ میں بھوکا تو تھا ہی اس لیے کسی تکلف کے بغیر کھانا شروع کر دیا۔ اس دوران وہ بوڑھا میرے سامنے بیٹھا رہا تھا۔

''جانتے ہو۔ میں تمہیں اپنے ساتھ کیوں لایا ہوں۔'' اس نے میرے کھانا ختم ہونے کے بعد پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''آپ بتائیں۔''

''میں یہ چاہتا ہوں کہ تم میری بیٹی سے شادی کر لو۔'' اس نے کہا۔

''شادی؟'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔''

''اوہ۔ ایک رات کے لیے کر لو۔ ایک ہفتے کے لیے۔'' اس نے کہا۔ ''تم پر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ جب چاہو یہاں سے جا سکتے ہو۔''

میں نے اس کی لڑکی کی طرف دیکھا۔ لڑکی کو دیکھ کر دل میں جذبات تو بے دار ہو گئے تھے لیکن اس بوڑھے کی یہ پیشکش سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ ''لیکن شادی کے لیے تو پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''تم سے پیسے کون مانگ رہا ہے۔''

میں بہت حیران تھا۔ وہ کیا چاہتا تھا۔ کچھ باتیں تو سمجھ میں آگئی تھیں لیکن اس کے کردار کا یہ پہلو سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وہ ایک باپ تھا جو اپنی بیٹی کے لیے ایک لڑکے کو گھر لے آیا تھا اور وہ بھی کاروباری نکتہ نظر سے نہیں۔ یہ ایک عجیب بات تھی۔ خواہش تو بدن میں سن سنانے لگی تھی لیکن اس کے ساتھ ہزار قسم کے اندیشوں نے بھی گھیر لیا تھا۔ اس وقت میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ بوڑھا کہیں کسی مصیبت میں نہ مبتلا کر دے۔ دل پر جبر کر لینا زیادہ بہتر تھا لیکن میں اتنی رات گئے اس گھر سے نکل بھی نہیں سکتا تھا۔

میں نے وہ رات اس لڑکی سے باتیں کرتے ہوئے گزار دی۔ بوڑھا کمرے میں سونے چلا گیا تھا۔ جبکہ میں اور وہ لڑکی آنگن میں بیٹھے رہے تھے۔ اس لڑکی نے اپنے اور اس بوڑھے کے بارے میں حیرت انگیز باتیں بتائیں۔ کیا اس معاشرے میں ایسے بھی کردار ہوتے ہیں۔ اس مزاج کے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ قصہ کچھ یوں تھا کہ بوڑھے کی بیوی ایک خوبصورت عورت تھی اور بوڑھے کو یہ شک تھا کہ اس کے دوسرے مردوں سے تعلقات ہیں اور بیٹی اس کی نہیں بلکہ کسی اور کی ہے۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اس کی بیوی ایک وفادار عورت تھی اور وہ لڑکی بھی اس کی تھی۔ اس کے باوجود بوڑھے کے دل میں نفرت اور انتقام کی آگ جلتی رہی۔ اس نے بیوی کی موت کے بعد اپنی بیوی سے جو انتقام لیا اس کی بھی مثال نہیں ملتی۔ اس کم بخت نے خود اپنی بیٹی کے لیے آدمی لانے شروع کر دیے تاکہ وہ اسے تباہ کر دیں۔ لوگ آتے اور اس لڑکی کو تباہ کرتے

رہے۔ اس بہانے اس بوڑھے کو کچھ پیسے بھی مل جاتے تھے۔ اگر پیسے نہ بھی ملتے تو بھی اس پر کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ تو صرف یہ چاہتا تھا کہ وہ لڑکی جو اس کی اپنی اولاد تھی، ہر رات تباہ ہوتی ہے۔ تو میں نے اپنی زندگی میں ایسا ایک کردار دیکھا جو آج تک میرے ذہن پر نقش ہے اور میں یہ سوچتا ہوں کہ غصہ اور نفرت کیسی چیز ہوتی ہے جو انسان کو انسان بھی نہیں رہنے دیتی۔ انسان اس وقت اندھا ہو جاتا ہے۔ اسے احساس نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہا ہے اور اسے کیا کرنا چاہیے۔

میں پٹنہ میں غصے میں آئے ہوئے لوگوں کو دیکھ چکا ہوں۔ میں یہ دیکھ چکا ہوں کہ جب وہ بھڑکنا چاہتے ہیں تو کس طرح بھڑک کر اوروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ انسان کس طرح دوسرے انسان کا خون کرتا ہے اور اس پر فخر اور خوشی کا اظہار بھی کرتا ہے۔

وہاں میں نے محرم میں اس قسم کے بھیانک اور خطرناک مظاہرے دیکھے ہیں۔ عاشورہ وہاں اتنی دھوم دھام سے ہوتا تھا کہ آج تک میں اس کی شان و شوکت کو فراموش نہیں کر سکا ہوں۔ وہاں شام چار پانچ بجے سے اکھاڑے نکلنے شروع ہو جاتے اور ساری رات یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔ محرم کے جلوس اور اکھاڑے وغیرہ جن راستوں سے گزرتے ان راستوں کے دونوں طرف کے مکانات عارضی طور پر کرائے پر لے لیے جاتے تھے تاکہ محرم کے جلوس کا منظر دیکھا جا سکے۔

پھر اکھاڑے آنے شروع ہو جاتے۔ اتنی سج دھج کے ساتھ جیسے آپ کسی تاریخی انگریزی فلم کا کوئی مرعوب کرنے والا منظر دیکھ رہے ہوں۔ سب سے پہلے گھڑ سوار دستے۔ خود پہنے اور زرہ بکتر لگائے ہوئے۔ ان دستوں کے بعد تلوار اور لاٹھی کا مظاہرہ کرنے والے۔ جو اتنی پھرتی اور چابک دستی کے ساتھ تلوار اور لاٹھیاں چلاتے کہ ان پر نگاہ نہیں جمتی تھی۔ ہاں ان گھڑ سوار دستوں سے پہلے اونٹ یا ہاتھی پر بیٹھا ہوا نقیب بھی آتا تھا جو ایک بڑا سا ڈھول پیٹ پیٹ کر یہ اعلان کرتا کہ فلاں نواب یا فلاں عملے کا اکھاڑا آ رہا ہے۔

لاٹھیوں اور تلواروں کا مظاہرہ کرنے والوں کے بعد دو رویہ مزدوروں کی قطاریں ہوتیں جو اپنے سروں پر فانوس اور جھاڑ اٹھائے رہتے۔ جن سے پورا علاقہ جگمگ کرنے لگتا تھا۔ روشنیوں کے بعد سیپل نچانے والے ہوتے۔ میں نے سیپل پھر کہیں اور نہیں دیکھے۔ سیپل مثلث کی شکل کا ایک بہت وزنی ڈھانچا ہوتا تھا۔ جس پر رنگ برنگے کپڑے مڑھے ہوتے۔ ان کے اوپر چھوٹے چھوٹے خنجر لگے ہوتے۔ ان خنجروں پر سنہرے جگمگ کرتے ہوئے لٹو ہوتے۔ سیپل کے ڈنڈے کو ایک شخص اپنی کمر کی بیلٹ کی تھیلی میں اڑس لیتا اور سیپل کو بیلنس کرنے کے لیے دو آدمیوں کے ہاتھوں میں دونوں طرف رسیاں ہوتیں جو اس سیپل کو کھینچ کر رکھتے۔

سیپل کے بعد بینڈ کے دستے ہوا کرتے جو طرح طرح کی دھنیں بجاتے رہتے۔ بینڈ والے عام طور پر مسلمان ہی ہوا کرتے تھے۔ اس سے ان کی غربت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بینڈ والوں کے بعد ہاتھیوں کے دستے ہوا کرتے تھے۔ ہر ہاتھی کے ماتھے پر ایک مصنوعی سورج ہوتا جس کے پیچھے تیز بلب روشن ہوتے۔ ہاتھیوں کے ساتھ اسلحہ خانہ چلا کرتا تھا۔ نیزے، تلوار، لاٹھیاں اور نہ جانے کیا کیا۔ یہاں تک تو سب خیر ہوتی لیکن جب بھی دو اکھاڑوں کے درمیان کسی بات پر جھگڑا شروع ہو جاتا تو پھر انسان کی وحشت پن کا کمال سامنے آ جاتا۔ وہ ہاتھیوں کو مجمع پر دوڑا دیا کرتے۔ چاہے جس کا جو بھی حال ہو۔ انہیں اپنی انا کی فکر ہوتی۔ اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ ان ہاتھیوں کی زد میں آ کر کتنے لوگ کچلے گئے ہیں۔

انسان ایسا ہی ہوتا ہے۔ بے رحم اور سخت دل۔ وہ ہر حال میں اپنی شان برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ چاہے اس کے لیے اسے لاشوں کو کچلتے ہوئے گزرنا پڑے۔ تو اس بوڑھے کا غصہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ خود اپنے آپ کو تباہ کرنے والا۔ اس نے اپنی بیٹی کو اپنے غصے کے لیے قربانی کا جانور بنا رکھا تھا۔

میں نے وہ رات بڑی مشکلوں سے گزاری۔ دل میں خواہش تو بہت تھیں لیکن ایک انجانا سا خوف تھا۔ شاید ہم میں سے بہت سے لوگ صرف اس لیے نیک اور مہذب ہوتے ہیں کہ وہ بزدل اور خوفزدہ ہوتے ہیں۔ ان کی اچھائیاں ان کی فطرت کی وجہ سے نہیں ہوتیں بلکہ عدم مواقع کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ بہر حال میں صبح سویرے ہی اس گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ اتنے دن گزر گئے ہیں مجھے نہیں معلوم کہ وہ لڑکی اب کس حال میں ہے اور کہاں ہے۔

میں اپنے ذہن کی کیفیت کے بارے میں بتا رہا تھا کہ میں ایک دھند کے عالم میں ہوتا۔ ایک خواب جس کی کوئی تعبیر نہیں تھی۔ نہ جانے مجھے کیا ہوا تھا۔ ایک وحشت کا عالم تھا۔ لکھنا پڑھنا تو بہت دور کی بات۔ میں نے تو اپنے

آپ کو بھی فراموش کر دیا تھا۔
ایک بار ایسی ہی کیفیت کے عالم میں دو آدمیوں سے میری ملاقات ہوگئی۔ یہ ملاقات لوکل ٹرین میں ہوئی تھی۔ میں ملیر سے شہر کی طرف آرہا تھا۔ وہ دونوں ڈبے میں میرے پاس بیٹھے تھے۔ میں نے ان جیسے لوگ بھی آج تک نہیں دیکھے۔ خدا جانے انہیں کیا سوجھ گئی تھی۔ ان میں سے ایک نے مجھ سے پوچھا۔ ”بیٹے۔ تمہارا نام کیا ہے۔“
”منظر۔“ میں نے بتایا۔ ”منظر امام۔“
”بہت اچھا نام ہے۔“ اس نے کہا۔ ”کیا تم کچھ وقت ہمارے ساتھ گزارو گے؟“
میں تو خود ایک کٹی پتنگ کی طرح اِدھر اُدھر ڈولتا پھر رہا تھا۔ میرے پاس صرف وقت ہی وقت تھا اس لیے میں نے فوراً ہامی بھرلی۔ کینٹ اسٹیشن پر اتر کر وہ دونوں مجھے ایک ہوٹل میں لے گئے۔ جہاں ہم نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ چائے پی۔ اس کے بعد فلم دیکھی۔ فلم دکھانے کے بعد انہوں نے صدر سے میرے لیے ایک خوبصورت جوڑا خریدا۔ بیس روپے دیے اور رخصت ہوگئے اور میں حیرت سے ان دو کرداروں کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ کیسے لوگ تھے۔ کتنے عجیب۔

بہر حال میں نے اپنی زندگی کچھ اس انداز سے گزاری ہے۔ کرداروں کے ہجوم میں رہا ہوں۔ انسانوں کے اتنے روپ دیکھے ہیں کہ اب کوئی روپ اجنبی نہیں رہا۔ میرا خیال ہے کہ میری اولاد یا نئی نسل کو شاید اتنے تجربات سے واسطہ نہ پڑا ہے اور خدا نہ کرے کبھی واسطہ ہو کیونکہ یہ ایک عذاب ہے۔ مسلسل عذاب۔

ایک بار میری جیب میں کچھ پیسے تھے۔ میں نے ریل کا ٹکٹ لیا اور حیدرآباد چلا گیا۔ میں وہاں والد صاحب کے ساتھ دو چار بار جا چکا تھا اس لیے وہ شہر میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ بس یوں ہی بغیر کسی مقصد کے۔ ایک چکر تھا میرے پاؤں میں زنجیر نہیں۔ آوارہ گردی کی ضد ہوگئی تھی۔ نہ جانے کیسی زندگی اور کن خوابوں کے درمیان بھٹکتا پھر رہا تھا اور یوں وہ کیفیت ابھی بھی اعصاب پر مسلط ہو جاتی ہے اور میں ایک کھوئے کھوئے عالم میں پیدل چلنا شروع کر دیتا ہوں۔ بھٹکتا رہتا ہوں۔ ایک گلی سے دوسری گلی۔ ایک علاقے سے دوسرے علاقے لیکن پھر کوئی زنجیر مجھے کھینچ کر گھر کی طرف واپس لے آتی ہے۔ یہ زنجیر گھر کی ہے۔ بیوی کی ہے، بچوں کی ہے، ایک احساس کی ہے کہ دیکھ تیرے

پیچھے کچھ لوگ ہیں جو تیرا انتظار کر رہے ہیں۔ تیری راہ دیکھ رہے ہیں تو ان کو چھوڑ کر کہاں اور کتنی دور جا سکتا ہے۔ جا واپس ہو جا۔ تیرا گھر اتیرا انتظار کر رہا ہے۔ تیرے اپنے تجھے یاد کر رہے ہوں گے شاید جب تو ان کے درمیان ہوگا تو انہیں کچھ دیر کی خوشیاں مل جائیں گی۔

اس وقت حیدر آباد ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ دھول اڑتی ہوئی۔ زندگی اس زمانے میں ہر شہر میں پُرسکون تھی۔ کسی قسم کا کوئی خوف لاحق نہیں تھا۔ میری یادداشت میں حیدر آباد کا شاہی قلعہ محفوظ ہے جس کے سامنے ایک اجاڑ سا پارک تھا اور قلعے کے اندر بہت بڑی آبادی تھی یا پھر ٹھنڈی سڑک۔ جس کے دونوں طرف اونچے اونچے درخت تھے۔ شاید اسی لیے ٹھنڈی سڑک کہا جاتا تھا۔ میرے سامنے کوئی منزل نہیں تھی۔ یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ میں یہاں آیا کیوں ہوں اور کہاں جانا ہے۔

میں بار بار ذہن میں چھائی ہوئی غبار کا جو ذکر کر رہا ہوں۔ وہ اس لیے ہے، ابھی تک میرے عزیز یہ معلوم نہیں کر سکے کہ میں کیوں اور کہاں چلا گیا تھا یا میری کیا کیفیت تھی۔ تو پھر وہی غبار کی کہانی سنانے لگتا ہوں۔ ایک بے مثال دھند۔ ایک گہری اور فراموش کر دینے والی غفلت۔ ایک سناٹا جس میں انجان راستوں پر سفر کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔ میں ان ہی راستوں پر سفر کرتا ہوا حیدر آباد چلا آیا اور یہاں مجھے ایک خاندان مل گیا۔ نہ جانے کچھ لوگ تھے۔ میرے ساتھ یہ ہی ہوتا رہا ہے۔ میں نے شاید کبھی کسی کے ساتھ رومان کیا ہو۔ کبھی کسی کے دکھ درد میں اس کا ساتھ نہ دیا ہو لیکن لوگوں نے میرا ساتھ دیا ہے۔ انجان لوگوں نے۔ جن سے میرا کبھی واسطہ نہیں رہا۔

نہ جانے وہ کون سی جگہ تھی۔ جہاں ایک آدمی مل گیا۔ وہ بہت ہی خونخوار قسم کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ کم از کم دیکھنے میں ایسا ہی تھا۔ چڑھی ہوئی آنکھیں، گھنی مونچھیں، لانبا قد، اس نے براہِ راست مجھ سے پوچھا تھا۔ ''اے لڑکے۔ تم حیدر آباد کے نہیں معلوم ہوتے۔ کراچی سے آئے ہو؟''

میں سہم کر رہ گیا تھا۔ اس سے انکار کی ہمت بھی نہیں ہوئی۔ میں نے اقرار میں اپنی گردن ہلا دی۔

''کیا گھر والے بہت ظلم کرتے ہیں؟'' اس نے مسکرا کر پوچھا۔

میں تڑپ کر رہ گیا۔ ذہن پر چھائی ہوئی دھند ایک لمحے کے لیے چھٹنے لگی تھی۔ ایسی تو کوئی بات نہیں تھی۔ گھر میں تو میرے ساتھ کوئی ظلم نہیں تھا بلکہ میرا تو بہت خیال رکھا جاتا۔ میں وہاں اپنی مرضی کا مالک تھا۔ سب ہی مجھ سے پیار کرتے تھے پھر بھی میں گھر چھوڑ کر کہیں اور چلا آیا تھا۔ زندگی کا یہ کوئی معقول رویہ تو نہیں تھا۔ یہ تو ایک پاگل پن تھا اور ایسے پاگل پن کا کوئی جواز نہیں ہوا کرتا۔ اس کی کوئی منطق نہیں ہوتی۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں نے اسے یہ بتایا کہ میرے گھر والے مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ میرا خیال رکھتے ہیں۔ تو اسے کبھی یقین نہیں آئے گا اس لیے میں نے اس سے جھوٹ بول دیا۔ خدا مجھے معاف کرے۔ ''جی ہاں۔ مجھ پر بہت ظلم ہوتا ہے۔''

''میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا'' اس نے کہا۔ ''کراچی کے لڑکے اسی لیے بھاگ کر یہاں آیا کرتے ہیں۔''

اس وقت میرے ذہن کو ایک اور جھٹکا لگا۔ اس نے یہ کیا کہہ دیا۔ بھاگ کر۔ کیا میں بھاگ کر آیا تھا؟ کیا میں ان لڑکوں میں سے تھا جو اپنے گھروں سے بھاگ نکلتے ہیں اور ان کی ساری زندگی برباد ہو کر رہ جاتی ہے۔ چلیں ان کے پاس تو شاید کوئی جواز ہوتا ہوگا لیکن میرے پاس اس عمل کا کیا جواز تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ ''نہیں۔'' میں نے اس کی تردید کی۔ ''میں بھاگ کر نہیں آیا ہوں۔''

''تو پھر کیوں آئے ہو؟'' اس نے غصے سے پوچھا۔ ''یہاں کون ہے تمہارا۔ کس سے ملنے آئے ہو۔''

اب میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں نے اپنی گردن جھکالی۔ اس شخص کی دہشت میرے دل پر قائم ہوگئی تھی۔ اس نے میرے ساتھ ایک عجیب ہمدردی کی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ کراچی لے آیا۔ اسی وقت اس نے اپنے گھر جانے کی بجائے مجھے اپنے ساتھ لیا۔ اسٹیشن پہنچا۔ ریل کا ٹکٹ لیا اور کراچی میرے گھر تک پہنچا دیا۔ یہاں میرے گھر والے واقعی بہت پریشان تھے کیونکہ میں ویسے تو پہلے بھی اس طرح گھر سے غائب ہوتا رہتا تھا لیکن کسی نہ کسی طرح گھر والوں کو میری خیریت کی اطلاع ملتی رہتی تھی لیکن اس بار کچھ زیادہ دن ہوگئے تھے اور کسی کو نہیں معلوم تھا کہ میں کہاں ہوں۔

ابا نے مجھے دیکھ کر ایک گہری سانس لی اور سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ ان کی یہ کیفیت ابھی تک مجھے یاد ہے۔ نہ جانے اس وقت ان کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔ امی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ انہوں نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ شریف آدمی مجھے پہنچا کر واپس چلا گیا تھا۔

بہرحال اس کے بعد میں اپنے گھر اور اپنے شہر کا ہو کر رہ گیا۔ یہ میری غبار آلود کیفیت کا آخری مرحلہ تھا۔ اس کے بعد جو کچھ بھی ہوتا رہا وہ گھر ہی میں ہوتا رہا۔ میں نے اپنی زندگی کے سارے تجربات اپنے گھر آنگن میں حاصل کیے پھر کہیں اور نہیں گیا۔ اس کے بعد زندگی کی رفتار بہت تیز ہوگئی تھی۔

اس کے بعد ہی والد صاحب نے مجھے ان صاحب کے یہاں رہنے کے لیے بھیج دیا تھا۔ جو ان کے پارٹنر بنے تھے اور میں جن کے گھر رہا اور جہاں وہ واقعہ پیش آیا جس کا میں تذکرہ کر چکا ہوں کہ میں صوفے کے پاس سویا ہوا تھا اور پڑوس کی یاسمین۔ بہرحال بار بار دہرانے کا کیا فائدہ۔

میں پی آئی بی کالونی میں ان صاحب کے گھر رہا کرتا۔ اس زمانے میں بھی یہ ایک صاف ستھری اور پڑھے لکھے لوگوں کی کالونی تھی۔ زیادہ ہجوم بھی نہیں تھا۔ جیل روڈ ایک تنگ سی سڑک تھی۔ پی آئی بی کا مین اسٹاپ بہت بڑا تھا۔ جہاں ناکارہ بسیں شور مچایا کرتیں۔ اس روڈ میں اسی قسم کی بسیں چلا کرتی تھیں اور سنا ہے کہ آج بھی ان بسوں کا وہی عالم ہے۔

معاشرے میں بسوں کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ لوگ بسوں کے ذریعے سفر کرتے اور بسوں میں عشق کیا کرتے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہو۔ کراچی آنے کے بعد بہت دنوں تک میں بس کے سفر سے گریز کیا کرتا تھا کیونکہ مجھے الٹی ہونے لگتی تھی۔ طبیعت اتنی خراب ہوجاتی کہ اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہوجاتا تھا۔

یہ کیفیت بہت دنوں تک رہی تھی۔ اس کے بعد ایک اور کیفیت مسلط ہوگئی اور جو شاید آج بھی ہے۔ بس میں بیٹھتے ہی مجھے نیند آنے لگتی تھی اور نیند بھی ایسی جیسے دنیا بھر کی خواب آور دوائی استعمال کرلی ہوں۔ سائیں سائیں کی سی کیفیت۔ ذہن میں خوابوں کی سن سناہٹ ہوا کرتی۔ اس کیفیت کو میں اس کے علاوہ اور کوئی نام نہیں دے سکتا۔ نہ جانے کتنی بار ایسا ہوا کہ نیند کے غلبے میں اپنا اسٹاپ پیچھے رہ گیا اور جب آنکھ کھلی تو پتا چلا کہ بہت دور نکل آیا ہوں۔

ہوسکتا ہے کہ ان باتوں سے میری زندگی کے سفر کا بظاہر کوئی تعلق نہ ہو لیکن یہ سب میرے مزاج کی کیفیت کا نام ہے۔ میری جسمانی اور ذہنی کمزوریوں کے پہلو ہیں۔ مثال کے طور پر میں ایک خوفزدہ شخص ہوں۔ بہت سی باتیں مجھے خوفزدہ کردیتی ہیں۔ ٹریفک کا شور اور اس کی روانی مجھے خوفزدہ کرتی ہے۔ لفٹ میں پھنسنے کا خوف لاحق رہتا ہے۔ خونخوار کتوں سے ڈر لگتا ہے اور موٹر سائیکل پر کبھی نہیں بیٹھتا۔ جھگڑے فساد کی خبریں میرے اعصاب کو شل کردیا کرتی ہیں۔

اپنی کہانی بیان کرنے کا شاید یہ بھی ایک طریقہ ہے کہ اپنے آپ کو مکمل طور پر بیان کردیا جائے۔ اپنی کوئی بات چھپائی نہ جائے۔ کم ازکم اس حد تک جہاں تک اپنی شرمندگی کا احساس اجازت دیتا ہوں میں شاید اپنے اندر ہی سے بزدل ہوں اور ایک قدیم فلسفے کے مطابق دنیا کی ساری برائیاں صرف بزدلی سے جنم لیتی ہیں۔ بزدل کھل کر کسی کا سامنا نہیں کرتا اسی لیے منافق ہوجاتا ہے وہ خوابوں اور تصورات کے درمیان رہتا ہے۔ وہ جھوٹ بولتا ہے۔ مکار ہوتا ہے۔ بزدلی اسے خوشامدی بنادیتی ہے اور میں ایک بزدل انسان ہوں۔

ایک رات میں ان ہی صاحب کے یہاں تھا کہ انہوں نے مجھے نیند سے بےدار کردیا۔ ''منظر۔ ہمیں ابھی ملیر چلنا ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''اس وقت؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں؟ ایک بات ہوگئی ہے۔'' انہوں نے میرے شانے پر تھپکی دی۔ ''جلدی تیار ہوجاؤ۔''

نہ جانے کیا بات تھی اور وہ مجھے اتنی رات گئے اپنے ساتھ کیوں لے جانا چاہتے تھے۔ بہرحال میں ان کے ساتھ ہولیا۔ ان کے پاس لال رنگ کی ایک پرانی سی گاڑی تھی جس میں انہوں نے اپنی بیوی بچوں کو بھی بٹھالیا تھا۔ ہم جب ملیر پہنچے تو میں نے اپنے مکان کے باہر کچھ لوگوں کو کھڑے ہوئے دیکھا۔ یہ محلے کے لوگ تھے اور ان کو دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ خدا خیر کرے۔ ایسی کیا بات ہوگئی تھی۔ بہرحال اندر جاتے ہی سب کچھ معلوم ہوچکا تھا۔

امی رو رہی تھیں۔ بھائی، بہن رو رہے تھے اور آنگن میں والد صاحب ایک سفید چادر اوڑھے لیٹے ہوئے تھے۔ بالکل خاموش۔ بےحس۔ ساکن۔ بس۔ ایک لمحہ۔ میں سب کچھ سمجھ چکا تھا۔ ایسی باتوں کے لیے کسی بیان، کسی اخبار اور کسی تقریر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ سب کچھ صاف صاف پتا چل جاتا ہے۔ ایک لمحے کے ہزارویں حصے ہیں۔ یہ سن سناتا ہوا احساس ہوگیا تھا کہ ابا اب اس دنیا میں نہیں رہے۔

یہ میری زندگی کا سب سے اہم موڑ تھا کیونکہ اس کے بعد بہت کچھ ہوا۔ یتیم ہوجانے کے المیے کے ساتھ ساتھ

واقعات کی رفتار میں بھی تیزی آگئی۔ یہ بہت نازک اور اہم موڑ تھا۔ میں بت بنا ہوا والد صاحب کے پاس کھڑا ہوا تھا کہ اچانک کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ......وہ......اوخدا۔ یہ اظہار بھی کیسا عذاب ہے۔ میں اس کا نام نہیں لے سکتا۔ بس یہ سمجھ لیں کہ میں یہاں سے اپنی محبت کی داستان کی ابتدا کر رہا ہوں کیونکہ وہ میری پہلی محبت تھی۔ دس گیارہ برس کی ایک خوبصورت سی بچی، جو مجھے تسلی دے رہی تھی۔ ''روتے کیوں ہو۔ مت رو۔ چپ ہو جاؤ۔''

اور میں چپ ہو گیا۔ بے طرح دل پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا ہو۔ جیسے زخم کو مرہم مل گیا ہو۔ میں اس کیفیت کو آج تک نہیں سمجھ سکا۔ مجھے قرار کیوں آ گیا تھا۔ یہ میری کیسی بے حسی تھی کہ میں نے والد کی لاش کے پاس بھی کھڑے ہو کر اپنے آنسو روک لیے تھے۔ شاید ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ کسی کے بچھڑ جانے کا غم اچانک نہیں ہوتا۔ بلکہ پہلا احساس بے بسی کا ہوتا ہے۔ ذہن خالی ہو جاتا ہے۔ سائیں سائیں کی سی کیفیت ہوا کرتی ہے۔ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ انسان اس وقت بہت نارمل ہوتا ہے۔ پھر دکھ کا احساس آہستہ آہستہ حملہ آور ہونے لگتا ہے۔ بہت آہستہ آہستہ۔ جیسے پوشیدہ دشمن ستونوں کی آڑ سے نکل نکل کر حملہ آور ہو جائیں۔ اس زخم کا کمال یہ ہے کہ وقت گزرنے کے باوجود یہ نہیں ہوتا بلکہ اس میں ٹیس اٹھتی رہتی ہے۔

میں اس کا نام شہناز لکھوں گا۔ گڑیا سی بچی۔ جو آج بھی میری نگاہوں کے سامنے اسی انداز سے دیکھ رہی ہے۔ جس کی آنکھیں بہت خوبصورت تھیں۔ جس کے ہونٹ بہت خوبصورت تھے اور جس کی آواز بہت اچھی تھی۔ کھنکھناتی ہوئی۔ اس نے مجھے تسلی دی اور دل کو جیسے قرار آ گیا۔ وہ کچھ دیر بعد عورتوں کے ہجوم میں گم ہو گئی تھی۔

صبح ہوتے ہوتے بہت سے عزیز رشتے دار وغیرہ بھی چلے آئے۔ وہی سب کچھ ہوتا رہا جو ایسے موقعوں پر ہوا کرتا ہے۔ رونا دھونا۔ گریہ زاری۔ مسلسل آنسو۔ تسلیاں۔ دلاسے۔ اس بات کے جھوٹے دعوے کہ سب لوگ ہمارا ساتھ دیتے رہیں گے۔ جیسے اپنے آپ کو تنہا نہیں سمجھنا چاہیے۔ دو چار دنوں کی گہما گہمی۔ والد صاحب کو کھوکھرا پار کے قبرستان میں جگہ ملی تھی۔ پہلے پہل ہم تقریباً روزانہ جایا کرتے اور اب تو صرف رسمی کارروائی کے لیے جاتے ہیں۔ یہ بات نہیں کہ ان کی یاد دل سے محو ہو گئی ہو بلکہ زندگی اتنی فرصت ہی نہیں دیتی۔ مالی حالات پیروں کی زنجیر بن جاتے ہیں۔ انسان اتنا خود غرض اور کمرشل ہو کر رہ گیا ہے کہ وہ اپنے آپ سے بھی ملنے کا وقت نہیں نکال پاتا۔

والد صاحب کی موت اور شہناز کے پرسے کے حوالے سے ایک اور واقعہ یاد آ گیا جو بہت دنوں بلکہ برسوں کے بعد پیش آیا۔ والد صاحب کا انتقال انیس سو باسٹھ میں ہوا تھا اور امی نے انیس سو نواسی میں ہم سے منہ موڑ لیا تھا۔ درمیان میں ستائیس سال کا وقفہ ہے۔ اس دوران بہت کچھ ہوا لیکن ایک واقعہ ایسا بھی تھا جو بالکل ایک جیسا تھا۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ ہم شوبزنس سے تعلق رکھنے والے لوگ اپنے دکھوں پر ڈھنگ سے رو بھی نہیں سکتے۔

والدہ کا انتقال اس وقت ہوا جب ٹی وی پر میری ایک سیریل ''ہنستے بستے'' کی ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔ انتقال کے تین دنوں کے بعد میں سیٹ پر موجود تھا کہ ایک لڑکی میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ چھوٹے سے قد کی۔ خاص طور پر اس کی آنکھیں۔ دل میں اتر جانے والی آنکھیں تھیں۔ میں اس سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔ وہ نہ جانے کس سلسلے میں ٹی وی اسٹیشن آئی ہوئی تھی اور اسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ میری والدہ کا انتقال ہوا ہے۔ اس لیے نہ جانے اس کے دل میں کیا سمائی کہ وہ سیدھی میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

''مجھے آپ کی والدہ کے انتقال کی خبر ملی ہے۔'' اس نے کہا۔

''جی ہاں۔'' میں نے اپنے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کی۔

''بہت افسوس ہوا سن کر۔'' اس نے تسلی دی۔ ''پلیز۔ اپنے آپ کو قابو میں رکھیں۔''

میں تڑپ کر رہ گیا۔ بالکل وہی انداز۔ وہی جذبہ۔ ویسا ہی راستہ۔ وقت نے اپنے آپ کو نہ جانے کس طرح دہرا دیا تھا۔ اس کی بہت سی باتیں شہناز ہی کی طرح تھیں۔ شاید اس لیے بھی میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ''محبوب کا ملنا تو قیامت ہی ہے لیکن ہم صورت محبوب کا ملنا بھی قیامت۔''

اس لڑکی کا نام روبی ہے اور وہ ایک بینک میں ملازم ہے۔ میں جب بھی غم دنیا سے گھبرا جاتا ہوں۔ کچھ دیر کے لیے اس کے پاس چلا جاتا ہوں۔ اس کی باتیں سنتا رہتا ہوں۔ اسے دیکھتا رہتا ہوں اور اپنے آپ کو دہراتا رہتا

ہوں۔

بہرحال تو والد صاحب کی موت کے بعد ہم سب کی زندگی آہستہ آہستہ اپنے معمول پر آگئی۔ وہ خلا تو پورا نہیں ہوسکتا تھا لیکن زندگی نے ہمیں اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ جیسا سب کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ حادثے بہت جلد فراموش کردیے جاتے ہیں۔

اب جو امی نے حالات کا جائزہ لیا تو پتا چلا کہ ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں رہا۔ سوائے اس چھوٹے سے مکان کے جس میں ہماری رہائش تھی۔ بینک میں تھوڑے سے پیسے تھے۔ جو کچھ ہی دنوں تک کام آتے۔ اس کے بعد کیا ہوتا۔ اذیتوں کے سانپ ہمارے وجود پر لہرانے لگے تھے۔ ہم سب کی زندگی کا یہ نیا سفر بہت دشوار ثابت ہورہا تھا لیکن امی نے سب کو سمیٹ کر رکھ لیا۔ وہ بہت حوصلے مند اور انتہائی مہربان عورت تھیں۔ ماں تو سب ہی کو پیاری ہوتی ہے کیونکہ ہم اس کی کوک سے جنم لیتے ہیں لیکن میں یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا کہ میری ماں ایک مثالی عورت تھی۔ امی انتہائی معصوم، سیدھی سادی اور نیک ہونے کے باوجود حالات کی نبض کو پہچاننے والی بھی تھیں۔

انہوں نے ہماری تعلیم کے لیے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ ہم آج جو کچھ بھی ہیں وہ ان ہی کی جوتیوں کے طفیل ہیں۔ حالانکہ انہوں نے صرف ساتویں آٹھویں تک تعلیم حاصل کی ہوگی لیکن انہیں علم سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ اسکول اور کالج جانے والے طالب علموں کو شفقت آمیز انداز سے مسکرا مسکرا کر دیکھتی رہتیں۔ اہلِ علم کی قدر کرتیں۔ ان ہی کی وجہ سے میرے دوستوں کا حلقہ پڑھے لکھے لوگوں کا تھا۔ میں اپنے گھر مشاعرے کیا کرتا تھا تو امی ان کی خاطر مدارات میں کوئی کمی نہیں رکھتیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو امی سے کہا کرتے۔ ”دیکھیں۔ منظر شاعر اور ادیب بنتا چلا جارہا ہے۔ اس کو ذرا سمجھائیں۔“

”کیوں! اس میں سمجھانے والی کون سی بات ہے۔“ امی اس وقت میرے لیے سپر بن جاتیں۔ ”یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ اس کا دھیان علم کی طرف ہے اور جو کچھ بھی کررہا ہے وہ بہت اچھا ہے اور اس کے لیے اسے سمجھانے کی نہیں بلکہ دعاؤں کی ضرورت ہے۔“

تو ایسی تھیں ہماری امی۔ جنہوں نے قدم قدم پر ساتھ دیا۔ ان کی شخصیت پورے خاندان کے لیے ایک مضبوط مرکز کی تھی۔

والد صاحب کی موت کے بعد میں نے اپنے آپ کو کچھ دنوں تک بہت تنہا اور اداس محسوس کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میں نے لکھنے لکھانے کا سلسلہ شروع نہیں کیا تھا۔ پڑھنے سے دلچسپی ہمیشہ سے رہی تھی۔ شہناز سے ملاقاتیں ہونے لگیں۔ ان ملاقاتوں میں ایک عجیب کیف تھا۔ ایک سرشاری تھی جو اس کے بعد کبھی میسر نہیں ہوئی۔

عشق کی ابتدا اس انداز سے ہوا کرتی ہے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھنا۔ مسکرا دینا۔ پھر اشاروں سے سلام کرنا۔ پھر ہلکی پھلکی باتیں۔ ایک بار اس نے مجھے ایک کتاب بھیجی۔ جس کا ہر ورق خوشبو میں بسا ہوا تھا۔ وہ کتاب محبت کے پہلے زینے کی طرح تھی۔ وہیں سے ہم ایک دوسرے سے قریب ہوئے اور سب سے پہلا خط اسی نے مجھے لکھا۔ میرے خدا۔ آج بھی جب میں اس دور کو یاد کرتا ہوں تو میری حالت عجیب ہوجاتی ہے۔

میں نے لکھنے کی ابتدا خط کے جواب سے کی۔ میرا خیال ہے کہ میں نے اتنے خوبصورت خطوط اس کے بعد کبھی نہیں لکھے۔ اگر وہ محفوظ رہ جاتے تو شاید ادب کا سرمایہ ہوتے۔ یہ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ ان خطوں کی زبان، سلاست، بے ساختگی اور جذبوں کا اظہار اپنی مثال آپ تھے۔ میں کیا تعریف کروں۔ میں شہناز سے یہ کہا کرتا تھا کہ اگر میں اپنا کوئی خط کسی غیر لڑکی کو بھی دے دوں اور اس میں ذرا بھی شعور ہو تو وہ بھی میرے پیچھے پیچھے ہاتھ باندھے چلی آئے گی۔ شہناز یہ سن کر ناراض ہوجایا کرتی تھی۔

خود اس کی تحریر بھی کم نہیں تھی۔ وہ کہا کرتی کہ تم سب کچھ میرے لیے ہو۔ تمہاری باتیں، تمہارے اندازے، تمہاری شخصیت اور تمہاری تحریریں صرف اور صرف میرے لیے ہیں۔ تم اپنے آپ کو سنبھال کر رکھنا کہ تم میری امانت ہو۔ تمہاری طرف سے کسی اور کا گزر بھی ہو تو اس سے معذرت کرلینا۔ راستہ بدل دینا۔

مجھے یہ فخر ہے کہ میں نے سچا اور مکمل عشق کیا۔ اپنے آپ کو شہناز کے سراپے اور اس کے وجود میں ضم کردیا۔ اپنی دھڑکنیں اس کی دھڑکنوں سے اس طرح وابستہ کرلیں کہ اگر ہم میں سے کسی پر بھی کوئی افتاد نازل ہوتی تو اس کا اندازہ دوسرے کو ہوجاتا۔

میں نے اس دوران شاعری بھی شروع کردی۔ افسانے بھی لکھنے لگا۔ شہناز کو خطوط تو لکھا ہی کرتا تھا اور شاید

ہی کسی کو اس بات پر یقین آئے کہ یہ میری تحریر چاہے وہ کاغذ پر لکھی ہو یا سگریٹ کے ڈبے پر آج تک شہناز کے پاس محفوظ ہے۔ اس نے میری تحریروں کو اپنے آپ میں جذب کر کے رکھ لیا ہے۔ اس نے اپنے سینے اور اپنی روح سے لگا رکھا ہے اور میں اپنی زندگی کے اس مرحلے پر یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا کہ میں نے شاید اسے اتنی محبت نہیں دی جتنی اس نے مجھے دی ہے۔ شاید میں بزدل تھا۔ ناکارہ تھا۔ بے وفا تھا۔ یا پتا نہیں کیا تھا۔ یا میرے پاس جذبوں کی وہ قوت اور وہ شدت نہیں تھی جو اس کے پاس تھی۔

میں یہ بتا چکا ہوں کہ ہماری گلی کے سامنے ایک بہت بڑا خالی میدان تھا۔ چاندنی راتوں میں ہم دونوں کسی نہ کسی بہانے ایک دوسرے سے ملتے اور اس میدان کی طرف نکل جاتے۔ ہم پوری دنیا سے بے نیاز ہو کر ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے چاندنی راتوں میں میدان کی سیر کرنے لگتے اور جب تھک جاتے تو کہیں بیٹھ کر ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگتے۔ اس وقت وہ اپنا سر میرے شانے سے لگا دیتی تھی۔ میری زندگی میں خوشیوں کا عمل دخل بہت کم رہا ہے لیکن میری خوشیاں، میرے جذبے، چاندنی راتیں، پھولوں کی خوشبو، چاند کا حسن، خوشگوار ہوائیں سب کچھ صرف اور صرف اس کی مرہون منت ہے۔ اس نے مجھے ہر جذبے سے آشنا کیا۔ ہر وہ لمس دیا جس لمس میں سرشاری ہے۔ ترنگ ہے اور سانسوں کا زیر و بم ہے۔

شہناز سے محبت کے ساتھ ساتھ میری دوسری سرگرمیاں بھی بڑھتی چلی گئیں۔ میں نے باقاعدہ شاعری شروع کر دی۔ میں نے اپنی سب سے پہلی غزل عزم اکبر آبادی کو دکھائی تھی جو ایک کہنہ مشق شاعر تھے اور بہت ہی دلچسپ انسان۔ ان کی باتیں بے حد شگفتہ ہوا کرتیں۔ مشاعروں میں ایک خاص ترنم سے غزلیں پڑھتے اور واہ واہ کا شور مچ جاتا۔ ان کے دو شعر سنا دوں تا کہ ان کی شاعرانہ صلاحیت کا اندازہ ہو جائے۔

اسیر جبر مشیت ہیں ہم زمانے میں۔ ہمارے پاؤں کی زنجیر میں صدا نہیں۔

جو وضع ہم نے بنالی نباہ دی اے عزم۔ کیا جو چاک گریباں تو پھر سیا بھی نہیں۔

ملیر میں بہت مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے صاحب ذوق لوگوں کی پوری کھیپ اس علاقے میں آ کر آباد ہو گئی ہو۔ روزانہ مشاعروں کے دعوت نامے آیا کرتے اور ہم رات کے مشاعروں کے لیے نکل جاتے۔ ہمارے ساتھ عزم صاحب، رضی الدین صدیقی، افسر صدیقی، کبھی کبھی مرحوم ثروت حسین، شوکت عابد وغیرہ بھی ہوا کرتے تھے جبکہ مشتاق راہی اور عبدالحمید صاحب بھی کبھی کبھی ہمارے ساتھ ہوتے۔

عبدالحمید صاحب مضطر تخلص کیا کرتے ہیں۔ یہ وہی ہیں جن کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ جن کے یہاں مشاعرہ ہو رہا تھا اور والد صاحب نے واہ وا کا شور سنا تھا پھر اس خاندان سے ہماری دوستی ہو گئی تھی۔ مضطر صاحب ایک بہت بڑے اسکول میں انگریزی پڑھایا کرتے۔ وہ انگریزی ادب کے آدمی تھے لیکن ان کی شاعری کمال کی شاعری ہوا کرتی۔ مجھے آج تک ان کے بے شمار اشعار یاد ہیں۔

سچ ازل سے ہے اس طرح باقی
جیسے سرکش دیا ہواؤں میں
احباب کے خلوص پہ بھی ناز سا رہا
زخموں کی نوعیت پہ بھی حیران سے رہے

شام ہوتی تو مضطر صاحب اپنے کوارٹر کے دروازے کے پاس تخت بچھا کر بیٹھ جاتے۔ اردگرد کرسیاں رکھ دی جاتیں اور لوگ آنے لگتے۔ چائے اور گفتگو کا دور چلتا رہتا۔ اردو ادب، انگریزی ادب، معقوف، فلسفے، کسی نئی کتاب پر تبصرہ۔ یہ سب کچھ ہوتا رہتا۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ میں نے علم و ادب کے بارے میں جتنی باتیں ان محفلوں میں سنیں۔ وہ پھر اس طرح نصیب نہیں ہو سکا۔ ان کے یہاں آنے والوں میں پروفیسر فائق بدایونی، رمضان صدیقی، میں، ضیاء بیگ اور دوسرے بہت سے لوگ تھے۔ یہ سب بہت پڑھے لکھے لوگ تھے اور مجھے فخر ہے کہ میں نے اپنے شعور کی ابتدا ایسی ہی محفلوں سے کیں۔ ہم ایسی ہی باتیں کیا کرتے۔ حالانکہ اس محفل میں سب سے کم عمر میں ہی تھا۔ اس کے باوجود میں بھی دل کھول کر ادب اور فلسفے پر گفتگو کیا کرتا۔

میں اس زمانے میں بہت مطالعہ کیا کرتا تھا۔ اس حوالے سے ایک بات یاد آ گئی۔ میرے گھر سے کچھ فاصلے پر انور سن رائے رہا کرتے تھے (ان کے بارے میں تفصیلی ذکر بعد میں آئے گا)۔ مشہور ادیب، صحافی، شاعر، ناول نگار وغیرہ۔ یہ بھی ہمارے اس زمانے کے دوست ہیں۔ تو مرحوم ثروت حسین نے میرا ایک خاکہ بنایا تھا۔ جس میں میں آ لتی

پالتی مارے بیٹھا ہوں اور میرے چاروں طرف فلسفے کی کتابیں بکھری ہوئی ہیں۔

جس دن عبدالحمید مضطر صاحب کے یہاں بیٹھک نہیں ہوتی۔ اس شام میں ٹہلتا ہوا ماڈل کالونی آجاتا۔ ثروت اور شوکت یہیں رہا کرتے تھے۔ ہم سب کو اچھی فلموں کا شوق تھا۔ ہم فلموں پر تبصرے کرتے۔ کبھی کبھی فلم دیکھنے اسٹار سینما یا ملیر کینٹ چلے جایا کرتے۔ اس زمانے کی ایک شرارت یاد ہے۔ ایک دن میں ثروت اور شوکت کے گھر بیٹھا ہوا تھا کہ ایک نوجوان شاعر تشریف لائے۔ میری ان سے پہلی ملاقات تھی۔ ثروت کو نہ جانے کیا سوجی کہ اس نے میری طرف اشارہ کرکے بتایا۔ ''ان سے ملیں۔ یہ صادقین ہیں۔ مشہور باکمال اور عظیم مصور۔''

وہ شاعر بھی اتنا سیدھا سادا تھا کہ اس بات پر یقین کر بیٹھا۔ بڑے ادب سے آکر اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ مجھ سے مصوری پر باتیں کیں۔ بڑے احترام سے میرا آٹو گراف بھی لیا۔ میں نے صادقین، مرحوم ہی کی ایک رباعی لکھ کر نیچے صادقین لکھ دیا تھا اور لطف یہ ہے کہ وہ مہینوں مجھے صادقین سمجھتے رہے اور وہ شاعر ہیں آج کے مشہور شاعر صابر ظفر جو شاید آج بھی اتنے ہی سیدھے سادے ہیں جتنے کل تھے۔

میں آج بھی اس اتفاق پر حیرت کرتا ہوں کہ شاعری ادب وغیرہ کے حوالے سے کیسے کیسے لوگ ہمارے اردگرد ہوا کرتے تھے اور ان سے کس طرح کی جان پہچان تھی۔ شاید ہی ایسی محبتیں اب کسی کو نصیب ہوتی ہوں۔ اب تو وقت اتنا تیز رفتار، بے رحم، کمرشل اور کمپیوٹرائزڈ ہو گیا ہے کہ لوگ ایسی باتوں کو وقت کا زیاں سمجھنے لگے ہیں۔ جہاں پہلے دو آنے یا آٹھ آنے روز کرائے کی لائبریریاں تھیں وہاں اب ویڈیو شاپ بن گئی ہیں۔ پورا کلچر ڈش اور کلاشنکوف کلچر بن کر رہ گیا ہے۔

ملیر سے آگے ڈرگ روڈ یا شاہ فیصل کالونی۔ یہاں بھی تقریباً روز کا آنا جانا تھا۔ یہاں بھی کیسے کیسے لوگوں سے میری سلام دعا تھی۔ آنا جانا تھا۔ گفتگو ہوا کرتی۔ شاعری ہوتی۔ ایک دوسرے کے حالات معلوم کیے جاتے اور پریشانیاں دور کرنے کی کوششیں ہوتیں۔ رضا مراد آبادی، سرشار صدیقی، مختار حیات، حمایت علی شاعر، اجمل اعجاز میڈیکل اسٹور والے، ممتاز صدیقی اور بہت سے دوسرے۔ ملنے کے لیے آنے والوں میں ایوب خاور (مشہور شاعر اور لاہور ٹی وی کے پروڈیوسر) نقاش کاظمی اور بہت سے دوسرے، ہر شخص اپنی اپنی جگہ شاعری اور ادب کا دلدادہ تھا۔ شاید اس زمانے میں اتنے کمرشل نہیں ہوئے تھے یا ہمارے پاس وقت بہت تھا۔

اس قسم کی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ مرحلہ عشق بھی جاری و ساری تھا۔ اب پورا محلہ، پورا علاقہ جاننے لگا تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کیا کرتے ہیں۔ ہم نے اس بات کو چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ گرمیوں کی دوپہریوں بھی جب زیادہ تر لوگ سوئے ہوتے۔ میں اس کے دروازے پر پہنچ جاتا اور وہ بھی دروازے پر آکر کھڑی ہو جاتی۔ پھر ہم ہر کھٹکے سے بے نیاز ہو کر باتیں کرتے رہتے۔ نہ جانے ہمارے پاس باتوں کا اتنا ذخیرہ کہاں سے آ گیا تھا۔

ایک شام اس کی گلی کے ایک بزرگ نے مجھے آواز دی۔ ''میاں بات تو سنو۔''

''جی جناب۔'' میں سر جھکا کر ان کے پاس پہنچ گیا۔

''میاں۔ یہ جو تم فلاں صاحبزادی سے دروازے پر باتیں کیا کرتے ہو۔ یہ اچھا نہیں لگتا۔ تم دونوں ہی شریف گھرانے کے ہو۔ اندر بیٹھ کر باتیں کر لیا کرو۔''

مجھے بہت شرم آئی۔ میں نے جب شہناز سے اس کا تذکرہ کیا تو وہ بھی شرما گئی تھی پھر ہم نے ایک بندوبست کیا کہ لکڑی کی ایک سیڑھی کے ذریعے چھت پر چلے جاتے۔ ہمیں اس بات کا ہوش ہی نہیں تھا کہ دھوپ کتنی تیز ہے۔ ہواؤں میں آگ لگی ہوئی ہے یا ہم تپش سے جل رہے ہیں۔ ہم موسموں کی تندی سے بے نیاز ہو چکے تھے۔

وہ عجیب زمانہ تھا۔ جیب میں کچھ پیسے آ جاتے تو اپنے آپ کو بادشاہ سمجھنے کا عمل شروع ہو جاتا تھا۔ کبھی کبھی میں اس کے لیے معمولی سے تحفے بھی خرید لیتا۔ جس کا جواب وہ اپنے بھرپور پیار سے دیا کرتی۔ ایک بار کچھ زیادہ پیسے ہوئے تو میں اسے اپنے ساتھ ملیر کے ایک ہوٹل میں لے گیا جہاں فیملی کیبن بھی بنا ہوا تھا۔ ہماری باتیں شروع ہوئیں تو پھر ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ اس وقت ایک دلچسپ اور شرمندہ کر دینے والا واقعہ رونما ہوا۔ جو آج بھی یاد آتا ہے تو ہونٹوں پر مسکراہٹ آ جاتی ہے۔

کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا شخص کوئی بہت ہی صاحب ذوق معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اس موقع پر کیا مصرعہ لکھ کر بھیجا تھا۔ ہوٹل کا بیرا ایک پلیٹ میں ایک چٹ لے کر آیا اور اس نے

بڑے ادب سے وہ چٹ میرے سامنے رکھ دی۔ جس پر لکھا تھا۔"بس ہو چکی نماز مصلّیٰ اٹھائیے۔"

میں نے شہناز کو وہ چٹ دکھائی۔ وہ بھی جھینپ گئی تھی۔ آج بھی یہ شستہ مذاق مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

ایک بار میرے اور مبین کے ساتھ ایک بہت دلچسپ واقعہ پیش آیا جو آج بھی یاد آتا ہے تو اپنی اس جرأت انداز پر حیرت ہوا کرتی ہے۔ میں ایک بار پھر یہ واضح کر دوں کہ ہو سکتا ہے کہ ان واقعات میں کوئی تسلسل نہ ہو کیونکہ جس جس طرح جو جو باتیں مجھے یاد آتی جا رہی ہیں وہ میں بیان کر رہا ہوں لیکن اس دور کی زندگی کا ایک خاکہ ضرور سامنے آ جائے گا۔

میں اور مبین خان نو سے بارہ فلم دیکھنے گئے۔ ہماری اگلی سیٹ پر دو لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ بہت شوخ اور چلبلی سی۔ وہ شاید اپنی ماں کے ساتھ فلم دیکھنے آئی تھیں۔ وہ زمانہ بہت سکون کا تھا۔ وارداتیں بہت کم ہوا کرتیں۔ اگر ہو جاتیں تو ہفتوں ان پر تبصرے ہوتے رہتے اور حیرت ظاہر کرتی جبکہ آج یہ حال ہے کہ

اب کوئی بات نئی بات نہیں
اب کسی بات پہ چونکا نہ کرو

خیر۔ تو میں ان دونوں لڑکیوں کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وہ شوخ لڑکیاں بار بار مڑ کر ہماری طرف دیکھ لیتیں اور مسکرانے لگتیں۔ یہاں بے وفائی والی کوئی بات نہیں تھی۔ میں شہناز سے بے انتہا پُرخلوص اور سنجیدہ ہونے کے باوجود اس قسم کی حرکتیں کرتا رہتا تھا۔ یہ ایک طرح کی ایکٹویٹی سمجھ لیں۔ تو جب ان لڑکیوں نے ہمیں بقول شخصے لفٹ دینی شروع کی تو میں نے مبین سے کہا۔"یار۔ کیوں نہ ان دونوں کا پیچھا کیا جائے۔"

مبین خان تو ایسے موقعوں کے لیے تیار ہی رہتے تھے۔ فوراً گردن ہلا دی۔ فلم ختم ہوئی تو مجمع باہر نکلا۔ ہم بھی ان دونوں کے قریب ہو گئے اور ساتھ چل پڑے۔ سینما ہال سے ایک راستہ لیاقت مارکیٹ کی طرف جاتا تھا جبکہ دوسرا راستہ نفیس سینما کی طرف۔ لوگ نفیس سینما کی طرف جا رہے تھے۔ ان ہی لوگوں میں وہ دونوں لڑکیاں بھی تھیں اور ان کے ساتھ وہ برقع والی بھی جو شاید ان کی ماں تھی۔ ہم بھی ساتھ ہو لیے۔

ہم بہت سے لوگوں کے درمیان تھے۔ کچھ دور چلنے کے بعد ہمیں یہ احساس ہوا کہ یہ تیس چالیس افراد ایک ہی سمت چلے جا رہے ہیں اور ہم ان کے ساتھ ہیں۔ اس وقت تک کوئی خاص بات درمیان میں نہیں آئی تھی۔ ہم بھی چلتے ہی رہے۔

بہت دیر بعد نفیس کے پیچھے کہیں جا کر ایک احاطہ دکھائی دیا۔ جس میں لکڑی کا ایک گیٹ تھا۔ اس احاطہ کے اندر شامیانہ لگا ہوا تھا۔ کئی کوٹھریاں وغیرہ بنی ہوئی تھیں اور اس وقت احساس ہوا کہ یہ مجمع نہیں بلکہ ایک ہی خاندان کے افراد تھے۔ جن میں وہ دو لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ یہ لوگ شادی کی تقریب میں مہمان کی حیثیت سے آئے ہوئے تھے اور نو سے بارہ کا شو دیکھنے چلے گئے تھے (یہ سب کچھ بعد میں معلوم ہوا تھا)

ان لڑکیوں نے بھی جب ہم دونوں کو احاطے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو حیران رہ گئیں۔ انہوں نے ایک دوسرے سے کچھ باتیں کیں اور انتہائی غیر محسوس طور پر ایسا اشارہ کیا جو صرف ہم ہی سمجھ سکے تھے۔ اس احاطے میں ایک کنواں بنا ہوا تھا۔ انہوں نے ہمیں اس کنویں کی طرف جانے کا اشارہ کیا تھا۔ ہم نے محسوس کیا کہ اب لوگ ہمیں حیرت اور شک بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ احاطے سے باہر تو انہوں نے کوئی توجہ نہیں دی تھی لیکن احاطے کے اندر آنے کے بعد انہوں نے ہماری طرف توجہ دی تھی۔ ہم بھی یہ سمجھ گئے کہ ہم بری طرح پھنس گئے ہیں۔ بہرحال ہم مجمع کے درمیان سے نکل کر کنویں کی طرف بڑھ گئے جس کے اردگرد چارپائیاں تھیں اور بہت سے لوگ ان پر سوئے ہوئے تھے۔ اس وقت رات بھی اچھی خاصی ہو چکی تھی۔

ایک بات یہ ہوئی کہ اس مجمع کے اندر آتے ہی لکڑی کا گیٹ بند کر دیا گیا تھا۔ یعنی ہم بری طرح پھنس چکے تھے۔ ہمارے لیے فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا لیکن زیادہ خوف بھی نہیں تھا کیونکہ وہ عہد ہی ایسا ہوا کرتا ہے۔ ایک سرشاری سی رہا کرتی ہے اور وہی سرشاری اس قسم کی حرکتوں پر اکسایا کرتی ہے۔

ان چارپائیوں کے پیچھے کچھ اور کوٹھریاں، آگے درخت اور جھاڑیاں۔ ہم ان ہی جھاڑیوں کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ بس خاموش بیٹھے رہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ جو اکا دکا لوگ سامنے تھے وہ بھی شاید جا کر سو رہے تھے اس لیے ہر طرف خاموشی طاری ہونے لگی تھی پھر بہت دیر کے بعد جب مکمل خاموشی طاری ہو گئی تو وہی دونوں لڑکیاں آتی ہوئی دکھائی دیں۔ وہ بھی بہت محتاط

ہو کر ہماری طرف آ رہی تھیں۔
"یہ تم دونوں نے کیسی حرکت کی۔" ان میں سے ایک نے قریب آ کر کہا۔ "اگر کسی کو معلوم ہو جائے تو۔"
"دیکھو۔ ہم نے تو یہ سوچا تھا کہ تم دونوں کا گھر دیکھ کر واپس چلے جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "مجھے کیا معلوم تھا کہ یہاں آنے کے بعد یہ تماشا ہو جائے گا۔"
"ہم سب شادی میں آئے ہوئے ہیں۔" اس نے بتایا۔ "ہم سب ایک ہی برادری کے ہیں۔ بہت بڑی برادری ہے ہماری۔ اس لیے تم دونوں کو بھی کوئی پہچان نہیں سکا لیکن یہ بہت خطرے کی بات ہے۔"
"وہ تو ہم بھی دیکھ رہے ہیں۔ اب یہاں سے نکلنے کا راستہ تو بتاؤ۔"
"صبح سے پہلے نہیں نکل سکتے۔" اس نے کہا۔ "برابر میں جو مسجد ہے اس کا مؤذن اس احاطے میں رہتا ہے۔ وہ سب سے پہلے اٹھ کر گیٹ کھول کر باہر چلا جاتا ہے اس کے بعد گیٹ کھلا ہی رہتا ہے۔ تم لوگ بھی اس وقت نکل لینا اور اب ساری رات جاگتے ہی رہو۔"
اور ہم ساری رات نہ صرف جاگتے رہے بلکہ ان دونوں کو بھی جگاتے رہے۔ عجیب بے دھڑک لڑکیاں تھیں۔ وہ ہر فکر کو خیرباد کہہ کر ہمارے ساتھ بیٹھی رہی تھیں۔ ایک نے مجھ سے دوستی کر لی ایک نے مبین سے۔ ہم ساری رات ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد صبح ہوتے ہی لڑکیوں کی بتائی ہوئی ترکیب پر عمل کر کے گیٹ سے باہر آ گئے۔ وہ رات بھی زندگی بھر یاد رہے گی۔
گھر کی صورتِ حال یہ تھی کہ میرے بھائی خواجہ اسرار احمد جنہیں ہم چھوٹے بھائی جان کہا کرتے۔ وہ ڈھاکا سے والد صاحب کے انتقال کے بعد کراچی چلے آئے تھے اور صحیح معنوں میں انہوں نے ہماری پرورش کی۔ ہمیں سمیٹ کر رکھ لیا۔ احساس ہی نہیں ہونے دیا کہ ہم دو ماؤں کی اولاد ہیں۔ وہ امی سے بہت پیار کرتے۔ اتنا احترام اور اتنی محبت کرتے کہ شاید یہ سب کچھ ہمارے حصے میں بھی نہیں آیا ہوگا اور بالکل اسی طرح امی بھی شاید ہم سے زیادہ ان ہی کو چاہتی تھیں۔ ہمارے یہاں سوتیلے پن کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔
میں رمضان صدیقی کا تذکرہ کر چکا ہوں۔ یہ پہلے بھائی جان کے دوست تھے پھر انہوں نے ہمارے گھر میں بھائی بہنوں کو ٹیوشن پڑھانی شروع کر دی۔ شادی سے پہلے تک بہت ہی لاابالی اور پیارے سے انسان۔ مجھ سے ادب کے رشتے سے دوستی ہوئی تھی۔ راجندر سنگھ بیدی، منٹو اور کرشن چندر انہیں بھی پسند تھے اور میں بھی انہیں پڑھا کرتا تھا۔ رمضان صدیقی کا پورا خاندان پنجاب میں آباد تھا۔ وہ اکیلے کرائے کے کوارٹر میں رہا کرتے۔ بہت ہی دلچسپ انسان تھے۔
چہرے پر چیچک کے نشان۔ گول مٹول سی بہت ہی خوبصورت مسکراہٹ اور ویسی ہی معصومیت۔ ایک عادت یہ تھی کہ موصوف حسن پرست بھی تھے اور کبھی کبھی پی بھی لیا کرتے۔ پینے کے بعد ان کی گفتگو کمال کی ہوا کرتی پھر وہ تصوف سے کم بات نہیں کرتے تھے۔ اسلامی اور مذہبی موضوعات پر ان کی معلومات کا دریا شراب نوشی کے بعد ہی رواں ہوتا تھا۔ ایک بار اسی ترنگ کے عالم میں مجھے اپنے ساتھ فلم دکھانے لے گئے۔
فلم شروع ہوئی تو انہوں نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ "یار منظر یہ سالے نیوز ریل کب تک دکھاتے رہیں گے۔"
میں نے کہا۔ "رمضان صاحب۔ ذرا ہوش میں آئیں۔ آپ کی دعا سے یہ نیوز ریل نہیں ہے۔ بلکہ باقاعدہ فلم شروع ہو چکی ہے۔"
بہت ہی معصوم انسان تھے۔ اتنے اچھے لوگ اتنے دوست اب کہاں ملتے ہیں۔ چند سال قبل رمضان صاحب کا انتقال ہوا ہے۔ مجھے تو ان کی موت کی خبر بھی بہت دیر سے ملی تھی۔ محلے میں ایک اسکول تھا جس کے مالک صغیر صاحب بہت منحنی سے شریف انسان تھے۔ ان کی دو لڑکیاں تھیں۔ رمضان صدیقی صاحب ان کی ایک صاحبزادی سے شادی کرنا چاہتے تھے کیونکہ وہ لڑکی انہیں پسند آ گئی تھی۔ انہوں نے یہ سوچا کہ کیوں نہ صغیر صاحب کی اپنے کوارٹر میں دعوت کر دی جائے اور اس کے بعد شادی کی گفتگو ہو۔
رمضان صاحب نے اس معاملے میں میری خدمات حاصل کیں۔ "یار منظر۔ میں نے صغیر صاحب کو کھانے پر بلایا ہے۔ تم بھی آ جاؤ۔ تم تو جانتے ہو کہ یہاں میرا کوئی بھی نہیں ہے۔ تم میری طرف سے ان سے شادی کی بات کر لینا۔ میں اپنی زبان سے اپنا رشتہ پیش کرتے ہوئے اچھا نہیں لگوں گا۔"
"یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔" میں نے انہیں تسلی دی۔ "میں صغیر صاحب سے سارے معاملات طے کر لوں گا۔"

اس دن بے چارے رمضان صدیقی نے بہت اہتمام کیا۔ اکیلے آدمی تھے۔ خود ہی بہت زبردست کھانا تیار کرلیا۔ مرغ قورمہ پلاؤ، فرنی اور نہ جانے کیا کیا۔ میں بھی ان کے پاس پہنچ گیا تھا۔ مقررہ وقت پر صغیر صاحب بھی تشریف لے آئے۔ کھانے کا دور چلتا رہا پھر چائے چلی۔ اس کے بعد رمضان صدیقی نے مجھے ایک طرف بلا کر کہا۔ ''بھائی۔ میں پان لینے جارہا ہوں۔ اتنی دیر میں تم ان سے بات کرلو۔''

''تم فکرمت کرو۔'' میں نے کہا۔ ''تم واپس آؤ گے تو ایک خوش خبری سننے کو ملے گی۔''

رمضان صدیقی پان لینے کے بہانے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے صغیر صاحب سے باتیں شروع کردیں۔ صرف شرارتاً۔ میں نے جان بوجھ کر رشتے وغیرہ کی کوئی بات ہی نہیں کی بلکہ دنیا بھر کی باتیں کرتا رہا۔ رمضان صاحب ایک گھنٹے کے بعد واپس آئے تھے۔ امیدوں سے بھرے ہوئے پھر صغیر صاحب ہم سے اجازت لے کر رخصت ہوگئے۔ ان کے جاتے ہی رمضان صدیقی نے بے تابی سے پوچھا۔ ''ہاں بھئی۔ اب بتاؤ کیا بات ہوئی۔''

''کون سی بات؟'' میں نے انجان بن کر پوچھا۔

''وہی رشتے کی بات۔''

''اوہ۔ وہ تو میں بھول ہی گیا۔''

رمضان صدیقی نے اپنا سر پیٹ لیا۔ اس بے چارے کی ساری محنت رائیگاں گئی تھی لیکن معصومیت دیکھیے کہ دو چار دنوں کی ناراضگی کے بعد وہ خود ہی میرے پاس چلے آئے تھے۔ اب ایسے لوگ کہاں ہیں۔ اب تو ذرا ذرا سی بات پر برسوں کے یارانے ختم ہوجاتے ہیں۔

میں اس قسم کی شرارتیں کرتا رہتا تھا۔ شاعری بھی چل رہی تھی اور شہناز سے ملاقاتیں بھی جاری تھیں۔ وہ بھی بہت خوبصورت باتیں کیا کرتی۔ چاند رات کو اس کے والد سے ملنے گیا۔ دراصل میں اس کو چاند کی مبارک باد دینے گیا تھا۔ اس کے والد سے دروازے کے باہر باتیں ہوتی رہیں اور وہ مجھے چلمن سے جھانک کر دیکھتی رہی۔ دوسری صبح اس نے مجھ سے کہا کہ سب لوگ آسمان کے چاند کو دیکھ رہے تھے اور میں اپنے چاند کو دیکھ رہی تھی۔

ایک بار میں پھر اس کا ذکر کررہا ہوں۔ شاید ابھی تک میری زندگی اس کی محبت کے دائرے سے باہر نہیں جاسکی ہے۔ میں کسی کولہو کے بیل کی طرح اسی کے مرکز پر گھومتا رہتا ہوں۔ کبھی کبھی جب میرے گھر والے کہیں چلے جاتے اور میں گھر میں اکیلا ہوتا تو وہ میرے لیے چائے اور ناشتا وغیرہ بنا کر لاتی اور مجھے کھاتا دیکھ کر خوش ہوتی رہتی۔ اس نے میری اتنی خدمت کی ہے کہ میں آج تک اپنے وجود میں اس کی خدمتوں کے لمس کی کیفیت محسوس کرتا رہتا ہوں۔

میری تحریروں کی اشاعت کا سلسلہ اسی زمانے میں شروع ہوگیا تھا۔ مجھے یاد ہے میری سب سے پہلی نظم نما غزل ماہنامہ نقاد میں شائع ہوئی تھی۔ وہ ایک بے کار معقول سی نظم تھی لیکن میرے لیے اس کی اشاعت بہت بڑی بات تھی۔ میں نے بڑے فخر کے ساتھ پورے خاندان کو وہ نظم دکھائی۔ بہت سے خوش تھے اور بہت سے یہ کہہ رہے تھے کہ میں اب ناکارہ ہوگیا ہوں۔ ابھی بھی بہت سے لوگ مجھ سے یہ احمقانہ سوال کرتے ہیں کہ آپ اس لائن میں کیسے آئے اور میں انہیں جواب دیتا ہوں کہ خدا کے بندو۔ لکھنے لکھانے کا ہنر حاصل نہیں کیا جاتا۔ یہ تو مقدر میں ہوتا ہے۔ شاعر یا ادیب بنتے نہیں ہیں بلکہ پیدا ہوتے ہیں۔ یہ کوئی ڈگری نہیں ہے کہ اپنی مرضی سے جا کر حاصل کرلی جائے۔

میں جو بھی لکھتا۔ سب سے پہلے شہناز کو دکھاتا۔ وہ جب تعریف کرتی تو میری محنت وصول ہوجاتی۔ میں نے اس کے لیے بہت سی غزلیں لکھیں۔ اپنی شاعری کو اس کے نام منسوب کرتا چلا گیا کیونکہ مجھے اس سے تحریک ملا کرتی تھی۔ اس کے بچھڑ جانے کے بعد میں ہزار کوششوں کے باوجود آج تک پوری ایک غزل بھی نہیں کہہ سکا ہوں۔ اب وہ رعنائی خیال کہاں۔

میں رمضان صدیقی کے حوالے سے جن صغیر صاحب کا تذکرہ کرچکا ہوں ان کا ایک اسکول بھی تھا۔ ان کی لڑکیاں اسی اسکول میں پڑھایا کرتیں۔ ایک بار ایک عجیب واقعہ ہوا۔ صغیر صاحب کے اسکول میں کوئی فنکشن تھا۔ انہوں نے تقریر کرنے کے لیے مجھے بلایا۔ بچوں نے اپنے اپنے آئٹم پیش کیے۔ اس کے بعد جب میں تقریر کرنے کے لیے کھڑا ہوا تو اچانک اسکول کی ایک دیوار گر پڑی۔ بہت سے بچے اس کی زد میں آگئے پھر کیسی تقریر۔ ہم سب زخمی بچوں کو ڈاکٹروں کے پاس پہنچانے میں مصروف ہوگئے۔

تین چار مہینوں کے بعد پھر انہوں نے اپنے اسکول میں ایک تقریب کی۔ اس بار بھی مجھے بلایا گیا اور اتفاق دیکھیں کہ اس بار بھی جب میں تقریر کے لیے کھڑا ہوا تو پھر

ایک دیوار گر پڑی۔ اس تجربے کے بعد صغیر صاحب نے مجھے اپنے اسکول میں بلانا ہی چھوڑ دیا۔

کھوکھراپار میں ایک اور شاعر تھے۔ شہرت بلگرامی جو مرثیے کہا کرتے اور آج کل شاعر اہل بیت پکارے جاتے ہیں (مگر افسوس دو سال قبل وہ انتقال کر گئے)۔ لہک لہک کر ایک خاص ترنم سے غزلیں پڑھا کرتے۔ ان سے بھی تقریباً روزانہ ہی ملاقات ہوا کرتی تھی۔

اس وقت مالی طور پر گھر کی حالت زیادہ بہتر نہیں تھی۔ اس کے باوجود صرف امی کی وجہ سے پورا خاندان ہمارے یہاں جمع رہتا تھا اور خدا جانے قلیل اسباب میں بھی اتنی برکتیں نازل کر دی تھیں کہ کسی قسم کی تنگی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ بلا مبالغہ دن بھر میں تقریباً سوڈیڑھ سو مہمان آیا کرتے تھے اور امی ان کی خاطر تواضع میں لگی رہتی تھیں۔ ایسا کوئی بھی نہیں تھا جو بغیر کچھ کھائے پیے گھر سے چلا گیا ہو۔ پورا محلہ اس بات پر حیران ہوا کرتا تھا کہ ہمارے یہاں مہمان کتنے آیا کرتے ہیں۔

ہم سب ہنستے بولتے رہتے تھے۔ اتنے خوبصورت اور آسودہ دن زندگی میں پھر کبھی نہیں آسکے۔ مہمانوں کے حوالے سے ایک اور دلچسپ بات ہے۔ ہمارے یہاں بڑے کمرے میں تخت بچھے ہوئے تھے اسی لیے جو مہمان آتا وہ بیٹھنے کے لیے نہیں بلکہ لیٹنے کے لیے آتا تھا۔ کچھ دیر تک وہ بیٹھا رہتا پھر آہستہ آہستہ اپنے پاؤں پھیلا کر لیٹ جاتا اور کچھ دیر بعد باقاعدہ سو جایا کرتا اور ہم سب بوکھلائے بوکھلائے گھومتے رہتے۔

ایک صاحب تھے جو اسی قسم کے مہمان تھے وہ ہر دوسرے تیسرے دن ہمارے یہاں آتے اور معمول کے مطابق آکر لیٹ جاتے پھر سو جاتے۔ ایک بار میں کہیں باہر سے گھر آیا تو وہ لیٹے ہوئے تھے۔ مجھے نہ جانے کیوں غصہ آگیا۔ میں نے اپنے چھوٹے بھائی ریاض سے کہا۔ ''ریاض، اس آدمی کو تخت سمیت اٹھا کر باہر گلی میں پھینک آؤ۔''

وہ صاحب بری طرح ناراض ہو کر چلے گئے اور پھر واپس نہیں آئے۔ عجیب عجیب کردار تھے۔ ایک اور صاحب تھے۔ بہت ضعیف لیکن بہت مزے کے انسان۔ ان کے گھر پر مذہبی تقریبات ہوتی رہتیں۔ کبھی عرس، کبھی میلاد، کبھی قوالیاں۔ وہ بھی اپنی ضعیفی کے باوجود کسی نہ کسی طرح ہانپتے کانپتے ہوئے ہمارے ہاں آجایا کرتے۔ ہم سب انہیں نانا کہا کرتے تھے۔

''نانا۔ سنا ہے اس دفعہ آپ کے یہاں آموں کی پیٹیاں آئی ہیں۔''

''ہاں آئی تو ہیں۔'' وہ ایک معصوم سی مسکراہٹ کے ساتھ کہتے۔

''تو بس نانا۔ کل کچھ آم لیتے آیئے گا۔''

اور وہ بے چارے اپنے گھر سے آم چرا چرا کر لایا کرتے، اپنی بیوی اور بچوں سے چھپا کر رات کے کسی وقت اٹھتے۔ کسی تھیلی وغیرہ میں آم بھرتے اور اس تھیلی کو رات بھر کے لیے کہیں چھپا کر رکھ دیتے اور صبح ہوتے ہی تھیلی اٹھا کر ہمارے یہاں پہنچ جاتے اور ہم سب بھائی بہن مزے مزے سے آم کھا کر ان کی حوصلہ افزائی کیا کرتے۔ ''واہ۔ نانا۔ آپ نے تو کمال کر دیا۔ آپ تو بہادر آدمی ہیں۔''

اور وہ اس دوران مسکراتے رہتے تھے۔ اتنی معصومیت تھی ان میں۔ ان ہی کا ایک اور دلچسپ واقعہ بھی تحریر کیے دیتا ہوں۔ ان کی ایک عادت بہت عجیب تھی۔ وہ جب بات کرتے تو باتوں کے دوران اپنے برابر والے شخص کی ران پر زور سے ہاتھ مارتے رہتے تھے۔ ہم لوگوں کو ان کی اس عادت کا علم تھا اس لیے ہم ان سے ذرا دور ہو کر بیٹھتے اور وہ اپنی عادت کے مطابق فرش پر ہاتھ مارتے رہتے۔

ایک بار ان کے یہاں ایک افطار کی دعوت ہوئی۔ اس دعوت میں انہوں نے ایک عربی شخص کو بھی مدعو کر لیا تھا۔ جو بے چارہ کسی مدرسے کا طالب علم تھا اور اردو کا ایک لفظ بھی نہیں جانتا تھا۔ اس کی بدقسمتی کہ اسے ان صاحب کے بالکل برابر میں جگہ ملی۔ اب ان بزرگ نے ہم لوگوں کی طرف دیکھ کر کوئی بات شروع کی اور اپنی عادت کے مطابق ایک زوردار ہاتھ اس عربی کی ران پر جڑ دیا۔ وہ بے چارہ اس وار سے تلملا کر رہ گیا۔ ابھی وہ سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ انہوں نے دوسری دفعہ پھر یہی حرکت کی۔ ہمارا ہنسی روکنا مشکل ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ عربی کچھ کہہ کر باہر چلا گیا۔ میں بھی صورت حال معلوم کرنے اس کے پیچھے پیچھے باہر گیا تو میں نے دیکھا کہ وہ بے چارہ اپنی عبا اٹھا کر اپنی ران کو دیکھ رہا تھا جو مار کھا کھا کر سرخ ہو گئی تھی۔

میں یہ بتا چکا ہوں کہ وہاں ہر ہفتے مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی طرح بھی دے دی جاتی اور طیر کے اساتذہ اپنے شاگردوں کے ساتھ مشاعرے میں شرکت

ہوتے۔ علی شیر خان صاحب نے اپنے گھر میں تنقیدی نشستوں کا سلسلہ بھی جاری کر رکھا تھا۔ یہاں ہم لوگ افسانے سنایا کرتے اور ایک دوسرے کی تخلیق پر بحث کرتے۔ ان باتوں کو بتانے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ آج کے اور اس دور کے ماحول کے درمیان موازنہ ہو سکے۔

بات فراغت کی نہیں بلکہ ذہنی رجحان کی ہے۔ فراغت تو آج بھی بہت سوں کے پاس ہوا کرتی ہے لیکن وہ یہ وقت ٹی وی دیکھ کر یا سیاست پر گفتگو کر کے ضائع کرتے رہتے ہیں۔ ان کے نزدیک ادب وقت کے زیاں کا نام ہے۔ یہ بے کار لوگوں کا مشغلہ ہے۔ خیر خیال اپنا اپنا، پسند اپنی اپنی۔

ہمارے دوستوں میں سب سے پہلے متین خان نے داغ مفارقت دی۔ وہ متین خان جن کا میں ذکر کر چکا ہوں جنہوں نے اپنے دشمنوں سے لڑنے کے لیے اپنے رومال میں ایک عدد پتھر کا بندوبست کر رکھا تھا۔ وہ بیمار تو تھے ہی ایک بار اسپتال گئے تو پھر ان کی واپسی ہی نہ ہوئی اور اب تو آئے دن کسی نہ کسی کے جانے کی خبر ملتی رہتی ہے۔ جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں۔ کہیں سے آب بقائے دوام لے ساقی۔ لیکن یہ دوام کہاں سے مل سکتا ہے؟ ہم تو آنے جانے کے لیے ہیں۔

جمیل الظفر سید سے بھی اسی زمانے کی ملاقات ہے۔ چھریرے بدن کا یہ نوجوان فلسفے کا طالب عالم تھا اور بے انتہا ذہین۔ اس کی باتیں بہت خوبصورت ہوا کرتیں۔ گھر نارتھ ناظم آباد میں تھا جو آج بھی ہے۔ اس وقت وہ گھر تنہا تھا۔ یعنی سوائے جمیل سید کے وہاں اور کوئی نہیں رہتا تھا۔ اس کے پاس ایک بائیک ہوا کرتی تھی۔ میں اکثر اس کے پاس نارتھ ناظم آباد چلا آتا اور ہم دونوں تیموریہ ہوٹل جا کر کھانا کھایا کرتے۔ اس زمانے میں حیدری مارکیٹ نہیں بنی تھی۔ صرف ایک اسٹرکچر تھا۔ البتہ کونے پر تیموریہ ہوٹل تھا۔ اس روڈ پر آگے جا کر مرحومہ پروین شاکر رہا کرتی تھیں۔

ہمارے مزاج اور پسند کا یہ حال تھا کہ امتحان کی راتوں میں ہم نیند بھگانے کے لیے کرنل محمد خان کی بجنگ آمد پڑھا کرتے یا فیض صاحب کی شاعری پر گفتگو کیا کرتے۔ میں نے اپنا پہلا افسانہ ''میٹھا پان'' اسی زمانے میں لکھا تھا جو بعد میں کہیں تلف ہو گیا۔ میرے نہ جانے کتنے افسانے اور کہانیاں اس طرح ضائع ہو چکی ہیں۔

اس زمانے میں شاعری کا یہ حال تھا کہ میں تقریباً روزانہ ایک غزل کہا کرتا۔ طبیعت اتنی موزوں ہو گئی تھی کہ مصرعہ طرح ہاتھ میں آتے ہی غزل ہونی شروع ہو جاتی تھی۔ افسوس کہ میری بے پروائی کے سبب میری ساری شاعری ضائع ہو چکی ہے میں نے کبھی ریکارڈ ہی نہیں رکھا۔

مجھے یاد نہیں کہ میں نے سگریٹ نوشی کب سے شروع کی۔ شاید مبین نے اس کی عادت ڈالی تھی۔ ہم وڈ بائن سے شروع ہوئے تھے۔ تھوڑے پیسے ملتے تو اس سے سگریٹ خرید لیتے۔ مبین کے ساتھ میں نے بہت اچھے دن گزارے۔ بے فکری اور آوارہ گردی کے دن۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے رازدار تھے۔ میں اسے شہناز سے اپنی محبت کی باتیں بتایا کرتا۔ اس کے جواب میں وہ بھی اپنی داستان محبت سنا دیا کرتا۔ بہت ہی میٹھے دن تھے۔ آہستہ آہستہ اثر کرتے ہوئے وجود پر محیط ہوتے ہوئے دن۔

ایک دوپہر ہم دونوں ماڈل کالونی کی طرف سے واپس آرہے تھے کہ ہم نے ریلوے لائن پر ایک بچے کو دیکھا جس کی ایک ٹانگ کٹ گئی تھی اور وہ سناٹے میں پڑا ہوا تھا۔ زخمی ٹانگ سے خون نکل رہا تھا لیکن وہ ہوش میں تھا۔ ہم لوگوں کا بھی عجیب حوصلہ تھا یا خدا نے حوصلہ دے دیا تھا کہ ہم نے اس زخمی بچے کو گود میں اٹھا لیا اور باری باری اسے گود میں لے کر دوڑتے ہوئے اس کے گھر پہنچ گئے۔ جہاں ظاہر ہے ایک کہرام مچ گیا تھا۔

میں سوچتا ہوں کہ اگر اس قسم کی ہمدردی ہم آج کرتے تو شاید پولیس سب سے پہلے ہم دونوں ہی کو اندر کر دیتی لیکن وہ بہت بھلا دور تھا۔ جب شرافت زندہ تھی ایسی بات نہیں تھی کہ یہ شہر اس زمانے میں پارساؤں کا شہر ہو یا وارداتیں نہ ہوتی ہوں۔ سب کچھ ہوتا تھا بلکہ رات ہوتے ہوتے جرائم کے آسیب سڑکوں پر آ جایا کرتے تھے اور ایک دہشت منڈلانے لگتی تھی جس کا تجربہ مجھے اور مبین کو ہو چکا تھا۔ وہ ایک حیرت انگیز رات تھی۔ اتنی بھیانک کہ شاید ہی کوئی اس بات پر یقین کر سکتا ہو۔ میں آج بھی سوچتا ہوں تو وہ رات ایک خواب کی طرح محسوس ہوتی ہے۔ کیا ایک ہی رات میں پے در پے اتنے حادثات ہو سکتے ہیں؟ لیکن ہوئے تھے اور وہ بھی ہمارے ساتھ۔

منظر امام کی خودنوشت ابھی جاری ہے

بقیہ واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ کریں

چائے

رانا محمد شاهد

یہ ایک ایسا مشروب ہے جو عالمی طور پر پسند کیا جاتا ہے۔ ہر ملک میں مرغوب ہے۔ اس کی شروعات کیسے ہوئی؟ کس ملک کے لوگوں نے اسے پہلی بار بطور مشروب استعمال کیا۔

معلومات میں اضافہ کے لیے ضرور پڑھیں

ایک تحقیق کے مطابق روزانہ دو ارب افراد اپنے دن کا آغاز چائے کی گرما گرم پیالی سے کرتے ہیں۔ چائے پانی کے بعد دنیا میں سب سے زیادہ پیا جانے والا مشروب ہے۔ چائے مفید اور صحت مند زندگی دیتی ہے۔ سردیوں میں سردی لگتی ہے تو یہ آپ کو حرارت مہیا کرتی ہے اور اگر آپ کا دماغ گرم ہو تو یہ اسے ٹھنڈا کرتی ہے۔ جہاں ذہنی تناؤ کے وقت آپ کو سکون مہیا کرتی ہے، وہیں روز مرہ زندگی میں ہردم آپ کا ساتھ دیتی نظر آتی ہے۔ ہر محفل کی

جان اور ہر گھر کی میزبان "چائے" کے بارے میں بہت سے لوگ نہیں جانتے ہوں گے کہ مزاج میں تیزی اور چستی لانے والا یہ مشروب ہم تک کیسے پہنچا۔

انسانی مزاج کو راحت بخشنے والی اور دماغ کو چستی مہیا کرنے والی چائے کی کہانی کا آغاز ایک دلچسپ اور سنسنی خیز انداز سے ہوتا ہے۔ ویسے تو چائے کی ابتدا کے حوالے سے کئی کہانیاں مشہور ہیں۔ مگر سب سے مشہور کہانی ایک چینی بادشاہ شین ننگ کی ہے۔ قدیم چینی دیو مالائی بادشاہ شین ننگ صفائی کا بہت خیال رکھتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے اپنی تمام رعایا کو حکم دیا کہ وہ پانی اُبال کر پیا کریں۔ ایک دن جنگل میں بادشاہ کے لیے ایک درخت کے نیچے پانی اُبالا جا رہا تھا کہ چند پتیاں ہوا سے اڑ کر دیگچی میں جا گریں۔ بادشاہ نے جب یہ پانی پیا تو نہ صرف یہ کہ اسے یہ ذائقہ پسند آیا بلکہ اس کے بدن میں چستی بھی آ گئی۔ ابلتے ہوئے پانی میں گرنے والی یہ پتیاں چائے کی تھیں۔ بادشاہ نے اپنے تجربے کے بعد عوام کو بھی حکم دیا کہ وہ بھی اسے آزمائیں۔ بادشاہ کے مطابق پتیوں سے بنا یہ پانی بخار، گردے کی تکلیف اور متعدد بیماریوں میں مفید ثابت ہوا ہے۔ یوں یہ مشروب آہستہ آہستہ چین سے دنیا بھر میں پھیل گیا۔ آج کی تحقیق صدیوں پہلے ہی بادشاہ کی بات کی تصدیق کرتی ہے کہ چائے میں متعدد بیماریاں روکنے اور عمر بڑھانے کی صلاحیت موجود ہے۔

کہا جاتا ہے کہ 16ویں صدی کی ابتدا میں پرتگالی اس کی تجارت کرنے لگے اور یورپ بھی چائے سے آشنا ہوگیا۔ پرتگالی ہی دراصل چائے کی پتی چین سے یورپ لائے۔ 1641ء میں ایک ولندیزی معالج نکولس ٹلپ نے تحقیق کے بعد اپنی کتاب میں لکھا کہ چائے پینے والے افراد بہت سی بیماریوں سے محفوظ رہتے ہیں اور یہ کہ ان کی عمر بھی لمبی ہوتی ہے۔ یوں ایک صدی کے اندر اندر چائے دنیا کے مختلف علاقوں میں پہنچ گئی۔ انگریزوں کو یہ اتنی پسند آئی کہ گھر گھر اس کا رواج ہوگیا۔

یہاں سب سے اہم بات یہ تھی کہ چین سے یورپ اور دوسرے ملکوں میں چائے کی پتی کیسے پہنچی۔ اس حوالے سے ایک کہانی بیان کی جاتی ہے جو کسی سنسنی خیز ناول سے کم نہیں۔ برصغیر میں ایسٹ انڈیا کمپنی پر مشرق سے ہر قسم کی تجارت کی ذمہ داری تھی۔ اسے چین سے چائے کی پتی مہنگے داموں خریدنا پڑتی تھی۔ اس کے بعد طویل سمندری راستے سے دنیا کے باقی حصوں تک چائے پہنچانے میں اخراجات میں مزید اضافہ ہو جاتا تھا۔ چنانچہ انگریز حکومت یہ چاہتی تھی کہ اپنی نوآبادی ہندوستان میں چائے کی کاشت شروع کرے تاکہ چین سے اسے مہنگے داموں چائے نہ لینی پڑے اور وہ خود اس میں خودکفیل ہو سکے۔

اس حوالے سے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ چائے کے پودے کے بارے میں انگریز کے پاس کچھ بھی معلومات نہ تھیں۔ چائے کا پودا کیسے اگتا ہے۔ اس سے چائے کیسے حاصل کی جا سکتی ہے، باوجود کوشش کے اس راز سے پردہ نہ اٹھایا جا سکا۔ چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس مشکل مہم کے لیے ایک انگریز رابرٹ فارچیون کو منتخب کیا۔ رابرٹ کے ذمے یہ کام تھا کہ اسے چین کے اُن مختلف علاقوں تک جانا تھا جہاں مارکو پولو کے بعد کسی یورپی نے قدم نہیں رکھا تھا۔ اسے چائے کے پودے کے بارے میں تمام معلومات اکٹھی کرنا تھی۔ کمپنی کو یہ معلوم ہوا تھا کہ چین کے صوبے فوجیان کے پہاڑوں میں سب سے عمدہ چائے اُگتی ہے اس لیے رابرٹ فارچیون کو وہیں جانے کا حکم ملا تھا۔

رابرٹ کو اس پُرخطر مہم پر جانے کے لیے جاسوس کا روپ دھارنا تھا۔ چنانچہ اپنا حلیہ تبدیل کرنے کے لیے اسے سر منڈوانا، بالوں میں نقلی مینڈھا گوندھنا اور چینی تاجروں جیسا روپ دھارنا پڑا۔ اس نے رابرٹ فارچیون سے اپنا ایک چینی نام "سنگ ہوا" یعنی "شوخ پھول" بھی رکھ لیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے اس جاسوس کو یہ ہدایات دی تھیں کہ چائے کے بہترین بیج اور پودے ہندوستان منتقل کرنے کے ساتھ ساتھ اس پودے کی کاشت اور چائے کی پتی کی تیاری کے حوالے سے ہر ممکنہ معلومات حاصل کرے۔ اس مشکل و مشقت طلب کام کے اسے پانچ سو پاؤنڈ سالانہ ادا کیے جانے تھے۔

فارچیون ایک تربیت یافتہ ماہر نباتیات تھا۔ تاہم اس کا کام آسان نہ تھا۔ اسے نہ صرف چائے کی پیداوار کے طریقے سیکھنے تھے۔ بلکہ اس نایاب پودے کو چین سے چوری کر کے ہندوستان بھی لانا تھا۔ اسے اپنے تجربے سے اندازہ ہوگیا تھا کہ چند پودوں سے کام نہیں چلے گا۔ بلکہ چین سے بڑے پیمانے پر چائے کے پودے سمگل کر کے ہندوستان لانا ہوں گے تاکہ چائے کی پیداوار بڑے پیمانے پر ہو سکے۔ اس مشکل مہم میں فارچیون کا خیال تھا کہ

ہندوستان میں چائے کا بین الاقوامی کاروبار عمدہ ترین چائے سے کیا جائے... چنانچہ اس کا مقصد چائے کے تمام پودوں کا حصول نہ تھا بلکہ وہ چائے کی عمدہ ترین قسم حاصل کرنا چاہتا تھا۔

رابرٹ فارچیون نے یہ مشکل سفر کشتیوں، پالکیوں، گھوڑوں، خچروں اور دشوار گزار راستوں پر پیدل چل کر بھی طے کیا۔ بالآخر وہ چائے کے ایک بڑے کارخانے تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ وہاں اس نے اپنی تحقیق میں یہ اہم بات اخذ کی کہ سبز چائے اور کالی چائے ایک ہی قسم کے پودے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس سے پہلے یورپ میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ سبز چائے اور خالی چائے کے پودے الگ الگ ہوتے ہیں۔ فارچیون نے دیکھا کہ اصل فرق پودے میں نہیں بلکہ سکھانے اور پکانے کے طریقے میں ہے۔ اس دوران اسے چائے کی مختلف اقسام سبز، کالی، سفید اور سرخ چائے، ان کی کاشت، اگنے کے موسم، پتی کی پیداوار اور سکھانے کے طریقوں کے حوالے سے مختلف تجربات سے گزرنا پڑا۔ فارچیون چائے بننے کے ہر ہر مرحلے کا خاموشی سے مشاہدہ کرکے نوٹس بناتا رہا۔

بالآخر رابرٹ فارچیون کی محنت رنگ لائی اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔ وہ چائے کے پودے کے بیج اور چند مزدور بھی ہندوستان اسمگل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس کی نگرانی میں چائے کے پودے آسام میں لگانے کا فیصلہ کیا لیکن یہاں ایک سنگین غلطی ہوئی جس کی طرف کسی کا دھیان نہ گیا۔ فارچیون چین سے یہ پودے اسمگل کرکے لایا تھا۔ یہ پودے چین کے بلند و بالا پہاڑوں کے ٹھنڈے موسموں کے عادی تھے۔ چونکہ آسام ایک گرم مرطوب علاقہ تھا اس لیے یہاں کی آب و ہوا ان پودوں کو راس نہ آئی اور وہ ایک ایک کرکے سوکھتے چلے گئے۔ اتنی محنت و مشقت بے سود ہو چلی تھی کہ ایک دلچسپ اتفاق نے اس علاقے کی قسمت بدل دی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی خوش قسمتی تھی کہ انہی مسائل کے دوران آسام میں اگنے والے ایک پودے کا معاملہ سامنے آیا۔ یہ پودا ایک اسکاٹش سیاح نے 1823ء میں دریافت کیا تھا۔ یہ پودا ایک جنگلی جھاڑی کی مانند آسام کے پہاڑی علاقوں میں اُگتا تھا۔ جس کی خاص بات یہ تھی کہ یہ چائے سے ملتا جلتا تھا۔ چنانچہ کمپنی نے فارچیون کو مہم کی ناکامی کے بعد اپنی تمام تر توجہ آسام کے اس پودے کی طرف مبذول کردی۔

فخرالدین رازی

(1149-1209ء)

ابوعبداللہ محمد بن عمر بن الحسین۔ اسلام کے مشہور ترین علمائے دین ومفسرین میں سے ایک سربرآوردہ عالم۔ بمقام رے پیدا ہوئے۔ ان کے والد ضیاء الدین ابوالقاسم اپنے شہر کے خطیب تھے، اسی لیے بیٹے کا لقب ابن الخطیب ہوگیا۔ ادب اور دینیات کی تحصیل سے فراغت کے بعد فخرالدین خوارزم چلے گئے جہاں وہ معتزلہ کے خلاف مناظروں میں مسلسل مشغول رہے جنہوں نے انہیں ملک چھوڑنے پر مجبور کردیا۔ ماوراالنہر پہنچے تو وہاں بھی ایسی ہی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا چنانچہ رے واپس آکر انہوں نے شہاب الدین غوری سے تعلقات استوار کیے، جس نے ان پر اعزازت اور دولت کی بارش کردی۔ 1184ء میں جب وہ بخارا کے ارادے سے ماوراالنہر جاتے ہوئے کچھ عرصے کے لیے سرخس میں ٹھہرے تو وہاں کے ایک طبیب نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنے پاس ٹھہرالیا۔ اظہار تشکر کے طور پر انہوں نے بوعلی سینا کی ''کلیات'' کی شرح لکھی۔ بخارا میں انہیں حسب توقع سرپرستی نہ ملی تو وہ ہرات چلے گئے، جہاں غزنہ کے غوری غیاث الدین نے انہیں شاہی محل ہی میں عوام کے لیے ایک مدرسہ کھولنے کی اجازت دے دی۔ سمرقند، ہندوستان اور دیگر مقامات کی سیاحت کے بعد وہ ہرات میں اقامت گزیں ہوگئے۔ اور عمر کا بڑا حصہ وہیں گزارا۔ ہرات میں وہ شیخ الاسلام کے لقب سے ملقب ہوئے۔ اس زمانے میں ان کی شان وشوکت عروج پر تھی چنانچہ تین سو سے زائد شاگرد ان کے ہمرکاب رہتے تھے۔ آغاز زندگی میں تنگ دست اور آخر عمر میں خوشحال تھے۔ رازی کی تصنیفات کی فہرست بہت طویل ہے، جن کا تعلق زیادہ تر کلام، فلسفہ، فقہ اور تفسیر سے ہے۔ اہم تصنیفات یہ ہیں: 1۔ اساس التقدیس فی علم الکلام۔ 2۔ بوامع البینات فی الاسماء والصفات (3) شرح الاشرات (4) المعالم فی اصول الدین۔ 5 مفاتیح الغیب (6) المناظرات (7) المباحث المشرقیہ۔

مرسلہ نعیم الدین، حاصل پور

آہستہ آہستہ دیسی چائے کی کاشت بڑھی تو کمپنی نے آسام کا ایک بڑا علاقہ اس ہندوستانی پودے کی کاشت کے لیے مختص کر دیا۔ دیسی چائے کے پودے کی کامیابی نے تجارت کے نئے در کھول دیئے۔ ایک دہائی کے اندر یہاں کی چائے کی پیداوار نے چین کو تینوں شعبوں مقدار، معیار اور قیمت میں پیچھے دھکیل دیا۔ چین میں چائے کی برآمد کم ہوئی تو وہاں چائے کی کاشت بھی کم ہوگئی۔ یوں چائے کے باغات خشک ہوگئے اور وہ ملک جو چائے کی پیداوار کے حوالے سے دنیا بھر میں مشہور تھا ایک دم بہت پیچھے چلا گیا۔ برصغیر میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے نہ صرف چائے کی کاشت کو بڑے پیمانے پر بڑھایا بلکہ چائے بنانے اور پینے کے آرٹ کو بھی فروغ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھارت چائے کی پیداوار میں دنیا میں سب سے آگے ہے۔

چائے کی تاریخ پر نظر دوڑائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ چینی لوگ ہزاروں برس تک پانی میں پتی ڈال کر پیتے رہے۔ انگریزوں نے چائے میں ایک نئی چیز متعارف کروائی اور وہ یہ کہ انہوں نے پہلے اس پانی کو پتی میں چینی اور پھر دودھ ڈالنا شروع کر دیا۔ آج بھی بیشتر چینی باشندے چائے میں کوئی اور چیز ڈالنا پسند نہیں کرتے مگر ہماری صورت حال مختلف تھی۔ ہم ہندوستانیوں نے جہاں انگریزوں کی دوسری عادات اپنائیں، وہیں چائے میں ملاوٹ سے کیوں پیچھے رہتے۔ اردو کے معروف ادیب و دانشور مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی آپ بیتی ''غبارِ خاطر'' میں چائے کے ساتھ ہمارے سلوک کا تذکرہ کچھ یوں کیا ہے۔ ''چائے چینیوں کی پیداوار ہے اور چینیوں کی تصریح کے مطابق پندرہ سو برس سے استعمال کی جارہی ہے۔ مگر وہاں کسی کے خواب وخیال میں بھی یہ بات نہ گزری ہوگی کہ اس جوہر لطیف کو دودھ کی کثافت سے آلودہ کیا جاسکتا ہے۔ مگر سترہویں صدی میں جب انگریز اس سے آشنا ہوئے تو نہیں معلوم ان لوگوں کو کیا سوجھی کہ انہوں نے دودھ ملانے کی بدعت ایجاد کی۔ اور چونکہ ہندوستان میں چائے کا رواج انہی کے ذریعے ہوا، اس لیے یہ بدعت یہاں بھی پھیل گئی۔ رفتہ رفتہ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ لوگ چائے میں دودھ ڈالنے کی بجائے دودھ میں چائے کر ڈال کر پینے لگے۔

چائے میں شفا بخش خصوصیات ہوتی ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس مشروب کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا اور اس کی حمایت میں دعوے بھی بڑھتے گئے۔ برطانیہ کی ایک یونیورسٹی کے شعبہ طب کے ڈین پروفیسر ونسنٹ مارکس نے 25 سال تک کیفین اور دیگر مشروبات پر تحقیق کی۔ اس کا کہنا تھا ''ایسا لگتا ہے کہ چائے کے بعض اجزاء صحت کے لیے مفید ہوسکتے ہیں اور ان سے بعض اقسام کے سرطان، دل کے امراض، فالج اور ہڈیوں کی بوسیدگی کا خطرہ کم ہوجاتا ہے۔''

مختلف تجربات کے بعد یہ اندازہ لگایا گیا کہ چائے سرطان سے محفوظ رکھتی ہے۔ ان میں آنتوں اور سانس کی نالی کا سرطان شامل ہے۔ برطانیہ کے ہی ایک ماہر طب ڈاکٹر سائمن میکسویل کا کہنا ہے ''چائے سرطان، فالج اور امراض قلب جیسی بیماریوں کا سدباب کر کے اس کی عمر میں اضافہ کرتی ہے۔ پھلوں اور سبزیوں کے زیادہ استعمال کے ساتھ اگر چائے نوشی کی جائے تو یہ صحت کے لیے مفید ہے۔''

ماضی میں چائے کے استعمال سے بہت سے لوگوں نے صحت مند زندگی گزاری۔ اس حوالے سے ماہرین کا کہنا ہے کہ ابلتا اور کھولتا ہوا پانی بیماریاں پھیلانے والے جراثیم کو مار ڈالتا ہے چنانچہ اعتدال میں چائے کا استعمال لوگوں کو صحت مند رکھتا ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق چائے میں فلورائڈ ہوتا ہے جو نہ صرف مسوڑھوں کو مضبوطی فراہم کرتا ہے بلکہ دانتوں کو کیڑا لگنے سے بھی محفوظ رکھتا ہے۔ جاپانی ماہرین کے مطابق چائے دانتوں پر میل کی تہہ نہیں جمنے دیتی اور بہت سے ایسے جراثیم چائے سے تلف ہوجاتے ہیں جن سے مسوڑھے خراب ہوتے ہیں۔

انسان ہزاروں برس سے نظام انہظام کے مسائل اور دیگر امراض کے لیے چائے کا استعمال کر رہا ہے۔ جڑی بوٹیوں سے تیار ہونے والی مختلف اقسام کی یہ چائے متلی، قبض اور بدہضمی میں بہت فائدہ مند ہوتی ہے۔ ہاضمے کی بہتری کے لیے استعمال ہونے والی پانچ اقسام کی چائے بہت شوق سے پی جاتی ہے۔ ان اقسام کا مختصر مختصر تذکرہ بھی سن لیں۔

ایک تحقیق کے ذریعے یہ معلوم ہوا ہے کہ پودینے میں پایا جانے والا مرکب مینتھول ہاضمے کے مسائل میں فائدہ پہنچاتا ہے۔ عام طور پر پودینہ ذائقے، خرابی معدہ میں راحت پہنچانے کے حوالے سے مشہور ہے۔ پودینے کی چائے کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کا اثر پودینے

کے تیزن جیسا ہوتا ہے۔
ادرک میں پائے جانے والے مرکبات متلی، اکڑن، اپھار، گیس اور بدہضمی میں فائدہ پہنچاتے ہیں ادرک اور اس سے بنی چائے کے فوائد کو مماثل سمجھا جاتا ہے۔
سونف کا ذائقہ سینٹھی سے ملتا جلتا ہے۔ اسے خام حالات میں کھایا جاسکتا ہے۔ سونف سے بنی چائے ذائقے میں سب سے اچھی ہوتی ہے۔ یہ قبض میں مفید ہے۔ نظام انہظام میں خوراک کے گزرنے کو آسان بنادیتی ہے۔ 80 سال سے زائد عمر کے ایک بوڑھے شخص کو قبض کی شکایت تھی۔ انہوں نے مسلسل 28 دن سونف سے بنی چائے پی اور نظام انہظام میں بہت بہتری آئی۔
سنا (Senna) ایک ایسی جڑی بوٹی ہے جو پھول دار پودے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس میں موجود کیمیکل بڑی آنت میں پٹھوں کی سختی کو دور کر کے خوراک کے گزرنے کو آسان بناتا ہے۔ سنا کی بنی چائے بچوں و بڑوں دونوں کو قبض میں راحت دیتی ہے۔
سیاہ چائے بہت سے صحت مند مرکبات کا مجموعہ ہے۔ اس میں شامل مختلف پودے مختلف کام کرتے ہیں۔ کوئی ہاضمہ بہتر کرتا ہے تو کوئی معدے کو السر سے بچاتا ہے۔ سیاہ یا کالی چائے سب سے زیادہ استعمال کی جانے والی چائے ہے۔ یہ دل کے امراض کم کرنے میں مدد دیتی ہے۔
ہاضمے کی بہتری کے لیے استعمال کی جانے والی چائے کی ان مشہور اقسام کے بارے میں جاننے کے بعد یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ عام طور پر جڑی بوٹیوں سے بننے والی چائے صحت مند افراد کے لیے بہت مفید سمجھی جاتی ہے۔ مگر اپنی روزمرہ زندگی میں کسی نئی چائے کو شامل کرنے سے پہلے احتیاط ضروری ہے۔ بعض اوقات خاص حالات مثلاً حاملہ اور دودھ پلانے والی ماؤں کے حوالے سے ماہرین طب سے مشورہ ضروری ہے۔ اگر آپ نظام انہظام میں بہتری کے لیے کسی بھی قسم کی چائے استعمال کرنا چاہتے ہیں کہ تو پہلے تھوڑی مقدار میں پئیں، بہتری محسوس کریں تو مقدار بڑھائیں۔
ہمارے ادیبوں و شاعروں کے ہاں بھی چائے کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ لاہور کا پاک ٹی ہاؤس اس حوالے سے تاریخی حیثیت رکھتا ہے جو ادبی شخصیات کا مرکز رہا ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے سعادت حسن منٹو نے معاشرے کے تلخ حقائق بیان کیے تو فیض احمد فیض نے انقلاب، حبیب جالب نے سیاست، انشاء جی نے مزاح اور احمد فراز نے رومانویت کے ہاتھ کی بنی چائے کو ایک شاعر بھی فراموش نہ کرسکا:

ملی بہت یوں تو زمانے بھر کی خوشی
وہ تیرے ہاتھ کی چائے نہ پھر ملی مجھ کو

تو وہیں ایک شاعر کو محبوب نے فراموش بھی کیا تو کچھ ادا سے:

دو کی بجائے چائے بنائی ایک کپ
افسوس آج تو بھی فراموش ہوگیا

شاعری میں چائے کی اہمیت کا اندازہ لگانا ہو تو ساغر صدیقی کو یاد کیجیے جو اپنی تخلیقات چائے کی پیالی کے عوض قربان کردیا کرتے تھے۔ چائے کے بارے میں یاروں میں یہاں تک کہا جاتا ہے کہ عقیدۂ غالب کے آموں کی مثل ہو کہ میٹھی ہو اور بہت سی ہو۔ ویسے میٹھی والی بات سے اتفاق نہیں ہے کیونکہ 2016ء میں مجھے شوگر ہوگئی تھی۔ اس کے بعد سے پھیکی چائے استعمال کررہا ہوں۔ دن میں تین بار تو لازمی کرتا ہوں اور پھیکی چائے اتنا لطف دیتی ہے کہ شوگر سے پہلے میٹھی کیا دیتی ہوگی۔ یعنی اصل بات زبان کے ذائقے کی ہے۔ چائے میں وہ لطف ہے کہ اس کے بغیر زندگی ادھوری اور بے کیف سی لگتی ہے۔
آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہمارے ہاں غریب سے غریب شخص یا ادارہ بھی مہمانوں کی تواضع سادہ پانی سے نہیں کرتا۔ دو ہی چیزیں ہیں۔ سافٹ ڈرنکس یا چائے۔ یہاں یہ بات تصدیق شدہ ہے کہ انسانی صحت کے حوالے سے چائے سافٹ ڈرنکس کے مقابلے میں بہت زیادہ مفید ہے۔ بعض لوگ تو چائے کے اتنے رسیا ہوتے ہیں کہ دن کا کوئی گھنٹا ایسا نہیں گزرتا کہ جب وہ چائے نہ پیتے ہوں۔ ایسے لوگوں کو دیکھ کر ہی لگتا ہے کہ جیسے یہ چائے کا چمچ منہ میں لے کر پیدا ہوئے ہیں۔ آپ کسی کے ہاں مہمان چلے جائیں یا کوئی آپ کے ہاں مہمان آجائے۔ آپ کو امتحانات یا کسی دفتری کام کے سلسلے میں نیند کے غلبے سے بچنا ہو، ہر جگہ چائے ہی آپ کے کام آتی ہے۔ سچ پوچھیں تو چائے کے بغیر زندگی بے کیف، بے ذائقہ ہے۔ ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ چائے دنیا کی عظیم نعمتوں میں سے ایک ہے۔

++

فلمی دنیا کے شب و روز کا احوال

فلم و ادب

اعجاز احمد نواب

پردۂ سیمیں پر پیش کی جارہی فلم کی بنیاد ادب ہے۔ اگر اچھی کہانی، اچھے مکالمے نہ ہوں تو فلم بین اسے مسترد کردیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ فلمی دنیا میں اچھے ادیب و شاعر کی اہمیت مسلم رہی ہے۔ بلند فکر کے حامل ادیب کی کہانی کو زیادہ کامیابی ملی ہے۔ اب احمد ندیم قاسمی کی کہانی گنڈاسا کو ہی لے لیں۔ اس خوبصورت کہانی پر تین فلمیں بنیں اور کامیاب ہوئیں۔ ابھی ابھی جو فلم بنی ہے اس نے تو دنیا بھر میں نام پیدا کرلیا ہے۔

ادب اور فلم کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے، خاموش فلموں سے لے کر اب تک فلم سازوں نے اردو ادب سے خوب خوب استفادہ کیا، اسی طرح اردو کے تقریباً تمام بڑے ادیب فلم سے وابستہ رہے، اور شعراء اپنی ان غزلوں گیتوں کا حوالہ دیتے رہے جو کسی نہ کسی فلم میں شامل ہوئیں، یا کسی گلوکار نے گائیں۔

لولی ووڈ میں پہلی فلم سے لے کر بیسویں صدی کے آخر تک نامی گرامی مصنفین کے ناول اور افسانے سلولائیڈ کے فیتے پر منتقل کرنے کا سلسلہ جاری رہا، سعادت حسن منٹو کی ان گنت کہانیوں پر فلمیں بنائی گئیں، کرشن چندر نے بے شمار فلمی اسکرپٹ لکھے، عصمت چغتائی کے فلمی کیریئر کا آغاز بھی ایک فلم سے ہی ہوا۔

احمد شجاع پاشا اردو ادب کا ایک بڑا نام ہے، آپ کے ناولوں اور افسانوں پر بننے والی فلموں کی گنتی نہیں کی جاسکتی۔

ابن صفی نے بھی فلم دھماکا لکھی، رضیہ بٹ کے بارہ ناولوں پر فلمیں اور ڈرامے بنے، رنگیلا کی ڈائریکشن میں تیار کی گئی پہلی فلم "دیا اور طوفان" دت بھارتی کے ناول سے ماخوذ تھی۔

کس نے توڑا ہے دل حضور کا
کس نے ٹھکرایا تیرا پیار ہو ہو ہو

وے سب توں سوہنڑیاں، ہائے وے من موہنڑیاں
سلمٰی کنول کے ناول پر فلم بنی، ہدایت کار سنگیتا کی ہدایتکاری میں فلم مٹھی بھر چاول "بیدی کے ناول" اک چادر میلی سی پر بنائی گئی تھی، طارق اسماعیل ساگر نے بھی فلمی اسکرپٹ لکھے، نسیم حجازی کے ناول خاک وخون پر فلم خاک وخون بنائی گئی جس کا مشہور گیت ہے۔

زندگی اپنی گزر جائے گی آرام کے ساتھ
اب تیرا نام بھی آئے گا میرے نام کے ساتھ

حبیب جالب نے فلم کالے چور لکھی

سجن میرے آ آ گونگے دی رمزنوں گونگا جانے
سوجا میری بانہہ رکھ کے سرہانے نہ جھک نہ شرما
سجن میرے آ آ

محی الدین نواب نے حسینہ چار سو بیس اور جوڑ گیا وہ مر گیا سمیت کئی فلموں کے اسکرپٹ لکھے، اسی طرح سیکڑوں فلموں کی کہانیاں ناولوں افسانوں سے ماخوذ ہیں۔

ایک تعلیم یافتہ خاندان کا پڑھا لکھا سپوت حسن عسکری ہے جن کے دادا 1916ء میں لاہور کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ حسن عسکری جسے ناولوں اور کتابوں سے حد درجہ لگاؤ تھا۔ اعلیٰ پولیس افسر کے بیٹے 1944ء میں پیدا ہوئے۔ ایم اے کررہے تھے کہ قسمت انہیں فلمی دنیا میں لے آئی، کچھ نیا کچھ الگ کرنے کی جستجو کے ساتھ مختلف فلم سازوں کو اپنے فلم کی خدمات مہیا کرنے لگے۔ فلم میکنگ کو جب انتہائی قریب سے دیکھا تو ان کے اندر کا کری ایٹو شخص مضطرب ہوگیا۔ ان کا ذہن ڈائریکشن کی طرف مائل ہوگیا، چاہتے تھے کہ کسی اچھی سی اردو فلم کی ڈائریکشن دیں، لیکن چونکہ اس وقت اُردو فلمیں صرف مضبوط اور منجھے ہوئے ہدایت کاروں کے حصے میں ہی آتی تھیں اور حسن عسکری نوجوان اور نووارد تھے، نیز پنجابی فلموں کا خوب زور بھی تھا۔ اچانک ایک دن معروف ترین ہدایت کار کیفی نے ان کی دلچسپی اور صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے انہیں اپنی نئی فلم میں بطور اسسٹنٹ ڈائریکٹر کام کرنے کی پیشکش کردی تو حسن عسکری نے سوچا کہ چلو پنجابی فلم کے بہانے اس شعبے میں داخل ہونے

کا موقع تو مل رہا ہے، یہ فلم چن مکھناں تھی۔

چن میرے مکھناں
تے اک پل ایدھر تکنا
تے نظراں رس نیناں دا چکھناں
او چن میرے مکھناں

اس فلم نے تو پنجابی سینما کے باکس آفس پر دھوم مچا دی۔ یہ فلم 1966ء میں ریلیز ہوئی تھی، اس کے فوراً بعد کیفی نے بھٹی برادرز کے تحت ایک اور نئی فلم شروع کر دی۔ سجن پیارا بھی 1968ء میں ریلیز ہو گئی۔

سجن پیارا ملے کوئی دکھ پھولیے
کاں گلے جندڑی تے نہ رولیے

یہ فلم بھی کامیاب ترین ثابت ہوئی۔ اس زمانے میں تو کیفی عنایت حسین بھٹی کے سر پر ہما بیٹھا ہوا تھا۔ حسن عسکری کی صلاحیتوں کی بھی شہرت پر کھولنے لگی، یہی وجہ تھی کہ ایک اور مشہور ڈائریکٹر اجمیر قادری نے جب اپنی فلم میرا بابل شروع کی تو ان کی نظر انتخاب بھی حسن عسکری پر آ ٹکی۔ میرا بابل بھی کامیاب ہوئی تاہم اس فلم کے درمیان ہی حسن عسکری کو ایک فلم ساز نے اپنی فلم ''خون پسینا'' کے لیے ہدایت کاری کی پیشکش کر دی۔ یہ بھی پنجابی فلم تھی حسن عسکری نے اپنی اس پہلی فلم کے لیے جان لڑا دی تا کہ فلم انڈسٹری میں بحیثیت ڈائریکٹر پاؤں جما سکیں۔ ان کی محنت رنگ لائی اور خون پسینا سپر ہٹ قرار پائی اسی اثناء میں انہیں ایک اور فلم ''سر دھڑ دی بازی'' کی پیشکش ہوئی یہ سلطان راہی کی فلم تھی۔

ایہہ ویلا دکھ سکھ پھولنڑ دا
کیوں جی ئیں کر دا ڈھولنڑ دا

اتفاق سے آخر الذکر فلم بھی بے حد پسند کی گئی اور فلم ساز کی چاندی ہو گئی، یوں حسن عسکری ہدایت کار کنفرم ہو گئے اور انہیں دو فلمیں بنانے کے لیے اور مل گئیں لیکن ابھی شاید عشق کے امتحاں اور بھی تھے۔

حسن عسکری کی اگلی دونوں فلمیں ہیرا اور غیرت دا نشان بری طرح پٹ گئیں۔

اس زمانے میں چونکہ لولی ووڈ میں دو ڈھائی سو ڈائریکٹر تھے لہٰذا جس کی ایک فلم باکس آفس پر ڈھیر ہو جائے اس کو دوسری فلم ملنا مشکل ہو جاتی تھی چہ جائیکہ عسکری صاحب کے ماتھے پر دو ڈیڈ فلاپ فلموں کا تمغہ آویزاں تھا، لہٰذا عسکری صاحب بالکل فارغ ہو گئے، کتابیں پڑھنا ایک ایسا مشغلہ ہے کہ بندہ فارغ اوقات میں بور نہیں ہوتا، کتابیں بوریت دور کرنے کے ساتھ ساتھ ناکامیوں سے سیکھنے اور آگے بڑھنے کا

حوصلہ بھی دیتی ہیں، حسن عسکری تو کتابی کیڑے تھے فلموں سے فارغ ہوئے تو مطالعہ کو اوڑھنا بچھونا بنالیا، یونہی پڑھتے پڑھتے ایک افسانہ ان کی نظروں سے گزرا، افسانہ نگار تھے احمد ندیم قاسمی۔ افسانے کا نام تھا گنڈاسا جس کا ہیرو ایک جٹ ہوتا ہے جس کا نام مولا جٹ ہے۔ یہ افسانہ عسکری صاحب کے دل میں کھب گیا۔ انہوں نے اسے پھر پڑھا، سہ بارہ پڑھا۔ وہ بار بار اس افسانے میں اٹک جاتے۔ اس میں کچھ نیا تھا۔ جٹ کا کردار فلموں افسانوں میں نیا تو نہ تھا البتہ جٹ کو ہمیشہ محنت کش جفاکش وفاشعار دکھایا جاتا تھا لیکن احمد ندیم قاسمی کے افسانے میں یہ کردار خوفناک حد تک دلیر تھا، مجرمانہ حد تک منتقم مزاج تھا۔ مولا جٹ جس کے والد کو عین اس وقت قتل کردیا جاتا ہے جب وہ میلے میں جوانمردی کے جوہر دکھا رہا ہوتا ہے۔

حسن عسکری نے ہر پہلو سے سوچا پرکھا اور پھر فیصلہ کیا کہ اس افسانے پر فلم بنی چاہیے۔ وہ کئی پروڈیوسرز سے ملے لیکن پے در پے دو فلاپ اور ڈبا فلموں کے بعد کوئی پروڈیوسر ان کی صلاحیتوں پر اعتماد کرنے کا روادار نہ تھا۔ کافی وقت بیت گیا کہ اچانک ایک نسبتاً کمزور پروڈیوسر کو کہانی کی ون لائن پسند آگئی اور اس نے اس کہانی پر فلم بنانے کے لیے آمادگی ظاہر کردی۔ فلم ساز عبدالمجید کے رضامند ہوتے ہی فلم پر تیاری شروع کردی گئی۔

مرکزی کردار کے لیے سلطان راہی پر نظریں جم گئیں حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا کہ بشیرا کے تابڑتوڑ کامیابی کے بعد سلطان راہی کو جب کافی ساری فلمیں ملیں تو موضوعات اور کردار کی یکسانیت کی وجہ سے تقریباً سبھی فلمیں اوپر تلے پٹتی چلی گئیں، لہٰذا سلطان راہی بھی کسی اچھی فلم، کسی بہترین بریک تھرو کے انتظار میں تھے۔ انہیں گنڈاسا کا ہیرو مولا جٹ پر مبنی کردار بے حد پسند آیا تھا، فلم ساز کی مالی حالت زیادہ بہتر نہ تھی، لہٰذا احمد ندیم قاسمی کے افسانے گنڈاسا کو فلم کے قالب میں ڈھالنے اور اس کا منظر نامہ اور ڈائیلاگ لکھنے کے لیے ایک بالکل نئے نو آموز اور ناتجربہ کار پتلے دبلے لیکن پڑھے لکھے نوجوان کو بلایا گیا جو بطور فلمی مصنف اپنا کیریئر بنانے کے لیے ایک عرصے سے فلمی دفتروں کے چکر کاٹ رہا تھا لیکن اس کی دال نہ گل رہی تھی۔ اس کا نام ناصر تھا جو بعد میں ناصر ادیب بن کر فلمی افق پر جگمگائے۔ فلم کا نام وحشی جٹ تجویز ہوا۔

بہرکیف نامساعد مالی حالات میں فلم کی شوٹنگ شروع کر دی گئی، فلم سست روی سے شروع ہوئی، لیکن ہدایت کار، مصنف اور مرکزی کردار اس فلم کے سلسلے میں خاصے جوشیلے تھے کیونکہ ان کا مستقبل بہرحال اس فلم سے جڑا تھا، چونکہ پروڈیوسر پارٹی مالدار نہ تھی لہٰذا فلم آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ بار بار اس کی شوٹنگ ملتوی ہوتی، کچھ عرصہ رکی رہتی پھر جب رقم کا کچھ بندوبست ہوتا تو فلم پھر شروع کر دی جاتی، فلم بننے کا دورانیہ بڑھتا گیا 1972ء میں فلم شروع ہوئی تھی اور 1975ء آگیا۔ اتنا وقت بیت جانے سے ایک بڑا نقصان ہونے کا خدشہ پیدا ہوگیا کہ چونکہ فلم بلیک اینڈ وائٹ تھی جبکہ اب اکثر و بیشتر فلمیں رنگین بن رہی تھیں، کہیں مبادا شائقین فلم اسے اس خامی کے باعث ہی مسترد نہ کردیں، لیکن فلم تو ریلیز کرنی تھی۔ خدا خدا کرکے فلم پایۂ تکمیل کو پہنچی اور ڈرتے ڈرتے اسے 7 اگست 1975ء کو سینماؤں میں ناظرین کی عدالت میں پیش کردیا گیا، فلم ساز اور ہدایت کار حسن عسکری پہلے دن پہلے شو کے وقت لاہور کے مین تھیٹر پر موجود تھے۔ پہلا شو ہونے کی وجہ سے رش تو تھا، لیکن فلم کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ بھی پہلا شو دیکھنے والے ہی کرتے ہیں، فلم شروع ہوئی تو اس وقت پروڈیوسر ڈائریکٹر کا سیروں خون بڑھ گیا جب فلم کے شروع میں ہی ...... سلطان راہی میلے میں نمائشی جوانمردی کے مظاہرے میں فتح یاب ہوکر ڈھول کی تھاپ پر بھنگڑا ڈال رہا ہوتا ہے تو عین اسی وقت اس کا دوست (افضال احمد) دوڑتا ہوا آتا ہے اور اسے چیختے ہوئے بتاتا ہے

مولیا

ملکاں نے تیرا پیو قتل کردتا ای

یہ کاٹ دار خبر سن کر سلطان راہی جس کی پشت اسکرین پر ہوتی ہے اور چہرہ دوسری سمت، یکدم ساکت ہوکر رہ جاتا ہے۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں پکڑا ہوا گنڈاسا جو اس کے سر سے بلند ہوتا ہے وہ دونوں ہاتھ گنڈاسا تھامے وہیں رک جاتے ہیں۔ بیک گراؤنڈ چیختا چنگھاڑتا میوزک یکدم تھم جاتا ہے۔ سینما ہال اور سینما اسکرین دونوں پر موت کی سی خاموشی طاری ہو جاتی ہے، پھر اسی پن ڈراپ سائلنٹ میں سلطان راہی مڑتا ہے۔ اور اس کے چہرے کے زاویے غم و غصے کی شدت سے پھڑپھڑاتے ہیں اور وہ آہستگی سے دونوں ہاتھوں سے تھاما گنڈاسا نیچے لانا شروع کرتا ہے، اور پھر چہار سو چھائی موت کی سی خاموشی میں سلطان راہی کی ایک چنگاڑہ بھرتی ہے۔

قتل تے مُن ہونڑ گے روشناں تے او وی ہونڑ گے
جنھاں ہالے تخم کے ساڈا دشمن بنڑناں اے۔

یہ سلطان راہی کی پہلی باضابطہ عوامی رجسٹرڈ بڑک تھی۔ جسے سنتے ہی تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرے سینما ہال کا سکوت ٹوٹ گیا اور سارے ہال کے تماشائیوں نے کھڑے ہو کر

تالیاں بجاتے ہوئے سلطان راہی کو اس کے فن کی داد دی۔
وحشی جٹ سپر ہٹ ہوگئی اس کے ساتھ ہی مالی بحران کے شکار فلم ساز کے لیے خزانے کا دروازہ کھل گیا۔
ناصر ادیب اور سلطان راہی کا ستارہ راتوں رات آسمانِ فلم پر پہنچ گیا اور مشکلات میں گھرے ٹیلنٹڈ نوجوان ہدایت کار حسن عسکری پر فلموں کی بوچھاڑ ہوگئی اور حسن عسکری نے کامیاب فلموں کی ایک لائن لگادی۔
سلاخیں، دوریاں، جنت کی تلاش، چوہدرانی، بسنتی، میلہ، دل کسی کا دوست نہیں اور بے شمار...... بلاشبہ حسن عسکری ایک روایت شکن اور روایت ساز قسم کے ہدایت کار ہیں۔ انہوں نے ایک ایسا ٹرینڈ سیٹ کیا جس کی آج تک تقلید ہورہی ہے۔ وحشی جٹ کے گیت وارث لدھیانوی نے لکھے اور اس کی موسیقی صفدر حسین نے ترتیب دی۔ یہ فلم 134 منٹ طوالت رکھتی ہے۔
حسن عسکری نے مجموعی طور پر اب تک 58 فلمیں ڈائریکٹ کی ہیں جن میں سے 32 پنجابی 18 اردو اور 2 پشتو فلمیں شامل ہیں۔ بطورِ ہدایت کاران کی پہلی فلم 1968ء میں خون پسینا اور آخری فلم 2017ء میں داستان تھی۔ حسن عسکری 1944ء میں پیدا ہوئے اللہ پاک انہیں صحت سلامتی والی عمر خضر عطا فرمائے۔ (آمین)

☆☆☆

مولا جٹ پاکستان فلم انڈسٹری کے ماتھے کا جھومر ہے، یہ ایک ایکشن ڈراما مووی تھی، جس میں تھرل اور سسپنس پورے عروج پر نظر آتا ہے۔
آج پینتالیس سال گزرنے کے باوجود اس کی شہرت اور دبدبہ جوں کا توں ہے، پروڈیوسر کے لیے یہ ایک ایسا بلینک چیک ہے، جسے وہ جب چاہتا ہے رقم بھر کر کیش کروالیتا ہے۔
بہت کم لوگوں کو پتا ہوگا کہ یہ شہرۂ آفاق فلم صرف دو ماہ اور چھبیس دن میں پایہ تکمیل کو پہنچ گئی تھی، جب کہ اس کے ری میک لیجنڈ آف مولا جٹ نے آغاز سے ریلیز تک دس سال لیے مولا جٹ کوئی عام فلم نہیں تھی، پاکستان کا سپر ئیر ڈاکومنٹ ہے اور یقیناً عین اسی طرح لیجنڈ آف مولا جٹ بھی پاکستان کا سپر ئیر ڈاکومنٹ ثابت ہوسکتی ہے، سوشل میڈیا مختلف یوٹیوب چینلز، پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا سے حاصل ہونے والی متفرق معلومات کے مطابق، مولا جٹ میں مرکزی کردار ادا کرنے پر آج سے پینتالیس سال پہلے سلطان راہی کو 70000 روپے معاوضہ ادا کیا گیا تھا، جبکہ فواد خان کو لیجنڈ آف مولا جٹ میں مولا جٹ کے مرکزی کردار کے لیے چالیس لاکھ روپے کے عوض سائن کیا گیا ہے، حمزہ علی عباسی کو نوری نت کے رول پر شاید پینتیس لاکھ ملے ہیں، جبکہ بقول محمد سرور بھٹی پروڈیوسر مولا جٹ مصطفیٰ قریشی کو نوری نت کے کردار کے لیے چالیس ہزار پیش کیے گئے تھے۔
اتفاق سے اس وقت صرف ایک ہی نام ایسا ہے جو مولا جٹ سیریز کی تمام تینوں فلموں کا حصہ رہا ہے وہ ہیں مصنف ناصر ادیب جنہوں نے 1972ء میں وحشی جٹ لکھی۔ 1979ء میں مولا جٹ بھی انہی کے قلم کا کارنامہ تھی اور اب 2022ء میں لیجنڈ آف مولا جٹ کی کہانی منظر نامہ اور مکالمے محترم جناب ناصر ادیب نے ہی تحریر کیے ہیں۔
ناصر ادیب پاکستان فلم انڈسٹری کے سب سے بڑے مصنف ہیں۔ آپ 1947ء میں پیدا ہوئے پہلے پہل ریڈیو پاکستان سے منسلک ہوئے لیکن جلد ہی فلم لائن میں آگئے پہلی فلم 1972ء میں وحشی جٹ سے لے کر لیجنڈ آف مولا جٹ 2022ء تک کل 375 فلموں کی کہانیاں اور مکالمے لکھ چکے ہیں جو بجائے خود اپنی جگہ ایک ورلڈ ریکارڈ ہے۔ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ دنیا بھر میں سب سے زیادہ فلموں کی کہانیاں انہوں نے لکھی ہیں۔ بادی النظر میں ان کا دعویٰ سچ دکھائی دیتا ہے۔ کوئی اور حریف ان کے آس پاس بھی دکھائی نہیں دیتا۔ گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں اپنا نام شامل کروانے کے لیے انہوں نے اپنے تمام کام کا بائیو ڈیٹا متعلقہ ادارے کو بھیج رکھا ہے جو اس وقت پڑتال کے مرحلے میں ہے۔
1981ء میں فلم چن وریام پر اور 1986ء میں فلم یہ آدم پر انہیں پاکستان کے سب سے بڑے نگار فلم ایوارڈ سے نوازا گیا، 2019ء میں ناصر ادیب کو صدر پاکستان کی جانب سے تمغہ برائے حسن کارکردگی بھی عطا کیا گیا ہے، جس طرح ناصر ادیب کا بتدریج فلمی سفر پچاس سالوں پر محیط ہے عین اسی مانند ان کے معاوضے کا سفر بھی انتہائی دلچسپ روئیداد ہے۔ زندگی کی پہلی فلم وحشی جٹ لکھنے کا معاوضہ انہیں دو ہزار روپے ملا تھا جو مولا جٹ تک پہنچتے پہنچتے ساڑھے سات ہزار روپے تک پہنچا اور پھر اب لیجنڈ آف مولا جٹ کے لیے ناصر ادیب صاحب کو پندرہ لاکھ روپے کی خطیر رقم ادا کی گئی، یوں دو ہزار سے پندرہ لاکھ تک پہنچتے پہنچتے انہیں آدھی صدی لگ گئی تاہم وہ لیجنڈ آف مولا جٹ کی زبردست کامیابی کے منتظر ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ وہ آئندہ فلم لکھنے کا معاوضہ پچاس لاکھ روپے وصولیں۔

ناصر ادیب کی کم از کم تین سو فلموں کا مرکزی کردار سلطان راہی تھے، سلطان راہی بھی ایک ریکارڈ ساز فلمی ہیرو تھے۔ پانچ سو سے زائد فلموں میں ہیرو آئے 800 سے زیادہ فلموں میں مرکزی کردار ادا کیا اور مجموعی طور پر لگ بھگ 1000 فلمیں ان کے کریڈٹ پر ہیں۔ سلطان راہی گنیز بک آف ورلڈز ریکارڈ ہولڈر بھی ہیں۔

مولا جٹ کی کامیابی میں ایک بڑا ہاتھ ہدایت کار یونس ملک کا بھی تھا۔

یونس ملک صرف ایک ہدایت کار ہی نہیں بلکہ پنجابی فلم انڈسٹری کے لشکرِ بے کراں کا سپہ سالار بھی ہے، ایکشن پنجابی فلموں کی شہرت و مقبولیت میں یونس ملک کا کردار ہمیشہ زندہ و جاوید رہے گا، دھان پان سا یونس ملک ایک دبنگ ہدایت کار تھا، عام لوگوں نے شاید مولا جٹ کے ساتھ ہی ان کا نام سنا ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ یونس ملک کے کریڈٹ پر سپر ڈپر ہٹ فلموں کی نہ ختم ہونے والی ایک قطار ہے، جس کی بنیاد پر کھڑا یونس ملک لولی وڈ سنیما کی تاریخی کتابوں میں ہمیشہ جاوداں رہے گا، یونس ملک پاکستان کی فلمی صنعت کو ہر دور میں زندہ رکھنے کا تیرِ بہدف نسخہ دے گئے۔ فلمی تجارت کا ایک بہترین فارمولا سب ہدایت کاروں کے ہاتھ میں دے دیا۔

یونس ملک 1948ء میں پیدا ہوئے واجبی تعلیم حاصل کی اور فلم کی کشش انہیں فلم اسٹوڈیوز تک کھینچ لائی۔ فلمی مرکز لاہور میں ان کے قدموں کی آہٹ 1970ء میں سنی گئی جب یہ ہدایت کار افتخار خان کے یونٹ میں داخل ہوا، انتہائی کمزور دبلا پتلا کم پڑھا لکھا واجبی شکل وصورت کا یہ نوجوان، بظاہر کچھ نہ کر سکنے والا لڑکا نظر آتا تھا، ایک سال تک وہ چھوٹے موٹے کاموں تک محدود رہا لیکن جلد ہی ہدایت کار افتخار خان کی جہاندیدہ نظروں نے بھانپ لیا کہ یہ کمزور سا لڑکا مضبوط اعصاب اور بہترین صلاحیتوں سے مالا مال ہے، اور دیگر کاموں میں مصروف ہونے کے باوجود فلم کی شوٹنگ، اسکرپٹ، مناظر، مکالمات اور فلم کے ربط پر گہری نگاہ رکھتا ہے، اور اسسٹنٹس کو اکثر دوران گفتگو لقمہ دیتا رہتا ہے۔

اس زمانے میں اداکار وحید مراد کا چہار سو طوطی بولتا تھا، اردو فلموں کا دور تھا اور وہ چاکلیٹی ہیرو تھے، گیت پکچرائز کروانے اور رومینٹک سین کرنے میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا، لیکن وحید مراد پنجابی فلموں کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور تعداد سے بھی خاصے متاثر دکھتے تھے، انہیں اپنی اداکارانہ صلاحیتوں پر ناز تھا اسی لیے انہوں نے پنجابی سینما تسخیر کرنے کی ٹھانی اور ایک رومینٹک

فلم مولا جٹ لٹریچر کا حصہ ہے۔ یہ احمد ندیم قاسمی کے گنڈاسا سے لیا گیا کردار ہے جو اس زمانے کا ہتھیار تھا۔ مولا جٹ سے پہلے اسی کہانی کو وحشی جٹ کے نام سے فلمایا گیا تھا۔ اس فلم کا اسکرین پلے بھی ناصر ادیب نے لکھا تھا۔ وحشی جٹ سے متاثر ہو کر اسی کہانی کو سرور بھٹی نے دوبارہ فلمایا۔ ان کی تکنیک، مہارت اور ہدایت کاری نے اس فلم کو کامیابی کے آسمان پر پہنچا دیا۔ اس فلم پر نگار ایوارڈ دیا گیا، نامور ادیب کا ایوارڈ مگر یہ ایوارڈ قاسمی صاحب کے نام پر دیا گیا تھا۔ قاسمی صاحب کو نامور ادیب ایوارڈ دیا گیا تو ناصر ادیب نے احتجاج کیا کہ کہانی تو میں نے لکھی ہے۔ اس پر الیاس رشیدی نے کہا کہ کہانی کا خاکہ تو ان کی کہانی سے لیا۔ آپ کو مکالمے کا ایوارڈ مل سکتا ہے۔

☆☆☆

کراچی کی فلم انڈسٹری اس مضبوط کہانی کو نئے انداز میں پیش کر رہی ہے تاکہ پاکستانی فلم انڈسٹری کو سہارا ملے۔ پس منظر پنجاب کا ہے لیکن فلم اردو میں ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ کسی حد تک پنجابی فلموں سے لوگوں نے نفرت کرنی شروع کر دی ہے پنجابی فلم زوال پذیر ہے اس لیے اردو فلمیں پسند کی جا رہی ہیں۔ پڑھے لکھے لوگوں نے اردو فلموں کو پسند کیا ہے۔ نئی تبدیلی کے ساتھ لیجنڈ آف مولا جٹ بھی سنبھالا دے گی کیونکہ اسے بھی ناصر ادیب نے ہی لکھا ہے۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ پرانے ماحول میں کہانی کو لے گئے ہیں جہاں جنگل کا قانون ہے وہاں گنڈاسا ہی چلے گا۔ ہالی ووڈ اسٹائل میں یقیناً لوگ اسے پسند کریں گے کہ یہ اتنی بڑی فلم ہے۔ چونکہ پنجابی لب ولہجہ اور کلچر کراچی والے ادا نہیں کر سکیں گے اس لیے ایک یہ بھی وجہ ہو سکتی ہے کہ اسے ہالی ووڈ اسٹائل میں بنایا گیا ہے۔ کراچی میں پہلے بھی اردو فلمیں بنی ہیں اس لیے ہماری توقعات اس سے وابستہ ہیں کہ لیجنڈ مولا جٹ بھی اچھا بزنس کرے گی۔ اگر اس سے بزنس ملتا ہے تو پھر لاہور انڈسٹری کو بھی حوصلہ ملے گا اور وہاں بھی دوبارہ فلمیں بننا شروع ہوں گی اور فلمیں ایک اچھی منڈی کے ساتھ کامیابی حاصل کریں گی۔

معروف فلمی مبصر سید ساجد یزدانی کے انٹرویو سے اقتباس

پنجابی فلم مستانہ ماہی بنانے کا اعلان کر ڈالا، اور ڈائریکشن کے لیے ان کی نظر انتخاب افتخار خان پر ٹھہری جو گزشتہ تھوڑے سے عرصے میں جگری یار، غیرت میرا ناں اور بھنا دور دیا جیسی خوبصورت اور کامیاب فلمیں دے کر لولی ووڈ میں اپنا ٹھکہ بنا چکے تھے، مستانہ ماہی کی شوٹنگ شروع ہوئی تو افتخار خان نے یونس ملک کی بے پناہ دلچسپی جوش و خروش صلاحیتیں دیکھتے ہوئے یونس ملک کو اپنا ایسوسی ایٹ مقرر کر دیا، یوں یونس ملک پہلی بار ایک اہم فلم کے لیے اسسٹنٹ ڈائریکٹر چن لیے گئے وہ بھی فلم ساز وحید مراد کی فلم کے لیے، مستانہ ماہی 1971ء میں ریلیز ہوئی اور باکس آفس پر دھوم مچادی، موسیقار تھے نزیر علی......

اینا ں پھل کلیاں دی محفل وچہ اوالہڑ جئی خشبوئیں جنھوں میں لبھناواں اوئیں

اور ملکہ ترنم کا ماسٹر پیس

سیونی میرا ماہی میرے بھاگ جگاون آ گیا۔

اس فلم کے لیے بطور ایسوسی ایٹ ڈائریکٹر یونس ملک نے جان لڑا دی، افتخار خان کے نائب کی حیثیت سے یونس ملک کی دوسری فلم ''ماں تے ماما'' تھی یہ بھی زبردست کامیاب فلم تھی نزیر علی کی موسیقی...... میں پل پل تینوں پیار کراں

تو قدم قدم ٹھکراناایں کی کر بیٹھی تقصیراں میں

کی بدلے لینے چاہناایں

اور اسی فلم میں نور جہاں کا ایک اور شہرت یافتہ گانا بھی تھا۔

دنیا چہ دل کولوں ودھ کیڑھی شے اے

اپنے استاد افتخار خان کی نگرانی میں یونس ملک کی تیسری اور آخری فلم بھی ایک لولی ووڈ کی شاہکار ترین فلم تھی جی ہاں جیرا بلیڈ منور ظریف کی سب سے خوبصورت فلم جس نے اپنے وقت میں کھڑکی توڑ بزنس کیا۔

اس کے موسیقار بھی نزیر علی تھے۔

تیرے مدھ بھرے نین مل پینڑ تے چندرا شراب چھڈ دے

صائقہ اور منور ظریف پر پکچرائز شدہ گیت

توتو تو دے چالاک بڑا ڈھولنا

میں میں میں نیئیں تیرے نال بولناں

اور رنگیلا اور صائقہ کی کیمسٹری میں

دے شرابیاں پی پی

ایک کلب ڈانس گیت بھی ہے انتہائی شاندار

نشے دے وچہ دھت نشئی نیناں والے

اے مدھ بھرے پیالے کہندے آ آ

تین سالوں میں، یکے بعد دیگرے تین بمباسٹک قسم کی کامیاب ترین فلموں مستانہ ماہی، ماں تے ماما اور جیرا بلیڈ کو اسسٹنٹ ڈائرکٹر کے طور پر ڈائریکٹ کرنے کے بعد اب یونس ملک ٹرینڈ ہو چکے تھے، ان کی ٹریننگ مکمل ہو چکی تھی اب وہ سولو پرواز کے لیے اپنے آپ کو مکمل تیار پا رہے تھے، استاد نے [illegible] اجازت [illegible] دی۔

فلم سازوں کی نظروں میں بھی وہ سما چکے تھے، یوں تھوڑی سی جدوجہد سے انہیں ایک فلم ریلا گجر مل گئی لیکن شاید یہ فلم صرف اعلان تک ہی محدود رہی، تاہم معاون ہدایت کار کے طور پر یونس ملک کی خوشبو پھیل چکی تھی لہٰذا جلد ہی انہیں ایک فلم جیرا سائیں کے نام سے مل گئی، جس کے مرکزی کردار سلطان راہی نے ادا کرنا تھا، دیگر کاسٹ میں مصطفیٰ قریشی نجمہ نازلی اور عالیہ تھیں، اس فلم کے موسیقار طافو تھے، سلطان راہی پہلی بار رومینٹک کردار میں تھے، اس فلم میں مسعود رانا کا بڑا خوبصورت گیت تھا جو سلطان راہی پر پکچرائز ہوا۔ نجمہ کے ساتھ طافو کی موسیقی میں تسی تے ساریاں مانواں پینڑاں اِک کہڑی نوں چھڈ کے کسے تے بری نظر نہ پانواں اِک کڑی نوں چھڈ کے لیکن کون جانتا تھا کہ یہ دھان پان کھلنڈرا نوجوان بطور معاون ہدایت کار تین سپر ہٹ فلموں کے بعد اپنی پہلی ہی فلم جیرا سائیں گولڈن جوبلی کے ساتھ فلم انڈسٹری میں انٹری دے گا، لیکن آگے کیا ہونے جا رہا تھا یہ ابھی کسی کو نہیں پتا تھا۔

جیرا سائیں ریلیز کے بعد گولڈن جوبلی ثابت ہوئی جس سے یونس ملک بطور ہدایت کار ایک دم ابھر کر سامنے آ گئے، ادھر ایک اور دھن کا پکا اور قسمت کا دھنی محمد سرور بھٹی فلمی دنیا میں قدم رکھ چکا تھا، یہ عین وہی وقت تھا جب وحشی جٹ کے بعد ناصر ادیب کا طوطی بول رہا تھا اور سلطان راہی سارے چاکلیٹی جنگجو اور سپر اسٹارز ہیروز کو پچھاڑتا روندتا پھلانگتا بڑھتا چلا جا رہا تھا، اور مقدر کا ہما ان سب کو گھیر کر ایک خاص پوائنٹ کی طرف لے جا رہا تھا۔ جی ہاں مولا جٹ فلم ساز سرور بھٹی نے وحشی جٹ کی جہاں کہانی ختم ہوئی تھی وہیں سے آگے کہانی چلا کر فلم مولا جٹ بنانے کا اعلان کر دیا۔ ہیرو وہی سلطان راہی، ہیروئن بھی وہی آسیہ، مصنف بھی وہی ناصر ادیب جبکہ نوری نت کا نیا کردار ڈالا گیا۔ دار و نتی نوری نت کی بہن تھی یہ لافانی کردار چکوری کے حصے میں آیا اور پھر وقت نے ثابت کیا کہ چکوری ہی اس کردار کے لیے موزوں ترین تھی، مولا جٹ پر لاگت 18 لاکھ آئی اور اس کی شوٹنگ انتہائی تیز رفتاری سے صرف دو ماہ

چھبیس دن میں مکمل کرلی گئی۔ فلم کے موسیقار ماسٹر عنایت حسین تھے۔ مولا جٹ اتنی کامیاب ہوئی کہ لوگوں کو وحشی جٹ کی کامیابی اس کے سامنے بہت چھوٹی محسوس ہونے لگی۔ مولا جٹ 9 فروری 1979ء میں سینماؤں پر نمائش کے لیے پیش کی گئی تو ایک بھونچال آگیا۔ اک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ سینماؤں پر تاحد نظر سر ہی سر نظر آنے لگے۔ مولا جٹ ریکارڈ توڑ، کھڑکی توڑ اور جوبلی توڑ قسم کی فلم ثابت ہوئی۔ مولا جٹ نے پہلے سلور جوبلی منائی پھر گولڈن جوبلی منائی پھر ڈائمنڈ جوبلی قرار پائی اور پھر سو ہفتے مسلسل چلنے کا ریکارڈ ڈائمنڈ جوبلی کا سنگ میل عبور کیا لیکن جوبلی کے بعد مولا جٹ کی شہرت کچھ اور سوا ہو جاتی مزید سینما گھروں میں اس کی نمائش از سر نو شروع ہو جاتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے مولا جٹ اپنے مین سینما پر 125 ویں ہفتے کو بجلی کی سی تیزی سے پار کر کے 150 ویں ہفتے میں داخل ہو گئی لیکن شائقین فلم کا غلغلہ اور جوش و خروش کم ہونے کو ہی نہ آرہا تھا۔

اب تو یہ بھی سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اب اس کو کون سی جوبلی کہا جائے۔ سب مروجہ جوبلیاں شوبلیاں ختم ہو چکی تھیں۔ فلم کی شہرت ملکی سرحدوں سے نکل کر دیارِ غیر تک جا پہنچی تھی۔ عوامی شہرت کا دریا پار کر کے مولا جٹ کے مکالمے اعلیٰ سرکاری ایوانوں میں گونجنے شروع ہو چکے تھے اور اب فلم اپنی مسلسل نمائش کے 216 ویں ہفتے میں چل رہی تھی۔ محمد سرور بھٹی کے ہاتھ تو قارون کا خزانہ لگ گیا تھا، لیکن اس وقت کی آمرانہ حکومت کو شاید مولا جٹ کی یہ کامیابی ایک آنکھ نہ بھائی تھی یہی وجہ تھی کہ ایک دن اچانک 216 ویں کھچا کھچ ہفتے میں چلتی فلم مولا جٹ کو بین کر دیا گیا اور فوری طور پر اس کی نمائش بند کرنے کا آرڈر کر دیا گیا۔ اس اچانک افتاد سے سبھی گھبرا گئے لیکن پھر فلم ساز سرور بھٹی کی لیگل ٹیم حرکت میں آئی اور ہائی کورٹ میں پابندی کو چیلنج کر دیا گیا۔ تقریباً ڈھائی ماہ کی سر توڑ کوششیں بار آور ثابت ہوئیں اور فلم کو آزادی کا پروانہ مل گیا۔ فلم کی نمائش پھر شروع ہوئی تو عوام الناس نے پھر سینماؤں پر دھاوا بول دیا، لیکن کچھ عرصہ بعد پھر مولا جٹ کو سینماؤں سے زبردستی اتارنے کے احکامات آگئے۔

پروڈیوسر کے وکلاء پھر ہائی کورٹ پہنچ گئے چند ماہ کی قانونی جنگ کے بعد تیسری بار مولا جٹ سینما گھروں میں چلنے لگی، ضیاء حکومت کو شاید مولا جٹ سے کوئی خدا واسطے کا بیر پیدا ہو گیا تھا۔ مولا جٹ کو تیسری بار پھر تشدد، فحاشی اور قتل و غارتگری کے سنگین الزامات سے بند کر دیا گیا، اب کی بار الزامات زیادہ سنگین ہونے کی بناء پر عدالتی جنگ اعصاب شکن اور طویل تر ہوتی چلی گئی اسی دوران ایک بار فلم پروڈیوسر محمد سرور بھٹی نے صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق سے ملاقات بھی کی اور مولا جٹ میں کچھ بھی نہ ہونے کی یقین دہانیاں کروائیں لیکن شاید فلم ساز کا مؤقف صدر صاحب کو قائل نہ کر پایا اور پابندی برقرار رہی۔ اس دوران ضیا حکومت ختم ہو گئی تو 1990ء میں مولا جٹ کو پابندیوں سے نجات حاصل ہوئی اور مولا جٹ کو پوری دھوم دھام سے ایک بار پھر پورے پاکستان میں سینماؤں پر نمائش کے لیے پیش کر دیا گیا۔ لاہور میں پھر ایک ساتھ دس سینما گھروں میں مولا جٹ چلی اور ایک بار پھر اس نے فلم ساز کو مالا مال کر دیا۔

مولا جٹ پاکستان کی واحد فلم ہے جس کے ڈائیلاگ عوام سے لے کر خواص تک گلی کوچوں چوراہوں سے لے کر اعلیٰ ایوانوں تک ایک تسلسل سے گونجتے رہتے ہیں اور ان میں کمی نہیں آتی۔ اکثر سیاسی راہنما اور وزراء ایک دوسرے کو کہتے ہیں کہ مولا جٹ کی طرح بڑھکیں نہ لگاؤ، یا تم تو ہمارے لیے نوری نت بن گئے ہو۔

مولا جٹ فلم کے اکثریتی کردار اب انتقال کر چکے ہیں 1996ء میں پاکستان کے سب سے بڑے سب سے مشہور سب سے زیادہ فلموں میں کام کرنے والے ہیرو اداکار وحشی جٹ مولا جٹ نامی فلموں میں مرکزی کردار ادا کرنے والے سلطان راہی کو اسلام آباد سے براستہ جی ٹی روڈ اپنی کار میں لاہور جاتے ہوئے گوجرانولہ بائی پاس پر ڈاکوؤں نے قتل کر دیا تھا، کیفی بھی فوت ہو گئے جس کی ٹانگ توڑ نوری نت کہتا ہے کہ...... ہنٹر جدوں وی تیری بیساکھی زمین تے وجے گی تے ایدے وچوں ٹک ٹک دی نئیں بلکہ نوری نت نت دی آواز آئے گی۔

کیفی پر عنایت حسین بھٹی کا گیت پکچرائز ہوا تھا۔ چکوری کے ہمراہ

نشے دیئے بوتلے، نہ اینی ات چ ک نی
میری اکو ڈیک نال ای جاویں گی تو مک نی

چکوری (وار دتی) بھی فوت ہو گئیں کیفی اور چکوری اصلی زندگی میں میاں بیوی تھے، وحشی جٹ کی چودھرانی غزالہ بھی کیفی کی بیوی یعنی چکوری کی سوتن تھیں۔

فلم میں جب نوری نت اور مولا جٹ کو تھانے سے کچہری الگ الگ ٹانگے میں لے جایا جا رہا ہوتا ہے تو وہاں بھی ایک گانا ہے۔

کون ماردا میدان پہلے ہلے اے تے ویلا آپ دسے

گا۔

جو شوکت علی اور عالم لوہار کی آوازوں میں تھا۔ شوکت علی اور عالم لوہار بھی اللہ کو پیارے ہوگئے اور اس گیت پر پرفارم کرنے والے رنگیلا اور البیلا بھی دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں، عالم لوہار پاکستان کے معروف فوک گلوکار عارف لوہار کے والد تھے۔

جبکہ عنایت حسین بھٹی، اداکار کیفی کے بڑے بھائی تھے ٹیلیویژن کے مشہور اداکار وسیم عباس عنایت حسین بھٹی کے بیٹے ہیں اور ٹی وی اداکارہ صبا پرویز وسیم عباس کی بیوی ہیں، مولا جٹ کے موسیقار ماسٹر عنایت حسین بھی فوت ہو چکے ہیں۔ مولا جٹ سے انہوں نے پنجابی سینما کے میوزک کو اک نیا آہنگ دیا۔ شور شرابہ گھن گرج والی موسیقی تھی جبکہ مولا جٹ سے قبل ان کی پہچان دھیمی اور مدھر موسیقی تھی۔ رضیہ بٹ کے ناول پر بنی فلم نائلہ کا گیت ملاحظہ فرمائیں۔

دور ویرانے میں اک شمع ہے روشن کب سے
کوئی پروانہ ادھر آئے تو کچھ بات بنے

نائلہ کی موسیقی بھی ماسٹر عنایت حسین نے ترتیب دی تھی۔

مولا جٹ فلم کے ڈائریکٹر یونس ملک بھی چند سال پہلے اللہ کو پیارے ہوگئے۔

مولا جٹ میں دادو نتی کے منگیتر کا کردار دبنگ اداکار اسد بخاری نے ادا کیا تھا۔ فلم میں اسد بخاری کا نام اکو قتل ہوتا ہے اسد بخاری بھی چند سال پیشتر وفات پا چکے ہیں۔ اسی طرح مولا جٹ میں اپنی مسحور کن جادوئی آواز سے فلم بینوں کو دیوانہ بنانے والی ملکہ ترنم بھی اللہ کو پیاری ہو چکی ہیں۔

پیاری گائیکہ مہناز کا ایک گیت بھی تھا مولا جٹ میں جو بہت ہی مشہور ہوا۔

جھانجر کرے تینوں پیار وے میں مر گئی۔

مہناز بھی چند سال پیشتر امریکا جاتے ہوئے ہوائی جہاز میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئیں۔

الیاس کشمیری بھی اس دار فانی سے رخصت ہو گئے ہیں۔

جن کا مولا جٹ میں مشہور ڈائیلاگ ہے۔

بھمبی اگ نوں پھوکاں ماریاں سواہا، اڈ کے سر چہ پیندی اے۔

فلم کی ہیروئن دل کش سراپے کی مالک اور مستند رقاصہ آسیہ تھیں جنہیں دیکھنے والے مکھو جٹی کے نام سے پہچانتے ہیں۔

وحشی جٹ کی ہیروئن بھی آسیہ تھیں اور اس فلم میں بھی اس کا نام مکھو جٹی ہی ہوتا ہے، دلچسپ بات ہے کہ لیجنڈ آف مولا جٹ میں بھی مکھو جٹی موجود ہے، تاہم اب دور جدید میں یہ کردار......ادا کر رہی ہیں آسیہ فلموں سے ریٹائرمنٹ کے بعد امریکا سیٹل تھیں، اور کچھ سال پہلے وہیں انتقال کر گئیں۔

ماکھا جٹ کا رول باکمال منفرد اور عمدہ اداکار ادیب تھے ادیب اتنے پاورفل ایکٹر تھے کہ ان پر پورا آرٹیکل ہونا چاہیے آہ ادیب بھی اللہ کو پیارے ہو گئے، مولا جٹ وحشی جٹ کا ایک اور زبردست کردار تانی کا بھی تھا، جو دونوں بازوؤں کو وا کر کے دوڑتے ہوئے پکار لگاتی ہے مولیا آآآآآ......یہ مولے جٹ کی ہر دو فلموں میں بھر جاتی ہوتی ہے، اس کردار کے لیے سیماں بیگم منتخب کی گئی تھیں، جنہوں نے یہ کردار باآسانی اور بہ احسن و خوبی ادا کیا تھا۔ افسوس سیماں بیگم نے لولی ووڈ کی تباہی کے بعد آخری عمر یعنی بڑھاپے میں بیروزگاری کا شکار ہو کر فاقہ زدگی کی زندگی گزارتے گزارتے اپنی جاں جان آفریں کے سپرد کر دی! اس فلم کے کوریوگرافر حمید چوہدری بھی وفات پا چکے ہیں، اسی طرح فلم کے لیے پس پردہ کام کرنے والے اکثر تکنیک کار بھی اب دنیا میں نہ رہے، جنہوں نے اپنی صلاحیتوں سے مولا جٹ کو امر کر دیا تھا۔

ہدایت کار بلال لاشاری کی فلم لیجنڈ آف مولا جٹ 1979ء میں بننے والی ہدایت کار یونس ملک کی فلم مولا جٹ کا ری میک کہہ لیں۔ سیکوئیل دیکھنے کے بعد ہی پتا چل سکتا ہے جبکہ مولا جٹ ڈائریکٹر حسن عسکری کی فلم وحشی جٹ کا تسلسل تھا۔

ان تینوں فلموں میں جو واحد قدر مشترک ہے، وہ ہے ان تینوں فلموں کے مصنف جناب ناصر ادیب وحشی جٹ کے مصنف ادیب تھے، مولا جٹ کے لیے بھی فلم ساز محمد سرور بھٹی کی نظر انتخاب ناصر ادیب پر ٹھہری اور مولا جٹ کے پینتالیس برس بعد ریلیز ہونے والی فلم لیجنڈ آف مولا جٹ کو بھی ناصر ادیب کے قلم نے لکھا ہے۔ اس مناسبت سے یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ وحشی جٹ لکھنے پر ناصر ادیب کو برائے نام چند ہزار ملے تھے جبکہ مولا جٹ کا معاوضہ اس زمانے یعنی 1979ء میں ناصر ادیب صاحب نے ساڑھے سات ہزار روپے وصول کیا تھا اس میں بھی دلچسپ امر یہ ہے کہ 2000 روپے انہیں نقد رقم ملی تھی اور باقی انہوں نے اپنی گاڑی مکینک کو دی ہوئی تھی اس کے واجبات مکینک کو مولا جٹ کے پروڈیوسر نے ادا کیے

تھے یوں مولا جٹ کی کہانی اور منظر نامہ کا حساب بے باق ہو گیا تھا، ادھر دور جدید میں لیجنڈ آف مولا جٹ کے لیے پروڈیوسر عمارہ حکمت نے ناصر ادیب صاحب کو پندرہ لاکھ روپے نقد معاوضے کی ادائیگی کی جبکہ ٹی اے ڈی اے اور سگریٹ کھانا چائے وغیرہ الگ سے ملتا تھا۔

بلال لاشاری پاکستان کے ہونہار اور ٹیلنٹڈ نوجوان فلم ڈائریکٹر اداکار اور کیمرا مین ہیں، آپ 14 اگست 1984ء کو لاہور میں پیدا ہوئے، آپ کے والد معروف بیوروکریٹ اعلیٰ گریڈ آفیسر کامران لاشاری ہیں، بلال لاشاری نے سان فرانسسکو اکیڈمی، آرٹ یونیورسٹی سے گریجویشن کی۔ آپ کی پہلی فلم کا نام ''وار'' ہے۔ وار انگریزی زبان میں تھی سب ٹائٹل میں اردو ترجمہ لکھا تھا تاہم جزوی طور پر وار اردو میں بھی تھی یعنی کہیں کہیں کچھ وار کے کردار اردو بھی بولتے دکھائی دیتے ہیں، ایک دم شاندار فلم تھی یہ فلم دیکھنے کا اتفاق مجھے جناح پارک راولپنڈی کے سنی پیکس سینما اسکرین پر ہوا، کہانی منظر نامہ ہدایتکاری پر بڑی مضبوط گرفت تھی بلال لاشاری کی، کراچی اور لاہور سمیت بالعموم پورے پاکستان اور بالخصوص دیار غیر میں بھی وار نے زبردست کامیابیاں سمیٹیں، وار کے ہیرو شان تھے جبکہ دیگر کاسٹ میں عائشہ خان، شمعون عباسی، علی عظمت، میشع شفیع، حمزہ علی عباسی اور کامران لاشاری خود تھے، اس کے مصنف اور پروڈیوسر حسن وقاص رانا تھے یہ فلم مائنڈ ورکس میڈیا کے تحت پیش کی گئی، اور ایک بڑا بزنس سمیٹنے میں کامیاب ٹھہری، تاہم مجھے ذاتی طور پر اس فلم میں جو کمی دکھائی دی وہ یہ تھی کہ فلم کا سب ٹائٹل اردو میں تھا یعنی اردو ترجمہ جو فلم کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا وہ انتہائی کمزور تھا، اس شعبے کو انتہائی ایزی لیا گیا ہے' ترجمہ نگار کمپوزر اور پروف ریڈر کا انتخاب بہتر نہ تھا، تلفظ کی اغلاط موجود تھیں!

بہرحال بلال لاشاری کی بہترین ڈائریکشن اور لاجواب کیمرا گرافی کی بدولت یہ خامی زیادہ نوٹس نہ پائی۔

''وار'' کی کامیابی کے بعد بلال لاشاری نے فلم لیجنڈ آف مولا جٹ کا اعلان کر دیا، لیکن نئی جنریشن کو شاید اس بہت پرانے موضوع میں خاص دلچسپی دکھائی نہ دی۔ کئی سال گزر گئے لیکن لیجنڈ آف مولا جٹ کی کوئی سن گن نہ تھی، نئی پود نے بھی اس بابت زیادہ استفسار نہ کیا، ادھر بلال لاشاری چپکے چپکے اپنا کام کرتے رہے، لیکن جب 2018ء میں... لیجنڈ آف مولا جٹ ٹریلر منظر نامہ پر آیا تو اچانک ہی کھلبلی مچ گئی، اس قدر متاثر کن ٹریلر تھا کہ شائقین فلم کے ساتھ ساتھ ناقدین فلم بھی بے اختیار واہ وا کر اٹھے پاکستان ہندوستان کے ساتھ ساتھ آدھی دنیا میں اس کی دھوم مچ گئی، چند ہی گھنٹوں میں لیجنڈ آف مولا جٹ کا ٹریلر وائرل ہوا اور کئی ملین ویوز اس نے حاصل کر لیے تب عید پر فلم کی ریلیز کی خبریں بھی سنی گئیں، لیکن پھر اچانک ہی چہار سو سناٹا چھا گیا۔ مولا جٹ کی ریلیز کی بابت کچھ پتا نہ چل رہا تھا، ایسے میں چہ میگوئیاں سننے میں آنے لگیں کہ سلطان راہی والی مولا جٹ کے پروڈیوسر نے مقدمہ کر دیا ہے۔

اور پھر ایک طویل قانونی جنگ شروع ہو گئی، محمد سرور بھٹی فلم ساز اصلی مولا جٹ نے ہر قانونی دروازہ کھٹکھٹایا، ہر فورم پر پہنچے، لیکن اس سے قبل کہ معاملات مزید بگڑتے اور لیجنڈ آف مولا جٹ کھٹائی میں پڑتی، دونوں فریقین میں معاہدہ طے پا گیا، اب معاہدہ کیا طے پایا اس بارے میں کوئی مستند خبر موجود نہیں تاہم لیجنڈ آف مولا جٹ کی سینما گھروں میں نمائش کی راہ ہموار ہو گئی۔ لیجنڈ آف مولا جٹ کیسی فلم ہے، کیا دور جدید کے تقاضے پورے کر پائی ہے، اس خبر کا تو انتظار سب کو ہے۔

خوش آئند بات یہ ہے کہ اس فلم کی ہائپ بڑی زبردست کری ایٹ ہوئی ہے۔ پاکستان، بھارت، چین سمیت کئی ممالک میں ایک ساتھ ریلیز ہونے والی لیجنڈ آف مولا جٹ یوں سمجھیں کہ وحشی جٹ اور مولا جٹ کے تسلسل کی تیسری فلم ہے۔ فلم کی کاسٹ میں حمائمہ ملک بھی ہیں جو دارونتی کا مشہور کردار ادا کرنے جا رہی ہیں۔ علی عظمت، نیر اعجاز اور شفقت چیمہ بھی اس فلم کا حصہ ہیں، لیجنڈ آف مولا جٹ 150 منٹ دورانیے کی فلم ہے۔ ناصر ادیب فلم کے مصنف ہیں۔ وحشی جٹ بھی ناصر ادیب کے قلم سے نکلی تھی مولا جٹ بھی ناصر ادیب نے ہی لکھی تھی اور اب لیجنڈ آف مولا جٹ کے مصنف بھی ناصر ادیب ہی ہیں، یقیناً پروڈیوسر اور ڈائریکٹر نے فلم کو ہر لحاظ سے موجودہ آڈینس کے لیے قابل قبول بنانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ چھوڑا ہوگا اور سینما میکنگ اور ورلڈ وائڈ آڈینس کو مدنظر رکھتے ہوئے ریلیز سے قبل اچھی طرح ٹھوک بجا کر دیکھ لیا ہوگا۔

لیجنڈ آف مولا جٹ 13 اکتوبر 2022ء کو پاکستان چین امریکا سمیت پوری دنیا میں ریلیز کی جا رہی ہے جب تک یہ سطور آپ تک پہنچیں گی یہ فلم ریلیز ہو چکی ہوگی اور اس کی کامیابی کا نتیجہ بھی آپ کے سامنے آ چکا ہوگا! پاکستانی سینما کے ریوائیول کے لیے لیجنڈ آف مولا جٹ کی کامیابی بہت ضروری ہے۔

++

زین مہدی

اردو ادب پر نظر ڈالیں تو ایسے کئی نام نظر آئیں گے جنہوں نے ادب میں تجربے کیے اور کامیاب بھی ہوئے۔ صنف شاعری پر اس نے بھی ایک ایسا تجربہ کیا جس نے اردو شاعری کا رخ ہی بدل دیا اسی وجہ سے کرشن چندر نے کہا تھا کہ وہ تو گیم چینجر ہے، پوری بساط ہی الٹ دینے والا ہے۔

اس شاعر کا ذکر جس نے اصولِ شاعری بدل دیے

پہلی جنگِ آزادی 1857ء کا اثر بالکل ہی ضائل ہو چکا تھا، لوگوں نے انگریزوں کی حکمرانی کو دل سے قبول کر لیا تھا اس لیے کہ وہ سب مان بیٹھے تھے کہ انگریزوں کو شکست نہیں دی جا سکتی ہے۔ انگریزوں کی قوت ناقابل تسخیر ہے۔ ان سے جنگ کرنا بے وقوفی ہے۔ دہلی پر قبضہ، لکھنو میں حضرت محل کی شکست، بہار میں لالہ کنور سنگھ کی لاٹھی بردار فوج کا قتل عام نے سب کو دہلا دیا تھا۔ اسی وجہ سے ہر طرف خاموشی چھا گئی تھی.. مگر اس علاقے میں تو دہلی و دیگر علاقوں کے ہنگاموں کا ذرا بھی اثر نہیں آیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں کے لوگ حکومت برطانیہ کی گڈ بک میں تھے۔ خاص کر اعوان قبیلہ۔ یوں تو یہ قبیلہ کافی دور تک آباد تھا مگر گوجرانوالہ میں جو قبیلے کی شاخ تھی اس کے لوگ خاصی تعداد میں سرکاری نوکریوں میں تھے۔ کوٹ بھاگا، اکال گڑھ میں اسی قبیلے سے تعلق رکھنے والا ایک خاندان عرصہ قدیم سے آباد تھا۔ وہ سب خاصی اچھی شہرت رکھتے تھے۔ خاص کر فضل الٰہی چشتی کے والد سول اینڈ ملٹری سرجن تھے۔

بڑے ڈاکیڑوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ انہی کی وجہ سے یہ خاندان علاقے بھر میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس گھرانے میں تعلیم کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی تھی کیونکہ یہ خیال عام تھا کہ سرکاری نوکری بھی مل سکتی ہے جب تعلیمی اسناد اعلیٰ ہوں، یہی وجہ تھی کہ ڈاکٹر صاحب نے بیٹے فضل الٰہی چشتی کو بھی تعلیمی میدان میں آگے بہت آگے لے جانا چاہا تھا مگر وہ کچھ پیچھے رہ گئے تھے۔ اعلیٰ امتحانات میں شرکت نہ کر سکے تھے اس لیے انہیں محکمہ تعلیم میں نوکری دلادی گئی تھی۔ وہ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز تھے۔ ضلع بھر کے اسکولوں میں معیار تعلیم پر نظر رکھنا ان کی ڈیوٹی تھی۔ وہ خود بھی اس کام میں فرحت محسوس کرتے، خوب دلچسپی لیتے تھے۔ دفتر میں کم بیٹھتے اور دورے پر دورہ کرتے۔ چھوٹے چھوٹے اسکولوں کے معائنہ سے افسران گریز کرتے تھے لیکن یہ "گھر اسکول" میں بھی پہنچ جاتے۔ گھر اسکول، اس اسکول کو کہا جاتا تھا جو خواتین گھر میں کھول لیتی تھیں۔ طریقہ کار یہ تھا کہ کوئی بھی پڑھی لکھی عورت محکمہ تعلیم کو درخواست دے دیتی کہ میرے پاس 25 بچے پڑھنے آتے ہیں۔ ابتدائی تین جماعت تک وہ پڑھا سکتی تھیں اور ان کی تنخواہ محکمہ تعلیم دیتا۔ ایسے اسکول زیادہ تر قصبوں میں ہوتے۔ معلمہ کی تعلیم واجبی سی ہوتی مگر انہیں ہر طرح کی مراعات ملتی تھی۔ ایسے اسکول صرف نام کے ہوتے تھے اس لیے افسران انہیں نظر انداز کر دیا کرتے تھے مگر یہ خاص طور سے ایسی خاتون کی حوصلہ افزائی کرتے تھے جو دل و جان سے تعلیم کی ترویج کرتیں۔ گو کہ ان کے ضلع میں ایسے صرف دو اسکول تھے اور یہ ان دونوں کی خوب پذیرائی کرتے۔ ان کا کہنا تھا کہ بھلے یہ عورتیں میڈل پاس ہیں، زیادہ پڑھ لکھ نہیں سکی ہیں لیکن تعلیم عام کر سکتی ہیں۔ پردے میں رہ کر نئی نسل کو تعلیم دے رہی ہیں تو یہ اچھی بات ہے مگر بڑے اسکولوں میں کوئی کوتاہی دیکھتے تو سخت ایکشن لیتے۔ ایک ایک کلاس میں جا کر بچوں کی ذہنی سطح چیک کرتے، سوالات پوچھتے۔ ان کے لہجے میں اپنے والد کا عکس تھا۔ لب و لہجہ فوجیوں جیسا تھا۔ اسکول انسپکشن کے وقت وہی لہجہ اختیار کرتے مگر گھر میں لہجہ بہت دھیما ہوتا۔ بیوی بچوں کے درمیان ہنستے مسکراتے رہتے۔ بچوں میں وہ اپنے اس بیٹے سے زیادہ قریب تھے جو یکم اگست 1910ء میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی پیدائش گھر کی تھی، بھاگا میں واقع پشتینی گھر کی۔

بھاگا کوئی شہر تو تھا نہیں مگر فضل الٰہی کو بہت عزیز تھا۔ اسی گاؤں کی گلیوں میں کھیل کر وہ بڑے ہوئے تھے۔ اسی گھر سے ان کی برأت چلی تھی۔ اسی گھر میں دلہن بیاہ کر لائے تھے۔ اسی گھر میں ان کے تمام بچے پیدا ہوئے تھے۔ جیسا کہ اوپر لکھا ہے کہ ان بچوں میں فضل الٰہی بخش کو نظر محمد زیادہ عزیز تھے۔ نظر محمد بھی ان سے زیادہ قریب تھا۔ گھر پر ہوتے تو اس کی پڑھائی پر خصوصی توجہ دیتے۔ یہی وجہ تھی کہ نظر محمد نہایت کم عمری میں ادب سے قریب ہو چکا تھا۔ پڑھائی میں بھی تیز تھا۔ اس وقت اس کی عمر صرف آٹھ سال تھی کہ اس نے ایک پوری نظم کہہ دی۔ نظم بھی فی البدیہہ۔ ہوا یہ تھا کہ اس کے اسکول میں انسپکشن کے لیے محکمہ تعلیم کا ایک انسپکٹر آیا ہوا تھا۔ جیسے ہی وہ اسکول کے احاطے میں داخل ہوا، پتا نہیں کہاں سے مکھیوں کا ایک چھوٹا سا جھنڈ اس کے سر پر آ گیا۔ شاید اس نے شہد یا اسی قسم کی کوئی میٹھی چیز کھائی تھی جس کی خوشبو یا اجزا اس کے منہ پر باقی رہ گیا تھا کہ مکھیاں راغب ہو گئی تھیں۔ وہ کبھی سر پر بیٹھتیں تو کبھی گال پر اور انسپکٹر بھی منہ پر ہاتھ مارتا تو کبھی سر پر۔

اس کی یہ حرکت دیکھ کر بچے بھی ہنسنے لگے تھے۔ خود وہ بھی محظوظ ہو رہا تھا اور تبھی اس کے دماغ میں خود کو منوانے کی معصوم شرارت نے پیر پھیلائے۔ وہ کلاس میں لوٹا اور قلم کی ساحری میں جت گیا۔ اسی وقت اس نے "انسپکٹر اور مکھیاں" لکھ دیں۔

اس نظم میں اس نے اتنے پُر مزاح انداز میں انسپکٹر کا خاکہ اڑایا تھا کہ پڑھنے والے مسکرانے پر مجبور ہو جاتے مگر یہ چھوٹی سی نظم ایسی تھی کہ کسی کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ نظم کسی بچے نے لکھی ہے۔ اوزان بھی درست تھے اور قافیہ بھی۔ اتنے دنوں سے ابو اور دادا کے کتب خانے سے جو چپکے چپکے استفادہ کر رہا تھا وہ کام آیا تھا۔

انسپکٹر صاحب کو بھلے ہی وہ نظم پسند نہ آئی مگر اسکول والوں نے خوب پسند کیا تھا۔ یہ خبر گھر تک بھی پہنچ گئی۔ والد نے نظم پڑھی تو ایک روپے کا سکہ بطور انعام دیا۔ اس وقت ایک روپیا خاصی بڑی رقم تھی۔ دادا نے بھی نظم پسند کی تھی۔ تعریف بھی کی تھی مگر یہ شرط بھی لگا دی تھی کہ اب وہ کسی بھی طور شاعری نہیں کرے گا۔ ابھی تدریسی دور ہے، صرف اسکول کی کتابیں پڑھے گا۔ لائبریری کے دروازے بھی اس پر بند کر دیے گئے تھے۔ دادا نے سختی سے حکم دیا تھا کہ وہ نصابی کتب کے علاوہ کوئی دوسری کتاب نہیں پڑھے گا۔

ن م راشد کے چار شعری مجموعے: ماورا (1942)، ایران میں اجنبی (1955)، لا= انسان (1969) اور گماں کا ممکن (1977) شائع ہوئے۔

ایران میں قیام کے دوران انھوں نے 80 جدید فارسی شعرا کے کلام کا ترجمہ "جدید فارسی شاعر" کے نام سے مرتب کیا۔

ان کے متعدد تنقیدی مضامین مختلف رسائل میں شائع ہوئے جن کو کتابی شکل نہیں ملی ہے۔ فیض نے "نقش فریادی" کا دیباچہ راشد صاحب سے ہی لکھوایا تھا حالاں کہ راشد کبھی ترقی پسند تحریک سے وابستہ نہیں رہے۔ وہ حلقہ ارباب ذوق سے تعلق رکھتے تھے۔

☆☆☆

ن م راشد کبھی فیض یا مجاز کی طرح مقبول عام شاعر نہیں رہے اس کی وجہ یہ ہے کہ راشد کی شاعری میں مختلف اجزا کا جو امتزاج ہے وہ فکری اور جذباتی رجحانات کے تصادم، ردعمل اور ہم آہنگی کا اک مسلسل عمل ہے جس کو سمجھنے اور جذب کرنے کے لیے کوشش اور محنت کی ضرورت ہے۔ راشد کی شاعری زود فہم یا فوری طور پر ہیجان میں لانے والی چیز نہیں۔ ان کی شاعری ہر اچھی اور بڑی شاعری کی طرح اپنے لیے اک جداگانہ تنقید کا مطالبہ کرتی ہے جو خود اس شاعری سے روشنی حاصل کر کے اس کے مطالعہ، تفہیم اور تحسین کی راہ ہموار کرے۔ راشد نے اپنی نظموں میں جس قسم کے داخلی آہنگ کی تخلیق کی ہے اس کے لیے آزاد نظم ہی زیادہ موزوں ذریعہ اظہار ہو سکتی تھی۔ بقول آفتاب احمد راشد شاعری میں لفظوں کے مجسمہ ساز ہیں وہ نظمیں نہیں کہتے سانچوں میں ڈھلے مجسمے تیار کرتے ہیں۔ اپنی نظموں کی تعمیر و تشکیل میں، ان کی تراش خراش میں، راشد جس احتیاط اور سلیقے سے کام لیتے ہیں اس سے ان کے احساس ہیئت کا اندازہ ہوتا ہے ان کے یہاں تجربات، جو داخلی ربط میں منسلک ہو کر ظاہر ہوتے ہیں، ان کی ترتیب میں اک ارتقائے خیال نظر آتا ہے، ہر تفصیل اک معین مقصد پوری کرتی ہے اور اس طرح، گویا، اک کل کے جزو کی حیثیت رکھتی ہے۔ راشد کی نظمیں صحیح معنوں میں نظمیں ہوتی ہیں۔ اپنے داخلی ربط کی وجہ سے بھی اور اپنی خارجی تنظیم کی وجہ سے بھی۔

اردو کی جدید نظم ہیئت کے اظہار کے نئے زاویوں روّیوں اور زبان و بیان کے تجربوں کے لیے ہمیشہ راشد کی مرہون منت رہے گی۔

اس حکم نامہ کے بعد اس نے والد یا دادا کی کتابوں سے منہ موڑ لیا تھا مگر چور چوری سے جاتا ہے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ ڈاک سے بہت سے ماہنامہ پرچے، اخبارات آتے تھے۔ وہ ان میں سے کوئی ایک پرچہ چھپا لیتا، پڑھنے کے بعد دو تین دن گزرنے پر چپکے سے لائبریری میں چھوڑ آتا۔

وقت گزرتا رہا، وہ چپکے چپکے اشعار وضع کرتا رہا۔ حمد و نعت بھی لکھتا اور انہیں اسکول کی دعائیہ محفل میں سناتا۔ ایک دو نعتیں چھوٹے چھوٹے رسالوں کو بھی بھیجیں۔ وہ شائع بھی ہوئیں مگر ان رسالوں کو وہ سب سے چھپا کر رکھ دیتا۔ والد و دادا، حافظ، سعدی غالب اور اقبال کے شیدائی تھے۔ ڈھیروں ڈھیر ان کے اشعار انہیں ازبر تھے۔ ان کا عکس اس میں بھی آرہا تھا۔ اس دماغ کے خزانے میں کم عمری کے باوجود اشعار جمع ہو رہے تھے مگر پڑھائی میں بھی آگے تھا۔ ایک کے بعد ایک امتحان پاس کرتا ہوا وہ میٹرک میں پہنچ گیا۔ اس نے 1926ء میں گورنمنٹ اسکول سے میٹرک پاس کیا اور مزید تعلیم کے لیے گورنمنٹ کالج لائل پور آ گیا۔

کالج کی فضا ادبی ماحول کے لیے سازگار ثابت ہوئی۔ اس کے ادبی ذوق کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے کالج کے رسالہ "بیکن" کا اسٹوڈنٹ ایڈیٹر بنا دیا گیا۔ وہی پرچہ جو عام سا تھا اس پر بحیثیت اسٹوڈنٹ ایڈیٹر احسن نے خوب محنت کی اور اس بار کا رسالہ ادبی تناظر میں بہت ہی اعلیٰ بنا، کالج کے باہر بھی اس رسالے کی خوب پذیرائی ہوئی۔ اس پرچے کے لیے اس نے کئی مضامین لکھے جسے خوب پسند کیا گیا تھا۔

تعریفوں نے اس پر اثر ڈالا اور اس کے اندر کا شاعر انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا۔ اس نے شعر کہنے کی رفتار بڑھا دی تھی لیکن وہ خود مطمئن نہیں تھا، اپنی شاعری میں اسے کچھ کمی نظر آتی تھی۔ ان اشعار پر بھی اسے شک گزرتا جو اس کی زبان سے ادا ہوتے ہی زبان زد عام ہو جاتے، لوگ تعریف کرتے مگر اسے کمی کا احساس گھیرے رکھتا، وہ سوچتا کہ ایسا کیا کیا جائے کہ لوگ اس کے اشعار کو بطور سند پیش کریں مگر کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی کہ امتحانات سر پر آگئے۔ اس نے خوب محنت کی اور 1928ء میں انٹرمیڈیٹ اچھے نمبروں سے پاس کر لیا۔ لائل پور اس وقت اتنا بڑا شہر نہیں تھا اس لیے اس نے لائل پور (فیصل آباد) سے آگے جانے کا فیصلہ کیا۔

اس وقت پنجاب کے تین ہی شہر بڑے مانے جاتے

تھے۔ امرتسر، ملتان اور لاہور۔ لاہور کو ترجیح دی جاسکتی تھی اس لیے اسے لاہور پسند آیا کہ اس وقت یہ شہر علم بانٹنے میں سب سے آگے تھا۔ اس نے لائل پور سے آگے آکر لاہور کے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لے لیا۔ یہاں آکر اس کی ادبی شخصیت میں مزید نکھار آگیا۔ اسے کالج کے رسالہ ''راوی'' کے اردو سیکشن کا ایڈیٹر مقرر کردیا گیا۔

اب تک وہ بے مہار سا ادبی میدان میں رواں دواں تھا۔ اس کی کوئی منزل نہ تھی۔ کبھی نثر پر طبع آزمائی کرتا تو کبھی نظم کی طرف آجاتا۔ جو دماغ میں آتا اسی راہ پر چل پڑتا۔ اس کی تخلیقات اس دور کے بڑے بڑے رسالے ''نگار''، ''ہمایوں'' میں چھپنے لگے تھے۔

کالج میں رہتے ہوئے اس دور کے بڑے بڑے شہسواروں سے اس کا رابطہ ہو رہا تھا۔ کسی سے خط و کتابت کے ذریعے تو کسی سے بالمشافہ رابطہ رہتا۔ پطرس بخاری اور پروفیسر لنگھارن سے تو گاڑھی چھننے لگی تھی۔ ان کی صحبت نے اس کے شعری ذوق کو خوب نکھارا۔ اس کی تخلیقات پسندیدگی کی سند حاصل کرنے لگی تھی۔ اس دور کے تمام بڑے پرچوں میں وہ چھپنے لگا تھا۔ لوگ قدرومنزلت کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے۔ بیوی بھی ملی تھی تو ادب شناس، گوکہ حد درجہ مذہبی تھی۔ نماز روزے کی پابند مگر اس میں ایک اضافی خوبی اور تھی۔ اس وقت جب لڑکیوں کو تعلیم دلانا لوگ معیوب سمجھتے تھے۔ قرآن پاک ناظرہ اور ابتدائی کتابوں سے آگے پڑھنا لڑکیوں کے لیے پسند نہیں کرتے تھے۔ اس دور میں اس کی بیگم نے انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کر رکھی تھی۔ وہ اپنے خاندان کی پہلی لڑکی تھی جو اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی۔ شوہر کی ادب پرستی کو وہ سراہتی بھی تھی۔ بیوی کے سراہنے نے اسے سہارا دیا ہوا تھا۔ وہ کھل کر ادبی کارگزاری انجام دینے لگا تھا۔ رات رات بھر ادبی محافل میں گزار دیتا۔ اس کا ادبی ذوق اس دور کے شعرا سے کچھ مختلف تھا۔ وہ اردو فارسی کے شعرا پر انگریزی شعرا کو فوقیت دیتا تھا، اس کا ماننا تھا کہ اردو فارسی کے اشعار ایک کھونٹے سے بندھ گئے ہیں اور کولہو کے بیل کی مانند بس ایک ہی انداز میں گھوم رہے ہیں۔ عشق و عاشقی کا تسمہ آنکھوں پر چڑھا کر خوش ہو رہے ہیں۔ زندگی عشق سے آگے بڑھنے کا اشارہ دے رہی ہے مگر ہمارے شعرا خواب سے باہر آنے پر تیار ہی نہیں ہیں۔

اس کی اس بات سے لوگ کسی طور پر متفق نہیں ہو پائے۔ اس کا مذاق بھی بنتا مگر وہ اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔

انہوں نے اپنی پہلی آزاد نظم ''جرأت پرواز'' لکھی۔ یہ نظم اس وقت کے ادبی ماحول کے لیے ایک نئی چیز تھی۔ لوگوں نے دیکھا لیکن صحیح طور پر سمجھ نہ سکے اور نظر انداز کردی گئی لیکن جب ادبی دنیا' لاہور کے سالنامہ میں ''اتفاقات'' شائع ہوئی تو لوگ چونک گئے۔ اس ایک نظم نے انہیں لاکھوں لوگوں تک پہنچا دیا۔ ایک بحث کا آغاز ہوگیا۔ آزاد نظم بھی ایسی اثر دار ہوسکتی ہے یہ بات پہلی بار کھل کر سامنے آئی تھی۔

☆☆☆

زندگی سے ڈرتے ہو......از: ن م راشد

زندگی سے ڈرتے ہو؟
زندگی تو تم بھی ہو، زندگی تو ہم بھی ہیں!
آدمی سے ڈرتے ہو؟
آدمی تو تم بھی ہو، آدمی تو ہم بھی ہیں!
آدمی زباں بھی ہے، آدمی بیاں بھی ہے،
اس سے تم نہیں ڈرتے!
حرف اور معنی کے رشتہ ہائے آہن سے، آدمی ہے وابستہ
آدمی کے دامن سے زندگی ہے وابستہ
لب اگر نہیں ہلتے، ہاتھ جاگ اٹھتے ہیں
ہاتھ جاگ اٹھتے ہیں، راہ کا نشاں بن کر
نور کی زباں بن کر
ہاتھ بول اٹھتے ہیں، صبح کی اذاں بن کر
روشنی سے ڈرتے ہو؟
روشنی تو تم بھی ہو، روشنی تو ہم بھی ہیں،
روشنی سے ڈرتے ہو!
شہر کی فصیلوں پر
دیو کا جو سایہ تھا پاک ہوگیا آخر
رات کا لبادہ بھی
چاک ہوگیا آخر، خاک ہوگیا آخر
اژدہام انسان سے فرد کی نوا آئی
ذات کی صدا آئی
راہ شوق میں جیسے، راہرو کا خوں لپکے
اک نیا جنوں لپکے!
آدمی چھلک اٹھے
آدمی ہنسے دیکھو، شہر پھر بسے دیکھو

تین مشہور عرب مصنفین

جن کا اسم نسبتی ثعالب سے ماخوذ ہے یعنی لومڑیوں کی کھالیں سینے اور ان کا کاروبار کرنے والے۔

1۔ثعالبی ابو منصور: 350ھ۔961ء ۔430۔1039ء

عبدالملک بن محمد اسماعیل پانچویں صدی ہجری گیارہویں صدی عیسوی کا ایک کاتب، شاعر اور مصنف جس کی پچاس سے زائد تالیفات ہیں۔ نیشاپور میں پیدا ہوا۔

بقول ابن خلکان ''ثعالبی فرا تھا یعنی لومڑی کی کھال کی پوستینیں سیا اور بنایا کرتا تھا۔ لیکن بقول ذکی مبارک ''یہ اس وقت کی بات ہے جب اس کا ادبی کمال ابھی ظاہر نہیں ہوا تھا اور اس کی شہرت ابھی دور دور تک نہیں پہنچی تھی۔'' جب اس نے کاتب، ادیب اور شاعر کی حیثیت سے کمال حاصل کرلیا تو ملوک و امرائے وقت کے ہاں اسے تقرب حاصل ہوگیا۔ جن امراء کے پاس اسے رسائی اور تقرب حاصل تھا ان میں امیر صاحب الجیش ابوالمظفر نصر بن ناصر الدین، سلطان مسعود ابن محمود، ابوالعباس، مامون بن مامون خوارزم، شاہ حلف بن احمد سنجری، الشیخ ابوالحسن محمد بن عیسیٰ، الکرجی، امیر ابوالفضل عبید اللہ بن احمد المیکالی، ابوالحسن مسافر بن الحسن، الوزیر ابونصر احمد بن محمد، امیر ابونصر سہل ابن المرزبان تھے۔ ثعالبی کی تصانیف میں سب سے زیادہ مشہور تصنیف ''یتیمۃ الدھر فی محاسن ابن العصر'' ہے۔ یہ کتاب اس نے ہارون بن المنجم کی کتاب البارع کے ذیل کے طور پر لکھی۔ یہ کتاب 384ھ میں لکھنا شروع کی اور تقریباً 403ھ میں اسے جرجان میں مکمل کیا۔ اس کتاب میں ثعالبی کے معاصر اور اس سے پہلی نسل کے شعراء کا تذکرہ ہے۔ جس کی ترتیب شعرا کے اوطان کے لحاظ سے کی گئی ہے۔ اس تذکرہ میں زیادہ تر منتخب اشعار مجموعہ ہے۔ جس میں شعراء کے سوانح حیات عام طور پر نہایت ہی

اس دور کے معتبر ادبی جریدے میں اس کی کاوشیں چھپتی لوگ پسند بھی کرتے اور تنقید بھی ہوتی مگر وہ اپنے دھن میں مست تھا۔ جن دنوں وہ لائل پور سے نکلنے والے زمیندار گزٹ کی ادارت کرز رہا تھا اس نے دیہات سدھار کے موضوع پر بے تحاشہ لکھا جو پسند بھی کیا جاتا تھا، اسی کی مناسبت سے لوگ طعنہ دیتے کہ تم کہاں ادب میں گھس آئے ہو، کھیت کھلیان دیکھو، دیہاتوں کی قسمت سنوارو۔۔۔ یہ ادب تو پڑھے لکھے لوگوں کے لیے ہے۔

وہ سب کی سنتا مگر جواب نہیں دیتا۔ جواب جاہلاں خموشی باشد۔ اس کی چپی سے سب شیر ہوتے۔ 1930ء میں اس نے بی اے کرلیا اور اقتصادیات میں ایم اے کرنے کی تیاری کرنے لگا ساتھ ہی ساتھ شام کی کلاسوں میں فرانسیسی بھی پڑھنے لگا اور آئی سی ایس کی تیاری بھی شروع کردی لیکن حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ اسے امتحانوں میں کم نمبر ملے، وہ بھی اردو کے پرچے میں۔ اس عرصے میں اس نے منشی فاضل کا امتحان بھی دے دیا اور سند بھی حاصل کرلی۔

اس کا قلم بھی خوب چل رہا تھا۔ اس نے کچھ ہٹ کر، عام روش سے آگے بڑھ کر لکھنے کی کوشش شروع کردی، اس میں وہ کچھ حد تک کامیاب بھی رہا۔ ایک کے بعد ایک کئی تحریریں سامنے آئیں جس میں اس کی معرکتہ الآراء تحریر ''امتیاز علی تاج کا ڈراما انارکلی''۔ ''ظفر علی خاں کی شاعری'' اور ''اردو شاعری پر غالب کا اثر'' شامل ہیں۔

ان تحاریر نے اس کی شہرت کو اوج پر پہنچا دیا۔ اردو ادب میں اسے بہترین اضافہ قرار دیا گیا۔ لوگ عزت سے دیکھنے لگے۔ شہرت ہند بھر میں پھیل گئی مگر جیب خالی کی خالی رہی۔ وہ نوکری کے لیے ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مار رہا تھا کہ اس کی قابلیت کو مدِنظر رکھ کر 1934ء میں تاجور نجیب آبادی نے اپنے رسالے شہکار کی ادارت سونپ دی۔ ادبی دنیا میں اس پرچے کا خاصہ نام تھا۔ دور دور تک اسے پسند کیا جاتا تھا۔ ایک سال تک وہ اس پرچے سے منسلک رہا مگر اسے آمدنی کا وسیلہ نہ ملا۔ بیروزگاری نے ہر طرف سے اسے گھیر رکھا تھا۔ شہکار پر بھی تنخواہ واجب الادا تھی۔ آمدنی کا جب کوئی راستہ نہ ملا تو انہوں نے ملتان کے کمشنر کے دفتر میں بطور کلرک نوکری کرلی۔

☆☆☆

ملتان میں ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں بطور کلرک لگ تو گئے

اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ مصنف نے تعریفی کلمات مبالغہ آمیز بیان کیے ہیں اور ان کلمات کا استعمال مختلف شعراء اور ادبا کے لیے اس طرح کیا ہے کہ کسی کے بارے میں بھی تشخیص اور تمیز میں مدد نہیں ملتی۔

2۔ ثعالبی، ابو منصور: (وفات ۔412ھ ۔1021) حسن بن محمد الرغنی ۔ایک عرب مورخ، اس کے حالات زندگی کے بارے میں معلومات بہت کم ہیں۔ اس نے ایک کتاب ''العزر فی سیر الملوک و اخبارھم'' لکھی اور اسے امیر نصر محمود غزنوی کے بھائی کے نام معنون کیا۔ اس کتاب میں نوع انسانی کی تاریخ حضرت آدمؑ سے لے کر محمود سبکتگین کے زمانے تک درج ہے۔ اس کتاب میں عرب تاریخ نویسی کی پرانی رسم یعنی واقعات کو خالصتاً سال وار لکھنے کی قیود سے آزاد ہو کر تاریخ کو نفسیاتی اصولوں کے مطابق قلم بند کرنے کی ایک قابل تعریف کوشش ہے۔ اس نے طبری، جوالیقی اور دوسرے عرب مورخین کی ... سے بھی استفادہ کیا ہے مگر کسی تنقید کے بغیر ان کا مواد شامل تصنیف کر لیا۔

3۔ ثعالبی

عبدالرحمن ۔788ھ ۔1376 ۔873ھ ۔1468 ۔بن محمد بن مخلوف الجزائری۔ شمالی افریقا کے الجزائر میں پیدا ہوئے۔ بجایہ، تونس اور قاہرہ میں تعلیم پائی۔ قاہرہ سے بغرض حج بیت اللہ حجاز کا قصد کیا۔ زیارت خانہ کعبہ کے بعد تونس واپس آئے اور یہیں وفات پائی۔ آپ کی تصانیف میں سب سے اہم قرآن مجید کی تفسیر ہے جو آپ نے 833ھ ۔1429ء میں مکمل کی۔ تفسیر کا نام ''الجواہر الحسان فی التفسیر القرآن'' ہے۔ اس کے علاوہ، العلوم الفاخرہ فی النظر فی امور الآخرہ'' جو مسائل معاد پر ہے۔ '' جامع الامہات فی احکام العبادات'' اور '' رسالہ الانوار المضیئہ الجامعہ بین الشریعۃ والحقیقۃ'' بھی آپ کی بہترین تصانیف میں سے ہیں۔

مرسلہ: قدیر محمد، کاموکی

تھے لیکن شاہین کا جہاں اور ہے کرگس کا جہاں اور۔ یہی حال ان کا بھی تھا۔ مارے باندھے دفتر جاتے تاکہ بے روزگاری کے عفریت سے بچتے رہیں۔ اسی زمانے میں وہ علامہ مشرقی کی تقاریر سے، ان کے فرمودات سے، ان کے افکار سے وہ متاثر ہو گئے اور پھر انہوں نے خاکسار تحریک میں باضابطہ شمولیت اختیار کر لی۔ بلکہ یوں سمجھ لیں کہ وہ پوری طرح خاکسار تحریک کے ہو گئے تھے۔ اعلیٰ عہدہ داروں نے بھی ان کے جذبے کو سراہا اور انہیں ملتان ضلع کا سالار بنا دیا۔

وہ اس تحریک کے ڈسپلین سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ دوست احباب سے کہا کرتے کہ ایک مسلمان کو ایسا ہی پابند ہونا چاہیے۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ایک واقعہ سناتے ہیں کہ گورنمنٹ کالج میں راشد کو مجلس اقبال کی ایک تقریب میں مدعو کیا گیا، وہ خاکسار کی وردی زیب تن کیے۔ کندھے پر بیلچہ رکھے کالج جا پہنچے، جونہی کالج گیٹ سے اندر داخل ہوئے تو لاہور کے خاکساروں کے ایک جیش نے انہیں سلامی دی۔ مجلس میں راشد نے اپنا مقالہ پڑھا اور تقریب بخیر وخوبی بغیر کسی بدنظمی کے اختتام پذیر ہو گئی۔

وقت گزرا۔ ایک ہفتہ گزر چکا تھا کہ کالج کے پرنسپل کو محکمہ پولیس کی جانب سے ایک رپورٹ پیش کی گئی کہ آپ کے کالج میں تاج برطانیہ کے خلاف سازش تیار کی جا رہی ہے۔ خاکسار تحریک کے کارکنان جمع ہو رہے تھے۔

پرنسپل انگریز تھا۔ رپورٹ دیکھتے ہی آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے اسی وقت صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کو بلایا اور رپورٹ ان کے سامنے رکھ دی کہ یہ سب ہمارے ہی کالج میں ہونا تھا؟ آپ لوگ یہ کیا کر رہے ہیں؟ اس کا جواب جلد داخل کریں۔

صوفی صاحب نے محکمہ پولیس کا لیٹر پڑھا اور پھر پرنسپل کو سمجھانے لگے کہ بات یہ نہیں ہے کہ جو کچھ اس میں لکھا ہے۔ راشد اسی کالج کا ہونہار اسٹوڈنٹ رہ چکا ہے۔ اسے بہ حیثیت سابق طالب علم کے بلایا گیا تھا۔ وہ آئے اور اپنا مقالہ پیش کیا چلے گئے۔ یہ ایک ادبی تقریب تھی، سیاسی نہیں۔ اگر اسے کچھ خاکساروں نے اپنا لیڈر مان کر سلامی دے دی تو اس میں ہمارا قصور کیا ہے؟ یوں بھی خاکسار تحریک سے جڑے لوگ اپنے قوانین کی بہت زیادہ پاسداری کرتے ہیں۔ اگر سامعین میں کچھ خاکسار بھی آ گئے تھے تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟

بڑی مشکل سے صوفی صاحب نے معاملہ رفع دفع کیا اور بعد میں راشد کو بھی سمجھایا کہ اس طرح ادبی محافل میں تو خاکسار تحریک کے کپڑے پہن کر نہ آیا کرو۔

”نہیں جناب ہم تو خاکسار ہیں۔ مرتے دم تک خاکسار رہیں گے۔“ وہ بولے بغیر نہ رہ سکے کیونکہ خاکسار تحریک کا جادو ان کے سر چڑھ کر بول رہا تھا لیکن یہ اثر زیادہ دیر قائم نہ رہا اور وہ تنظیم کی آمریت سے اوب گئے۔ انہیں ایسا لگنے لگا کہ سب کچھ نمائشی ہے ورنہ یہ وہی تھے جنہوں نے اپنی ایک کوتاہی پر خود کو سر عام کوڑے لگوائے تھے۔ دراصل وہ ہر چیز کو پرکھنے کے قائل تھے۔ انہیں احساس ہونے لگا تھا کہ علامہ مشرقی کا فلسفہ انہیں مطمئن نہیں کر پا رہا ہے۔ انہوں نے ڈائریکٹ سوال کر دیا کہ اس تحریک کا منتہا کیا ہے؟ اس تحریک کو صرف سامراجیت کے خلاف جدوجہد کرنا ہے یا اس کے ذریعہ ملک کی عسکری تنظیم کرنی ہے۔ یہ ایسے سوال تھے جس نے تنظیم کے بڑوں کو چونکا دیا۔ اور وہ جواب نہ پا کر تحریک سے استعفا دے کر خاموش بیٹھ گئے۔

یہ وہی تھے جو بڑے جوش و ولولے کے ساتھ اس کارواں میں شامل ہوئے تھے۔ اس اُمید کے ساتھ کہ علامہ مشرقی کی رہبری میں ہم آزادی چھین کر لے لیں گے مگر ایک سوال کا جواب نہ ملنے کی وجہ سے وہ مایوسی کی دلدل میں ڈوب گئے۔ اگر وہ مزید ان کا ساتھ دیتے تو ان کے اندر کا جوشیلا آدمی انہیں ٹکرا جانے پر اکسا دیتا جو خود ان کے حق میں غلط ہوتا۔ جس تنظیم کے رضا کار قائد اعظم پر قاتلانہ حملہ کر سکتے ہیں وہ تو اسے بھی تو چیونٹی کی طرح مسل سکتے ہیں اسی سوچ نے انہیں کچھ بولنے، کچھ اور سوال کرنے سے روک دیا تھا اور وہ دوبارہ سے اپنے جون میں واپس آ گئے تھے۔

ایک طوفان کی طرح وہ خاکسار تحریک میں شامل ہوئے تھے۔ نہایت جوش و ولولہ کے ساتھ ابھرے تھے اور پانی کے بلبلے کی طرح بیٹھ گئے۔

یہ بات عام لوگوں کو سمجھ نہ آئی اور ان سے سوالات ہونے لگے۔ مگر ان کے پاس ہر سوال کا ایک ہی جواب تھا، خاموشی۔ ہر ایک کا سوال سن کر ہنس دیتے اور صرف اتنا کہتے کہ چھوڑو میاں، رات گئی بات گئی۔ ان کا ساتھ چھوڑ دیا تو ان کا ذکر کرنا بھی مناسب نہیں۔

خاکسار تحریک سے الگ ہونے کے بعد انہوں نے خود کو ادبی کاموں میں الجھا لیا۔ اسی دوران انہوں نے ایک اہم ناول کا ترجمہ شروع کر دیا۔ اس کا مصنف عالمی شہرت یافتہ تھا پھر اس ناول میں اس نے انداز ایسا رکھا تھا کہ قاری کو اوّل تا آخر باندھے رکھا تھا۔ اسی دلچسپی کو مدِنظر رکھ کر انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ اسے اردو قالب میں ڈھالیں گے، انہوں نے ترجمہ مکمل کیا اور پبلشر کو پہنچا دیا۔ ترجمے کا پیسا دینا تو دور کی بات ہے وہ ان کی آمد کا سن کر ہی غائب ہو جاتا تھا۔

ایسی اوچھی حرکتوں نے ان کا دل توڑ دیا۔ وہ اپنی پریشانی میں الجھے ہوئے تھے اور یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ وہ آدمیت کے جامے سے باہر آ جائے اس لیے انہوں نے ایک دو سے ذکر کیا اور صبر کر کے بیٹھ گئے کہ اللہ تعالیٰ مصائب دیتا ہے تو اس سے نکلنے کی راہ بھی سجھا دیتا ہے۔

1939ء میں قسمت نے ایک بار پھر سہارا دیا اور آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت مل گئی۔ جاب بہت اچھی نہیں تھی مگر سہارا کے لیے کافی تھی۔ دال روٹی کا انتظام ہو رہا تھا۔ انہیں نیوز ایڈیٹر کی جاب ملی تھی۔ وہ اسی میں خوش تھے کہ سال کے آخر میں انہیں ترقی مل گئی۔ وہ پروگرام اسسٹنٹ بنا دیئے گئے۔ انہوں نے اپنے کام پر پوری توجہ دی تھی اس لیے ان کے کام میں ایک نکھار نظر آتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ 1941 میں انہیں دہلی بھیج دیا گیا۔ اس بار ان کی حیثیت ڈائریکٹر آف پروگرام کی تھی۔ اس تیز رفتار ترقی میں ان کی محنت اور ذہن دونوں شامل تھے۔ عام شاعروں کی طرح لاابالی نہیں تھے۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ کس پر دھونس جمانی ہے اور کس سے منت ترلے کر کے کام نکلوانا ہے۔ دہلی میں قائم پنجابی لابی بڑی مضبوط تھی۔ اس لابی کی خوبی یہ تھی کہ غیر پنجابی کو کسی بھی طرح دہلی میں ٹکنے نہیں دینا ہے۔ اختر الاامان، مجاز و کئی دیگر شاعر اسی سیاست کا شکار ہوئے مگر اسی لابنگ نے انہیں بہت آگے پہنچا دیا۔ 1942ء میں اسی لابنگ کا نتیجہ تھا کہ انہیں فوج میں کمیشن مل گئی۔ عارضی کمیشن اور ممالک غیر میں تعینات ہونے کا خواب پورا ہوتا نظر آ گیا۔ 1943ء سے 1947ء تک وہ ایران، عراق، سیلون میں انٹر سروس پبلک ریلیشن ڈائریکٹریٹ کے تحت کام کرتے رہے۔ فوج کی ملازمت کی معیاد پوری ہوئی تو واپس انڈیا آ گئے اور آل انڈیا ریڈیو لکھنو کے ریجنل ڈائریکٹر بنا دیئے گئے۔ اسی دوران قیام پاکستان کا مرحلہ طے ہو گیا۔ مسلمانوں کو ان کے خواب کی

تعبیر مل گئی۔ ایک الگ آزاد وطن مل گیا۔ وہ بھی پاکستان آ گئے۔

پاکستان آنے کے بعد پہلی تعیناتی ریڈیو پاکستان پشاور میں بہ حیثیت ریجنل ڈائریکٹر ہوئی۔ پھر وہاں سے لاہور آ گئے۔ اب ان کی عزت و تکریم میں مزید اضافہ ہو چکا تھا۔ انہیں لوگ عزت سے دیکھنے لگے تھے۔ یوں بھی وہ عمر کے اس حصے میں آ چکے تھے کہ بچکانہ سیاست سے دور رہنا ہی مناسب لگنے لگا تھا۔ 1949ء میں انہیں ریڈیو پاکستان کے صدر دفتر کراچی منتقل کر دیا گیا۔ کراچی دارالحکومت تھا۔ اس وجہ سے مہاجرین کی اکثریت کراچی کا رخ کر رہی تھی۔ ان مہاجرین میں ایک سے ایک لعل و گہر آ رہے تھے۔ پورے ملک کی کریم یہاں جمع ہوتی جا رہی تھی۔ ایسے وقت میں ان کی سیاست اتنا کام آتی نظر نہیں آ رہی تھی انہوں نے خود کہہ سن کر اپنا تبادلہ ایک بار پھر پشاور کرا لیا۔ ریڈیو پاکستان پشاور کے ریجنل ڈائریکٹر کے عہدے پر رہے پھر وہیں سے انہوں نے مزید آگے نکلنے کی راہ ہموار کی اور 1952ء میں وہ اقوام متحدہ میں شامل ہو گئے۔ شعبہ اطلاعات میں انہیں ایک اہم عہدہ مل گیا تھا۔ اقوام متحدہ میں آ جانے کی وجہ سے وہ عالمی طور پر اہمیت کے حامل بن گئے تھے۔ ان کی تقرری کبھی نیویارک تو کبھی جکارتہ تو کبھی تہران میں ہوتی۔

اس ملک، اس ملک میں گھومتے ہوئے انہیں تھکن سی ہونے لگی تھی۔ دل کرتا کہ اب واپس جا کر آرام کریں مگر نوکری چھوڑنا بھی تو آسان نہ تھا اس لیے وہ کوشش میں لگ گئے کہ اب ان کا تبادلہ پاکستان ہو جائے۔

بالآخر ان کی خواہش پوری ہوتی نظر آئی اور 1958 میں کراچی منتقل ہونے کا حکم نامہ موصول ہو گیا۔ انہیں کراچی میں اقوام متحدہ کے انفارمیشن ڈپارٹمنٹ کے ڈائریکٹر کی سیٹ سنبھالنی تھی۔ اسی حیثیت سے تعانتی ہوئی تھی۔

1958ء کا ذکر ہے، ان کا تقرر یو این او کے انفارمیشن سینٹر کراچی میں ہو چکا تھا جبکہ قبل ازیں وہ غیر ممالک میں غیروں کے ساتھ اپنوں سے دور اجنبی بن کر بہت سارا وقت گزار آئے تھے۔ پردیس میں دیس کا دکھ کس طرح دل کو کچوٹتا ہے اس کرب سے وہ گزر آئے تھے اس لیے کراچی کا جانا پہچانا منظر خوشی کی نوید ثابت ہوا تھا۔ یہاں ان کے کئی دیرینہ احباب موجود تھے۔ مثلاً غلام عباس جن سے ان کی خوب نبھتی تھی۔ ریڈیو کے پرانے ساتھی زیڈ اے بخاری، سید رشید احمد، حمید نسیم اور ضیا جالندھری پھر آغا عبدالحمید بھی کراچی کے چیف ایڈمنسٹریٹر بن کر آ گئے۔ یعنی کہ ایک مضبوط حلقہ موجود تھا۔

یو این او کی جانب سے ان کی تقرری تھی، اس لیے تنخواہ بھی معقول تھی۔ طارق روڈ پر رہائش رکھی تھی جو ابھی بازار نہیں بنا تھا مگر کراچی کے پوش علاقوں میں شمار ہو رہا

منتخب اشعار

الٰہی تیری دنیا جس میں ہم انسان رہتے ہیں
غریبوں جاہلوں مردوں کی بیماروں کی دنیا ہے
یہ دنیا بے کسوں کی اور لاچاروں کی دنیا ہے
ہم اپنی بے بسی پر رات دن حیران رہتے ہیں
ہماری زندگی اک داستاں ہے ناتوانی کی
(انسان)

☆☆☆

زندگی کے کہنہ آہنگ مسلسل سے مجھے
سرزمین زیست کی افسردہ محفل سے مجھے
(وادیٔ پنہاں)

☆☆☆

گزر گئی ہے تقدس میں زندگی میری
رہا ہے اپنی امنگوں پہ اختیار مرا

☆☆☆

خیال ہی میں کیا پرورش گناہوں کو
کبھی کیا نہ جوانی سے بہرہ یاب انہیں

☆☆☆

یہ مل رہی ہے مرے ضبط کی سزا مجھ کو
کہ ایک زہر سے لبریز ہے شباب مرا

اذیتوں سے بھری ہے ہر ایک بیداری
مہیب و روح ستاں ہے ہر ایک خواب مرا

لو آ گئی ہیں وہ بن کر مہیب تصویریں
وہ آرزوئیں کہ جن کا کیا تھا خوں میں نے

☆☆☆

اے کاش چھپ کے کہیں اک گناہ کر لیتا
حلاوتوں سے جوانی کو اپنی بھر لیتا

تھا۔ ایسے علاقے میں ایک خوبصورت کوٹھی میں رہ رہے تھے۔ استعمال کے لیے مہنگی کار موجود تھی۔ یعنی کہ اس دور کی قیمتی کار مرسڈیز ذاتی استعمال کے لیے لے رکھی تھی۔ ان دنوں ان کے دیگر مشاغل بھی شباب پر تھے۔ ہفتہ وار چھٹی کے دن پابندی سے سیر و تفریح کے لیے ساحل سمندر پر جاتے۔ اگر گھر پر ہوتے تو غلام عباس کے ساتھ شطرنج کی بازی سجا لیتے۔ حقہ نوشی جز لاینفک تھا۔ ہر دس پندرہ دن بعد محفل بھی سجاتے جس میں شہر و بیرون شہر کے شعراء ادیب کو مدعو کرتے۔ ایک دو بار فیض احمد فیض کو بھی مدعو کیا تھا۔ فیض صاحب آتے تو اپنے جلو میں دو چار احباب کو بھی لے آتے۔ ان میں ایک محمد حسین عطا بھی تھے۔ یہ عطا صاحب فیض کے ان رفقا میں تھے جن کا ساتھ جیل سے شروع ہوا تھا۔ فیض صاحب ان کی دوستی میں رطب اللسان رہتے۔

عطا صاحب کا تعلق پشاور سے تھا۔ خالص پختون تھے مگر عشق اردو میں پور پور ڈوبے ہوئے تھے۔ ادب کی خدمت کے ساتھ تجارت میں بھی اول تھے۔ ایلفنسٹن اسٹریٹ پر میٹروپول ہوٹل کے نکڑ کی جانب اس زمانے میں ایکسلیسٹر ہوٹل کے قریب میرینا ہوٹل تھا۔ یہ ہوٹل عطا صاحب کا تھا۔ عطا صاحب کی راشد کے ساتھ سلام دعا اس وقت سے تھی جب وہ ریڈیو پاکستان پشاور میں ہوا کرتے تھے۔ عطا صاحب کو بھی راشد کی شاعری پسند تھی۔

عطا صاحب دعوتیں کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ بس انتظار میں رہتے تھے کہ کوئی معروف ادیب یا شاعر کراچی آئے۔ ایک دفعہ جب فیض صاحب کراچی آئے تو عطا صاحب نے ان کی اور راشد صاحب کی ایکسلیسٹر ہوٹل میں دعوت کی۔ ان دنوں وہاں ایک مصری رقاصہ کا شو ہو رہا تھا۔ بیلی ڈانسر پرنس امینہ کا یہ فلور شو خوب مقبول تھا۔ اس شو کی خاص بات یہ تھی کہ ڈرم بجانے والا امینہ کا شوہر تھا جو کسی انگریز لارڈ کا چھوٹا بیٹا تھا۔ وہ کمال کا ڈرم بجاتا تھا۔ لوگ امینہ کا بیلے ڈانس دیکھنے ضرور آتے تھے مگر ان پر ڈرمر کا سحر بھی طاری رہتا تھا۔

اس دعوت میں فیض، راشد اور ان دونوں کے کالج کے ساتھی سید رشید احمد اور ڈاکٹر آفتاب احمد بھی شامل تھے۔ وہ سب وقت مقررہ پر ہوٹل کی اوپری منزل پر واقع ہال میں پہنچے تو دیکھا کہ عطا صاحب کی وجہ سے ہوٹل والوں نے خاص انتظام کر رکھا ہے۔ منیجر نے خود دروازے پر آکر استقبال کیا اور سب کو اسٹیج کے قریب کی دو میزوں میں سے ایک پر بیٹھایا۔ ٹیبل پر پہلے سے اعلیٰ قسم کے مشروبات مع لوازمات بڑے سلیقے سے سجے ہوئے تھے۔ فلور شو میں ابھی دیر تھی۔ فیصلہ یہ ہوا کہ پہلے کھانا کھا لیا جائے کیونکہ شو کے درمیان اٹھ کر جانا دقعت طلب ہوتا۔ اس مشورے پر فوراً عمل کیا گیا لیکن ابھی کھانا کھایا ہی جا رہا تھا کہ فلور شو کی تیاری اختتام پر پہنچ گئی یعنی رنگین روشنیاں جلنے بجھنے لگیں اور اس کے ساتھ ہی ہوٹل کے منیجر کچھ اور مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے ان کی میز کے ساتھ والی میز پر لے آئے۔ ان مہمانوں میں اس زمانے کے وفاقی وزیر ذوالفقار علی بھٹو بھی تھے۔ انہوں نے فیض صاحب کو دیکھتے ہی کسی قدر استعجاب اور بڑی بے تکلفی کے لہجے میں پوچھا۔

"Faiz! what are your doing here?"

فیض صاحب نے سر اٹھا کر ایک نظر ان پر ڈالی پھر چھری کانٹا سنبھال کر اپنی پلیٹ پر جھک گئے اور بڑی بے پروائی سے جواب دیا۔ "عیش!"

یہ لفظ انہوں نے ہر ہر حرف کی آواز کو ابھارتے ہوئے کچھ اس انداز سے ادا کیا کہ جیسے ان کا نطق ان کی زبان کے بوسے لے رہا ہو۔

تمام ساتھی فیض صاحب کے اس جواب سے محظوظ ہوئے، راشد صاحب تو اپنی ہنسی بھی دبا نہ سکے۔ بعد میں بھی بڑا لطف لے لے کر اس کی داد دیتے رہے، یہاں تک کہ اسے سکندر اور دیو جانس کلبی کے اس مشہور مکالمے سے جا بھڑایا کہ جس میں سکندر کے اس سوال پر کہ اسے کیا چاہیے؟ دیو جانس کلبی نے اپنے بورئیے پر بیٹھے ہوئے صرف اتنا کہا تھا۔ "ذرا ایک طرف ہٹ جاؤ اور دھوپ مت روکو۔"

کراچی میں وقت اچھا گزر رہا تھا کہ ایک بار پھر ان کے تبادلے کا حکم نامہ آ گیا۔ اس بار انہیں امریکا جانا تھا۔

ملکوں ملکوں گھومتے ہوئے انہیں تو ایسا کوئی فرق نہیں پڑا تھا مگر بار بار ہوا پانی کی تبدیلی نے ان کی بیگم پر اثر دکھا دیا تھا۔ ان کی صحت پر منفی اثر ہوا تھا۔ جوڑوں کا درد شروع ہو گیا تھا۔ یہ درد اتنا شدید ہوتا کہ وہ زندگی سے مایوس ہونے لگی تھیں۔ اپنی موت کی تمنا کرنے لگی تھیں۔ اس دور کے تقریباً تمام اچھے حکیم کو دکھایا گیا۔ اچھے ڈاکٹروں کے پاس بھی لے جایا گیا مگر درد جب اٹھتا پھر تیز ہی ہوتا چلا جاتا۔ آرام آنے کا نام نہ تھا۔ کسی نے سائیٹیکا کا درد بتایا کسی نے گٹھیا کا درد کہا۔ ایک کے بعد ایک ڈاکٹر حکیم کو دکھایا گیا۔ ہر قسم کی دوا استعمال کر لی گئی لیکن گھڑی بھر کا آرام پھر وہی تکلیف۔

اس وقت کراچی دارالحکومت تھا۔ یہاں ایک سے ایک اچھے ڈاکٹر موجود تھے مگر انہیں کسی سے بھی آرام نہیں مل رہا تھا۔ جب درد اٹھتا تھا تو وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگتی تھیں۔

ان کی تکلیف دیکھ کر ایک ڈاکٹر نے مشورہ دے دیا کہ اگر اینٹی مسکولر پین کا انجکشن لگا لیا جائے تو گٹھیا جیسے مرض سے نجات مل جاتی ہے۔ تکلیف سے وہ گھبرائی ہوئی تھیں۔ انہوں نے اجازت دے دی۔ اجازت ملتے ہی ڈاکٹر نے انجکشن لگا دیا۔

خود ڈاکٹر کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ انجکشن غلط ہے۔ انجکشن لگتے ہی طبیعت بگڑ گئی، ایسی بگڑی کہ پھر سنبھل کر نہ دی کیونکہ انجکشن جعلی تھا۔ اس جعلی انجکشن نے ان کی جان لے لی۔

زندگی کے ساتھی کا یوں ساتھ چھوڑ جانا معمولی بات نہیں ہے۔ راشد ٹوٹ سے گئے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ مرنے والا کتنا ہی قریبی کیوں نہ ہو اس کے ساتھ مرا نہیں جاتا ہے۔ انہیں نیویارک جانا تھا، تبادلے کا آرڈر آچکا تھا۔ وہ بیٹیوں بیٹوں کے ساتھ نیویارک روانہ ہو گئے۔

نیویارک کا یہ سفر کچھ معنوں میں ان کی زندگی کا ایک نیا سفر ثابت ہوا۔ بلکہ زندگی کا سنگ میل ثابت ہوا۔ کس طرح یہ آگے بتایا جائے گا۔ فی الحال ڈاکٹر آفتاب احمد کی باتیں سنا دوں جس کا ذکر انہوں نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ان دنوں مجھے ایک اپنے کام کے سلسلہ میں نیویارک جانا پڑا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے درمیان انہوں نے یو این او اسکول جہاں ان کی بیٹی پڑھ رہی تھی وہاں کی ایک استانی کا ذکر چھیڑ دیا۔ شیلا کا ذکر کچھ اس انداز سے وہ کر رہے تھے کہ وہ کسی اور طرف جھکاؤ کا اشارہ تھا۔ اس کے بعد بھی جب میں نیویارک پہنچا تو اسی کی باتیں کرنے لگے۔ پھر جب میں اپنی بیگم کے ساتھ نیویارک گیا تو انہوں نے مجھے اور میری بیگم کو چائے پر بلایا۔ اس دعوت کا مقصد یہ تھا کہ وہ مجھے اس استانی شیلا سے ملوانا چاہ رہے تھے۔ ہمیں بلانے کے ساتھ انہوں نے اسے بھی دعوت دی۔ چائے پر ہم پہنچے تو شیلا بھی آئی ہوئی تھی۔ ایک دوسرے سے تعارف ہوا۔ پھر رات کے کھانے کے لیے راشد صاحب ہمیں نیویارک کے مشہور چائنا ٹاؤن میں واقع ایک معروف چائنیز ریسٹورنٹ میں لے گئے۔ جو بہت اعلیٰ پائے کا ریسٹورنٹ تھا۔ چینی کھانا راشد صاحب کی خاطر مدارات کا ایک جزو ہوتا تھا۔ وہ چائنیز

''راشد کی شاعری میں نفسیاتی تحلیل اور جذباتی تسلسل ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور ان دونوں کے ہم آہنگ ہونے سے ایک آزاد تسلسل کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جدید نفسیات کے ماہروں نے ذہنی لاشعور کو ماپنے کے لیے آزاد تسلسل کا آلہ ایجاد کیا ہے۔ کسی شخص سے مخاطب ہو کر ایک فہرست میں سے منتخب الفاظ یا فقرے بولے جاتے ہیں اور اس سے کہا جاتا ہے کہ وہ ہر سوال کا جواب ان الفاظ یا ان الفاظ کے مجموعے سے دے جو سب سے پہلے اس کے ذہن میں آئیں۔ ان جوابات سے اس فرد کی زیرِ نفسی کیفیت کے متعلق نتائج مرتب کیے جاتے ہیں۔ شعر کی بھی ایک حد تک یہی کیفیت ہے۔ شاعر کے دل میں ایک خیال اٹھتا ہے۔ پھر اس کا ذہن لاشعور اس خیال میں وابستہ دوسرے خیالوں اور تصویروں کو کھینچ لاتا ہے اور انہیں شعر کی صورت میں منتقل کر دیتا ہے۔''

''راشد کا اسلوب مکمل آزاد تسلسل کے مطابق ہے۔ بعض اعلیٰ درجہ کی فلموں میں ایسے لمحاتی مناظر جن کا بظاہر آپس میں کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ناظر کے سامنے پے در پے لائے جاتے ہیں لیکن ان مناظر کے مجموعی اثر سے ایک واضح تصویر اور مکمل تاثر ناظر کے دل و دماغ پر کھچ جاتا ہے۔ آزاد تسلسل کی یہ ایک غیر مرئی صورت ہے۔ ''اجنبی عورت'' میں ارضِ مشرق کی زبوں حالی اور ''انتقام'' میں ایک شبستاں کا تاثر پیدا کرنے کے لیے راشد نے اسی نوع کی فن کاری سے کام لیا ہے۔ آزاد تسلسل راشد کا خاص انداز ہے۔ اس کی مثالیں اس کی اکثر نظموں میں ملتی ہیں۔''

کرشن چندر

کھانے کے شوقین تھے... اور اپنے ذوق کا اظہار اس طرح کرتے تھے کہ چھری کانٹے کی بجائے چوپ اسٹیک سے کھاتے تھے۔

اس قیام کے دوران ایک چھٹی کے دن انہوں نے دوپہر میں ہماری تواضع کے لیے خصوصی اہتمام کیا۔ پتا نہیں کہاں سے بکرے کے سری پائے لے آئے۔ اسے پکانے وہ خود بیٹھے۔ کسی کو بھی اپنے کام میں شریک نہ کیا، نہ اپنی بیٹیوں کو اور نہ میری بیگم کو، یہاں تک کہ پیاز چھیلنے میں بھی کسی کی مدد نہیں لی۔ جب بھی کوئی مدد کی خاطر آگے آتا وہ ایک ہی بات

کہتے کہ یہ خالص میری طرف سے دعوت ہے۔

انہوں نے اکیلے سب کام کیا اور پھر جب ہم لوگ سیرین بریڈ کے ساتھ جس بے تکلفی سے سری پائے کھائے، خصوصاً راشد صاحب نے جس بے تکلفی کا مظاہرہ کیا۔ جس طرح کھایا۔ وہ یادگار ہے۔ اس دعوت میں شیلا شریک نہ تھی۔ اگر شیلا جیسی نازک مزاج، چھری کانٹوں سے کھانے والی فرنگی خاتون دیکھ لیتی تو شاید راشد صاحب کے عشق کا معاملہ خطرے میں پڑ جاتا۔

اگلی شام ایک دو دیگر احباب کے ساتھ گزری پھر ایک شام نظر محمد راشد کے پرانے رفیق کار جی کے فرید کے ہاں کہ وہ بھی ریڈیو سے یو این او کی انفارمیشن سروس میں چلے آئے تھے۔ ان سے اور ان کی بیگم سے میری پرانی یاد اللہ تھی اور وہ دونوں میری بیگم کے خاندان کے پرانے جاننے والے تھے۔ فرید صاحب کا گھر فشنگ میڈوز میں تھا، جہاں شروع شروع میں یو این او کا دفتر ہوا کرتا تھا۔ اب وہاں یو این او کے اہلکاروں کی ایک پوری بستی ہے۔ ظاہر ہے فرید صاحب نے راشد کو بھی بلایا۔ میں نے محسوس کیا کہ راشد صاحب نے ہماری یہ دعوت قبول کرنا کچھ پسند نہیں کیا۔ بعد میں مجھ سے کہنے لگے کہ وہ جگہ بہت دور ہے، تم نے ٹال دینا تھا، اب تمہارے ساتھ مجھے بھی جانا پڑے گا۔

میں نے کہا کہ فرید صاحب نے اپنی کار لانے لے جانے کے لیے پیش کی تھی اب میں دوری کا بہانہ کیسے کرتا، اصل بات یہ تھی کہ اب راشد صاحب کی شامیں شیلا کے ساتھ گزر رہی تھیں اور انہوں نے شیلا کو بلایا نہیں تھا۔ راشد صاحب کی طبیعت کچھ مکدر سی ہو گئی تھی۔ مگر چونکہ فرید صاحب سے دوستانہ مراسم تھے۔ بڑے خلوص سے تاکید کی تھی۔ لہٰذا وہ ہمارے ساتھ فرید صاحب کے گھر پہنچے۔ پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی تھی۔ کچھ دیر بعد دوسرے مہمان بھی آ گئے تھے۔ گپ شپ شروع ہو گئی۔ اچانک میری نظر راشد صاحب کی کرسی کی جانب اٹھی تو وہ خالی تھی۔ میں نے فرید صاحب سے پوچھا تو شرارت سے مسکرا کر بولے اوپر کمرے میں اپنی مخدومہ سے فون پر بات کر رہے ہیں۔ یہ گفتگو ساری شام وقفہ وقفہ سے جاری رہی۔

نیو یارک کے ہمارے اس قیام کے دوران ہی انہوں نے بتا دیا تھا کہ وہ شیلا سے شادی کرنے والے ہیں۔ میں نے جانتے ہوئے بھی پوچھا کہ کون ہے شیلا تو وہ بولے کہ ان کی بچی کی ٹیچر ہیں جو آہستہ آہستہ وہ ان کی زندگی میں در آئی ہیں۔

حسن کوزہ گر سے انتخاب

جہاں زاد، نو سال پہلے
تو ناداں تھی لیکن تجھے یہ خبر تھی
کہ میں نے، حسن کوزہ گر نے
تری قاف کی سی افق تاب آنکھوں
میں دیکھی ہے وہ تابناکی
کہ جس سے میرے جسم و جاں، ابر و مہتاب کا
رہگزر بن گئے تھے
جہاں زاد بغداد کی خواب گوں رات
وہ رود دجلہ کا ساحل
وہ کشتی وہ ملاح کی بند آنکھیں
کسی خستہ جاں رنج بر کوزہ گر کے لیے
ایک ہی رات وہ کہربا تھی
کہ جس سے ابھی تک ہے پیوست اس کا وجود......
اس کی جاں اس کا پیکر
مگر ایک ہی رات کا ذوق دریا کی وہ لہر نکلا
حسن کوزہ گر جس میں ڈوبا تو ابھرا نہیں ہے!

☆☆☆

جہاں آزاد سے انتخاب

میں انساں ہوں لیکن
یہ نو سال جو غم کے قالب میں گزرے!

دونوں میں قربت بڑھ چکی ہے۔ اکثر شامیں دونوں کی ساتھ گزرتی ہے۔

شاید اس لیے کہ وہ تو پہلے ہی اکیلے پن کا شکار تھے جس کی جھلک ان کی نظموں میں صاف جھلکتی ہے۔ بیوی کے انتقال کے بعد یہ احساس سوا ہو گیا تھا۔ ایسے وقت میں شیلا کا ان سے قریب ہونا ان کے لیے مداوا ثابت ہوا۔ وہ تو پہلے ہی ترسے ہوئے تھے۔ کسی ایسے ساتھی کے لیے جو ان کی باتوں کو سنے، سمجھے۔ مشورے کا ساتھی ہو لیکن ان دنوں وہ ذہنی خلجان میں بھی نظر آتے۔ کبھی انہیں اس بات کی فکر ہوتی کہ ان دونوں میں عمر کا خاصہ فرق ہے۔ کبھی رنگ و نسل کا کانٹا دل میں چبھتا ہوا پاتے لیکن شیلا تو طوفانی رفتار سے ان کی طرف بڑھ رہی تھی اس لیے وہ خاموش تھے۔

شیلا نے کہہ رکھا تھا کہ شادی وہ انہی سے کرے گی مگر

حسن کوزہ گر آج اک تودۂ خاک ہے جس
میں نم کا اثر تک نہیں ہے
جہاں زاد بازار میں صبح عطا یوسف
کی دکان پر تیری آنکھیں
پھر اک بار کچھ کہہ گئی ہیں
ان آنکھوں کی تابندہ شوخی
سے اٹھی ہے پھر تودۂ خاک میں نم کی ہلکی سی لرزش
یہی شاید اس خاک کو گل بنادے!

☆☆☆

مجھے وداع کر

اے میری ذات، پھر مجھے وداع کر
میں تیرے ساتھ
اپنے آپ کے سیاہ غار میں
بہت پناہ لے چکا
میں اپنے ہاتھ پاؤں
دل کی آگ میں تپا چکا!
مجھے وداع کر
کہ آب و گل کے آنسوؤں
کی بے صدائی سن سکوں
حیات و مرگ کا سلام روستائی سن سکوں
میں روز و شب کے دست و پا کی نارسائی سن سکوں!

اپنے والدین کی اجازت سے۔ یہ بات مشرقی معاشرے میں عام سی بات ہے لیکن مغربی معاشرے میں ایسا کم ہی دیکھا جاتا ہے اس وجہ سے بھی وہ ہچکچاہٹ کا شکار تھے کہ کہیں وہ انہیں طفل تسلی تو نہیں دے رہی ہے؟ اسی لیے وہ جب بھی کہتی کہ میں اجازت لینے والدین کے پاس جا رہی ہوں تو ان کا دل دھڑک اٹھتا۔ شیلا کے والد اطالوی تھے اور والدہ انگریز۔ ان کا ایک گھر لندن میں تھا اور دوسرا روم میں۔ شیلا اجازت لینے کے لیے یورپ جانا چاہ رہی تھی اور راشد مخمصے کا شکار تھے کہ وہ یورپ جائے گی تو ان کے رقیب کا سایہ اس پر پڑ جائے گا۔ رقیب کہیں درمیان میں کود نہ پڑے۔

مگر یہ سارے خدشات غلط ثابت ہوئے اور شیلا لندن جا کر والدین کی اجازت لے آئی۔ مگر شادی کے لیے انہیں لندن جانا پڑا۔ شادی لندن میں ہونا تھی۔ ہوگئی اور پھر وہ شیلا کے ساتھ نیویارک لوٹ آئے۔

☆☆☆

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ ایک بڑا حلقہ اب انہیں پسند بھی کرنے لگا تھا۔ ردیف و قافیہ کے بغیر اشعار ایک نئی بات تھی پھر بھی لوگ پسند کر رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ راشد سماجی حقائق کو دوسرے شعرا کی طرح ہنگامی اور عام فیشن کی رو میں بہہ کر نہیں دیکھتے بلکہ اس لیے دیکھتے ہیں کہ وہ ان کی اپنی داخلی دنیا کو شدید طور پر متاثر کرتے ہیں اور وہ اپنی شاعرانہ ریاضت داری سے مجبور ہیں کہ ان تاثرات کا اظہار کریں۔ چنانچہ ان کی نظمیں انہی تاثرات یعنی ان کی ذہنی تلخی، اضطراب اور جھنجلاہٹ کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ یہ سب کچھ ایک مخصوص خارجی ماحول کی پیداوار ہے جس نے ایک دو نہیں ہزاروں حساس نوجوانوں کو اس حالت میں مبتلا کر دیا ہے چنانچہ ان نظموں میں عالمگیر تجربات کا اظہار ہے۔ راشد کی آپ بیتی گویا جگ بیتی کی ترجمان ہے۔ ''زنجیر'' کے یہ اشعار ملاحظہ کریں۔

گوشہ زنجیر میں
اک نئی لرزش ہویدا ہو چلی
ہر جگہ پھر سینہ نخچیر میں
اک نیا ارماں نئی اُمید پیدا ہو چلی
شکر ہے دنبالہ زنجیر میں
اک نئی جنبش
نئی لرزش ہویدا ہو چلی
کوہساروں، ریگ زاروں سے صدا آنے لگی
ظلم پروردہ غلامو! بھاگ جاؤ
پردہ شبگیر میں اپنے سلاسل توڑ کر
چار سو پھیلے ہوئے ظلمات کو اب چیر جاؤ
اور اس ہنگام باد آوردوں کو
حیلہ شبخوں بناؤ!

وہ تحریر میں جس طرح آزاد خیال، مذاہمتی نظر آتے ہیں۔ عملی زندگی میں بھی تلقین کے عادی تھے۔ ان کے بیٹے شہریار راشد نے ایک واقعہ بیان کیا تھا کہ ایک روز وہ سامنے وہسکی کا گلاس رکھے خیالوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ کچھ فاصلے پر میں بیٹھا انہیں بددلی سے دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے مجھے قریب آنے کا اشارہ دیا۔ دراصل ایک ٹی وی سیریل دیکھ کر یہ احساس میرے دماغ میں بیٹھ گیا تھا کہ شراب پینے والے باپ ظالم ہوتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے قریب جاتے

ہوئے ڈر رہا تھا۔ وہ فوراً تاڑ گئے۔ ایک دوسرے گلاس میں تھوڑی سی وہسکی انڈیلی اور بولے۔ ''آؤ میرے ساتھ بیٹھ کر وہسکی پیو، مگر اس فعل کے تم خود ذمہ دار ہو گے۔''

اس عملی تلقین نے شہریار پر گہرا اثر ڈالا اور اس نے کبھی وہسکی کی جانب ہاتھ نہیں بڑھایا۔

اس واقعہ سے یہ صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ اپنے احساس دوسروں تک کس خوبصورتی سے ترسیل کر دیتے تھے۔ عملی طور سبق دیتے تھے۔ اس بات کے ثبوت میں شہریار ایک اور واقعہ بتاتے ہیں۔ ''اس وقت میری عمر سات آٹھ سال ہو گی۔ ہم لوگ نیویارک میں رہ رہے تھے۔ پڑوس میں ایک شریر لڑکا رہا کرتا تھا۔ اس نے شرارت میں میرے حلق میں ٹوتھ پیسٹ ٹھونس دیا۔ میں بوکھلایا ہوا گھر آیا۔ پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ ماں باپ مجھ سے ہمدردی جتائیں گے لیکن ہوا یہ کہ والد نے مجھے گھر سے نکال دیا، کہا کہ جب تک اس لڑکے سے حساب نہ چکا دو گھر میں مت گھسنا۔ بے چاری والدہ نے بہت شور مچایا کہ یہ کیا کر رہے ہو مگر انہوں نے ایک نہ سنی۔ میں بھی غصے میں آگیا اور گھر سے سیدھا نکلا اور اس ہیکڑ کی ایسی ٹھکائی کی کہ اس کی سب ہیکڑی نکل گئی۔ پھر کبھی اس کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ مجھ سے شرارت کرتا۔ گویا کہ وہ ہر بات عملی انداز میں ترسیل کرتے یہی وجہ تھی کہ انہوں نے پہلی آزاد نظم ''جرأت پرواز'' لکھی تو لوگوں نے خاکہ اڑایا۔ آوازے کسے کہ یہ جناتی شاعری ہے۔ بغیر ردیف قافیہ کے بھی کبھی اشعار موزوں ہوتا ہے؟ انہوں نے کسی کا بھی جواب نہیں دیا۔ اپنے آپ میں گم رہے اور وقت گزرتا رہا۔ لوگوں نے یہی سمجھا کہ شاید انہوں نے یہ لایعنی شاعری چھوڑ دی ہے مگر وہ تو شاعری کا ایک نیا عہد تخلیق کر رہے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ حالی اور آزاد سے لے کر اقبال تک، اور اقبال سے لے کر جوش تک حفیظ جالندھری و اختر شیرانی تک، اردو نظم نے بڑا تیز سفر کیا لیکن یہ سفر نظم نگاری کی دیرینہ روایات کے دائرے ہی میں ہوا لیکن ن م راشد اور ان کے ایک اور ممتاز ہم عصر میراجی کے یہاں اس نظم نے ہیت و اسلوب میں ایک ایسی تبدیلی کی بنیاد ڈالی جس نے نظم کا سانچہ ہی بدل ڈالا۔

ن م راشد کا پہلا مجموعہ ماورا 1941ء میں شائع ہوا تو گویا یہ ٹھہرے ہوئے پانی میں ایک پتھر کی مثال ثابت ہوا۔ راشد نے اپنی نظموں میں نہ صرف یہ کہ نظم آزاد کا کامیاب تجربہ کیا بلکہ مغرب کے شعر بالخصوص انگلستان و فرانس کے جدید شعرا سے متاثر ہو کر نظم نگاری کے فن کو نئے طریقوں سے برتا۔

ابتدا میں ن م راشد اور میراجی دونوں ہی شدید تنقید کا نشانہ بنے لیکن انہوں نے جو بیج بویا وہ بہت جلد تناور درخت بن گیا۔

☆☆☆

شاعری کے علاوہ راشد کے دوسرے شوق، گھڑسواری، شطرنج، کشتی رانی تھے۔ شراب نوشی کبھی کم اور کبھی زیادہ اس وقت تک چلتی رہی جب تک دل کے عارضہ کے نتیجہ میں ڈاکٹروں نے سختی سے منع نہیں کر دیا۔ مشاعروں میں بہت کم شریک ہوتے تھے۔ 10 مارچ 1973ء کے ایک خط میں اپنے دوست امین حزیں کو لکھتے ہیں۔ ''یہ جانتا ہوں کہ آیندہ زندگی کے لیے سب سے بڑا سہارا پاکستان ہی ہے۔ وہیں عزیز اور دوست ہیں...اور وہیں میری تمام ادبی شہرت بھی ہے۔''

یاد رہے کہ کچھ ہی عرصہ قبل انہوں نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ انگلستان میں بس جانے کا حتمی فیصلہ کر چکے ہیں۔ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اس فیصلہ میں شیلا کی مرضی کا دخل تھا۔ ان کے بیٹے شہریار نے پاکستان فارن سروس جوائن کر لیا تھا۔ اس نے ایک پاکستانی لڑکی سے شادی کی تھی اور کہا تھا کہ بیوی اور سروس کی وجہ سے اس کا تعلق پاکستان سے رہے گا۔

گو کہ راشد صاحب نے انگلستان میں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر ان کا دل پاکستان کے لیے ہمکتا تھا۔ اس سلسلہ میں ان کے آخری دنوں کے خطوط گواہ ہیں۔ جیسا کہ امین صاحب کو لکھے خطوط سے ظاہر ہے یا پھر ڈاکٹر جمیل جالبی کو لکھے خط میں لکھا۔ ''بہت سے دن پے در پے ایسے گزر جاتے ہیں کہ کچھ لکھنے پڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ انگلستان میں رہ کر سب سے بڑا نقصان یہی ہے کہ ان احباب سے دور ہو گیا ہوں، جنہیں اہل دل میں شمار کرتا ہوں اور جن کے ساتھ گفتگو مایہ الہام بنتی ہے۔''

ایسا لگتا ہے کہ دوری اور محرومی کا احساس دل کا روگ بن گیا تھا۔ 14 اگست 1974 کو وہ انگلستان پہنچے اور 9 اکتوبر 1975ء کو دل کی حرکت رک گئی۔ انگلینڈ کے قصبہ چلٹنہم میں انتقال ہو گیا مگر تدفین کہیں نہیں ہوئی کیونکہ ان کی مبینہ وصیت کے مطابق ان کی لاش کو سپرد آتش کیا جانا تھا۔ پاکستان میں اس بات پر خاصی ناراضگی جتائی گئی تھی حتی کہ باقاعدہ طور پر تعزیتی جلسے بھی منعقد نہیں ہوئے۔ پتا نہیں وقت آخر انہوں نے ایسی عجیب وصیت کیوں کر دی؟

++

جسے اللہ رکھے

نسرین اختر نینا

معجزے آج بھی رونما ہوتے ہیں۔ محیر العقول واقعات سامنے آتے رہتے ہیں جو عقل کو عاجز کردیں۔ دس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرتا ہوائی جہاز درمیان سے دو ٹکڑے ہوجائے اور اس میں سے کوئی نازک اندام لڑکی گرجائے تو اس کا حشر کیا ہوگا؟

■ جرمنی کی اس دوشیزہ کی روداد جو عقل کو حیران کردے

آسمان پر بلندیوں کو چھوتا LANSA ائرویز کا جہاز منزل کی جانب گامزن تھا۔ نیچے گھنا جنگل تھا۔ دنیا بھر میں خطرناک ترین جنگل میں سرفہرست جنگل جو طوالت میں بھی بہت زیادہ ہے۔ اس فلائٹ میں دیگر مسافروں کے ساتھ جولیانا کوپک بھی تھی۔ وہ کھڑکی سے اڑتے بادلوں کو دیکھ رہی تھی کہ جہاز یکایک دو ٹکڑے ہوگیا۔ اس ٹوٹے ہوئے حصے سے جولیا نیچے گرتی چلی گئی۔

جولیانا کوپک 10 اکتوبر 1954ء کو جرمنی میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کے والدین سائنس دان تھے۔ والدہ کا نام میریا کوپک تھا اور والد کا نام ہانس ولیم کوپک تھا۔ وہ جنوبی امریکا کے ملک پیرو میں واقع ایمیزون رین فارسٹ میں ریسرچ کرنے کی غرض سے آئے ہوئے تھے۔ خود وہ بھی کچھ عرصہ تک

اپنے والدین کے ہمراہ اس جنگل میں رہ چکی تھی۔ ہانس ولیم کوپک ایک ٹوٹے ہوئے کیبن میں رہتے تھے، جس میں پرانا سامان بھرا تھا۔ یہ سامان ان سے قبل رہنے والے چھوڑ گئے تھے۔ جولیانا کی والدہ جو کہ Ornithologist تھیں۔ ان کا زیادہ تر وقت ریسرچ میں گزرتا تھا۔ اسی طرح والد Biologist تھے۔ وہ بھی جنگل میں پائے جانے والے حشرات اور دیگر جنگلی اشیاء کے بارے میں تحقیقات کررہے تھے۔ والدین کی مصروفیت میں وہ مخل ہونا نہیں چاہتی تھی اسی لیے وہ جنگل کی سیر پر نکل جاتی۔

دن بھر ادھر ادھر بھٹکتی رہتی۔ یہ جنگل دنیا بھر میں سب سے گھنا جنگل تسلیم کیا جاتا تھا۔ خطرناکی میں بھی سرفہرست تھا۔ اس لیے وہ کیبن سے زیادہ نہیں جاتی تھی۔ ننھی سی بچی نے جنگل کے بارے میں بہت سی معلومات، تجربات حاصل کرلی تھی۔

جنگل میں گھومتے پھرتے ہوئے وہ خوف و دہشت میں کبھی مبتلا نہیں ہوئی بلکہ اسے جنگل کا ماحول بے حد متاثر کن محسوس ہوتا تھا جبکہ اس جنگل میں قدم قدم پر خطرہ تھا۔ ایسے ایسے حشرات الارض پائے جاتے تھے جو دنیا میں کہیں اور نظر نہیں آتے۔

اس کے والد نے اسے سمجھایا تھا کہ جنگل میں رہنے کے تین اصول ہیں۔ کسی بڑے جانور سے سامنا ہو تو اس سے ڈر کر بھاگنا نہیں چاہیے بلکہ اونچے درخت پر چڑھ جانا چاہیے۔ اس طرح وہ جانور اپنی راہ لے لے گا۔ غلطی سے بھی کسی بڑے جانور کو غصہ مت دلانا۔ بڑے جانوروں کے مقابلے میں چھوٹے چھوٹے زہریلے کیڑوں سے زیادہ خطرہ ہوتا ہے۔ جنگل میں راستہ بھول جانے کی صورت میں ہمیشہ کسی ندی کو تلاش کرنا چاہیے کیونکہ ندیوں کے قریب کوئی نا کوئی انسانی بستی ضرور ہوتی ہے اور سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ جنگل میں ہر پھل کھانے کے قابل نہیں ہوتا کیونکہ ممکن ہے کہ وہ پھل زہریلا ہو جس سے انسان کی جان بھی جاسکتی ہے۔ یہ سب باتیں جولیانا نے چھوٹی عمر ہی میں عملی طور پر سمجھ لی تھیں۔ پھر جب وہ کچھ بڑی ہوئی تو اسے حصول علم کے لیے پیرو پہنچادیا گیا۔

وہ اسکول میں سینئر اسٹوڈنٹ تھی چونکہ کرسمس کی چھٹیوں سے پہلے اسکول میں گریجویشن کرنے والے طلبا کی الوداعی تقریب تھی اس لیے جولیانا چاہتی تھی کہ وہ بھی اس میں شریک ہوجائے مگر اس کی والدہ چاہتی تھی کہ وہ کرسمس سے پہلے پہلے اپنے شوہر کے پاس چلی جائیں جو کہ مشرقی پیرو کے پوکالپا، نامی گاؤں میں مقیم تھے یہ شہر Ucayali دریا کے کنارے واقع ہے جو کہ دریائے ایمیزون کے معاون دریاؤں میں سے ایک ہے۔ وہ سب پُرامید تھے کہ اس مرتبہ پورا خاندان اکٹھے کرسمس منائیں گے۔

وہ ماں بیٹی لاک ہیڈ الیکٹرا کمرشل ائرلائنز کی LANSA Flight 508 کے ذریعے اپنی منزل کی جانب روانہ ہوئیں۔ وہ بے حد خوش اور پُرجوش تھیں۔ دوسری طرف جولیانہ کے والد بھی بے تابی سے ان کے منتظر تھے۔ موسم بے حد خراب تھا۔ گرج چمک کے ساتھ بارش ہورہی تھی کہ اچانک بجلی چمکی اور پھر خوفناک کڑک سنائی دی۔ دراصل جہاز پر بجلی گری تھی اور جہاز جو کہ دس ہزار فٹ کی بلندی پر محو پرواز تھا۔ بجلی کے گرنے سے دو ٹکڑے ہوگیا۔ لوگ چیخ رہے تھے۔ دعائیں مانگ رہے تھے۔ مگر جولیانا نہایت خاموشی سے اپنی سیٹ پہ بیٹھی رہی۔ اس کے کانوں میں ماں کے الفاظ گونجے۔

''سب کچھ ختم ہوگیا۔'' اور واقعی سب کچھ ختم ہوگیا تھا۔

جہاز فضا ہی میں پھٹ کر دو ٹکڑے ہوگیا تھا۔ جولیانا اپنی سیٹ سے بندھی ہوئی تھی۔ اسی لیے گرنے کے دوران سیٹ سے متصل پیراشوٹ کھل گیا۔ یوں اس کے گرنے کی رفتار آہستہ ہوگئی اور نہایت آرام سے اترنے لگی۔ نیچے گھنے درخت پھیلے ہوئے تھے۔ وہ ان پر گری تھی۔ یہ معمولی جھٹکا بھی تکلیف دہ تھا۔ وہ بے ہوش ہوگئی۔ ہوش آیا تو اسے گردن میں شدید درد کی ٹیسیں اٹھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس کی کالر بون ٹوٹ چکی تھی۔ دائیں آنکھ سوج رہی تھی۔ دائیں بازو پہ گہرا زخم تھا جو ٹہنیوں نے لگایا تھا۔ جب اس کی آنکھیں جنگل کی تاریکی میں دیکھنے کے قابل ہوئیں، تو یہ دیکھ کر اس کا دل ڈوب گیا کہ ہر طرف خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ جہاز کے گرنے سے قبل لوگوں کی دلخراش چیخیں گونجی تھیں لیکن اب خاموشی تھی مکمل خاموشی۔ اس کا مطلب تھا کہ سارے مسافر مرچکے تھے۔ وہ کسی نا کسی طرح اپنی سیٹ سے اٹھی تاکہ ماں کو تلاش کرسکے۔ مگر کافی دیر کی تلاش کے باوجود اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ ہر طرف جہاز کے ٹکڑے، ٹوٹے پھوٹے سامان اور مسافروں کے جسموں کے ٹکڑوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ جولیانا نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس میں چوکلیٹ کا پیکٹ تھا، جو اسے جہاز میں ائرہوسٹس نے دیا تھا اور اس نے یہ سوچ کر جیب میں ڈال لیا تھا کہ بعد میں کھائے گی۔

یہ تصور ہی ہراساں کرنے والا تھا کہ وہ اس گھنے اور تاریک جنگل میں تنہا، ذی روح تھی۔ ایمیزون ایک ایسے قفس

کے لیے جو اس رین فارسٹ سے کماحقہ آگاہ نہ ہو، ایک خطرناک اور خوفناک جگہ تھی۔ ناقابلِ تصور دشواریوں اور مصائب سے بھرپور تھی لیکن جولیانا اس لحاظ سے خوش قسمت تھی کہ چودہ سال کی عمر میں اس نے اپنے والدین کے ہمراہ اٹھارہ ماہ اس جنگل میں گزارے تھے۔ جنگل میں اپنے قیام کے دوران اس نے وہاں کے خطرات سے بخوبی آگاہی حاصل کرلی تھی۔ اس نے جہاز کی بکھری ہوئی چیزوں میں سے کچھ ضروری چیزیں اکٹھی کیں اور ایک چھوٹے سے شولڈر بیگ میں ڈال لیا جو کسی اور مسافر کا تھا۔ اس کے ذہن میں اپنے والد کے الفاظ گھوم رہے تھے جو کئی سال قبل جنگل میں رہنے کے اصول بتاتے ہوئے بولے تھے۔ اب اس لیے جب کہ وہ جہاز کے ملبے، دور دور تک بکھرے ہوئے سامان اور مسافروں کے بے جان جسم پرنم آنکھوں سے دیکھ رہی تھی تو وہ اپنے والد کی بتائی ہوئی باتوں کو یاد کررہی تھی۔ اس نے کبھی سوچا بھی تھا کہ زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آئے گا... جب وہ جنگل میں بے یارو مددگار ہوگی۔ صدمے کی بات یہ تھی کہ وہ اپنی پیاری ماں کو ہمیشہ کے لیے کھو چکی تھی۔

جولیانا کافی دیر تک جہاز کے ملبے کے پاس کھڑی اپنی ماں کو یاد کرتی رہی۔ دیگر مسافروں کے بارے میں سوچتی رہی جو اپنے پیاروں کے ساتھ کرسمس منانے کی غرض سے روانہ ہوئے تھے اور یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ ایک ایسے سفر پہ جارہے ہیں جس کا اختتام موت ہے اور ان کے چاہنے والے ان کا انتظار ہی کرتے رہ جائیں گے۔

کچھ دیر تک بجھی بجھی آنکھوں، دکھی دل کے ساتھ جولیانا جہاز کے ملبے کو تکتی رہی پھر مایوس ہوکر جنگل میں راستہ تلاش کرنے کی مہم پر روانہ ہوگئی۔ چلتے چلتے اسے ایک جگہ بڑا سا نالہ نظر آیا اور اس نے اس کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کردیا۔ کیونکہ اسے علم تھا کہ یہ نالہ اسے کسی نہ کسی ندی تک پہنچادے گا اور ندی انسانوں کی کسی بستی تک اس کی راہنمائی کرے گی چنانچہ گیارہ روز تک وہ ندی کے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ اس دوران اس نے جنگلی پھل کھائے، ذائقہ برقرار رکھنے کے لیے چاکلیٹ کا ٹکڑا بھی کھالیتی۔ وہ رکے بغیر مسلسل چل رہی تھی۔ جب تھک جاتی تو کسی درخت سے ٹیک لگا کر کچھ دیر کے لیے بیٹھ جاتی اور ہلکی سی جھپکی لے کر پھر سے چل پڑتی۔

جس ندی کے ساتھ ساتھ وہ چل رہی تھی اس میں مگرمچھ، پیرانہ مچھلی اور Stingray جیسے خطرناک، آبی جانور بھی موجود تھے۔ وہ اس بات سے بخوبی آگاہ تھی کہ پیرانہ مچھلی بہتے پانی میں حملہ نہیں کرتی اور مگرمچھ کو جب تک تنگ نہ کیا جائے وہ انسانوں کو نقصان نہیں پہنچاتا۔ اسی طرح اسٹنگرے کو ڈنڈے سے ڈرا کر بھگایا جاسکتا ہے۔ اتنی زیادہ معلومات کے باوجود اسے علم تھا کہ وہ اس جنگل میں زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہ سکتی۔ جنگل بے حد گھنا تھا اور درندوں کی بہتات بھی تھی۔ اسے مدد کی اشد ضرورت تھی کیونکہ جنگل بہت بڑا تھا۔ اونچے اونچے آسماں کو چھوتے درخت تھے۔ جھاڑ، جھنکاڑ، مختلف قسم کے حشرات الارض کی آوازیں، درندوں کی چنگھاڑیں اور پرندوں کی چہچہاہٹیں مسلسل کانوں تک پہنچ رہی تھیں تو ایسے خطرناک ماحول میں ایک نوعمر لڑکی کے لیے زندہ بچ جانا ایک معجزہ ہی ہوسکتا تھا۔ مگر جولیانا ایک عام لڑکی نہیں تھی۔ کم عمر ہونے کے

اس کی شناخت... اوپر کے بڑے دانت

ابن انشا سے کون واقف نہیں۔ انہیں ان کی خوبصورت شاعری اور شگفتہ کالم نگاری کی وجہ سے آج بھی سب جانتے ہیں، مگر ان کا اپنا ایک پرابلم تھا کہ وہ سوائے ایک اداکارہ کے کسی کو پہچانتے نہیں تھے۔ اگرچہ وہ روزانہ ایک فلم بڑی پابندی سے دیکھتے تھے۔ یہ قصہ قیام پاکستان کے دو تین برس بعد کا ہے جب ابن انشا لاہور میں رہتے تھے اور ان کے گھر کے ارد گرد نشاط سنیما اور کیپٹل سنیما تھے۔ ایبٹ روڈ پر واقع اپنے اس مکان میں وہ کئی برس رہے اور سنیما گھروں کے قریب ترین ہونے کی وجہ سے وہ روزانہ ایک فلم دیکھ لیا کرتے تھے۔ ایک دن ان کے ایک ادیب دوست نے ان سے پوچھا۔

''یہ تم روزانہ فلم کیوں دیکھتے ہو؟''

''مجھے ہندوستانی فلموں کی ہیروئن بڑی اچھی لگتی ہیں۔''

''اچھا۔ کون کون سی ہیروئن اچھی لگتی ہیں تمہیں؟''

''یوں تو سبھی ہیروئن اچھی لگتی ہیں۔ مگر سوائے ایک کے کسی کو پہچان نہیں پاتا نہ ہی ان کے نام مجھے معلوم ہیں۔''

''وہ خوش نصیب ہیروئن کون ہے جس کا نام بھی تمہیں یاد ہے اور جسے تم پہچان بھی لیتے ہو؟''

''اس کا نام ثریا ہے۔ میں اسے اسکرین پر دیکھتے ہی پہچان لیتا ہوں۔''

دوست نے جب ان سے اس خصوصی رغبت کی وجہ پوچھی تو جانتے ہیں، ابن انشا نے کیا جواب دیا؟ انہوں نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔

''دراصل میں اس کے اوپر کے دانتوں کی وجہ سے اسے پہچان لیتا ہوں جو باہر کو نکلے ہوئے ہیں اور اتنے نمایاں ہیں کہ مجھے اسے پہچاننے میں دیر نہیں لگتی۔''

ثریا، اپنے اونچے دانتوں کے علاوہ اپنی معمولی شکل وصورت کی وجہ سے پرکشش شخصیت کی مالک نہیں تھی۔ اس کے باوجود اپنے دور کی نامور اداکارہ تھی۔ وہ اپنے دور میں سب سے زیادہ معاوضہ لینے والی اداکارہ تھی۔ اس زمانے کی دو بڑی اداکاراؤں کامنی کوشل اور نرگس پر اسے اس لیے برتری حاصل تھی کہ وہ اپنے گانے بھی خود ہی گاتی تھی۔ اپنی

باوجود بے حد جرأت مند اور بے خوف تھی۔ بچپن کا وقت جنگل میں گزارنے کی وجہ سے اس کی فضاؤں اور ماحول سے مانوس تھی۔ گوکہ اسے یہ علم نہیں تھا کہ وہ کب تک کسی انسانی آبادی کے قریب پہنچ سکے گی مگر اسے یہ اُمید تھی کہ ایک دن ضرور انسانوں تک پہنچ جائے گی۔ ''لیکن کب؟'' یہ ایک ایسا سوال تھا۔ جس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔

اگرچہ جنگل کے اوپر سے اکثر جہاز گزر رہے تھے۔ جن کی آوازیں وہ سن رہی تھی۔ مگر جہاز میں سے اسے دیکھا نہیں جاسکتا تھا۔ کیونکہ گھنے جنگل میں ایک چھوٹی سی لڑکی کسے نظر آسکتی تھی۔ نہ ہی اس کے پاس ایسے آلات موجود تھے۔ جن کی مدد سے وہ جہازوں کو اپنی جانب متوجہ کرسکتی ہے اس کے لیے یہ اشد ضروری تھا کہ وہ اس جنگل سے نکل کر ایسی جگہ پہنچ سکے جہاں ریسکیو والے اسے دیکھ سکیں۔

جیسے جیسے وہ جنگل میں آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کی مشکلات میں اضافہ ہورہا تھا۔ زہریلے کیڑے اسے کاٹتے رہے تھے جن کی وجہ سے اس کے جسم پہ کئی زخم بن گئے تھے جن سے سڑاند آنے لگی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد قبر میں انسان کیڑوں کی خوراک بن جاتا ہے۔ مگر یہاں تو وہ زندہ ہی کیڑوں کی غذا بن رہی تھی اور وہ بے بسی سے یہ سب اذیت برداشت کررہی تھی دس روز گزرنے کے بعد اس کی حالت ایسی تھی کہ وہ کھڑی بھی نہیں ہوسکتی تھی لیکن اس قدر مشکلات اور تکلیف کے باوجود اس نے ہمت نہیں ہاری۔ اسے یقین تھا کہ جو خدا اسے اس قدر خوفناک حادثے سے بچاسکتا ہے تو وہ اسے جنگل سے بھی بحفاظت نکال لے گا اور اسی امید کا دامن تھامے وہ ماحول کی خوفناکی کو نظرانداز کرتے ہوئے خود کو گھسیٹ رہی تھی۔

اس کے ایک ہی پاؤں میں جوتا تھا۔ وہ اپنے جوتے والے پاؤں کو زمین کی نوعیت کا جائزہ لینے کے لیے پہلے آگے بڑھاتی تھی تاکہ اسے یقین ہوجائے کہ اس کے سامنے گھاس میں کوئی سانپ تو نہیں چھپا ہوا ہے اس کو اس دشوار گزار جنگل میں اس طرح بھی تحفظ کا احساس ہوا کہ وہ زیادہ تر ندی کے کنارے کے قریب پانی میں چلتی تھی اور اس کے لیے یہ بات

آواز کا جادو جگانے کے ساتھ ساتھ اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کا بھی لوہا منوا چکی تھی۔ اس کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ اس نے شادی نہیں کی اور کنواری ہی دنیا سے رخصت ہوگئی۔ شادی نہ کرنے کی وجہ اس کی سخت کوش نانی کو قرار دیا جاتا ہے۔ دیو آنند کے ساتھ اس کی شادی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ 1948ء سے 1951ء تک اس نے دیو آنند کے ساتھ چھ فلموں میں لیڈنگ رول ادا کیے تھے۔ اس دوران ان دونوں کے درمیان محبت کا رشتہ استوار ہو گیا تھا اور وہ شادی کرنا ہی چاہتی تھی کہ اس کی نانی سماج کی دیوار بن گئی اور ان کی سیاست نے یہ ثابت کر دیا کہ ''یہ شادی نہیں ہو سکتی۔''

مگر اس حقیقت کو ایک شخص ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ثریا نے اس کے عشق میں مبتلا ہونے کی وجہ سے دیو آنند سے شادی نہیں کی۔ وہ مزنگ لاہور کا ایک درزی تھا۔ جس کا دعویٰ تھا کہ وہ ثریا کا عاشق ہے اور ثریا بھی اس پر مرتی ہے۔ وہ ادھیڑ عمر کا اور خاصا بدشکل آدمی تھا۔ مگر اپنے عشق کے ہاتھوں مجبور تھا۔ گزشتہ صدی کے پچاس اور ساٹھ کے عشروں میں اس کا یہ عشق بہت مشہور رہا۔ لاہور کے اخبارات کے فلمی ایڈیشنوں میں اس کے مراسلے اور بیانات اکثر چھپتے رہتے تھے جن میں وہ اس بات کے دعوے کرتا تھا کہ ثریا اس کی ہے اور اس کے انتظار میں بیٹھی ہے۔ وہ شادی کرے گی تو صرف اسی سے کرے گی ورنہ عمر بھر کنواری رہے گی۔ اس زمانے میں لاہور کے تقریباً سبھی اخبار ثریا کے اس عاشق کے بارے میں کچھ نہ کچھ چھاپتے رہتے تھے۔ کچھ لاہوریئے اس سے مزہ بھی لیتے تھے، انہی کے ورغلانے پر وہ دو چار باراتیوں کے ساتھ دولہا بن کر بمبئی چلا گیا کہ اپنی محبوبہ کو دلہن بنا کر لاہور لے آؤں گا۔ بمبئی جا کر میرین ڈرائیو میں واقع ثریا کے گھر کے باہر اس نے پڑاؤ ڈال دیا کہ میں برات لے کر آ گیا ہوں۔ مگر حسب توقع اسے وہاں کسی نے کوئی لفٹ نہیں دی کہ وہ ہفتہ بھر کی کوشش بسیار کے باوجود ثریا سے ملنے میں کامیاب نہ ہوا۔ لاہور واپس آ کر اس نے نہایت آزردگی سے بتایا۔ ''میرے دشمنوں نے مجھے ثریا سے ملنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ انہیں خطرہ تھا کہ وہ مجھ سے نکاح کر کے لاہور چلی جائے گی اس لیے انہوں نے اسے کمرے میں بند کر دیا تھا۔ مگر ثریا میری ہے اور دیکھنا وہ میرے علاوہ کسی سے شادی نہیں کرے گی۔''

مرسلہ: انور فرہاد، کراچی

بھی حوصلہ افزا تھی کہ بالآخر یہ ندی کسی نہ کسی دریا ہی میں مل جائے گی۔ شروع میں تو وہ پھر بھی کچھ دیر کے لیے صاف جگہ پر ستا لیتی تھی۔ تھوڑی بہت نیند بھی پوری کر لیتی تھی... مگر وقت گزرنے کے ساتھ اس کے لیے سونا مشکل ہو رہا تھا۔ کیونکہ اس کے بازو کا زخم جراثیم آلود ہو چکا تھا۔ اس میں کیڑے پڑ چکے تھے۔ جن کا کاٹنا ناقابل برداشت ہو رہا تھا۔ وہ سوچتی تھی کہ اگر وہ جنگل سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی اور اس کی دوبارہ زندگی بچ گئی تو یہ ایک معجزہ ہی ہوگا۔ اس کی زندگی کا دوسرا معجزہ، اور پھر قدرت نے معجزہ دکھا ہی دیا۔ گیارہ دنوں کی محیر العقول، انتہائی مشکل جدوجہد کے بعد وہ جنگل سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی، اتنے روز بعد اس نے نیلا آسماں دیکھا تھا۔ اس کی عجیب سی کیفیت تھی۔ اسے اپنی خوش قسمتی کا یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایک بار پھر موت کے ہولناک پنجوں سے بچ نکلی تھی۔

دریا کے کنارے ایک چھوٹے سے شیلٹر کے پاس ایک کشتی بندھی ہوئی تھی۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ کشتی کی جانب بڑھی۔ پہلے اسے خود کو کیڑوں سے نجات دلانا تھا جو اس کے زخموں میں رینگ رہے تھے اسے کاٹ رہے تھے اور یہ تکلیف ناقابل برداشت اس نے ایک مرتبہ اپنے والد کو پالتو کتے کے زخموں پہ گیسولین ڈالتے دیکھا تھا اور استفسار پر اس کے والد نے اسے بتایا تھا کہ گیسولین کی بو سے زخم میں رینگنے والے کیڑے بھاگ جاتے ہیں۔ چنانچہ جولیانا نے جلدی سے کشتی کا فیول ٹینک تلاش کیا اور کشتی میں پڑے ایک چھوٹے سے ڈبے کی مدد سے فیول ٹینک سے کچھ گیسولین نکالی اور اپنے زخموں پر ڈال لی۔ اس نے دیکھا کہ گیسولین سے بچنے کے لیے کیڑے زخموں سے نکل نکل کر بھاگنے لگے۔ جولیانا دلچسپی سے کیڑوں کو بھاگتے ہوئے دیکھتی رہی۔ ساتھ ہی ان کی گنتی شروع کر دی وہ تقریباً 35 تھے۔

کیڑوں سے نجات حاصل کر کے اسے بے حد سکون محسوس ہوا۔ وہ کشتی میں بیٹھ کر مالک کا انتظار کرنے لگی۔ اگرچہ اسے کشتی چلانی آتی تھی مگر مالک کی اجازت کے بغیر کشتی کو استعمال نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اگرچہ اس کی حالت مخدوش تھی اور

اسے جلد از جلد طبی امداد کی ضرورت تھی۔

جب وہ دریا پہ پہنچی تھی تو رات کا وقت تھا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ رات کا گہرا اندھیرا تھا اور آسمان کی وسعتوں پہ ننھے منے ستارے جگمگ جگمگ کر رہے تھے... مگر چاندنی غائب تھی اس لیے بھی اندھیرا زیادہ گہرا تھا اور جولیانا کو اپنی قوت برداشت کو بروئے کار لا کر صبح کی آمد کا انتظار کرنا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ جہاں اس نے گیارہ روز جنگل میں تکلیف دہ گزارے ہیں۔ جہاز کا حادثہ برداشت کیا۔ ماں کو کھونے کا دکھ سہا ہے۔ تو یہ رات بھی گزر جائے گی۔ اب جبکہ کم از کم اس کے زخموں میں کیڑے نہیں تھے اور ان کے کاٹنے کی اذیت بھی نہ تھی... پھر وہ آرام سے کشتی میں بیٹھی ہوئی تھی اور پھر کہتے ہیں نا کہ نیند تو پھانسی کے تختے پہ بھی آجاتی ہے۔ جولیانا بھی تھکان سے نڈھال ہو کر کشتی میں ہی سو گئی۔ سات طویل گھنٹوں بعد صبح طلوع ہوئی تو جولیانا بھی بیدار ہو گئی تھی۔ تبھی وہاں کچھ کاری گر آگئے جو کہ اسی علاقے کے تھے۔ مگر وہ اسپینی تھے۔

وہ ایک نوعمر لڑکی کو کشتی میں بیٹھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ جولیانا کو تھوڑی بہت اسپینی زبان آتی تھی اسی لیے اس نے اپنی بپتا سنائی۔

وہ کاری گر پہلے اسے ایک قریبی گاؤں میں لے گئے جہاں کئی روز بعد جولیانا نے غسل کر کے لباس تبدیل کیا جو اسے ایک خاتون نے دیا۔ ناشتا کرنے کے بعد اسے اپنے جسم میں توانائی سی محسوس ہوئی۔ اگرچہ اب بھی زخموں سے اٹھنے والی ٹیس نا قابل برداشت تھیں۔ خاتون خانہ نے اسے وقتی آرام کے لیے ایک مرہم دیا جو اس نے اپنے زخموں پہ لگا لیا... مگر پھر بھی زخموں میں تکلیف محسوس ہو رہی تھی اور وہ ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔ پھر اسے انہی کاریگروں نے ایک گاڑی کے ذریعے Turna Vista District کے ائرپورٹ پر پہنچا دیا۔ ائرپورٹ کے حکام کو جولیانا کی کہانی معلوم ہوئی تو فوری طور پر ایک چھوٹے طیارے کے ذریعے ایک مقامی پائلٹ اسے Pucallpa کے اسپتال میں لے گیا۔ جہاں اسے طبی امداد دی گئی۔ اس کے زخموں کا علاج کیا گیا۔ اسپتال ہی میں جولیانا کو بتایا گیا کہ اس المناک حادثے میں وہ تنہا مسافر تھی جو کہ معجزانہ طور پر بچ گئی۔ جہاز کے ملبے کو تلاش کرنے والوں نے اس کی ماں کی لاش 12 جنوری کو دریافت کر لی تھی۔ جولیانا کو یہ جان کر بے حد افسوس ہوا کہ اس کی ماں ابتدائی طور پر بچ گئی تھی مگر پھر کئی روز کے بعد زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے زندگی کی بازی ہار گئی۔

اسپتال میں کچھ دن تک زیر علاج رہنے کے بعد اسے ایک جہاز کے ذریعے اس کے والد کے پاس پہنچا دیا گیا۔ انہیں پہلے ہی بیٹی کے زندہ بچ جانے کی خبر مل چکی تھی... ورنہ تو وہ یہ سمجھ کر بے حد رنجیدہ تھے کہ ان کی بیوی اور پیاری بیٹی دونوں ہی حادثے میں جاں بحق ہو گئی ہیں۔ اگرچہ بیوی کی موت کا صدمہ بے حد گہرا تھا... مگر بیٹی کو زندہ سلامت پا کر وہ بے حد خوش ہوئے تھے اور خوشی کے جذبات کی شدت سے ان سے صحیح طرح سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔

اس حادثے کے بعد جولیانا اس قدر خوف زدہ ہو گئی تھی کہ اس کا کہنا تھا کہ کافی عرصے تک مجھے جہاز کے اس ہولناک حادثے کے بارے میں خواب آتے رہے اور میں گھبرا کر بیدار ہو جاتی تھی اور پھر خود کو زندہ سلامت اپنے کمرے میں بیڈ پر پا کر خدا کا شکر بجا لاتی تھی۔ کبھی خواب میں خود کو میں اس خوفناک جنگل میں بھوکی پیاسی بھٹکتے ہوئے دیکھتی اور چیخ مار کر جاگ جاتی۔ غرض یہ کہ مجھے اس حادثے کو بھلانا بے حد مشکل ہے اور یہ ہمیشہ میری یادداشت میں تازہ رہے گا۔

کئی ٹی وی چینلز میں اس کے انٹرویو دکھائے گئے وہ کچھ دنوں بعد جرمنی چلی گئی جہاں اس نے اپنا مکمل علاج کروایا اور پھر مزید تعلیم کے حصول کے لیے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور بائیالوجی میں ڈگری حاصل کی۔

1989ء میں اس کی شادی E.Diller نامی شخص سے ہو گئی اور اب وہ جولیانا ڈلر کہلاتی ہے۔

جس جہاز میں جولیانا اور اس کی والدہ سفر کر رہی تھیں اس میں ایک فلم ڈائریکٹر Werner Herzog نے بھی سفر کرنا تھا... مگر کسی وجہ سے وہ اس میں سوار نہ ہو سکا اور یوں اس کی زندگی بچ گئی۔ اس ڈائریکٹر نے جولیانا کے اس معجزانہ طور پر بچ جانے پر 1998ء میں Wings of Hope نامی ڈاکومینٹری بنائی تھی۔

اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد جولیانا واپس پیرو گئی اور وہاں اس نے چمگادڑوں پر ریسرچ کی۔ اب وہ جنگل کی وکیل بن کر لوگوں کو جنگل کی اہمیت کے بارے میں بتاتی ہے کہ جنگلات ہمارے لیے کتنے ضروری ہیں اس نے جہاز کے حادثے کے بارے میں کتابیں بھی تحریر کی ہیں ایک کتاب کا نام When I Fell From Sky ہے جبکہ دوسری کتاب The True Story Of One Women Mira Culous Survival ہے۔

++

گمشدہ بادشاہ

اے آر راجپوت

فرانس کی شاہی تاریخ میں کچھ ایسے بھی نام ہیں جو شرمندہ کردینے والے ہیں۔ اس ملک میں جب انقلاب آیا تو شاہی خاندان پر کیا گزری، کیسی کیسی افتاد آپڑی تھی اسی کا مختصر جائزہ۔

شاہی خاندان کی ایک ٹوٹی کڑی

فرانس کی تاریخ سے آگاہ بہت سے لوگ اس امر کو جانتے ہیں کہ انقلاب فرانس کے دوران برسر اقتدار بادشاہ لوئی شش دہم کا سر قلم کردیا گیا تھا اور بہت سے لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ انقلاب کے بعد جب 1814ء میں فرانس کی بادشاہت کچھ عرصہ کے لیے بحال ہوئی تو جو بادشاہ تخت پر بیٹھا وہ لوئی ہشت دہم تھا، لیکن کتنے لوگ ہیں جنہوں نے یہ سوچا ہے کہ لوئی شش دہم اور لوئی ہشت دہم کے درمیان آنے والے لوئی ہفت دہم کے ساتھ کیا گزری۔

مختصراً یہ کہ لوئی ہفت دہم کا انجام کیا ہوا؟ اس سوال کے جواب میں تاریخ فرانس کا ایک پُراسرار معما پایا جاتا ہے کیونکہ لوئی ہفت دہم یقیناً موجود تھا لیکن اس کی تاج پوشی کی نوبت بھی نہیں آئی۔

اس کے ملک کے لوگ بھی اسے بہت جلد بھول گئے۔ جس دور میں وہ زندہ تھا، وہ بھاری بھرکم مسائل کا دور تھا۔

ان مسائل کی موجودگی میں اس بادشاہ کے بارے میں پریشان ہونے کی زحمت کون کرتا؟

لوئی ہفت دہم (سترھواں بادشاہ) لوئی شش دہم (سولھویں بادشاہ) کا بیٹا تھا اور جنوری 1793ء میں جب اس

کے باپ نے اپنی مغرور گردن تختہ دار پر رکھی تو اس وقت لوئی ہفت دہم جس کا نام ڈافن تھا صرف آٹھ سال کی عمر کا تھا۔
لندن میں آپ کو کبھی عجائب گھر میں جانے کا اتفاق ہو تو آپ وہاں اس دور کے فرانسیسی شاہی خاندان کے ساز و سامان میں کچھ میز کرسیاں دیکھ سکتے ہیں۔
مزید برآں مادام تساؤ کی بنائی ہوئی وہ تصویر بھی دیکھ سکتے ہیں جس میں ننھے بادشاہ یعنی ڈافن اپنی ماں کے گھٹنوں کو پکڑے ہوئے نظر آتا ہے۔ اس عورت کا نام میری انطولی تھا۔
اس ملکہ کو بھی اس کے شوہر کی طرح پھانسی کے تختہ پر لٹکایا تھا۔ تصویر میں ڈافن ایک چھوٹا سا بچہ نظر آتا ہے لیکن اس کا چہرہ اپنے باپ کی بھرپور مشابہت لیے ہوئے ہے۔ اس کے چہرے کے معصومانہ تاثرات اس بے رحمانہ سلوک سے متضاد نظر آتے ہیں جو اس کی ماں یعنی ملکہ سے ہوا۔
فرانس کے انقلابیوں نے جب اپنے سکون واطمینان کی خاطر لوئی شش دہم کو پھانسی پر چڑھایا تو یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ اب ڈافن کا کیا ہو......؟ کیونکہ اپنے باپ لوئی شش دہم کی موت کے بعد وہ خود بخود لوئی ہفت دہم کی حیثیت سے بادشاہ ہوگیا تھا۔
باپ کی موت نے اسے فرانس کی بادشاہت سے ہمکنار کردیا تھا۔ اس مرحلہ پر انقلابیوں کی وہ کنونشن جس نے لوئی شش دہم کے لیے فوراً موت کا حکم صادر کردیا تھا پھوٹ کا شکار ہوگئی۔ ننھے بچے کے لیے موت کی سزا کے مسئلہ پر انقلابیوں میں شدید اختلافات اُبھرے۔
کنونشن کے وہ ارکان جو یہ چاہتے تھے کہ ڈافن زندہ رہے یہ دلیل دینے لگے کہ بادشاہ کا تختہ اُلٹ کر انہوں نے جو جمہوریہ قائم کی ہے اگر وہ ایک اچھی، صحت منداور طاقتور مملکت ہے تو پھر اسے ایک بچے سے کیا خطرہ لاحق ہوسکتا ہے؟ ان ارکان کا دعویٰ تھا کہ ایک بچے کے قتل سے سوائے انقلاب کی بدنامی و رُسوائی کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا اس لیے بہتر یہی ہے کہ اس بچے کو زندہ رہنے دیا جائے۔
اس مسئلہ پر دن بھر بحث ومباحثہ ہوتا رہا پھر ڈافن کو زندہ رہنے کی اجازت مل گئی۔ کم از کم اسے زندہ رکھا گیا۔ اس کے باپ کو پھانسی دینے کے پورا ایک سال بعد تک ڈافن کو پیرس کے ایک جیل خانہ میں رکھا گیا۔
اس دوران اس کی ماں بھی بیٹے کے ہمراہ مقید رہی لیکن ایک سال بعد اسے بھی جیل کی کوٹھری سے نکال کر پھانسی کے لیے لے جایا گیا۔
اس طرح باپ اور ماں دونوں کی موت نے ڈافن کو خود بخود فرانس کا بادشاہ بنادیا (قانوناً وہ فرانس کے تخت کا حق دار ہوگیا) اس وقت ڈافن کی عمر صرف نو سال تھی۔
انقلابیوں کے کنونشن نے پیرس کے سائمن خاندان کو ڈافن کا سرپرست مقرر کیا لیکن جنوری 1794ء میں سائمن خاندان نے سرکاری ملازمت چھوڑدی اور پھر اس ماہ (جنوری 1794ء) کے بعد سے کوئی نہیں جانتا کہ ڈافن کے ساتھ کیا ہوا......؟

☆☆☆

اس سلسلہ میں سب سے معتبر روایت انتہائی دہشت ناک ہے۔ یہ روایت بادشاہ کے دو وفاداروں سے متعلق ہے ان میں ایک تو فرانس کا بیرن ڈی باٹز ہے اور دوسری ایک انگریز اداکارہ لیڈی ایٹلِس ہے۔
اپنے باپ کی پھانسی سے پہلے جب ڈافن قید خانہ میں تھا تو ان دونوں شاہ پسندوں نے بچے کو بچا کرلے جانے کی ناکام کوشش کی تھی۔
اس سے یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ وہ بچے سے آشنا تھا اور یہ بھی جانتے تھے کہ وہ کہاں قید ہے؟ ان کی کہانی کچھ اس طرح ہے۔
جب سائمن خاندان سرکاری ملازمت چھوڑ گیا تو ننھے ڈافن کو چھ ماہ تک ایک تنگ وتاریک کوٹھری میں قید رکھا گیا۔ اس قید کا حکم انقلابی کنونشن کے رہنماؤں نے جاری کیا تھا۔
نو سال کے ایک چھوٹے سے بچے کے لیے جیل کی تنگ وتاریک کوٹھری... بھگتنا یقیناً بہت اذیت ناک تھا۔ اس کوٹھری میں اسے کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ وہ کسی سے بات نہیں کرسکتا تھا کہ اس کوٹھری میں کوئی دوسرا تھا ہی نہیں۔ پھر یہ کہ اسے قید تنہائی کی سزا بھی دی گئی تھی۔
بچے کو اس کوٹھری میں اس خوراک پر زندہ رکھا گیا جو سلاخوں میں ہاتھ ڈال کر اسے تھمادی جاتی تھی۔ شاہی محل کے باغات کی کھلی ہواؤں میں رہنے والے شہزادے پر اس تنگ و تاریک کوٹھری میں جو گزری ہوگی اس کا صرف تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔
پھر 27 جولائی 1794ء کو (دونوں شاہ پسند وفاداروں نے نہایت یقین سے یہ تاریخ بیان کی تھی) ننھے بادشاہ سے ایک انقلابی رہنما براس نے ملاقات کی۔ اس رہنما کے حکم پر ننھے بادشاہ کی قید تنہائی ختم کردی گئی۔
مزید برآں اسے تنگ وتاریک کوٹھری سے نکال کر نسبتاً آرام دہ جگہ پہنچایا گیا یوں حالات کچھ بہتر ہوئے لیکن ڈافن کی جسمانی حالت خراب رہی وہ ابتداء سے ہی ایک کمزور سا بچہ تھا۔

چھ ماہ تک اندھیرے اور تنہائی میں اس کی حالت اور خراب ہو گئی۔

سوال یہ ہے کہ اعلیٰ انقلابی حکام کے دل میں اچانک ڈافن کے لیے نرمی کیوں پیدا ہوئی؟ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ براس جس نے ڈافن کو نسبتاً آرام دہ ماحول میں بھیجنے کا حکم دیا، ایک خاتون جوزیفائن ہیو ہرنز کو خوش کرنا چاہتا تھا۔

یہ عورت بہت دور اندیش تھی اور مستقبل کی منصوبہ بندی کر رہی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ اگر ملک میں کبھی بادشاہت بحال ہوئی تو ڈافن اس کی مٹھی میں ہوگا۔

جلاوطن ہونے والے شاہ پسند اس وقت جوزیفائن کے دوست براس کو پھانسی لگانے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ اگر وہ واپس آگئے تو نہ صرف براس کو تختہ دار پر کھینچا جائے گا بلکہ خود اسے بھی موت کی سزا ہوگی۔

یہ تھی اس عورت کی سوچ۔ چنانچہ اس انجام سے بچنے کے لیے جوزیفائن نے ڈافن کو یرغمالی کی حیثیت دے دی۔

تاہم اس سلسلہ میں براس اور جوزیفائن سے دو بڑی غلطیاں ہوئیں۔ سب سے پہلی غلطی یہ کہ ڈافن کی سختی سے نگرانی ناکام رہی۔ دوسرے یہ کہ انہوں نے شاہ پسندوں کی اس بچے سے وابستگی کا غلط اندازہ لگایا جو ان کے خیال میں مستقبل کا بادشاہ تھا۔

بیرن ڈی باٹزار لیڈی اٹیکنس کے مطابق شاہ کے وفادار لوگ ڈافن کو بچانے کا عزم ضرور رکھتے تھے۔ ان دونوں کے بیان کے مطابق ایک رات ان شاہ پسندوں یا ان کے ساتھیوں نے قید خانہ میں نقب لگائی۔ وہ اس کمرے میں پہنچے جہاں ڈافن قید تھا۔

انہوں نے اسے نیند سے جگایا اور اسے نکال کر باہر لے گئے اور اس کی جگہ ایک یتیم بچے کی لاش رکھ گئے۔

سوال یہ ہے کہ فرانس کے یہ شاہ پسند اس بچے کو کہاں لے گئے؟ اس سوال کا آج تک کہیں سے کوئی جواب نہیں ملا۔

دوسری صبح انقلابیوں کو ڈافن کے بستر سے بچے کی لاش ملی۔ انہوں نے اس وقت تو خاموشی اختیار کی لیکن پھر اچانک اعلان کیا کہ 8 مئی 1795ء کو ڈافن کا انتقال ہو گیا۔ اعلان میں یہ بھی کہا گیا کہ وہ طویل عرصہ سے بیمار تھا۔

ایک سوال یہ ہے کہ جب ان انقلابیوں کو بستر سے لاش ملی تو ان پر کیا گزری؟ کیا انہوں نے غلطی سے یتیم بچے کی لاش کو ڈافن کی لاش ہی سمجھا یا پھر یہ ڈافن ہی کی لاش تھی، جو واقعی مر گیا تھا۔

اب گویا لاش کی شناخت کا مسئلہ تھا۔ اسے شناخت کرنے والا صرف ایک ہی شخص تھا اور وہ ڈاکٹر تھا جو شاہی خاندان کا معالج تھا، لیکن وہ اس لاش کے معائنہ یا شناخت سے پہلے ہی اچانک فوت ہو گیا۔ اس پر یہ افواہ پھیل گئی کہ ڈاکٹر کو زہر دے کر ہلاک کیا گیا ہے۔

اس افواہ کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ ڈاکٹر اگر لاش کا معائنہ کر لیتا تو ثابت ہو جاتا کہ لاش ڈافن کی نہیں ہے۔ اس لیے ڈافن کی موت ثابت کرنے کے لیے ڈاکٹر کو شناخت سے پہلے ہی ایک سازش کے تحت ہلاک کر دیا گیا۔

شاہ پسندوں نے انقلابی حکومت کو ڈاکٹر کی موت کے سنگین نتائج سے خبردار بھی کیا۔ تاہم ان تمام حالات سے اس کہانی کی تصدیق ہوتی ہے جو بیرن ڈی باٹزار لیڈی اٹیکنس نے بیان کی لیکن ایک اہم نکتہ اس کہانی کے خلاف ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر ڈافن کو قید خانہ سے نکال کر واقعی محفوظ مقام پر پہنچا دیا گیا تھا تو پھر بادشاہت کی بحالی پر اسے کیوں نہ سامنے لایا گیا؟ کیا اصل یہی تو نہیں کہ ڈافن قید خانہ سے بچ کر نکلا ہی نہیں تھا۔

کیا وہ واقعی 8 مئی کو جیل میں دم توڑ گیا تھا یا پھر یہ مان لیا جائے کہ جیسا کہ شاہ پسندوں نے دعویٰ کیا تھا کہ ڈافن جلاوطنی کے دوران مر گیا تھا۔

جو لوگ ان سوالات کے جواب دے سکتے تھے وہ سب کے سب فوت ہو گئے تھے۔ جوزیفائن 1814ء میں فوت ہوئی۔ اسے فرانس کی ملکہ بننے کا فخر حاصل ہوا۔

وہ نپولین بوناپارٹ کی بیوی بنی لیکن ملکہ جوزیفائن کی زبان سے کبھی کسی نے ڈافن کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں سنا۔

براس نے بھی کبھی ڈافن کا ذکر نہیں کیا۔ وہ 1829ء میں مرا اس کے تمام اسرار اس کے ساتھ ہی دفن ہو گئے۔

بہرحال بادشاہت کی بحالی کے بعد فرانس کو بادشاہوں کی کوئی کمی نہیں پیش آئی۔ ڈافن کے چچا کاؤنٹ ڈی پراونس نے تخت و تاج سنبھالا اور لوئی ہشت دہم کا لقب اختیار کیا۔ اس کی تخت نشینی کے بعد کسی نے یہ پرواہ نہیں کی کہ ڈافن پر کیا گزری......؟

لوگ یہی خیال کرتے ہیں کہ ایک مردہ بادشاہ سے ایک زندہ بادشاہ بہرحال بہتر ہے۔ اس طرح اس ننھے بچے کی کہانی ظلم ناک اندھیاروں میں گم ہو جاتی ہے جو شاید فرانس کا ایک عظیم شہنشاہ بن سکتا تھا بشرطیکہ اسے اچھے حالات ملتے۔

++

روسیاہ

عاطر شاہین

وہ ایک معصوم سا سیدھا سادا نوجوان، غربت کی گود میں پلا بڑھا، خوابوں کی دنیا ہی اس کا مسکن تھا کہ اسے سبق سکھانے کے لیے اس کی بہن کو اغوا کرلیا گیا اور تب اسے آنکھیں آہنپوش کرنی پڑیں۔ مصائب کے دلدل کو پار کرتا ہوا وہ آگے بڑھا تو اس پر آشکار ہوا کہ تقدس کے ملمع چڑھے چہروں کے عقب میں مکروہ چہرے ہیں۔ وہ ان کے چہروں سے نقاب ہٹانا چاہتا تھا مگر بھول گیا تھا کہ زمینی خدا بن بیٹھے مقدس ظالمین کی قوت ناقابل شکست ہے۔

پل پل بدلتے چہروں کی طویل سرگزشت

(گزشتہ اقساط کا خلاصہ)

دیال سنگھ نے علی کو یقین دلایا تھا کہ وہ غدار نہیں ہے اس کے باوجود علی اس کی طرف سے محتاط تھا۔ علی، جمیل کے گھر والی گلی میں پہنچا تو وہاں ایک مسجد شہید کی جا چکی تھی۔ کسی نے پولیس کو فون کر کے بلا لیا تھا۔ علی جمیل کے گھر چلا گیا تھا۔ علی نے دیپک کے جن ساتھیوں کی پٹائی کی تھی اس کی ویڈیو سوشل میڈیا پر وائرل ہو گئی تھی اور ایک ہندو نے علی کو ٹیررسٹ کہا تھا جمیل کو پتا چلا تھا تو وہ علی کے پاس گیا تھا۔ علی نے اسے ہاروے کا نمبر لینے کے لیے ڈان کلب بھیجا تھا لیکن وہ بھی ناکام لوٹا تھا۔ علی، دیال سنگھ کی ٹیکسی میں بیٹھ کر مضافات والی عمارت میں گیا تھا۔ گیٹ پر تالا تھا اس لیے علی واپس چلا گیا۔ اس نے دیال سنگھ کے ذمے رتن کمار کی ہوٹل میں موجودگی کا کام لگا دیا تھا۔ علی نے جوتی کو قابو کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اس کے ہاتھ نہیں چڑھی، پھر علی نے ڈرامائی انداز میں دیپک کو بلایا اور اسے شہر سے دور ایک کم آبادی والے علاقے میں لے گیا تھا وہاں ان دونوں کی فائٹنگ بھی ہوئی تھی۔ بالآخر دیپک فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ علی، جوتی کو بے ہوش کر کے دیپک کی کوٹھی میں پہنچ گیا، وہاں اس نے رادھا کو کور کر لیا تھا لیکن جب دیپک کا فون آیا تو اس نے شور مچا دیا تھا کہ وہ ہتیارا یہاں موجود ہے۔

(اب آگے پڑھیں)

وہی ہوا تھا جس کا مجھے خدشہ تھا۔ میں نے رادھا کو کوتاہ فہم سمجھا تھا لیکن وہ میری سوچ سے بھی بڑھ کر ثابت ہوئی تھی۔ تبھی اس نے فائدہ اٹھاتے ہوئے بلا تامل دیپک کو میری موجودگی سے خبردار کر دیا تھا اب کفِ افسوس ملنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ رادھا اپنا کام کر چکی تھی جس کی مجھے ہرگز توقع نہیں تھی۔

میں سمجھتا تھا کہ رادھا ایک کمزور اور ڈرپوک عورت ہو گی۔ وہ ڈر کے مارے دیپک کو کچھ نہیں بتائے گی، میرے کہے پر عمل کرے گی لیکن میں اس کے ہاتھوں بے وقوف بن گیا تھا۔

ازیں پیش رادھا مزید کچھ کہتی، میں نے الٹے ہاتھ کا تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیا۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ گھوم کر بیڈ پر جا گری۔ اس کے ہاتھ سے سیل فون بھی چھوٹ کر قالین پر گر گیا تھا۔

غصے سے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ میں نے سیل فون اٹھا لیا تو دوسری طرف سے دیپک کی تشویش بھری آواز سنائی دی۔

''رادھا...... کیا تم ٹھیک ہو...... کیا ہوا ہے تمہیں؟ رادھا...... کیا تم میری آواز سن رہی ہو...... رادھا...... جواب کیوں نہیں دیتی...... ہیلو...... ہیلو......''

میں نے غصے سے ہونٹ بھینچتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا تو دیپک کی آواز آنا بند ہو گئی۔ میں نے سیل فون سوئچ آف کر کے ریک پر پھینک دیا۔ رادھا اٹھ کر نہ صرف بیٹھ گئی تھی بلکہ اس نے مجھے غیظ و غضب نظروں سے دیکھا۔ اس نے اپنے رخسار پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ انداز ایسا تھا جیسے وہ مجھے کچا چبانا چاہتی ہو۔ لمحاتی توقف کے بعد وہ سانپ کی طرح پھنکاری۔ ''ت...... ت...... تت...... تم نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ تمہیں شاید میرے بھائی کے بارے میں جان کاری نہیں ہے۔ وہ بہت کھترناک (خطرناک) منش ہے۔ وہ تیری بوٹیوں کو کتوں کے آگے ڈال دے گا۔''

میں نے ایک نظر جوتی کی طرف دیکھا جو خود رفتگی کے عالم میں تھی۔ میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''مس رادھا!'' میں نے اسے مس رادھا اس لیے کہا تھا کیونکہ وہ اب تک سنگل تھی۔ ''میں عورتوں پر انیائے نہیں کرتا، لیکن تم نے مجھے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس کی ذمہ دار تم خود ہو۔ میرے منع کرنے کے باوجود تم نے دیپک کو میری موجودگی سے باخبر کر دیا۔ شاید وہ اِدھر نہ آئے، اور اگر آیا تو مجھے گھیرنے کی کوشش کرے گا۔''

''آخر تم بتاتے کیوں نہیں ہو، میرے بھائی نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟'' رادھا نے سابقہ سوال دوہرایا۔ اس کے لہجے میں ناہمواری تھی۔ ''تم اس سے اور وہ تم سے کیا چاہتا ہے۔ سمسیا کیا ہے آخر؟''

میں زیرِ لب مسکرایا۔ شاید وہ واقعی دیپک کے بارے میں نہیں جانتی تھی کہ وہ ایک روسیاہ انسان رتن کمار کا مہرہ ہے۔

''سمسیا بہت اہم ہے رادھا جی! میرا خیال ہے اگر تم یہی سوال دیپک سے کرو تو زیادہ بہتر ہے۔'' میں نے جواباً کہا۔ ریوالور بہ دستور میرے ہاتھ میں تھا۔ ''لیکن میں جانتا ہوں، وہ پاکھنڈی تمہیں سچ نہیں بتائے گا۔ وہ خود کو نردوش ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا اور مجھے موردِ الزام ٹھہرائے گا۔''

شاید رادھا کو دیپک کو میرا پاکھنڈی کہنا برا لگ تھا، تبھی اس نے چڑتے ہوئے کہا۔ ”تم میرے بھائی کو پاکھنڈی مت کہو، تمہیں اس کا کوئی ادھیکار نہیں ہے۔ میرا بھائی پاکھنڈی نہیں ہے۔ وہ ایک پوتر اور نیک منش ہے۔ غریبوں کا ہمدرد۔“

طنزیہ مسکراہٹ نے خود بہ خود میرے چہرے کا احاطہ کیا۔ میں نے متانت لہجے میں کہا۔ ”رادھا جی! وہ سب دکھاوا ہے لیکن شاید تم نہیں سمجھو گی۔ تم صوفے پر بیٹھ جاؤ۔ کھڑی کھڑی تھک جاؤ گی۔“

اس بار بھی رادھا نے میرے حکم کی بلاچوں چراں تعمیل کی اور مجھے دزدیدہ نظروں سے دیکھتی ہوئی صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے رخسار سے ہاتھ ہٹالیا تھا۔ میرے الٹے ہاتھ کے تھپڑ نے اس کا رخسار سرخ کر دیا تھا لیکن مجھے مطلق پروا نہیں تھی۔ جو غلطی کرتا ہے سزا بھی وہی بھگتا ہے۔ میں نے کچھ سوچا اور دروازے کو اندر سے لاک کر دیا۔ رادھا نے نگاہ کج مجھ پر ڈالی اور مستفسر ہوئی۔ ”تم نے دروازہ کیوں لاک کیا ہے۔ آخر تمہارا ارادہ کیا ہے؟“

میں چل کر رادھا کے سامنے جاکر کھڑا ہوگیا۔ اور اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ”رادھا! تم اپنے بھائی کے بارے میں کتنا جانتی ہو؟“

کہنے کے ساتھ ہی میں نے ایک نظر جوتی پر بھی ڈالی تھی۔ وہ بہ دستور عالم بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ مجھے اس کی طرف سے کوئی فکر نہیں تھی۔ وہ بندھی ہوئی تھی۔ البتہ یہ فکر دامن گیر تھی کہ رادھا نے وہاں میری موجودگی سے دیپک کو آگاہ کر دیا تھا۔ وہ یقیناً اپنے گرگوں کے ساتھ یہاں آئے گا اور مجھے مارنے یا گھیرنے کی کوشش کرے گا۔

”میں اپنے بھائی کے بارے میں تم سے زیادہ جان کاری رکھتی ہوں۔“ رادھا نے چیں بہ جبیں ہو کے کہا۔ ”دیپک ایسے بھائی قسمت والوں کے گھر جنم لیتے ہیں۔ مجھے اپنے بھائی پر وشواش ہے، مان ہے۔“

اس بار میں طنزیہ انداز میں ہنس پڑا۔ رادھا کو شاید میرا ہنسنا بھی برا لگا تھا لیکن اس نے اظہار نہیں کیا تھا البتہ وہ مجھے تیکھے چتونوں سے دیکھ رہی تھی۔

”اگر تمہیں دیپک کی اصلیت معلوم ہو جائے تو شاید تمہارا وشواش، مان سب کچھ ٹوٹ جائے گا اور تمہیں اس سے نفرت ہو جائے گی۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میرے بتانے پر تمہارا دل بھی برا ہو سکتا ہے، لیکن بات وہی ہے، اگر تم اس سے پوچھو گی تو وہ صاف مکر جائے گا اور مجھے ہی موردِ الزام ٹھہرائے۔“

”کیا ہے اس کا اصلی چہرہ؟“ اس نے تند لہجے میں استفسار کیا۔

”اس کا چہرہ سیاہ ہے۔“ میں نے بے ساختہ کہا۔ ”رادھا جی! تم یوں سمجھ لو کہ اس کے ایک نہیں دو چہرے ہیں۔ باقی تم اس سے پوچھ لینا تو زیادہ بہتر رہے گا، لیکن مجھے نہیں لگتا وہ تمہیں اپنے کرتوتوں کے بارے میں بتائے گا، وہ ایک مکار، عیار اور اپرادھی منش ہے، میں نے اس سے رتن کمار کے بارے میں پوچھنے کی بہت کوشش کی تھی، مجال ہے اس نے زبان کھولی ہو، اس نے تشدد برداشت کیا لیکن رتن کمار کی نمک حرامی نہیں کی۔ اسے کہتے ہیں وفاداری۔“

”مجھے تمہاری کوئی بات سمجھ نہیں آرہی۔“ رادھا ہونٹ بھینچ کر مستفسر ہوئی۔ اس کے لہجے سے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ الجھ گئی ہے۔ ”یہ رتن کمار کون ہے؟ بھگوان کے لیے، مجھے سیدھی طرح بتاؤ کہ سمسیا کیا ہے؟ میرا بھائی کیسے اپرادھی ہو سکتا ہے؟“

”تمہارا بھائی اپرادھی ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ پھر میں نے بیڈ پر بے ہوش پڑی جوتی کی طرف اشارہ کیا۔ ”تم جوتی سے پوچھ سکتی ہو، کیونکہ یہ دیپک کا دایاں ہاتھ ہے اور دیپک رتن کمار کا۔“

رادھا نے بے اختیار چونک کر جوتی کی طرف دیکھا، اس کے چہرے پر غیر یقینی کے تاثرات لہرائے تھے۔ وہ جوتی کو مسلسل یوں دیکھ رہی تھی جیسے مراقبے میں چلی گئی ہو۔ کچھ دیر کے بعد وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی تو اس کے لہجے میں غیر یقینی کی رمق شامل تھی۔ ”نہیں...... مجھے یقین نہیں آ رہا۔ یہ تو بہت معصوم اور نیک ناری ہے۔“

اس کی بات پر بے اختیار میری ہنسی چھوٹ گئی۔ اس دنیا میں کئی ایسے لوگ موجود ہیں جو دو چہرے رکھتے ہیں۔ ظاہر کچھ اور باطن کچھ اور۔ اور ایسے معصوم اور سادہ لوگ بھی موجود ہیں جو ردسیاہی لوگوں کو نہیں پہچان پاتے۔ وہ انہیں پوتر، نیک اور نہ جانے کیا کیا سمجھتے ہیں۔

”تم ہنس کیوں رہے ہو؟“ رادھا نے ترش روئی سے پوچھا۔

”تم نے جوتی کو معصوم اور نیک ناری کہا، اسی لیے مجھے ہنسی آگئی۔“ میں نے اپنی ہنسی کو روکتے ہوئے کہا۔

''تو کیا میں نے غلط کہا ہے؟''

''سو فیصد غلط۔'' میں نے کہا۔ ''یہ وہ ناگن ہے جس کا ڈسا پانی بھی نہیں مانگتا۔ تم نے اس کا صرف ایک روپ دیکھا ہے، دوسرا روپ دیکھو گی تو حیرت سے تمہارا ہارٹ بھی فیل ہو سکتا ہے۔''

''ک...... کک...... کیا یہ خطرناک ناری ہے؟'' رادھا کے منہ سے لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکلے۔

''خطرناک نہیں...... بہت خطرناک۔ اس کے بھی دیپک کی طرح دو چہرے ہیں۔'' میں نے تصحیح کی، پھر لمحاتی توقف کے بعد مزید کہا۔ ''یہ اور دیپک دونوں اپنی پارسائی کا ڈھونگ رچاتے ہوئے تمہیں بے وقوف بنا رہے ہیں۔ یہ ایک ایسے گینگ کے لیے کام کرتے ہیں جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتی۔ ویسے جوتی اور دیپک کا سمبندھ کیا ہے؟''

''دونوں ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔'' رادھا نے جواباً کہا۔ ''جس ہوٹل میں دیپک کام کرتا ہے جوتی اس ہوٹل کے مالک کی بیٹی ہے۔ شاید ان دونوں کی ملاقات اسی ہوٹل میں ہوئی تھی پھر انہیں پیار ہو گیا۔''

''اوہو......'' میرے منہ سے نکلا۔

''لیکن کیا تم مجھے بتانا پسند کرو گے کہ یہ دونوں کس گینگ کے لیے کام کرتے ہیں؟'' رادھا کی سوئی اب ایک جگہ اٹک گئی تھی۔ ''میں تمہاری بنتی کرتی ہوں، مجھے بتاؤ یہ دونوں کس گینگ کے لیے کام کرتے ہیں اور تمہاری ان سے کیا دشمنی ہے؟''

قبل اس کے کہ میں مزید کوئی بات کرتا، دفعتاً ہمیں جوتی کے کراہنے کی آواز سنائی دی تو ہم دونوں نے بے اختیار چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ہوش میں آ رہی تھی۔ حالانکہ میرا اندازہ تھا کہ وہ دو گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گی، بہرکیف وہ بندھی ہوئی تھی اس لیے مجھے اس کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

ہوش میں آنے کے بعد جوتی نے بے اختیار اٹھنے کی کوشش کی لیکن بندھا ہونے کی وجہ سے صرف کسمسا کر رہ گئی۔ اس نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا، اگلے ہی لمحے اس کے حسین چہرے پر غیظ و غضب کے تاثرات نمودار ہو گئے۔ وہ غصے سے بولی۔ ''تم...... تم نے مجھے باندھا ہے۔''

''نہیں...... تمہیں تمہاری ہونے والی نند رادھا نے باندھا ہے۔'' میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ کہنے کے ساتھ ہی میں نے رادھا کی طرف اشارہ کیا۔ ''بے شک اس سے پوچھ لو۔ بتاؤ رادھا جی...... اسے تم نے ہی باندھا ہے نا؟''

جوتی نے گردن گھما کر رادھا کی طرف دیکھا۔ رادھا مضطرب ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی صفائی میں کہا۔ ''جوتی! تمہیں میں نے ہی باندھا ہے لیکن اس کے کہنے پر۔''

''اوہو...... دیپک کہاں ہے؟'' شاید اسے دیپک کا خیال آیا تھا تبھی اس نے رادھا سے پوچھ لیا۔

''وہ اپنے غنڈوں کے ساتھ مجھ پر چڑھائی کرنے آ رہا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس کے آنے سے پہلے تم رادھا جی کو اس کے دلارے بھائی کے کرتوت بتا دو تاکہ اسے اپنے بھائی کے بارے میں جان کاری ہو سکے۔'' کہنے کے ساتھ ہی میں نے رادھا کی طرف مراجعت کی۔ ''اپنے من کو تھام کر رکھنا رادھا جی، تمہارے من میں دیپک کی جو مورت نقش ہے، ممکن ہے وہ مورت پاش پاش ہو جائے۔''

''رادھا! تم اس کی باتوں پر یقین مت کرنا، یہ جھوٹ بول رہا ہے۔'' جوتی نے رادھا کو شیشے میں اتارنے کی خاطر کہا۔ ''یہ پاکستانی ٹیررسٹ ہے۔ یہ تمہارے بھائی کی ہتیا کرنا چاہتا ہے۔''

جوتی کی بات سن کر رادھا پتھر کی مورت بن گئی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس کی حالت ایسی ہو گئی تھی جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ وہ ایک بار پھر مراقبے میں چلی گئی تھی مگر مجھے مطلق پروا نہ ہوئی۔

''اچھا، میں ٹیررسٹ ہوں۔'' میں نے رخ جوتی کی طرف موڑتے ہوئے زہر آگیں لہجے میں کہا۔ ''اور جو تم دونوں مل کر رتن کمار کے ساتھ کام کر رہے ہو، وہ کیا ہے؟ کیا وہ ٹیررازم کے زمرے میں نہیں آتا؟'' کہنے کے ساتھ ہی میں اٹھ کر جوتی کی طرف بڑھا۔ اپنی طرف مجھے بڑھتے دیکھ کر جوتی کی سٹی گم ہو گئی۔ وہ کسمسائی جیسے خود کو آزاد کرانے کی کوشش کی ہو۔

''رک جاؤ۔ میری طرف مت آؤ۔'' جوتی غرائی۔

میں نے اس کی بات نظر انداز کی اور ریوالور کی نال اس کی پیشانی پر رکھتے ہوئے غراہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ''تم رادھا جی کو دیپک اور اپنے کرتوت بتانا پسند کرو گی یا میں تمہارا بھیجا اڑا دوں۔''

ریوالور کی نال اپنی پیشانی پر دیکھ کر جوتی کے چہرے پر پہلی بار خوف کے تاثرات ابھرے۔ اس کی آنکھوں کی

پتلیاں ریوالور کی نال پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ میں نے کن انکھیوں سے رادھا کی طرف دیکھا تو وہ خوف بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ تبھی جوتی کے منہ سے سرسراتی آواز نکلی۔ ''پپ...... پپ...... پلیز۔ ریوالور ہٹاؤ۔ پلیز۔''

''دیپک اور اپنے کرتوتوں کے بارے میں رادھا جی کو بتاؤ۔'' میں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ ''اور ہاں، یاد آیا، تم میرے دوست جیک کی قاتلہ ہو مس جوتی۔ تم اس وقت میرے رحم وکرم پر ہو۔''

''میں...... میں بتاتی ہوں۔ تم۔ تم ریوالور ہٹاؤ۔'' وہ خوف کے زیرِ اثر ہکلاتے ہوئے بولی تو میں نے ریوالور ہٹا لیا۔ موت کو سامنے دیکھ کر واقعی جوتی کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ اس کے مساموں نے پسینا اگلنا شروع کر دیا تھا۔

''آیئے رادھا جی۔'' میں نے احتراماً رادھا سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''اور اس کی زبانی دیپک اور اس کے کرتوتوں کے بارے میں غور سے سنیے۔''

رادھا اٹھ کر بیڈ کے قریب آ گئی۔ وہ یوں خاموش تھی جیسے میں نے اس کے بولنے پر پابندی لگا دی ہو۔ جوتی عالمِ تذبذب میں تھی۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس موقع پر کیا کرے لیکن وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے صاف گوئی کا مظاہرہ نہ کیا تو میرے غیظ وغضب سے نہ بچ سکے گی۔ تبھی اس نے رادھا کی طرف دیکھتے ہوئے مری مری آواز میں کہا۔ ''رادھا! یہ۔ یہ سچ کہہ رہا ہے۔ میں اور...... دیپک، رتن کمار کے لیے کام کرتے ہیں۔''

''گڈ۔ حسین ہونے کے ساتھ ساتھ عقل مند بھی ہو۔'' میں نے اس کی تعریف میں زمین وآسمان کے قلابے ملانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ جواباً اس نے نظر قہر و غضب مجھ پر ڈالی جیسے کہہ رہی ہو، میں تمہارا خون پی جاؤں گی۔ میں مسکرا دیا اور بات آگے بڑھائی۔ ''اگر تم یہ بھی بتا دو کہ تمہارا اگر دوگھنٹال رتن کمار کا گینگ کیا کام کرتا ہے تو رادھا جی کی معلومات میں اضافہ ہو جائے گا۔ شاباش، بتاؤ۔''

رادھا ششدر حالت میں کھڑی تھی۔ شاید اسے یقین نہیں آیا تھا کہ جس بھائی کو وہ پوتر اور اچھا سمجھتی تھی وہ ایک اپرادھی اور ہتیارا تھا۔ یقیناً اس کا وشواش ٹوٹ گیا تھا۔ جواب میں جوتی نے ہونٹ بھینچ کر خاموشی اختیار کر لی۔ اس سے پہلے کہ میں جوتی کو دوبارہ بولنے پر مجبور کرتا، تبھی رادھا غصے سے جوتی کی طرف بڑھی۔

''بتاؤ جوتی! یہ رتن کمار کون ہے اور تم دونوں اس کے لیے کیا کام کرتے ہو؟'' رادھا نے جوتی کو جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ غصے سے شاید وہ آپے سے باہر ہو گئی تھی۔ ''بتاؤ جوتی، مجھے جان کاری چاہیے۔''

صورتِ حال بھانپتے ہوئے میں نے آگے بڑھ کر جوتی کو رادھا کی گرفت سے آزاد کرایا۔ جوتی لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ ساتھ ہی اس نے خود کو بھی میری گرفت سے آزاد کرانے کی ناکام کوشش کی۔ میں نے جوتی سے کہا۔ ''کول ڈاؤن رادھا جی۔ میرا خیال ہے، یہ نہیں بتائے گی۔''

''پھر تم ہی بتاؤ۔''

''بیٹھو۔'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا تو وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں نے دیوار گیر گھڑی کی طرف نظر دوڑائی تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔

میں نے بھی ایک صوفے پر بیٹھ کر لحاتی توقف اختیار کیا پھر جوتی کی طرف دیکھتے ہوئے انکشاف آمیز لہجے میں گویا ہوا۔ ''رتن کمار ایک سوشل ورکر ہے۔ اس کا ممبئی میں ایک بہت بڑا ہوٹل بھی ہے لیکن درحقیقت وہ گینگسٹر ہے۔ ہوٹل کی آڑ میں اس نے اپنا ایک بہت بڑا گینگ بنایا ہوا ہے جو پورے انڈیا میں پھیلا ہوا ہے۔ رتن کمار خوب صورت کنیاؤں کی خرید و فروخت کا بزنس کرتا ہے۔ اس کا لنک امریکا کے ایک بہت بڑے گینگ سے ہے جو خرید شدہ لڑکیوں کو پورنوگرافی کے لیے استعمال کرتا ہے اور پھر وہ پورن ویڈیو دنیا بھر کی ویب فحش ویب سائٹس کو فروخت کر دی جاتی ہیں۔ امریکی گینگ کا سربراہ ہیری ٹام ہے اور اس کی بھی اپنی فحش ویب سائٹ ہے۔ دیپک اور یہ جوتی، رتن کمار کے خاص ہرکارے ہیں۔ وہ ان دونوں کو ہر ماہ لاکھوں روپے دیتا ہے۔''

رادھا دھک سے رہ گئی تھی کیونکہ اس کے چہرے کے تاثرات بدل چکے تھے۔ اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں جن میں دنیا جہان کی حیرت سموئی ہوئی تھی۔ شاید اس پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ کئی لحات تو وہ اسی پوزیشن میں بیٹھی رہی، پھر جب اس کا سکتہ ٹوٹا تو وہ اٹک اٹک کر بولی۔ ''نن...... نن...... نہیں، دد...... دیپک ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ۔ وہ پاپی نہیں ہو سکتا۔''

''بدقسمتی سے یہ سچ ہے رادھا جی۔'' میں نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''تمہارا بھائی اور یہ جوتی دونوں ہی

پاپی ہیں۔ میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ میری دیپک سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے، میری دشمنی صرف رتن کمار سے ہے۔ میں اسے نرک پہنچانا چاہتا ہوں۔''

دفعتاً جوتی نے مداخلت کی۔ ''رادھا! یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ تم اس کی بات پر یقین نہ کرو، میں تمہیں بتا چکی ہوں، یہ پاکستانی ٹیررسٹ ہے......'' اس کا انداز رادھا کو اپنی طرف مائل کرنے کا تھا لیکن رادھا نے اس کی طرف نظر تک نہ اٹھائی۔

''رادھا جی! تم میری بات کا یقین کرو یا نہیں۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ''مجھے اس کی مطلق پروا نہیں ہے۔ میں نے رتن کمار تک پہنچنا ہے اور اس تک مجھے دیپک ہی پہنچا سکتا ہے اسی لیے میں نے دیپک کو اغوا کیا تھا۔ وہ رتن کمار کا نمک خوار اور ڈھیٹ انسان ہے اس نے مجھے رتن کمار کے بارے میں نہیں بتایا، اگر میں اس کی جان بھی لینے کی کوشش کرتا تو تب بھی وہ نہ بتاتا، وہ میری دسترس سے نکل گیا اور پھر میں نے یہی سوچا کہ تم اس کی دیدی ہو، اگر میں تمہیں مجبور کروں تو تم اس سے شاید رتن کمار کے بارے میں اگلوا لو، لیکن تم نے اسے میری یہاں موجودگی سے باخبر کر کے اچھا نہیں کیا۔ اب تم ہی اس سے رتن کمار کے ٹھکانے کا معلوم کرو گی، اور یقین کرو اگر تم ایسا کرو گی تو یہ اُن ناریوں کی بھلائی ہوگی جنہیں اغوا کر کے فروخت کیا جاتا ہے، وہ تمہاری پوجا کریں گی۔''

کہنے کے ساتھ ہی میں نے جوتی کی طرف دیکھا جو غیظ بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی کیونکہ میں نے اس کا اور دیپک کا پول کھول دیا تھا۔ میں طنزیہ انداز میں مسکرایا تو وہ بھنا کر رہ گئی۔

''جیسا کہ تم نے بتایا کہ دیپک نے تمہیں رتن کمار کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تو وہ مجھے بھی نہیں بتائے گا۔'' رادھا بولی۔ شاید اس نے کافی حد تک خود کو سنبھال لیا تھا۔ ''میں اپنے بھائی کو تم سے زیادہ جانتی ہوں۔ مجھے یاد ہے بچپن میں جب دیپک میری چیزیں چوری کر لیتا تھا تو پتا جی کے پوچھنے کے باوجود نہیں بتاتا تھا۔ یہاں تک کہ پتا جی اس کی پٹائی بھی بہت کرتے تھے۔''

''ہنہ۔'' میں نے ہنکاری بھری۔

''لیکن تم چنتا مت کرو۔'' رادھا نے مزید کہا۔ ''مجھ سے جو کچھ ہو سکا میں تمہارے لیے کروں گی کیونکہ تم اپرادھیوں کے خلاف کام کر رہے ہو۔ ان پاپیوں کی وجہ سے ہی کنیاؤں کی عزتیں محفوظ نہیں ہیں۔''

مجھے خوش گوار حیرت ہوئی کہ رادھا میری باتوں سے متاثر ہو گئی تھی۔ اس کا یہ اچھا فیصلہ تھا لیکن وہ عورت ذات تھی اگر دیپک کو معلوم ہوگا کہ اس کی دیدی میری حمایتی بن گئی ہے تو وہ اس سے خفا ہو جائے گا۔

''رادھا! تم اس راکسس کا ساتھ دو گی؟ مجھے سن کر تعجب ہوا ہے۔'' دفعتاً جوتی دوبارہ اسے اکسانے کے لیے بولی۔

''تم چپ رہو پاپی لڑکی۔'' رادھا ایک بار پھر جوتی پر چڑھ دوڑی۔ وہ اٹھ کر اس کی طرف بڑھی تھی۔ ''تم عورتوں کے نام پر ایک کلنک ہو۔ ارے تم کیسی ناری ہو، جو دوسری ناریوں کو اغوا کر کے گندے کام کے لیے بیچ دیتی ہو۔ تھو ہے تم پر۔'' کہنے کے ساتھ ہی اس نے جوتی پر تھوک بھی دیا تھا جو اس کے چہرے پر پڑا تھا۔ میں بھی اٹھ کر اس کے پاس کھڑا ہو گیا تھا۔

''تمہیں اس کا حساب دینا ہوگا رادھا۔'' جوتی غراہٹ سے مشابہ آواز میں بولی۔ ''میں تمہارا وہ حشر کروں گی کہ تو کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے گی۔''

''ارے جا جا، بڑی دیکھی ہیں تیرے جیسی ناریاں۔'' رادھا نے اپنے ہاتھ کو نچاتے ہوئے کہا۔ ''میرا من چاہ رہا ہے تیرا گلا گھونٹ دوں، تجھے نرک میں پہنچا دوں۔ بڑی ہی اپرادھی ہے تو۔''

مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں واقعی رادھا جوش غیظ میں جوتی کا گلا نہ دبا دے اس لیے میں نے مداخلت کی۔ ''پلیز رادھا جی، کول ڈاؤن رہیں، اپنے حساب کتاب بعد میں کر لینا۔ اس سے تو میں نے بھی اپنے دوست کی موت کا بدلا لینا ہے۔'' میں نے ایک نظر جوتی پر ڈالی۔

رادھا ایک نظر قہر و غضب جوتی پر ڈالتی ہوئی صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر غصے کے تاثرات ابھرے ہوئے تھے۔ شاید اس نے اپنے بھائی دیپک اور جوتی کے بارے میں جو سنا تھا وہ اس کی توقع کے برخلاف تھا۔ سچ واقعی کڑوا اور تلخ ہوتا ہے۔ میں ٹہلتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ رادھا کا دل میری طرف سے صاف ہو چکا تھا۔ اس کے سامنے اس کے بھائی دیپک اور ہونے والی بھابی جوتی کی اصلیت کھل کر سامنے آ گئی تھی۔

چند ہی لمحے گزرے تھے کہ دفعتاً ہمیں باہر سے کودنے کی آوازیں سنائی دیں ہم بے اختیار ٹھٹک گئے۔ رادھا نے

تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ ''یہ کیسی آوازیں ہیں؟''
''شاید کوئی دیوار کودا ہے۔'' میں نے اندازاً کہا۔
رادھا اٹھ کر کھڑکی کی طرف بڑھی۔ کھڑکی پر سفید رنگ کا ایک دبیز پردہ تھا جسے اس نے تھوڑا سا ہٹا کر چہرہ شیشوں سے لگا کر دیکھنے کی کوشش کی۔ چند لمحے دیکھنے کے بعد وہ پیچھے ہٹ گئی۔
''کون ہے؟'' میں نے ترنت پوچھا
''پولیس...... پولیس آگئی ہے۔'' رادھا نے تیز لہجے میں کہا اور پردہ برابر کر دیا۔ پولیس کا سن کر میں بھی پریشان ہو گیا تھا۔
''پولیس کیوں آئی ہے؟'' میں بڑبڑایا۔ رادھا مجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو کہ اب تم کیسے بچو گے۔ فوری طور پر اندازہ نہ لگا سکا کہ اس کے یہ تاثرات میرے حق میں تھے یا خلاف۔
میرا خیال تھا کہ دیپک کے ہرکارے آگئے ہوں گے، لیکن وہ ہرکارے نہیں تھے، وہ پولیس والے تھے جنہیں دیپک نے بھیجا تھا۔ میرے لیے یہ صورت حال پریشان کن تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں چوہے دان میں پھنس گیا ہوں اور مجھے نکلنے کا کوئی راستہ دکھائی نہ دے رہا۔ میں نے اس کمرے کی بناوٹ کا جائزہ لیا۔ کونے میں اٹیچ باتھ روم کا دروازہ تھا اور ایک باہر کی طرف کھلنے والا دروازہ تھا۔ روشن دان بھی اتنا چوڑا نہیں تھا کہ میں اس سے میں آسانی سے نکل جاتا۔
''اب دیکھتی ہوں تم کیسے بچتے ہو۔'' دفعتاً جوتی کی استہزائیہ آواز سنائی دی تو ہم دونوں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی بات پر غصہ تو بہت آیا تاہم وقت ایسا نہیں تھا کہ اس کی بات کا جواب دیا جاتا۔ میں نے ضبط کا مظاہرہ کیا۔ تبھی دروازے پر زور زور سے دستک ہوئی۔ ساتھ ہی ایک مردانہ آواز گونجی۔
''دروازہ کھولو۔ مجھے معلوم ہے تم اسی کمرے میں چھپے ہوئے ہو، تم پاکستانی ٹیررسٹ ہو۔ دروازہ کھولو ورنہ ہم دروازہ توڑ دیں گے۔ تمہیں چاروں طرف سے گھیرا جا چکا ہے۔ تم کسی صورت فرار نہیں ہو سکتے۔''
میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ درحقیقت میں فکر مند ہوا تھا کیونکہ واقعی فرار ہونے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پولیس والا مسلسل دروازہ بجانے کے ساتھ ساتھ وہی سابقہ جملے دوہرا رہا تھا۔ میں نے رادھا کی طرف دیکھا تو اس کا چہرہ اب سپاٹ تھا۔ چند لمحے پہلے والی پریشانی اب ہوا ہو چکی تھی۔
''پریشان مت ہو، میں تمہاری مدد کروں گی۔'' رادھا نے فہمائشی لہجے میں کہا۔ ''پولیس تم تک نہیں پہنچ سکے گی۔''
''تم میری مدد کرو گی؟'' میں سمجھ نہ پایا تھا۔ ''لیکن کیسے؟''
''آؤ میرے ساتھ۔'' اس نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ میں الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ دروازے پر مسلسل دستک دی جا رہی تھی اور ساتھ ہی دروازہ کھولنے کا بھی کہا جا رہا تھا۔ علاوہ ازیں دروازہ نہ کھولنے کی صورت میں توڑنے کی دھمکیاں بھی دی جا رہی تھیں۔ دروازہ خاصہ مضبوط تھا اس لیے اسے توڑنے میں خاصہ وقت لگ سکتا تھا۔ باتھ روم کا دروازہ کھول کر رادھا نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔
''آؤ۔''
''کیا تم مجھے باتھ روم میں بند کرنا چاہتی ہو؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔
''نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''باتھ روم سے ایک خفیہ راستہ ہے جس کے ذریعے تم باہر نکل سکتے ہو۔ جلدی کرو، اگر پولیس نے دروازہ توڑ دیا تو پھر میں کچھ نہ کر سکوں گی۔''
''تم میری کیوں مدد کر رہی ہو؟'' یہ سوال فطری تھا۔
''فی الحال اس وقت سوال و جواب کا وقت نہیں ہے۔'' رادھا نے کہا۔ ''میں تمہیں بتا دوں گی کہ میں تمہاری مدد کیوں کر رہی ہوں، جلدی کرو۔ وقت کم ہے۔''
میں نے لحہ بھر کو رادھا کے لب و لہجے پر غور کیا تاہم کسی بھی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ میں نے رادھا کی طرف بڑھتے ہوئے جوتی کے بارے میں کہا۔ ''اس کا کیا کرو گی؟ یہ تو پولیس کو بتا دے گی کہ تم نے مجھے......''
''جوتی کی فکر مت کرو۔'' رادھا نے میری بات قطع کی۔ ''اسے میں سنبھال لوں گی۔''
رادھا جیسی دکھائی دیتی تھی ویسی نہیں تھی۔ بہرکیف میں اس کے پیچھے باتھ روم میں داخل ہو گیا۔ باتھ روم اتنا بڑا تھا جتنا ہمارے ہاں پندرہ بائے بیس فٹ کا کمرا ہوتا ہے۔ دروازے کے ساتھ ہی دیوار پر لکڑی کی الماری بنی ہوئی تھی۔ اس نے جلدی سے الماری کا پٹ کھولا اور ہینگر پر لگے کپڑے اِدھر اُدھر ہٹائے۔ دوسری طرف دیوار تھی۔ اس

نے دیوار کے کونے میں ہلکا سا دباؤ ڈالا تو سرر کی آواز کے ساتھ ہی دیوار کا ٹکڑا دائیں طرف سرک کر دیوار میں غائب ہوگیا اور دوسری طرف اندھیرا دکھائی دیا۔ رادھا نے آگے جھک کر دیوار پر ٹٹولتے ہوئے بٹن پریس کیا تو دوسری طرف کا حصہ روشن ہوگیا اور ایک سرنگ سی جاتی ہوئی دکھائی دی۔

میں حیرت بھری نظروں سے اس سرنگ کو دیکھتا رہ گیا۔ رادھا نے کہا۔ ''تم اس سرنگ کے ذریعے باہر جا سکتے ہو۔ باہر پہنچ کر میرا انتظار کرو میں کار لے کر آرہی ہوں۔''

میں جلدی سے سرنگ میں داخل ہوگیا۔ پیچھے سے مجھے سرر کی آواز سنائی دی تو میں سمجھ گیا کہ رادھا نے سرنگ کا دہانہ بند کر دیا ہے۔ اس سرنگ کی چھت کافی نیچے تھی اس لیے مجھے جھک کر چلنا پڑا تھا۔

سرنگ زیادہ طویل نہیں تھی، تقریباً چالیس گز دور جانے کے بعد وہ بائیں طرف مڑ رہی تھی۔ اس طرف بھی روشنی تھی شاید بجلی کا ایک ہی سوئچ سے کنکشن کیا گیا تھا۔ آگے جا کر سرنگ دائیں طرف مڑ گئی تھی۔ وہ سرنگ سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی تھی۔ ابھی میں سرنگ میں ہی تھا کہ اچانک لائٹ آف ہوگئی اور سرنگ میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ بے اختیار میرے قدم رک گئے اور میں گھور گھور کر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ پتا نہیں لائٹ چلی گئی تھی یا کوئی اور مسئلہ ہوا تھا۔ میں نے بجلی کو کوسا، کم بخت نے اس وقت ہی آف ہونا تھا۔ گھپ اندھیرے میں دیکھنا دشوار ہو رہا تھا۔ میں ٹامک ٹوئیے مارتا ہوا آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ گو مجھ پر مشکل وقت ضرور تھا لیکن میں پتلون ڈھیلی کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔

دفعتاً میری حساس سماعت میں سرنگ کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی تو میں نے مڑ کر دیکھا۔ شاید سرنگ میں کوئی داخل ہوا تھا۔ اگلے ہی لمحے مجھے ٹارچ کی روشنی دکھائی دی جو بتدریج تیز ہوتی جارہی تھی۔ شاید وہ رادھا تھی جو ٹارچ لے کر آرہی تھی۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد آنے والا نمودار ہوا۔ وہ رادھا تھی جس نے ٹارچ تھامی ہوئی تھی۔ اس کا آنا مجھے شک میں مبتلا کر گیا تھا... کیونکہ پولیس اس کے گھر میں موجود تھی، جوتی بندھی ہوئی تھی اور وہ ٹارچ لے کر سرنگ میں آگئی تھی۔

''رادھا جی! تم۔'' میں نے کہا۔

''ہاں۔'' رادھا نے میرے قریب پہنچ کر کہا۔ ''لائٹ میں خرابی ہوگئی ہے اس لیے میں تمہیں یہ ٹارچ دینے آئی تھی۔''

''پولیس چلی گئی؟'' میں نے استفسار کیا۔ جواب دینے کی بجائے اچانک رادھا نے ٹارچ بالکل میری آنکھوں کے سامنے کر دی اور میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ عین اسی لمحے رادھا نے کوئی چیز میرے سر سے لگا دی اور میرے حلق سے کراہ نکل گئی۔ ساتھ ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ ایک لمحے سے بھی پہلے میں لہرا کر فرشِ خاک پر گرا اور میرے دماغ میں تاریکی بھر گئی۔ میرے دماغ میں آخری احساس یہی تھا کہ رادھا نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ اس کے بعد جس طرح کیمرے کا شٹر بند ہو جاتا ہے اسی طرح میرے دماغ کا کیمرا بھی آف ہوگیا تھا۔

☆☆☆

میری آنکھ کھلی تو میں نے ماحول کو یکسر بدلے ہوئے پایا۔ میں سرنگ کی بجائے رادھا کے کمرے میں کرسی کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ میرے ہاتھ تو کرسی کے ساتھ پیچھے کی طرف بندھے ہوئے تھے لیکن پیر آزاد تھے۔

بے ہوش ہونے سے پہلے کے تمام مناظر میری آنکھوں کے سامنے گھوم کر میرا تمسخر اڑا گئے تھے کہ تم تو خود کو بہت ہوشیار اور چالاک سمجھتے تھے، کیسے تم ایک عورت کے جھانسے میں آگئے لیکن میری سمجھ سے باہر تھا کہ رادھا نے میرے ساتھ یہ کھیل کیوں کھیلا تھا۔ حالانکہ میرا خیال تو یہی تھا کہ اپنے بھائی دیپک اور جوتی کے سیاہ کرتوت جاننے کے بعد اسے ان سے نفرت ہوگئی تھی اور اس نے مجھے پولیس سے بچانے میں میری مدد کی تھی۔

میری سوچ، میرا گمان اور میرا مان سب کچھ ہی اکارت ہوگیا تھا۔ رادھا بھی صفِ دشمناں میں شامل ہوگئی تھی۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ دروازہ کھلا اور سب سے پہلے رادھا بڑے طمطراق انداز میں داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے جوتی تھی جس کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ تھی۔ رادھا اور جوتی دونوں کو دیکھ کر مجھے شاک لگا تھا۔ میرے دماغ میں بم کا دھماکا ہوا تھا جس نے میرے پورے وجود کی عمارت کو تہس نہس کر دیا تھا۔ میرا دماغ بھیانک حقائق کے جوالا مکھی سے پھٹنے لگا تھا۔ تاہم میں نے اپنی کیفیت پر قابو پا لیا تھا۔ ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر میں سمجھ گیا تھا کہ دونوں نے میرے ساتھ ناٹک کیا تھا۔ میں نے اپنے اعصاب کو کنٹرول میں رکھا تھا۔

رادھا اور جوتی دونوں ہی صوفوں پر گویا گرنے والے

انداز میں بیٹھ گئی تھیں۔ رادھا نے اپنی معصومیت کو داغ دار کر دیا تھا۔ وہ معصوم نہیں تھی بلکہ اس نے معصوم ہونے کا دکھاوا کیا تھا۔ ایک طرح سے اس نے مجھے بھرپور انداز میں شیشے میں اتارا تھا اور میں اس کے ہاتھوں بے وقوف بن گیا تھا۔

''یقیناً تم ہم دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر حیران ہو رہے ہو گے؟'' رادھا نے لب کشائی کی۔

''بالکل نہیں۔'' میں نے تحمل مزاجی سے جواب دیا۔ ''دھوکا دینا تم ایسے لوگوں کی سرشت میں شامل ہے۔ ہاں البتہ میں اعتراف کرتا ہوں کہ تمہاری معصومیت کی وجہ سے دھوکا ضرور کھا گیا رادھا جی۔ تم دونوں نے کمال اداکاری کی ہے، تم دونوں تو آسکر کی حق دار ہو، لیکن یاد رکھنا، آنے والا دن تمہارے لیے یوم مکافات بھی ہو سکتا ہے۔''

میری بات پر رادھا کے چہرے پر سے مسکراہٹ یکدم غائب ہو گئی۔ فرطِ اشتعال سے اس کی رنگت سرخ ہو گئی تھی۔ اس کا بدن بھی لرز رہا تھا، جوتی نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر اسے اشتعال میں آنے سے باز رکھا۔ ''رادھا! غصہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اسے جو بھی کہنا ہے کہنے دو، یہ اپنی باتوں سے تمہیں مشتعل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ بس دیپک آ جائے وہی اس کی زندگی کا فیصلہ کرے گا۔''

''اگر مجھے دیپک کا خیال نہ ہوتا تو میں تمہاری بوٹیاں نوچ لیتی۔'' رادھا سانپ سے مشابہ پھنکاری۔ ''تم نے میرے بھائی پر جتنا تشدد کیا ہے تمہیں اس کا حساب دینا پڑے گا، میں حساب لیے بغیر تمہیں مرنے نہیں دوں گی۔''

''میں بھی حساب برابر کیے بغیر تم سب کو چھوڑنے والا نہیں ہوں۔'' میں نے دبنگ لہجے میں جواباً کہا۔ ''ثابت ہو گیا ہے کہ تم بھی دیپک اور رتن کمار کے ساتھ ملی ہوئی ہو۔''

''ہاں، رادھا بھی ہمارے ساتھ کام کرتی ہے۔'' رادھا سے پہلے ہی جوتی بول پڑی۔ ''چونکہ اب تم مرنے والے ہو اس لیے تمہیں بتانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ہمارے گینگ میں بہت ساری لڑکیاں اور لڑکے کام کرتے ہیں جو شہر کی خوب صورت اور کم سن ناریوں کو جال میں پھانس کر لاتے ہیں، ہم انہیں رتن کمار کے حوالے کرتے ہیں اس کے بعد انہیں امریکی پورن کمپنیوں کے پاس فروخت کر دیا جاتا ہے۔ جس طرح اسماعیل شاہد نے تمہاری بہن کو ہیری ٹام کو فروخت کیا تھا۔ رتن کمار کو تمہاری بہن پسند آ گئی تھی اس لیے اس نے اسے ہیری ٹام سے خرید لیا تھا۔ تمہاری بہن کی بدقسمتی کہ اس نے رتن کمار کی داشتہ بننے کی بجائے موت کو ترجیح دی۔''

جوتی کے منہ سے اپنی بہن کے بارے میں غلیظ الفاظ سن کر میرے وجود میں آگ سی بھر گئی۔ میرے خون کا ہر قطرہ تیزاب بن کر لہو میں آگ کی طرح پھیل گیا تھا۔ میں نے جوشِ غیظ سے جوتی کو ٹوکتے ہوئے کہا۔ ''اُلو کی پٹھی، میری بہن کے بارے میں غلط الفاظ کہے تو میں تمہاری زبان کاٹ دوں گا۔''

جوتی میری بات کے جواب میں اشتعال میں آنے کی بجائے قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ پھر وہ ہنستے ہوئے اٹھی اور دھیرے دھیرے میری طرف بڑھی۔ جبکہ رادھا صوفے پر براجمان رہی۔ میری نظریں جوتی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میرا وجود ابھی تک آگ کی زد میں تھا۔ اگر میرے ہاتھ بندھے نہ ہوتے تو شاید میں اس کا حشر کر دیتا۔ میرے سامنے پہنچ کر جوتی استہزائیہ انداز میں مسکراتی میری طرف دیکھتی رہی پھر یکدم اس کا چہرہ سپاٹ ہو گیا اور کرختگی چھا گئی۔ اگلے ہی لمحے اس نے میرے سر کے بال اپنی مٹھی میں جکڑے اور ایک جھٹکے سے میرا سر اوپر کیا۔ میری آنکھوں میں بغور دیکھنے کے بعد اس نے میرے منہ پر مکا جڑ دیا۔ میرے منہ سے ہلکی سی کراہ نکل گئی، میرے سر کے بال اس کی مٹھی میں ہی تھے۔ تکلیف کے باعث میری آنکھوں میں نمی تیر گئی تھی۔ میرے اندر آتش فشاں پھٹ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ میرے منہ پر دوسرا مکا مارتی، رادھا نے مداخلت کی۔ ''چھوڑ دو اسے جوتی، کیوں اپنا کھون (خون) جلا رہی ہو۔''

''اس نے مجھے اُلو کی پٹھی کہا ہے۔'' جوتی پھنکارتی ہوئی بولی۔ ''میں اس کا منہ توڑ دوں گی۔ سمجھتا کیا ہے یہ خود کو؟'' کہنے کے ساتھ ہی اس نے میرے منہ پر ایک اور مکا جڑ دیا۔ اس کے نرم و نازک ہاتھ اس وقت پتھر بنے ہوئے تھے یا پہلے سے پتھر ہی تھے اس کا مجھے اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔

رادھا اٹھ کر جوتی کے پاس آئی اور اس کی گرفت سے میرے سر کے بال چھڑوائے اور اپنے ساتھ صوفے پر بٹھا دیا۔ ''خود پر کنٹرول رکھو جوتی! دیپک آ جائے پھر دونوں مل کر اس سے حساب چکتا کرنا۔''

''میرا تو بس نہیں چل رہا ورنہ میں اس کی کند چھری سے کھال ادھیڑ دوں۔'' وہ خود پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے غرائی۔ میں استہزائیہ انداز میں مسکرا رہا تھا

جس سے اس کا طیش کم ہونے کی بجائے بڑھ رہا تھا۔
''یہ دیپک کہاں رہ گیا ہے، ابھی تک پہنچا کیوں نہیں؟'' جوتی، رادھا سے مستفسر ہوئی۔
''آتا ہی ہوگا۔'' رادھا بولی۔
میں نے مداخلت کی۔ ''رتن کمار کو بھی بلا لیتی۔ کیا اسے میرے بارے میں اطلاع نہیں دی؟''
''رتن کمار امریکا گیا ہوا ہے۔'' رادھا نے جواباً اطلاع دی۔ ''لیکن تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے واپس آنے سے پہلے ہی تم نرک میں پہنچ چکے ہو گے۔''
''وہ یقیناً امریکا لڑکیوں کی خرید وفروخت کے سلسلے میں گیا ہوگا۔'' میں نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔ جواباً ان دونوں میں سے کسی نے کوئی تبصرہ نہ کیا۔ جوتی تو بہ دستور مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھی۔ میں آزادی حاصل کرنے کی کوئی ترکیب سوچ رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ دیپک کے آنے سے پہلے ہی خود کو رسی سے آزاد کرا لوں ورنہ دیپک نے مار مار کر میرا ابھر کس نکال دینا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں جوتی اور رادھا کو باتوں میں لگانے کے ساتھ ساتھ رسی بھی کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ رسی کافی مضبوطی کے ساتھ باندھی گئی تھی۔ یقیناً ان دونوں عورتوں نے مل کر باندھی ہو گی۔
دفعتاً میرے دماغ میں پولیس کا خیال آیا تو میں نے رادھا سے پوچھا۔ ''کیا وہ پولیس بھی نقلی تھی جو تھوڑی دیر پہلے یہاں آئی تھی؟''
رادھا نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں...... وہ اصلی پولیس تھی۔ اسے دیپک نے بھیجا تھا۔''
''ہنہ...'' میں نے ہنکاری بھری۔ ''پھر تم نے مجھے پولیس کے حوالے کیوں نہیں کیا تھا؟''
''کیونکہ تم پولیس کے نہیں، ہمارا شکار ہو۔'' رادھا مکروہ انداز میں ہنس کر بولی۔ ''پولیس کو میں نے یقین دلا دیا تھا کہ یہاں ایک ایرا دمی آیا تھا لیکن پولیس کا سنتے ہی بھاگ گیا اور ہم نے اس کے ڈر سے خود کو کمرے میں بند کیا ہوا تھا۔ پولیس میری بات سن کر مطمئن ہوگئی اور چلی گئی۔''
''بہت ہی چالباز اور شاطر عورت ہو تم۔'' میں نے زہر آگیں لہجے میں کہا۔ ''آخر بہن کس کی ہو۔''
''اچھا اب اپنی بکواس بند کرو اور خاموش ہو جاؤ۔'' رادھا نے مجھے ڈپٹا۔ شاید اسے اپنی تعریف میں کہے گئے الفاظ پسند نہیں آئے تھے۔ اس کا چہرہ بھی سرخ ہو گیا تھا۔
میں نے خاموشی اختیار کر لی تھی لیکن میرا دماغ مسلسل رسی سے چھٹکارا پانے کی ترکیب سوچنے میں مصروف تھا۔ میری فوری رہائی ضروری تھی۔ چند لمحوں کے بعد ایک ترکیب میرے ذہن میں آ ہی گئی اور میں نے اس پر فوری طور پر عملدرآمد کرنے کا سوچ لیا۔ میں نے رادھا سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''رادھا جی! وہ......''
رادھا نے بہ سرعت میری بات قطع کی۔ ''میں نے کہا، خاموش رہو۔''
''میری بات تو سن لو۔'' میں بھی باز نہیں آرہا تھا۔
''نہیں سننی۔ خاموش بیٹھے رہو۔'' وہ ڈپٹنے والے انداز میں بولی تھی۔
''تمہیں میری بات سننی اور ماننی ہوگی۔'' میں نے بھی درشتگی سے کہا۔
''اس کے منہ پر ٹیپ چپکا دیتے ہیں۔'' دفعتاً جوتی نے رادھا کو مفت مشورہ دیا۔ ''اس کی ٹرٹراہٹ بند ہو جائے گی۔''
''ہاں...... یہ ٹھیک رہے گا۔'' رادھا نے اس کا مشورہ مان لیا، قبل اس کے کہ وہ جوتی کے مشورے پر عملدرآمد کرتی، میں نے جلدی سے کہا۔
''مجھے واش روم جانا ہے۔''
رادھا نے منہ بنایا اور بے ساختہ پوچھا۔ ''اس وقت؟''
میں زیر لب مسکرا دیا۔ اس نے تو ایسے کہا تھا جیسے واش روم جانے کا بھی وقت مقرر ہوتا ہے۔ میں نے جواباً طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''میڈم رادھا! واش روم جانے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔ پلیز، میں نے واش روم جانا ہے ورنہ میرا مثانہ پھٹ جائے گا...... یا اگر برداشت سے باہر ہو گیا تو پھر تمہارا یہ خوب صورت، نرم و گداز اور قیمتی قالین خراب ہو جائے گا۔ پھر اس کا الزام مجھ پر مت لگانا۔ یہی بات میں تم سے کہنا چاہ رہا تھا اور تم سننے کی روادار نہیں ہو رہی تھی۔''
اس نے ایسے منہ بنایا جیسے چھوٹا بچہ کڑوی دوائی پیتے وقت بناتا ہے۔ تبھی جوتی نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا جو سو فیصد درست تھا۔ ''رادھا! میرا من کہتا ہے یہ واش روم جانے کا ناٹک کر رہا ہے۔''
''ناٹک......'' رادھا نے زیر لب دوہرایا۔
''ہاں۔'' جوتی نے سر ہلایا۔
''اگر تمہیں واش روم جانا ہو تو کیا تم بھی ناٹک کرتی ہو...'' میں نے ناگواریت سے کہا پھر رادھا کی طرف

دیکھا۔ جواباً وہ مجھے گھور کر رہ گئی۔

میں نے رادھا سے کہا۔ ''رادھا جی، اس کی باتوں پر یقین نہ کرنا۔ یہ خود بہت بڑی فلم ہے۔ پلیز، مجھے واش روم جانے کی اجازت دو، میرے پیٹ میں درد شروع ہو گیا ہے جو برداشت سے باہر ہو رہا ہے۔ آہ۔'' کہنے کے ساتھ ہی میں نے منہ سے کراہ نکالی۔

رادھا نے بدقت مجبوری جوتی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی الجھن کے تاثرات نمودار ہو گئے تھے۔ تبھی جوتی نے کہا۔ ''رادھا! میں کہہ رہی ہوں یہ ناٹک کر رہا ہے۔ تم اس کی بات پر یقین نہ کرو۔ یہ فرار ہونے کی بھی کوشش کر سکتا ہے۔''

میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ''بدبخت ناری! تمہارے پاس ریوالور ہے، کیا میں تمہیں بے وقوف نظر آتا ہوں کہ ریوالور کی موجودگی میں فرار ہونے کی کوشش کروں گا۔ آہ میرا مثانہ۔ رادھا جی، پلیز کچھ کرو۔ ورنہ......''

''اچھا اچھا ٹھیک ہے۔'' رادھا جلدی سے بولی۔ شاید وہ میری بات کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ پھر وہ جوتی کی طرف متوجہ ہوئی تو جوتی نے کہا۔

''ٹھیک ہے رادھا! تم اس کے ہاتھ کھول دو، میں اسے ریوالور سے کور کرتی ہوں۔ اگر یہ ناٹک کر رہا ہوا اور اس نے فرار ہونے کی کوشش کی تو میں بلادریغ اسے گولیاں مار دوں گی۔ ویسے بھی تو اس نے مرنا ہی ہے، دیپک کے ہاتھوں نہ سہی، میرے ہاتھوں ہی سہی۔ بات تو ایک ہی ہے۔'' کہنے کے ساتھ ہی اس نے اپنی پتلون کی جیب سے وہی ریوالور نکال لیا جو کچھ دیر پہلے میرے پاس تھا۔ پھر وہ مجھ سے قدرے فاصلے پر جا کر کھڑی ہو گئی اور اس نے ریوالور کا رخ میری طرف کر دیا۔ وہ بے حد چوکنی اور تربیت یافتہ تھی۔

رادھا میرے عقب میں آئی اور رسی کھولنے لگی۔ ساتھ ہی اس نے کانا پھوسی کی تھی۔ ''ہوشیاری مت دکھانا بالک، ورنہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ جوتی بہت سنگ دل ناری ہے۔''

''فی الحال تو مجھے واش روم جانا ہے۔ ایسی صورت میں چالاک سے چالاک منش بھی مجبور ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''رسی جلدی کھولو ورنہ......''

''رسی کھول تو رہی ہوں۔'' رادھا نے مجھے ٹوکا۔ ''چند سیکنڈ برداشت کر لو۔''

''برداشت کر تا رہا ہوں لیکن اب برداشت سے باہر ہو رہا ہے۔'' میں نے مسکی سی صورت بناتے ہوئے کہا۔

چند لمحوں کے بعد رادھا رسی کھولنے میں کامیاب ہو گئی۔ میں اٹھا اور تیزی سے واش روم کی طرف دوڑا۔ واش روم میں داخل ہوتے ہی میں نے اندر سے کنڈی لگائی اور حوائج ضروریہ سے فراغت کے بعد میں ان دونوں عورتوں سے نمٹنے کی ترکیب سوچنے لگا۔ اتفاق کی بات تھی کہ اس وقت مجھے واش روم جانے کی حاجت محسوس ہو رہی تھی اور میں نے اسی کو بنیاد بناتے ہوئے ترکیب سوچی تھی۔

مجھے واش روم میں سات، آٹھ منٹ ہی ہوئے تھے کہ دفعتاً رادھا نے دروازے پر دستک دی، ساتھ ہی اس کی آواز سنائی دی۔ ''اور کتنی دیر ہے۔ جلدی باہر آؤ۔''

میں نے واش روم کا اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا لیکن مجھے ایسی کوئی چیز نہیں ملی تھی جس کی مدد سے میں رادھا کو قابو کر سکتا۔ میرا ارادہ پہلے رادھا اور پھر جوتی کو قابو کرنا تھا۔ یہ تو رادھا کی زبانی معلوم ہو گیا تھا کہ رتن کمار امریکا گیا ہوا ہے، اس کی واپسی کب ہو گی یہ اس نے نہیں بتایا تھا۔ میں نے اپنا منصوبہ بدل دیا تھا۔ پہلے میں دیپک کے ذریعے رتن کمار تک پہنچنا چاہتا تھا اب میں نے رادھا کے ذریعے اس تک پہنچنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں رادھا کو قابو کر کے یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ ان پر قابو پانے کے بعد میں دیال سنگھ کو بلاؤں گا اور رادھا کو اپنے ساتھ کسی محفوظ ٹھکانے پر لے جاؤں گا۔ جب تک رتن کمار امریکا سے واپس نہیں آ جاتا، رادھا کو اپنی کسٹڈی میں رکھوں گا۔

میں نے کی ہول سے دائیں آنکھ لگا کر دوسری طرف جھانکا تو مجھے دروازے کے پاس رادھا کھڑی دکھائی دی۔ میں تہی دست تھا اس لیے اپنے زورِ قوت سے رادھا کو قابو کرنا تھا۔ میں چند لمحے حالات کا مشاہدہ کرتے ہوئے غور کرتا رہا پھر میں نے ہینڈل پر ہاتھ جما دیا۔ اگلے ہی لمحے میں نے بے آواز انداز میں ہینڈل کو گھماتے ہوئے ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ رادھا ٹھٹکی، اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتی میں نے برقی سرعت کے ساتھ اسے بازو سے پکڑتے ہوئے پھرکی کی طرح گھمایا اور اس کی گردن کے گرد اپنا بازو حائل کر دیا۔ اگلے ہی پل رادھا ماہی بے آب کی طرح پھڑکی، اس نے میری گرفت سے نکلنا چاہا لیکن نہ صرف کسمسا کر رہ گئی بلکہ اس کے منہ سے کراہ سی نکل گئی۔ جوتی ریوالور کا رخ ہماری طرف کیے کشمکش میں مبتلا ہو گئی تھی۔ شاید اسے بھی توقع نہیں تھی کہ بازی ایک لمحے میں ہی

پلٹ جائے گی۔ تبھی وہ سانپ کے انداز میں پھنکاری۔
''چھوڑ دو..... چھوڑ دو رادھا کو......''
''ریوالور پھینک دو۔'' میں نے بھی درشتگی سے کہا۔
''ورنہ رادھا کی نرم و نازک گردن کی ہڈی ایک جھٹکے میں توڑ دوں گا۔'' کہنے کے ساتھ ہی میں نے رادھا کی گردن پر بازو کا دباؤ بڑھایا تو اس کے منہ سے کراہ خارج ہوئی۔ میں نے رادھا کے کان میں سرگوشی کی۔ ''جوتی سے کہو ریوالور پھینک دے ورنہ......''
''ج......ج...... جو......تی۔ ریوالور پھینک دو۔'' رادھا کراہتے ہوئے بولی۔
''لیکن دیدی......'' جوتی نے کہنا چاہا، لیکن میں نے ایک بار پھر برق سرعت کا کامیاب مظاہرہ کرتے ہوئے جوتی کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی رادھا کو گھما کر جوتی کی طرف دھکیل دیا تھا۔ وہ جوتی سے ٹکرائی اور اگلے ہی لمحے دونوں لڑکھڑا کر فرش بوس ہوگئیں۔ جوتی کے ہاتھ سے ریوالور بھی نکل کر دیوار کے ساتھ جا گرا تھا جسے میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اٹھا لیا تھا۔ میں نے یہ نفسیاتی حربہ اس لیے استعمال کیا تھا کیونکہ اس حربے سے کسی کی بھی ذہنی قوت مزاحمت کو شکست دیا جاسکتا ہے۔ دونوں مجھے گالیوں سے نوازتی ہوئیں اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ جس گینگ سے وہ وابستہ تھیں گالیاں دینا ان کا شیوہ تھا اس لیے مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی۔ جوتی نے اٹھتے ساتھ ہی مجھ پر جھپٹنا چاہا لیکن میں نے اسے ڈرانے کے لیے مصلحت اندیشی کے تحت فرش پر گولی چلادی تھی۔ اب یہ جوتی کی تیرہ بختی تھی کہ گولی فرش پر لگنے کی بجائے اس کے پیر میں لگ گئی تھی۔
جوتی کے منہ سے دردناک چیخ نکلی تھی۔ ساتھ ہی وہ ایک بار پھر فرش بوس ہوگئی تھی۔ جوتی کی حالت دیکھ کر رادھا متوحش ہوگئی تھی۔
جوتی درد سے چیخنے کے ساتھ ساتھ مغلظات بھی بک رہی تھی لیکن اس کی بکو اس سے میری صحت پر مطلق اثر نہیں ہوا تھا۔ میں نے ریوالور کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے سفاکانہ لہجے میں کہا۔ ''جوتی! جب تم نے میرے دوست کو گولی مار کر ہلاک کیا تھا تو میں نے اسی وقت قسم کھائی تھی کہ میں تم سے اس کی موت کا بدلا ضرور لوں گا۔ شاید قسمت نے مجھے موقع دے دیا ہے۔''
جوتی کی چیخیں نہ صرف بند ہوگئی تھیں بلکہ لمحہ بھر میں وہ لاش کی طرح سفید پڑ گئی تھی۔ گولی اس کے پیر میں لگی تھی۔
اس کے پیر سے خون نکل رہا تھا۔ میرے سفاک لہجے نے اس کے ہوش اڑا دیے تھے۔ تبھی وہ منت سماجت کرنے لگی۔ ''م...... مجھے معاف کردو...... بھگوان کے لیے......''
''تم جیسی ظالم، سفاک اور ناسور کو اگر میں نے چھوڑ دیا تو یہ ان معصوم ناریوں پر ظلم ہوگا جنہیں تم لوگ اغوا کر کے پورنوگرافی کے لیے بیچ دیتے ہو۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''میں عورتوں پر ہاتھ اٹھانے کا قائل نہیں ہوں لیکن تم عورت نہیں، عورت کے نام پر دھبا ہو۔''
جوتی، موت کے خوف سے اپنا درد بھی بھول گئی تھی۔ اس کا وجود غالباً زلزلے کی زد میں آ گیا تھا کیونکہ آہستہ آہستہ کپکپا رہی تھی۔ وہ ہنوز مجھ سے زندگی کی بھیک مانگ رہی تھی لیکن اس کی گریہ وزاری نے میرا دل موم نہیں کیا تھا۔ میں نے ٹرائیگر دبا دیا تھا۔ سائیلنسر لگے ریوالور سے ہلکی سی ٹھک کی آواز نکلی تھی اور گولی جوتی کی پیشانی میں لگی تھی۔ وہ چیخے بغیر ہی ایک جھٹکے سے سر کے بل فرش پر گری اور تڑپے بغیر ہی ساکت و جامد ہوگئی البتہ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں جن میں دنیا بھر کی حیرت سموئی ہوئی تھی۔ شاید اسے یقین نہیں تھا کہ میں اسے مار بھی سکتا ہوں لیکن وہ اپنے انجام کو پہنچ گئی تھی۔
''یہ...... یہ تم نے کیا کر دیا؟'' دفعتاً رادھا کی خوف بھری آواز نے میری سماعت کو مجروح کیا۔ ''تم نے جوتی کو مار دیا۔ اوہو...... تم نے جوتی کو مار دیا ہے۔''
میں نے تنفر بھری نظر جوتی پر ڈالی پھر رادھا کا متوحش چہرہ دیکھا۔ میں نے ریوالور کی نال سے نکلتے دھویں کو پھونک مار کر فضا میں تحلیل کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ اسی انجام کے قابل تھی رادھا جی۔''
''تم نے بہت غلط کر دیا ہے! دیپک تجھے زمین میں زندہ گاڑ دے گا۔'' رادھا نے شاید مجھے ڈرانا چاہا تھا۔ ''تم جانتے نہیں ہو، وہ...... وہ جوتی سے بہت محبت کرتا ہے، اسے جب جوتی کی ہتیا کا پتا چلے گا تو وہ پاگل ہو جائے گا۔''
''میری فکر کرنے کا دھنیہ واد رادھا جی، لیکن تم چنتا مت کرو۔'' میں نے اس کی پریشانی دور کرنے کی خاطر کہا۔ ''اس بار میرا دیپک سے سامنا ہوا تو میں اسے بھی جوتی کے پاس ہی بھیج دوں گا۔ دونوں اس دنیا میں تو نہیں مل سکے لیکن نرک میں مل جائیں گے۔''
میری بات پر رادھا بل کھا کر رہ گئی تھی۔ شاید اس نے خود کو سنبھال لیا تھا، تبھی وہ ہنکارا بھرتے ہوئے بولی۔ ''نرک

میں تم بھی جاؤ گے۔ تم ہتیارے ہو۔ تم نے میری آنکھوں کے سامنے جوتی کی ہتیا کی ہے۔ تم بہت بری موت مرو گے۔ بہت بری موت مرو گے۔''

''جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔'' میں نے ترنت کہا۔ ''کیا تمہارا دیپک سے رابطہ ہوا تھا؟''

''ہاں۔''

''کب؟''

''جب میں نے سرنگ میں تمہیں بے ہوش کر دیا تھا۔'' رادھا نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔ ''پولیس کے جانے کے بعد میں نے دیپک سے رابطہ کیا تھا۔ میں جانتی تھی کہ وہ بابو رام کی طرف تھا کیونکہ جب اس نے پہلے کال کی تو وہ نمبر بابو رام کا ہی تھا۔ شاید وہ شدید زخمی ہے اسی لیے ابھی تک نہیں آیا۔ اس نے کہا تھا کہ ہم تمہیں باندھ کر رکھیں، وہ اپنے مزید ساتھیوں کو یہاں بھیج رہا ہے۔ اس کے ساتھی یہاں پہنچنے ہی والے ہوں گے، میں دیکھتی ہوں تم کیسے بچ کر جاتے ہو۔''

میں زیرِ لب مسکرایا اور پختہ یقین کے ساتھ کہا۔ ''ایک ایسی ذات ہے جو مجھے نہ صرف بچائے گی بلکہ تم پاکھنڈیوں کو نرک میں پہنچانے کے لیے میری مدد بھی کرے گی۔''

''تم کس کی بات کر رہے ہو؟'' رادھا ٹھٹکی۔

''اللہ کی۔'' میں نے جواباً کہا۔ پھر میں نے ریوالور کا رخ اس کی طرف کر کے کہا۔ ''چلو دروازے کی طرف مڑو اور چلنا شروع کرو۔''

وہ چونکی اور ہکلاتے ہوئے مستفسر ہوئی۔ ''کک...... کہاں؟ تم مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟ میں تمہارے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گی۔''

''تمہیں میرے ساتھ جانا ہوگا رادھا جی۔'' میں نے تحکم آمیز لہجے میں کہا۔ ''ورنہ میں تمہیں بھی گولی مار کر یہیں ڈھیر کر دوں گا۔ چلو میرے ساتھ۔'' کہنے کے ساتھ ہی میں نے ریوالور کی نال اس کی نیم برہنہ کمر سے لگا دی اور مڑنے اور آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ وہ شش و پنج میں مبتلا تھی۔

''چلو۔'' میں نے غراہٹ سے مشابہ آواز میں کہا۔

''تم...... تم مرو گے۔'' وہ دروازے کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے بولی۔ ''تم کتے کی موت مرو گے۔ دیپک تجھے کتے کی موت مارے گا۔''

''کون کتے کی موت مرے گا یہ آنے والا وقت بتائے گا۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔ ''اب اپنی زبان بند رکھو ورنہ مجھے تمہیں خاموش کرنے کے لیے کچھ کرنا پڑے گا۔''

رادھا دوبارہ نہیں بولی تھی۔ میں اسے ریوالور کی زد پر لیے صحن میں آ گیا۔ پورچ میں جوتی کی کار موجود تھی۔ میں نے رادھا کو کار کی طرف بڑھنے کو کہا۔ پہلے تو وہ ہچکچائی پھر جب میں نے ریوالور کا دباؤ ڈالا تو اس نے کار کی طرف قدم بڑھائے۔ دفعتاً کوٹھی کے گیٹ پر ایک کار آ کر رکی تو میں نے بے اختیار چونک کر گیٹ کی طرف دیکھا، تبھی رادھا زور سے چلّائی۔ ''بچاؤ...... بچاؤ...... گیٹ کود کر آ جاؤ۔ مجھے بچاؤ۔''

''الو کی پٹھی۔'' مجھے رادھا پر غصہ آ گیا۔ میں نے اسے چپ کرانے کی خاطر اس کے منہ پر ہاتھ رکھنا چاہا لیکن اس میرے پیٹ میں کہنی مار دی۔ ساتھ ہی اس نے ساڑی کا پلو میرے سر پر ڈال دیا جس سے میرا چہرہ چھپ گیا۔ ایک لمحے کے لیے میں حواس باختہ ہوا لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے ساڑی کا پلو اپنے چہرے سے ہٹایا۔ عین اسی لمحے رادھا نے مجھے دھکا دے دیا تھا۔ دھکا غیر متوقع تھا اس لیے میں الٹے قدموں لڑکھڑاتا ہوا فرش بوس ہوا۔ صد شکر کہ ریوالور میرے ہاتھ میں تھا۔ رادھا اسی کمرے کی طرف دوڑ گئی تھی جس میں سرنگ تھی۔ میں اٹھ کر اس کے پیچھے بھاگنا ہی چاہتا تھا کہ عین اسی لمحے گیٹ کے اوپر سے دو مسلح شخص چھلانگیں لگا کر آ گئے۔ ایک نے مجھ پر فائر جھونک دیا۔ خوش بختی سے گولی میرے سر کے بالوں کو چھو کر گزر گئی تھی۔

میں نے سنبھلتے ہی جوتی کی کار کی طرف چھلانگ لگا دی تھی۔ جیسے ہی میں نے چھلانگ لگائی تھی ان دونوں نے بیک وقت مجھ پر فائر جھونک دیئے تھے اور اللہ کے فضل و کرم سے میں گولی کا شکار ہونے سے بچ گیا تھا۔ کار کی اوٹ لیتے ہی میں نے ایک پر نشانہ تاک کر ٹریگر دبا دیا۔ گولی اس کی ٹانگ میں لگی تھی اور دلخراش چیخ مار کر وہیں فرش بوس ہو گیا تھا جبکہ دوسرے نے فرش پر گرنے والے انداز میں چھلانگ لگائی اور اٹھتے ساتھ ہی اس نے مجھ پر گولی چلا دی تھی۔

گولی کی آواز سے فضا مرتعش ہوئی۔ اس کے گولی چلانے سے پہلے ہی میں کار کی اوٹ میں ہو گیا تھا۔ گولی لان میں غائب ہو گئی تھی اور گولی چلانے والا اپنی حفاظت کے پیش نظر ستون کی آڑ میں ہو گیا تھا۔ میں نے اس پر گولی چلائی تھی جو ستون کو لگی تھی۔ اب ہم دونوں ہی وقفے سے وقفے سے ایک دوسرے پر گولیوں کا تبادلہ کر رہے تھے لیکن ہم دونوں میں سے کوئی بھی زخمی نہیں ہوا تھا۔ پھر جب میرا ریوالور گولیوں سے خالی ہو گیا تو وہ میرے لیے بے کار ہو گیا

تھا۔ میں نے ریوالور پھینک دیا۔ عین اسی لمحے ستون کے پیچھے چھپے شخص نے مجھ پر گولی چلا دی تھی۔ میں نے حتی الامکان بچنے کی کوشش کی تھی لیکن گولی میرے بازو کی کھال چھیلتی ہوئی دیوار میں پیوست ہوگئی تھی اور میرے منہ سے سسکاری سی نکل گئی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے گرم گرم سلاخ میرے بازو کے ساتھ لگائی گئی ہو۔ میں نے بے اختیار چھلی ہوئی جگہ پر ہاتھ رکھا تو میرے منہ سے ایک بار پھر سسکاری نکل گئی۔ میں فرش پر بیٹھ گیا۔ میرا ہاتھ خون سے رنگ گیا تھا۔ صد شکر کہ گولی میرے سینے یا سر میں نہیں لگی تھی ورنہ مجھے خالقِ حقیقی کے پاس پہنچنے میں زیادہ تاخیر نہ ہوتی۔ اللہ کو میری زندگی مقصود تھی اسی لیے اس نے مجھے بچا لیا تھا۔ یقیناً اللہ نے مجھ سے ابھی اور بھی بہت سے کام لینے تھے اسی لیے وہ مجھے ہر مشکل سے بچا رہا تھا۔

لمحہ بھر کے توقف کے بعد اس نے دوبارہ گولی چلائی تھی جو میرے سر کے بالوں کو چھو کر گزری تھی۔ میں تہی دست ہو چکا تھا اس لیے احتیاط کے تقاضوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے میں پوری طرح کار کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ ٹانگ پر گولی کھانے والا بہ دستور وہیں بیٹھا کراہ رہا تھا، البتہ اس کا ریوالور اسی کے پاس تھا اگر میں اس کا ریوالور حاصل کر لیتا تو دوسرے مسلح شخص سے مقابلہ کرنا آسان ہو جاتا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ کار سے قدرے فاصلے پر موجود تھا۔ میں نے فرش پر لیٹتے ہی دوسرے شخص کی نقل و حرکت چیک کی۔ وہ ستون کی آڑ سے نکل کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا کار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مجھے رادھا کی طرف سے بھی فکر تھی۔ اس نے کمرے میں جاتے ہی مجھے گھیرنے یا مارنے کے لیے مزید غنڈوں کی فوج طلب کر لی ہوگی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ خفیہ سرنگ کے راستے کوٹھی سے نکل گئی ہو۔ میرا وہاں رکنا فضول تھا میں ریوالور بردار پر قابو پانے کے بعد وہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔

مجھ سے ایک غلطی ہوئی تھی کہ جب میرے ریوالور کی گولیاں ختم ہوتی تھیں تو مجھے اسے پھینکنا نہیں چاہیے تھا۔ بہ وقت ضرورت وہ کام آسکتا تھا۔ میں نے نظر دوڑائی تو وہ کچھ ہی فاصلے پر پڑا تھا۔ اس تک رسائی حاصل کرنا ریوالور بردار کی گولیوں کا نشانہ بننے کے مترادف تھا۔ دفعتاً میری نظر بائیں طرف دیوار کے ساتھ ترتیب سے بڑے گملوں پر پڑی تو میرے دماغ میں ایک کوندا سا لپکا۔ ان گملوں میں چھوٹے بھی تھے اور بڑے بھی۔ فی الحال میں چھوٹے گملے سے کام چلانا چاہتا تھا۔ اگلے ہی پل میں نے ایک گملا اٹھایا اور پھرتی سے اٹھنے کے ساتھ ہی پوری قوت سے گملا ریوالور بردار پر پھینک دیا۔ شاید اسے میری اس حرکت کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ گملا اس کے سر پر لگا اور اچھل کر کار کے بونٹ پر گرا پھر لڑھک کر فرش بوس ہوگیا۔ گملا سر پر لگنے کے باعث ریوالور بردار کے منہ سے کراہ نکلی تھی۔ اس نے اپنے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ میں نے اس صورتِ حال سے پوری طرح فائدہ اٹھاتے ہوئے کار کی اوٹ سے نکلتے ہی اس پر جست لگا دی۔ میں نے ایک ریسلر کے انداز میں اپنا دایاں کندھا اس کے پیٹ میں مارا اور پھر ہم دونوں پختہ فرش پر گرے۔ اس کے منہ سے نکلنے والی چیخ بڑی ہی کریہہ آمیز تھی۔ تکلیف کے باعث اس کا منہ بھی کھل گیا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے ریوالور جھپٹا اور اٹھنے کے ساتھ ہی اس کی ٹانگ پر گولی چلا دی۔

گولی لگتے ہی اس نے ایک بار پھر دلخراش چیخ ماری اور ٹانگ پکڑ کر مینڈک کی طرح پھدکنے لگا۔ پہلے شخص کے ہاتھ میں ریوالور نہیں تھا شاید جب وہ ٹانگ پر گولی کھانے کے بعد گرا تھا تو اس کے ہاتھ سے ریوالور نکل کر تاریکی میں جا گرا تھا۔ مجھے رادھا کا خیال آیا تو میں ریوالور تھامے کمرے کی طرف دوڑا۔ اندر سے دروازہ بند تھا۔ میں نے تین چار بار کندھے مار مار کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ دروازہ مضبوط تھا کندھوں کی ٹکروں سے نہ ٹوٹا۔ بادلِ نخواستہ میں نے ریوالور کی نال لاک پر رکھ کر ٹریگر دبایا تو لاک ٹوٹ گیا۔ میں نے ہینڈل گھما کر دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو کر غائرانہ نظروں سے دیکھا۔ رادھا موجود نہیں تھی۔ واش روم کا دروازہ بند تھا۔ میں نے واش روم کے لاک کے ساتھ بھی وہی کیا۔ چونکہ مجھے سرنگ میں جانے کا راستہ معلوم ہو چکا تھا اس لیے میں نے ریوالور پینٹ کی بیلٹ میں اڑسا اور سرنگ کا راستہ کھولنے لگا۔

سرنگ میں داخل ہونے سے پہلے میں نے لائٹ جلا دی تھی۔ پھر میں نے اندر داخل ہوتے ہی عقب سے دروازہ بند کیا اور ریوالور تھامے دوڑنے لگا۔ وہ سرنگ سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی آگے جا رہی تھی۔ سرنگ زیادہ طویل نہ تھی۔ اس کے اختتام پر لوہے کا ایک دروازہ تھا جو بند ہونے کے باعث میرا منہ چڑا رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ رادھا سرنگ سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ میں نے غصے کی شدت سے ریوالور والا ہاتھ دیوار پر مارا تھا۔ دیپک کے بعد وہی رتن کمار تک پہنچانے کا ذریعہ بن سکتی تھی۔

میں واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ ممکن ہے دیپک کے مزید ہرکارے پہنچ چکے ہوں۔ میں نے سرنگ سے باہر جانے کا فیصلہ کیا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ لوہے کے دروازے پر عام سی کنڈی لگی ہوئی تھی جو عام طور پر گھر کے دروازوں پر ہوتی ہے۔ یقیناً دوسری طرف بھی وہی کنڈی تھی اسی لیے اسے گولی سے توڑنا ناممکن تھا۔ میرے لیے واپس جانے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ شاید مشیت ایزدی یہی تھی۔ میں اپنے زخمی بازو کو تھامے مڑ کر دوڑتا ہوا سرنگ سے نکل کر پہلے واش روم، پھر کمرے میں پہنچا، کمرے سے باہر نکلا ہی تھا مجھے چند سائے گیٹ سے کودتے ہوئے دکھائی دیئے۔ میرے پاس وقت نہیں تھا کہ میں ان کی تعداد گنتا لیکن میرا قیاس سچ ثابت ہوا تھا۔ رادھا نے میرا خانہ خراب کرنے کے لیے مزید ہرکارے منگوا لیے تھے۔ یقیناً وہ بھی مسلح تھے۔ میں نے چھپنے کے لیے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں پھر مجھے کچھ نہ سوجھا تو میں جلدی سے ایک اور کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور پھر اندر سے بند کر دیا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔

میں لائٹ جلا کر آنے والے ہرکاروں کو اس کمرے کی طرف متوجہ نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے دم سادھے دروازے کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا رہا۔ قدموں کے دوڑنے کی آوازیں سنائی دیں، پھر آوازیں تھمیں اور ان کی جگہ انسانی آوازوں نے لے لیں۔

''اوہو...... کیا تم دونوں زخمی ہو؟'' ایک نے شاید زخمیوں سے دریافت کیا تھا۔

''ہاں۔'' ایک زخمی نے جواباً کراہتے ہوئے کہا۔ ''اس راکسس نے ہم دونوں کی ٹانگوں پر گولیاں ماری ہیں۔''

''کہاں ہے وہ؟ اور رادھا جی؟''

''رادھا جی تو شاید نکل گئی ہیں لیکن وہ ابھی اِدھر ہی ہے۔'' اسی زخمی کی آواز سنائی دی۔

''پوری کوٹھی میں پھیل جاؤ اور اسے تلاش کرو۔'' لیڈر نے حکم دیتے ہوئے کہا۔ ''دیپک باؤ کا آرڈر ہے، اسے دیکھتے ہی گولیوں سے اڑا دوں۔ کوئی رعایت نہیں کرنی۔''

''ٹھیک ہے۔'' ملی جلی آوازیں سنائی دی تھیں پھر لمحہ بھر کے بعد دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں گونجیں۔ شاید وہ کوٹھی میں پھیل رہے تھے۔ میں دروازے کے ساتھ لگا موجودہ صورت حال پر غور کر رہا تھا۔ دروازے کے قریب دیوار پر ایک سوئچ بورڈ لگا ہوا تھا جس پر ایک بٹن تھا یقیناً وہ کمرے میں لائٹ جلانے کے لیے تھا جیسے عام طور پر ہر گھر میں دروازے کے قریب دیوار پر لگا ہوتا ہے۔ اس کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ کمرے میں داخل ہوتے ہی لائٹ آسانی سے جلائی جا سکتی ہے۔ میں نے لائٹ نہیں جلائی تھی کیونکہ باہر موجود ہرکارے لائٹ جلتی دیکھ کر اس طرف متوجہ ہو سکتے تھے۔ کچھ دیر کے بعد میری آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہو گئی تھیں۔ ایک کھڑکی باہر کی طرف کھلتی تھی جس پر دبیز پردہ پڑا ہوا تھا۔ کچھ سوچ کر میں کھڑکی کی طرف بڑھا۔ زمین پر بھی شاید دبیز قالین تھا کیونکہ میرے چلنے سے آواز پیدا نہیں ہوئی تھی۔ میں تھوڑا سا پردہ ہٹایا تو روشنی کا ہلکا سا سایہ دھندلے شیشے کو کراس کر کے اندر کود آیا۔ میں نے اس ہلکی سی روشنی میں کمرے کا جائزہ لیا۔ اس کمرے میں ایک چبوترے پر مورتی رکھی ہوئی تھی۔ اس چبوترے کے پیچھے اتنی جگہ ضرور...... تھی کہ اگر کوئی اس کے پیچھے چھپنا چاہتا تو آسانی سے چھپ سکتا تھا۔ بائیں دیوار پر ایک الماری تھی جس کے پٹ بند تھے۔ شاید وہ کمرا پوجا پاٹ کے لیے مختص تھا۔ میں مورتی کو دیکھ رہا تھا کہ دفعتاً مجھے چبوترے کے پیچھے کچھ محسوس ہوا۔ یقیناً چبوترے کے پیچھے کوئی چھپا ہوا تھا۔ میرے دماغ میں یکدم رادھا کا خیال ابھرا۔

اوہو...... کہیں چبوترے کے پیچھے رادھا تو نہیں چھپی ہوئی۔ میں نے چونکتے ہوئے سوچا۔ اس سوچ کے دماغ میں آتے ہی میرے اعصاب تن گئے اور میں نے ریوالور والا سیدھا کیا اور پھر دھیرے دھیرے چلتا ہوا چبوترے کی طرف بڑھا۔ چبوترے کے پیچھے پہنچ کر میں نے کھڑکی سے آنے والی روشنی میں غور سے دیکھا تو میرے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

وہ رادھا ہی تھی جو اس انداز میں دبکی ہوئی تھی کہ اس نے اپنے سر مورتی کے پیچھے خالی جگہ پر دیا ہوا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہاں گٹھڑی پڑی ہو۔ میں نے رادھا کو اس کی ساڑی کی بدولت پہچان لیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ رادھا سرنگ کے راستے فرار نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کمرے میں آ کر چھپ گئی تھی لیکن سوال یہ تھا کہ سرنگ کا دروازہ دوسری طرف سے کس نے بند کیا ہوگا؟ بہرکیف، میرے پاس اس جھنجٹ کے بارے میں سوچنے کا وقت بالکل بھی نہیں تھا۔ میں نے غراتے مگر دھیمے لہجے میں کہا رادھا سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''رادھا جی! خاموشی سے چبوترے کے پیچھے سے نکلنا پسند کرو گی یا میں......'' میں نے جان بوجھ کر بات ادھوری

چھوڑ دی تھی۔
یقیناً رادھا بھی سمجھ گئی تھی کہ اب اس کا چھپنا بے کار ہے کیونکہ میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ سیدھی ہوئی اور چبوترے کے پیچھے سے نکل آئی۔ مدھم روشنی میں اس کا سانولا رنگ چمک رہا تھا اور غصے کے تاثرات بھی اس کے چہرے پر پھیلے ہوئے واضح دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے ریوالور کا رخ اسی کی طرف کیا ہوا تھا۔
وہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور تنبیہی لہجے میں بولا۔ ”منہ سے کوئی آواز نہ نکالنا ورنہ تمہارے لیے اچھا نہیں ہوگا۔“
اس نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے لیکن چہرے پر غصہ ہنوز موجود تھا۔ رادھا سے غلطی ہوئی تھی اس نے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ لاک نہیں کیا تھا۔ انسان جب حواس باختہ ہو جائے تو پھر اس کی عقل بھی خبط ہو جاتی ہے۔ یقیناً یہی حال رادھا کے ساتھ ہوا تھا۔ حواس باختگی میں وہ دروازہ لاک کرنا بھول گئی تھی۔ جیسا کہ اس نے اس کا اعتراف بعد میں کیا تھا۔ دفعتاً باہر دوڑنے کی آوازیں گونجیں۔ میں چونکا ضرور تھا لیکن میری نظریں رادھا پر جمی ہوئی تھیں کیونکہ اس سے کسی بھی حرکت کی توقع کی جا سکتی تھی تاہم کئی لمحے گزر گئے اس نے کوئی حرکت نہ کی۔ شاید ریوالور کا خوف تھا کہ وہ جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی مجھے گھورتی رہی تھی۔
دفعتاً باہر سے آواز سنائی دی۔ ”ہم نے پوری کوٹھی میں دیکھ لیا ہے وہ کہیں بھی نہیں ہے۔“
”شاید وہ فرار ہو گیا ہے۔“ دوسری آواز نے کہا۔
”وہ اتنی جلدی کیسے فرار ہو سکتا ہے۔“ شاید یہ آواز اسی لیڈر کی تھی جو احکامات دے رہا تھا۔
”ارے اس کمرے کا دروازہ بند ہے۔ کہیں وہ اسی کمرے میں چھپا ہوا نہ ہو۔“ یہ آواز لیڈر کے دوسرے ساتھی کی تھی۔ شاید اس نے اسی کمرے کی نشان دہی کی تھی جس کمرے میں، میں اور رادھا موجود تھے۔
”یہ کمرا تو پوجا پاٹ کے لیے مخصوص ہے۔“ لیڈر نے بتایا۔ ”اس کی چابی رادھا دیدی کے پاس ہوتی ہے لیکن وہ بھی چلی گئی ہیں۔“
”ہو سکتا ہے وہ اسی کمرے میں چھپا ہوا ہو۔“ یہ کسی اور مرد کی آواز تھی۔ جس نے اپنا خیال ظاہر کیا تھا۔
”لیکن ہم دروازہ نہیں توڑ سکتے۔“ لیڈر نے کہا۔ ”میں کہہ تو رہا ہوں کہ اس کی چابی دیدی رادھا کے پاس ہوتی ہے۔ عقل کے اندھو، جب یہ دروازہ لاک ہے تو وہ اندر کیسے داخل ہو سکتا ہے؟“
”صحیح کہہ رہے ہو۔“ ایک آواز سنائی دی۔
دفعتاً کسی نے چیخ کر کہا۔ ”میں نے کسی کو اس کمرے میں جاتے دیکھا تھا۔“
میرے دل کی دھڑکن بڑھ چکی تھی۔
”کس کو؟ وہی تھا یا کوئی اور......“ لیڈر کی چونکتی ہوئی آواز سنائی دی۔
”یہ مجھے نہیں پتا۔“ وہ بولا۔ ”اندھیرے میں مجھے صاف نہیں دکھا۔“
”پھر اب کیا کریں۔“ یہ دوسرے نے پوچھا۔
”میں دیکھتا ہوں۔“ لیڈر کی آواز گونجی۔ پھر شاید وہ دروازے کے پاس آیا تھا، دروازہ بجاتے ہوئے اس نے پوچھا۔ ”اندر کون ہے؟“
میں نے رادھا سے دھیمی آواز میں کہا۔ ”رادھا! اسے بتاؤ کہ اندر تم ہو، خبردار، اگر تم نے ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی، تو تم جان سے بھی جاؤ گی۔“ آخر میں میرا لہجہ دھمکی آمیز ہو گیا تھا۔
رادھا میری بات کا مطلب سمجھ گئی تھی تبھی وہ سہمے ہوئے انداز میں گویا ہوئی۔ ”میں...... میں کچھ نہیں کروں گی۔“
میں نے ہنکاری بھری اور اسے دروازے کی طرف بڑھنے کا اشارہ کیا۔ وہ مجھ پر نگاہِ کج ڈالتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی تو میں بھی ریوالور کی نال اس کی پشت سے لگائے اس کے پیچھے پیچھے بڑھا۔ مجھے اُمید تھی کہ وہ موت کے خوف سے باہر موجود لوگوں کو متوجہ نہیں کرے گی۔ وہ وہی کرے گی جیسا میں نے کہا تھا۔
میرے اشارے پر اس نے دروازے کے پاس پہنچ کر چٹخنی نیچے گرائی اور ایک پٹ کھول کر کہنے لگی۔ ”وکرم! اندر میں ہوں۔“
”اوہو...... رادھا دیدی۔ کیا وہ بھی اندر ہی ہے؟“ لیڈر، جس کا نام رادھا نے وکرم لیا تھا، نے بے چینی سے پوچھا۔
”بے وقوف! اگر وہ اندر ہوتا تو کیا میں دروازہ کھول کر بتاتی۔“ وہ طنزیہ لہجے میں کہنے لگی۔ لمحاتی توقف کے بعد وہ مزید کہنے لگی۔ ”اگر وہ کوٹھی میں نہیں ہے تو پھر بھاگ گیا ہو گا۔“
رادھا نے عقل مندی کا ثبوت دیا تھا۔ شاید اس نے میرا

رویہ دیکھ لیا تھا جب میں نے بے رحمی، سفاکی اور سنگدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جوتی کو بلا تامل گولی مار کر موت کی نیند سلا دیا تھا۔

"ہم نے کوٹھی کا ایک ایک چپہ چھان مارا ہے دیدی۔" وکرم نے جواب میں کہا۔ "لیکن وہ کوٹھی میں نہیں ہے، صرف یہی کمرا بچا تھا اس لیے......"

"پھر وہ فرار ہو گیا ہوگا۔" رادھا نے تنبیہی لہجے میں کہا۔ "تم سب باہر جاؤ اور اسے تلاش کرو۔ وہ زخمی ہے اور زیادہ دور نہیں گیا ہوگا اگر وہ نہ پکڑا گیا تو تم میں سے کسی کی خیر نہیں ہوگی۔ جاؤ۔"

"ٹھیک ہے دیدی۔" وکرم نے کہا۔ "ہم اسے باہر تلاش کرتے ہیں۔ آپ چنتا مت کریں، ہم اس کی لاش ہی لے کر آئیں گے۔"

چند لمحوں کے بعد دوڑتے قدموں کی آوازیں گونجی تو رادھا نے میرے اشارے پر دروازہ بند کر دیا۔ میں نے اطمینان کی سانس لی اور رادھا کو ایک سائیڈ پر کھڑے ہونے کا اشارہ کیا۔ اس نے بلا چوں چرا میرے حکم کی تعمیل کی۔ میں اس کی طرف سے پوری طرح ہوشیار تھا کیونکہ اس سے کچھ بعید نہیں تھا۔ وہ قابل اعتبار نہیں تھی۔ مجھے تلاش کرنے والا وکرم اپنے ساتھیوں کو کوٹھی سے باہر لے گیا تھا۔ میں نے دروازے کے ساتھ والی دیوار پر بٹن دیکھا تو اسے پریس کر دیا۔ کمرے میں لائٹ پھیل گئی اور وہ روز روشن کی طرح روشن ہو گیا۔

"تم بچ کر کہیں نہیں جا سکتے۔" رادھا نے دبی دبی آواز میں کہا۔ "تم بہت بری طرح مارے جاؤ گے۔ اگر میں وکرم کو کہہ دیتی کہ تم میرے ساتھ اندر موجود ہو تو وہ اندر داخل ہونے میں تاخیر نہ کرتے۔"

"پھر میرے ساتھ تم بھی ماری جاتی۔" میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم نے اس لیے ایسا نہیں کیا کہ تم جانتی تھی کہ میں تمہیں مارنے میں دیر نہیں کروں گا۔"

جواباً وہ مجھ پر نظر قہر و غضب ڈال کر دانت پیسنے لگی۔ یقیناً اس کے اندر ہلچل مچی ہوئی تھی اور وہ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے کچھ نہ کچھ سوچ رہی تھی۔

"کیا سوچ رہی ہو رادھا جی؟" میں نے کہا پھر میں نے خود ہی متبسم لہجے میں اس کا جواب دے دیا۔ "تم یقیناً مجھے مارنے کا سوچ رہی ہوگی۔"

جواباً اس نے خاموشی اختیار کیے رکھی۔ میں بھی رادھا کو ساتھ لے کر وہاں سے نکلنے کا سوچ رہا تھا لیکن ابھی خطرہ ٹلا نہیں تھا۔ وکرم اور اس کے ساتھی باہر موجود تھے۔ ان کے جانے کے بعد ہی وہاں سے نکلا جا سکتا تھا۔ میرا لباس بھی خراب ہو چکا تھا میں اس لباس سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا لیکن ابھی موقع نہیں تھا اس لیے سوچا تھا کہ جب دیال سنگھ سے بات ہوگی تو اس سے نیا سوٹ منگوالوں گا۔

"ہم نے یہاں سے نکلنا ہے۔" دفعتاً میں نے رادھا سے کہا۔

"ہم نے...... کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ ترش روئی سے مستفسر ہوئی۔

"یعنی تم بھی میرے ساتھ ہی چلو گی رادھا جی۔" میں نے صراحت سے کہا۔

"میں تمہارے ساتھ کیوں جاؤں گی؟"

"جانا پڑے گا۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "تمہاری زندگی کی بقاء اسی میں ہے کہ تم میرے ساتھ تعاون کرتی رہو۔"

"میں تمہارے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گی۔" اس نے جیسے ٹھان لی تھی کہ وہ میرے ساتھ تعاون نہیں کرے گی۔

"پھر مجبوراً مجھے تمہیں مارنا پڑے گا۔" میں نے آخری حربے کے طور پر کہا۔ "اچھی طرح سوچ لو، میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

شاید وہ تلملا کر رہ گئی تھی کیونکہ اس کے چہرے پر غصے کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ لمحہ بھر کے بعد وہ بولی۔ "تم مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟"

"فی الحال اس علاقے سے تو نکلیں۔" میں نے کہا۔ "پھر دیکھیں گے کہ ہم کہاں جا سکتے ہیں۔"

"تم مجھے اپنے ساتھ کیوں لے جانا چاہتے ہو؟" اس نے استفسار کیا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے لہرائے تھے۔

"تم مجھے پسند آگئی ہو۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"کیا بکواس کر رہے ہو؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں رادھا جی۔" میں نے بہ دستور مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم مجھے بہت اچھی لگی ہو۔"

"اگر تم میرے ساتھ بلاتکار کرنے کا ارادہ رکھتے ہو تو یہ تمہاری بھول ہے۔" رادھا تند لہجے میں بولی۔ "میں جان تو دے دوں گی لیکن تمہیں اپنی عزت نہیں لوٹنے دوں گی۔"

اس کی بات پر میں طنزیہ انداز ہنس دیا۔ "ارے رادھا

جی، کیوں ایسا سوچ رہی ہو، میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔کیا میرے چہرے پر لکھا ہوا ہے کہ میں اپرادھی ہوں۔''

''کسی کے چہرے پر نہیں لکھا ہوتا۔''

''سچ کہہ رہی ہو رادھا جی۔'' میں نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔''کسی کے چہرے پر نہیں لکھا ہوتا کہ وہ پوتر ہے یا اپرادھی۔ تمہارے چہرے پر بھی نہیں لکھا ہوا۔ جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا تو یہی سمجھا تھا کہ تم معصوم، پوتر اور اچھی عورت ہوگی لیکن دیکھ لو تم نے میرے ساتھ کیا کیا تھا۔کوئی نہیں جانتا اس معصوم چہرے کے پیچھے ایک بھیانک اور روسیاہی چہرہ چھپا ہوا ہے، لوگ جسے پوتر اور نیک دل سمجھتے ہیں وہی ان کی بیٹیوں کی عزتوں کے لٹیرے ہیں۔تم لوگ دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے خود کو بے حد پوتر اور نیک ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہو لیکن اگر یہی لوگ تمہارا اصل چہرہ دیکھ لیں تو شاید تھوکنا بھی پسند نہ کریں۔''

میں نے اس پر طنز کیا تھا۔جواباً وہ مجھے کاٹ دار نظروں سے گھور کر رہ گئی۔اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا اس لیے وہ خاموش ہی رہی تھی۔

''بہر کیف، اب میری بات غور سے سنو۔'' لمحاتی توقف کے بعد میں نے مزید کہا۔''ابھی وکرم آئے گا اور بتائے گا کہ انہیں میں کہیں بھی نہیں ملا۔تم انہیں واپس جانے کا کہہ دینا۔میری بات سمجھ رہی ہو نا؟''

''ہاں سمجھ گئی ہوں۔''

''اچھی بات ہے۔'' میں نے ٹھنڈی سانس اپنے اندر انڈیلی۔''غلطی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اور اپنے چہیتے بھائی دیپک کو بھی فون کر کے میرے بارے میں بتا دینا کہ وہ بھاگ گیا ہے اور تم کہیں اور شفٹ ہو رہی ہو۔''

''وہ پوچھے گا کہ کہاں جا رہی ہو تو تب کیا بتاؤں؟'' وہ ہونٹ بھینچتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''کچھ بھی کہہ دینا۔'' میں نے کہا۔''ویسے بھی تم ایسے روسیاہ لوگوں کے ایک نہیں، ایک سو ایک ٹھکانے ہوتے ہیں۔''

''تم کتے کی موت مرو گے۔''

''فی الحال تو تم میرے رحم و کرم پر ہو۔'' میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔''اگر کہو تو تمہیں کتیا کی موت مار دوں؟''

جواباً اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔یقیناً وہ اندر سے مشتعل ہو رہی تھی لیکن ظاہر ہے وہ کچھ کر نہیں سکتی تھی۔وہ جوتی کا انجام دیکھ چکی تھی اسی لیے مجھے اُمید تھی کہ وہ ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گی جس سے اسے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ وکرم اپنے ساتھیوں کے ساتھ آ گیا۔اس نے دروازہ بجاتے ہوئے رادھا کو آواز دی۔

''رادھا دیدی......''

میں نے رادھا کو اشارہ کیا کہ وہ میری ہدایات پر عمل کرنا شروع کر دے۔اس نے مجھے تیکھے چتونوں سے دیکھتے ہوئے دروازے کا لاک کھولا اور ایک پٹ کھول کر باہر دیکھنے لگی۔

''کیا وہ ملا؟'' رادھا نے تفتیشی انداز میں پوچھا۔

''نہیں دیدی۔'' وکرم نے نفی میں کہا۔''ہم نے ہر جگہ اسے تلاش کیا ہے، کالونی کا ایک ایک چپہ دیکھا ہے لیکن شاید وہ فرار ہو گیا ہے۔''

''ہم...'' رادھا نے ہنکاری بھری۔

''اب کیا حکم ہے دیدی؟''

''تم اس طرح کرو کہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ واپس چلے جاؤ۔'' رادھا نے جواباً کہا۔''جب مجھے ضرورت پڑی تو تمہیں بلا لوں گی۔''

''کیا آپ اکیلی رہیں گی دیدی؟'' وکرم کے لہجے میں تشویش کی رمق شامل تھی۔

''نہیں۔'' رادھا کہنے لگی۔''تھوڑی دیر تک میں بھی دیپک کے پاس جا رہی ہوں۔''

''ٹھیک ہے دیدی۔'' وکرم نے کہا اور وہ مشورہ دینے والے انداز میں دوبارہ گویا ہوا۔''اگر آپ کہیں تو میں آپ کو چھوڑ آؤں، کہیں وہ راکسس......''

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے، میں خود چلی جاؤں گی۔'' رادھا نے اسے ٹوکا۔''بس تم اب جاؤ۔''

''ٹھیک ہے دیدی۔''

وکرم کے جانے کے بعد رادھا نے دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا دی اور گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔تھوڑی دیر کے بعد قدموں کی آوازیں معدوم ہو گئیں۔میری نظریں رادھا کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جب وہ وکرم سے بات کر رہی تھی۔میں اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا کہ کہیں وہ اشارتاً وکرم کو بتا دے کہ راکسس اسی کے کمرے

میں موجود ہے اور میں اس کے رحم و کرم پر ہوں، لیکن اس نے وکرم کو کسی قسم کا اشارہ نہیں دیا تھا اور میں مطمئن ہو گیا تھا۔

''میں نے انہیں واپس بھیج دیا ہے۔'' رادھا نے گویا اطلاعاً کہا۔

''ہم بھی روانہ ہوتے ہیں۔''

''لیکن کہاں؟''

''فی الحال یہاں سے نکلو، پھر بتاتا ہوں۔'' میں نے تنبیہی انداز میں کہا۔ ''لیکن ایک بار پھر کہہ رہا ہوں، اگر تم نے کوئی چالاکی یا ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو میں تمہیں مارنے میں کوئی رعایت نہیں کروں گا۔''

میرے لہجے کی سرد مہری ہی تھی کہ میں نے رادھا کے چہرے پر خوف کے تاثرات ابھرتے ہوئے دیکھے تھے۔ اس نے کچھ کہنے کو لب وا کیے ہی تھے کہ پھر اس نے بھینچ لیے۔ وہ کشمکش کا شکار تھی اور لیت و لعل سے کام لے رہی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ کسی کا انتظار کر رہی ہو۔ وہ ایک کائیاں اور خطرناک عورت تھی۔ پل پل چہرے بدلنے والی۔

''میرے پاس وقت نہیں ہے مس رادھا۔'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر تم مجھے یہاں سے نکال کر نہیں لے جا سکتی تو پھر مجھے تمہارا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میں جیسے تیسے کر کے نکل ہی جاؤں گا لیکن تمہیں اپنی جان سے ہاتھ دھونا ہی پڑے گا۔'' کہنے کے ساتھ ہی میں نے ریوالور پر ہلکا سا دباؤ ڈالا تو ہلکی سی آواز ابھری۔ چونکہ میری آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہو چکی تھیں اس لیے رادھا کے چہرے پر ابھرے خوف کے تاثرات واضح دکھائی دے رہے تھے۔

''رک...... رک جاؤ۔'' وہ منمنائی۔ ''اچھا ٹھیک ہے، میں تمہیں اس کوٹھی سے نکالتی ہوں۔''

''جلدی کرو۔'' میں نے دبنگ لہجے میں کہا۔ گو میرے زخمی بازو سے خون نکلنا بند ہو گیا تھا لیکن ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ میں جلد از جلد زخمی بازو کی ڈریسنگ کرنا چاہتا تھا ورنہ بارود کا زہر بازو میں پھیلنے کا خطرہ تھا۔

''ہمیں اُسی سرنگ سے جانا ہوگا۔'' رادھا نے کہا۔

''لیکن اس سرنگ کا دروازہ دوسری طرف سے بند ہے۔'' میں نے گویا انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ ''پہلے میں نے بھی اسی سرنگ سے نکلنے کی کوشش کی تھی۔''

''اس کا دروازہ آٹو میٹک کھلتا ہے۔'' رادھا نے مجھے حیران کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس کا میکنزم معلوم ہے۔''

میں نے ہنکاری بھرنے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ پھر میں نے اسے ریوالور کی زد پر رکھتے ہوئے دروازہ کھولا اور ہم دونوں یکے بعد دیگرے باہر نکلے۔ باہر زخمی شخص بہ دستور موجود تھے اور فرش پر لیٹے ہوئے تھے۔ شاید اس کی حالت خراب ہو چکی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی ایک نے چیختے ہوئے کہا۔

''ارے یہ وہی ہے، وکرم...... وکرم۔''

میں نے اس کے چیخنے کی مطلق پروا نہ کی اور رادھا کو لیے اس کے کمرے میں پہنچ گیا۔ میں اندر سے دروازہ بند کرنا نہیں بھولا تھا۔ جوتی کی لاش پڑی ہوئی تھی اور اس کی پیشانی سے نکلنے والا خون بھوؤں کے اوپر جمنے کے ساتھ ساتھ قالین میں بھی جذب ہو چکا تھا جس سے قالین کا وہ حصہ ملگجا ہو چکا تھا۔ بہرکیف، وہ سرنگ میں داخل ہو گئی۔ میں سرنگ کا عقبی دروازہ بھی بند کرنا نہیں بھولا تھا اسی وجہ سے ہم دونوں کے درمیان فاصلہ بڑھ گیا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر میں نہیں بچوں گا تو رادھا کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبوں گا۔

سرنگ میں لائٹ پہلے ہی آن تھی۔ اختتامی دروازے پر پہنچے تو رادھا نے دروازے کے کونے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ اگلے ہی پل دروازہ بے آواز انداز میں گھوم کر کھل گیا اور دوسری طرف بھی سرنگ دکھائی دی۔

میں حیرت بھری نظروں سے دوسری طرف کی سرنگ دیکھ رہا تھا۔ رادھا مجھے دیکھے بغیر ہی سرنگ میں داخل ہو گئی۔ میں اس سے قدرے فاصلے پر موجود تھا۔ میں ایک بار پھر رادھا کی چالاکی کا شکار ہو گیا تھا۔ سرنگ میں داخل ہوتے ہی اس نے دائیں دیوار پر ہاتھ مارا تھا۔ اگلے ہی پل دروازہ گھومنے لگا۔ میں بے اختیار چونکا۔ میں نے جست لگائی لیکن میرے پہنچنے سے پہلے ہی دروازہ بند ہو گیا تھا اور میں دانت پیسنے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکا۔ فوری طور پر میرے ذہن میں آیا تو میں نے اس جگہ ہاتھ مارا جس پر رادھا نے ہاتھ مار کر دروازہ کھولا تھا لیکن میری کوشش رائیگاں گئی۔ ہاتھ مارنے کے باوجود دروازہ نہ کھلا تو میں نے جھنجلاہٹ بھرے انداز میں بند دروازے پر مکا جڑ دیا۔ یہ میرے اندر کا غصہ تھا۔

''سچ کہتے ہیں کہ عورت کو سمجھنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔'' میں زیر لب بڑبڑایا۔ رادھا میری سوچ سے بھی زیادہ تیز طرار اور چالاک نکلی تھی۔ کتنی آسانی سے اس نے مجھے مات دے دی تھی۔ وہ ظاہر یوں کر رہی تھی جیسے میرے

دام جال میں آ گئی ہو۔ میرے لیے وہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کیا پتا رادھا کوئی اور چال چلے اور میں اس سرنگ میں پھنس جاؤں۔ میرے لیے وہاں سے جلدی نکلنا ضروری ہو گیا تھا۔

میں نے دو تین بار اسی جگہ پر ہاتھ مارا تھا جہاں سے دروازہ کھلنے کا میکنزم تھا لیکن شاید رادھا نے میکنزم جام کر دیا تھا۔ میں واپس مڑا اور تقریباً دوڑتا ہوا سرنگ کے دروازے پر پہنچا۔ میں نے بڑی عجلت میں دروازہ کھولا اور واش روم سے ہوتا ہوا کمرے میں پہنچا۔ میرے لیے اس کوٹھی میں رکنا باعثِ خطر تھا اس لیے میں باہر نکل کر گیٹ کی طرف دوڑا۔ زخمی نے مجھے دیکھا تو وہ دوبارہ چلایا۔ ''وکرم...... وہ باہر جا رہا ہے۔''

وہ مسلسل چیخ چیخ کر وکرم کو متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وکرم اپنے ساتھیوں کو لے کر وہاں سے جا چکا تھا لیکن یہ میری خام خیالی ثابت ہوئی تھی۔ مین گیٹ کا ذیلی دروازہ کھول کر میں باہر نکلا ہی تھا کہ مجھے عقب سے دوڑنے کی آوازیں سنائی دیں۔ ساتھ ہی ٹِز کی آواز کے ساتھ ایک گولی مین گیٹ میں سوراخ کرتی ہوئی کہیں نکل گئی اور میں بال بال بچ گیا تھا۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ عقب میں آنے والا وکرم اور اس کے ساتھی تھے یا کوئی اور...... بہرکیف سامنے دکھائی دینے والی جھاڑ جھنکاڑ کی طرف میں نے دوڑ لگا دی۔ ان کے کوٹھی سے باہر آنے سے پہلے ہی میں جھاڑ جھنکاڑ کی طرف چھلانگ لگا چکا تھا۔ میں جھاڑیوں میں پہلو کے بل گرا تو میرے منہ سے کراہیں خارج ہوئیں، شاید کچھ کانٹے میرے وجود میں پیوست ہو گئے تھے۔ ساتھ ہی میرے ہاتھ سے ریوالور نکل کر جھاڑیوں میں کھو گیا۔ میں کانٹوں کی پروا نہ کرتے ہوئے کہنیوں کے بل رینگتا ہوا جھاڑیاں کراس کرنے لگا۔ دفعتاً میرے کانوں میں وکرم کی آواز پڑی۔ وہ اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا۔ ''تم ادھر جاؤ، تم ادھر جاؤ۔ وہ یہیں کہیں چھپا ہوا ہے۔ اسے جندہ (زندہ) نہیں بچنا چاہیے ورنہ رادھا دیدی ہماری کھال اتار لیں گی۔''

''تم چنتا مت کرو۔ ہم اس کی لاش ہی لے کر آئیں گے۔'' ایک ساتھی کی آواز گونجی۔ صد شکر کہ جھاڑیوں میں رینگنے کے دوران آوازیں پیدا نہیں ہوئی تھیں ورنہ وکرم کا جھاڑ جھنکاڑ کی طرف متوجہ ہو جانا یقینی امر تھا۔ میں نے چند لمحوں کے لیے رینگنا ترک کر دیا تھا تاکہ وکرم اور اس کے ساتھی تتر بتر ہوں تو میں آگے بڑھوں۔ کانٹے لگنے کے باعث میرے جسم سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ کچھ کانٹے تو میں نے وہیں لیٹے لیٹے ہی نکال دیئے تھے جو رہ گئے تھے وہ میں نے باہر نکال کر نکالنے تھے۔

چند ثانیے کے بعد جب مجھے یقین ہو گیا کہ وکرم اور اس کے ساتھی میری تلاش میں اِدھر اُدھر پھیل گئے ہیں تو میں نے آہستہ آہستہ دوبارہ آگے کی طرف رینگنا شروع کر دیا۔ دوسری طرف ایک پختہ دیوار تھی جو شاید کسی کوٹھی کی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور غیر معتدل سانس کو ہموار کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ دو سائے میرے سامنے سے گزر گئے۔ میں تہی دست ہو گیا تھا اور میرے دشمنوں کے پاس ہتھیار تھے اس لیے مجھے سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا تھا۔

شاید رات کا آخری پہر تھا۔ جھاڑیوں میں جھینگر اپنے اپنے وائلن بجانے میں مگن تھے جن کی آوازوں سے میری سماعت کو کچھ نقصان نہیں پہنچ رہا تھا۔ میں چند لمحے وائلنوں کی آوازوں سے محظوظ ہوتا رہا پھر موجودہ صورتِ حال پر غور وفکر کرنے لگا۔ اب جو مسئلہ درپیش تھا وہ وہاں سے نکلنے کا تھا کیونکہ دیپک کی کوٹھی عین جھاڑیوں کے سامنے تھی۔ اگر میں جھاڑیوں سے نکلتا تو عین ممکن تھا کسی کی نظر مجھ پر پڑ جاتی اور پھر انہوں نے مجھے مارنے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا تھا۔ جس کوٹھی کی دیوار کے ساتھ میں چھپکلی کی طرح چپک کر بیٹھا تھا اس کوٹھی کی دیوار کے ساتھ ہی ایک گلی تھی لیکن فاصلہ خاصہ زیادہ تھا اس لیے جھاڑیوں میں رینگ کر جانے کے باعث بھی کانٹے چبھنے کا خدشہ تھا، علاوہ ازیں اگر سانپ، بچھو یا کوئی اور موذی بلا چھپی ہوئی تو اس کے ڈسنے کا بھی خطرہ تھا۔ میں ایک جال سے نکل کر دوسرے جال میں بری طرح پھنس چکا تھا۔

کوٹھی کی دیوار بھی زیادہ بلند نہیں تھی۔ میرے دماغ میں فوراً خیال آیا کہ مجھے دیوار کود کر کوٹھی میں جانا چاہیے پھر میں دوسری طرف گلی کی طرف والی دیوار کود کر وہاں سے نکل جاؤں گا۔ یہی بہتر راستہ تھا۔ اس کالونی میں مسلمان اور ہندو دونوں برادریوں کے لوگ رہ رہے تھے۔ اب یہ معلوم نہیں تھا کہ میں جس کوٹھی میں کودنے کے لیے پر تول رہا تھا وہ گھر ہندو برادری کا ہے یا کسی مسلمان کا۔

میں اٹھا اور ایک ہی بار میں دیوار پر چڑھ گیا۔ دوسری طرف کودنے میں دیر نہیں لگائی اور بھد سے نیچے نرم نرم

گھاس پر گرا۔ وہ ایک کشادہ لان تھا لان کی دوسری طرف ایک بڑی سی عمارت تھی اور دونوں کے درمیان ٹائلوں کی بنی روش تھی۔ میرے پاس کوٹھی کا جائزہ لینے کا وقت نہیں تھا اس لیے میں جھاڑیوں کی آڑ لے کر گلی والی دیوار کی طرف بڑھا۔ گلی میں کودنے سے پہلے میں نے دوسری طرف جھانکنا ضروری سمجھا، چنانچہ میں نے منڈیر تھام کر خود کو اوپر کھینچا اور گلی میں جھانکتے ہوئے قرب و جوار کا جائزہ لیا۔

گلی ویران و سنسان پڑی تھی۔ لائٹس کا بھی کوئی خاص انتظام نہیں تھا۔ میں منڈیر پر چڑھا اور پھر گلی میں کودنے میں ایک لمحہ بھی تاخیر نہ کیا۔ میرے کودنے سے ایک بار پھر دھد کی آواز پیدا ہوئی۔ میں چند ثانیے جہاں بیٹھا تھا، بیٹھا اطمینان کرتا رہا پھر میں نے تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے دیپک کی کوٹھی والی گلی کی طرف بڑھنے کی بجائے مخالف سمت میں بڑھنا شروع کر دیا۔ بہرکیف مختلف گلیوں سے ہوتے ہوئے بالآخر میں مین سڑک پر پہنچ ہی گیا۔ میں نے یوں لمبا سانس لیا جیسے میں جیل سے چھوٹ کر آیا ہوں۔

کچھ دیر ایک تاریک گوشے میں ستانے کے بعد میں نے دیال سنگھ کو بلانے کا فیصلہ کیا۔ میرے پاس ٹھکانا تو تھا نہیں جہاں میں جاتا۔ رہنے کے لیے ایک ٹھکانا بنا تھا لیکن وہ بھی ٹیررسٹ کا لیبل لگنے کے باعث ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ میں نے جیب سے فون نکال کر دیال سنگھ کو فون کر دیا۔ صبح کے چار بج رہے تھے اور وہ سو رہا تھا۔ قبل اس کے کہ فون بند ہو جاتا، دیال سنگھ نے فون اٹھا لیا اور سوئی ہوئی آواز میں بولا۔ ''ہیلو...... رات کو کون فون کر رہا ہے؟''

''دیال سنگھ! میں ہوں۔'' میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

''کون میں پا جی؟ اپنا نام بتاؤ۔'' شاید اس نے رامو کا نمبر میرے نام سے سیو نہیں کیا تھا بھی وہ پوچھ رہا تھا۔ میں دھیمی آواز میں بولا تھا اس لیے شاید وہ میری آواز بھی نہیں پہچان سکا تھا۔

''میں ہوں...... ونود۔''

''ونود......'' اس نے زیرِ لب دہرایا۔ پھر جیسے وہ چونک پڑا تھا۔ میں نے چشمِ تصور میں دیکھا وہ بستر پر سے اچھلا بھی ہوگا۔ ''سرکار...... یہ تسی ہو...... کیسے ہو؟''

''کیوں...... کیا کچھ ہوا ہے؟'' میں اس کے لہجے پر چونکا۔

''او نہیں سرکار۔'' دیال سنگھ نے کھسیانے لہجے میں کہا۔ ''میں تو ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔ ویسے تسی ہو کیسے۔ مینوں تو اڈی بڑی یاد آ رہی تھی۔'' وہ پنجابی، اردو اور ہندی مکس کر کے بولتا تھا۔

''دیال سنگھ!'' میں نے کہا۔ ''میں بھیم کالونی کے باہر مین سڑک پر ہوں۔ کیا تم مجھے لینے آ سکتے ہو۔''

''ہیں۔ تسی ادھر کیا کر رہے ہو؟'' دیال سنگھ شاید حیران ہوا تھا۔ ''اچھا ٹھیک ہے سرکار۔ میں پندرہ بیس منٹ میں وہاں پہنچ رہا ہوں۔''

''میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' میں نے جواباً کہا اور پھر اس کی کوئی بات سنے بغیر ہی سیل فون بند کر دیا۔ بات کرنے کے بعد میں سیل فون سوئچڈ آف کر دیتا تھا لیکن میں جلد از جلد اس سیل فون سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں دیال سنگھ میری مدد کر سکتا تھا۔ وہ سیل فون اور اپنے نام سے سم خرید کر دے سکتا تھا۔

مجھے یاد تھا جب دیال سنگھ نے مجھ سے فون کے بارے میں پوچھا تھا تو میں نے جھوٹ بولا تھا کہ میرا فون گر گیا ہے۔ میں نے ابھی بھی اسی نمبر سے فون کیا تھا۔ شاید دیال سنگھ کو نمبر یاد نہیں تھا یا اس نے سیو ہی نہیں کیا تھا جو کہ میرے لیے اچھی بات تھی۔

☆☆☆

دیال سنگھ کو آنے میں پچیس منٹ لگ گئے تھے۔ اس کی آنکھوں سے صاف دکھائی دیتا تھا کہ وہ سویا ہوا تھا۔ اس نے مجھے سرتاپا دیکھا اور حیران رہ گیا۔ ''سرکار! یہ تواڈی حالت کس نے کی ہے؟''

''ٹیکسی میں بیٹھو پھر بات کرتے ہیں۔'' میں نے ٹیکسی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا اور بیٹھ گیا۔ دیال سنگھ نے بھی اپنی سیٹ سنبھالی اور ٹیکسی آگے بڑھا دی۔

''سرکار! لگتا ہے تواڈی کسی کے ساتھ لڑائی ہوئی ہے۔''

''ہاں۔ تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔'' میں نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے کہا۔

''اوہو، سرکار کس کے ساتھ؟''

''رتن کمار کے غنڈوں کے ساتھ۔'' میں نے جواباً کہا۔ ''کیا تمہارے پاس کوئی محفوظ ٹھکانا ہے؟ رتن کمار کے کتے میری تلاش میں ہیں، میرے بازو پر بھی زخم ہے میں مرہم پٹی کرنا چاہتا ہوں۔''

''تسی چنتا نہ کرو سرکار۔'' دیال سنگھ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کو ایسی جگہ لے جاتا ہوں جہاں کوئی

بھی تسی کو تلاش نہیں کر سکے گا۔''
''پھر جلدی چلو۔'' میں نے بازو میں اٹھنے والی ٹیس کو برداشت کرتے ہوئے کہا۔ دیال سنگھ نے ٹیکسی کی اسپیڈ بڑھادی۔ چونکہ رات کا وقت تھا اور سڑکیں سنسان و ویران تھیں اس لیے دیال سنگھ بے فکری سے ٹیکسی بھگائے جارہا تھا۔ مجھے رتن کمار کا خیال آیا تو میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔
''رتن کمار کے بارے میں معلوم کیا؟''
''ہاں سرکار۔''
''کیا پتا چلا؟'' میرے وجود میں جیسے سنسناہٹ کی لہر دوڑی۔
''سرکار۔'' دیال سنگھ نے جواباً کہا۔ ''میں نے اپنے ایک جاننے والے ویٹر کے ذمے لگایا تھا، اس نے بڑی مشکل سے معلوم کر کے بتایا ہے کہ رتن کمار ان دنوں امریکا گیا ہوا ہے۔ وہ واپس کب آئے گا اس بارے میں کسی کو معلوم نہیں ہے۔''
دیال سنگھ کی بات سن کر میں نے لمبی سانس لی۔ رادھا کی بات کی تصدیق ہوگئی تھی۔ یہ بھی کہ دیال سنگھ نے میرے لیے کام کیا تھا۔ میرے ذہن میں اس کے حوالے سے جو وسوسے تھے وہ محو ہو گئے تھے۔ کچھ دیر کے بعد وہ مجھے ایک علاقے میں لے گیا جہاں کچے پکے مکانات بنے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں مسجدیں تو کہیں مندر بھی دکھائی دیئے۔ اس نے ٹیکسی ایک پختہ مکان کے دروازے پر روکی اور میری طرف دیکھ کر کہا۔ ''آجاؤ سرکار۔''
ہم دونوں ٹیکسی سے باہر نکل گئے۔ دیال سنگھ نے جیب سے مکان کی چابی نکالی اور تالا کھول دیا۔ میں اس کے پیچھے چلتا ہوا مکان میں داخل ہوا۔ دو کمروں اور چھوٹے سے صحن پر مشتمل وہ مکان گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کئی سالوں سے اس میں صفائی ہی نہ کی گئی ہو۔ دائیں ہاتھ پر چھوٹا سا کچن تھا اور اس سے کچھ فاصلے پر واش روم۔ دیال سنگھ نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو کر لائٹ جلائی تو میں بھی کمرے میں داخل ہوا۔
کمرے میں صرف ایک چارپائی، ایک ٹرنک اور میز پڑی ہوئی تھی۔ ان کے علاوہ اور کوئی چیز قابل ذکر نہ تھی۔ یہ تینوں چیزیں بھی گرد سے اٹی ہوئی تھیں۔ چھت پر پنکھا لٹک رہا تھا۔ چونکہ کمرے میں خاصہ حبس تھا اس لیے دیال سنگھ نے پنکھا چلا دیا تھا۔

''یہ مکان کتنے عرصے سے خالی پڑا ہے؟'' میں نے دیال سنگھ سے دریافت کیا۔
دیال سنگھ کے چہرے پر مسکراہٹ رینگی۔ کہنے لگا۔
''تقریباً چار پانچ ماہ سے۔''
''تمہارا اپنا مکان ہے؟''
''ہاں سرکار۔'' دیال سنگھ نے جواباً سر ہلایا۔
''تو تم یہاں کیوں نہیں رہتے؟''
''بس سرکار، ماتا پتا کے دیہانت کے بعد اس گھر میں دل نہیں لگتا تھا۔'' دیال سنگھ کے چہرے پر اداسی چھا گئی، تبھی وہ غم زدہ لہجے میں بولا۔ ''اسی لیے میں نے یہاں رہنا چھوڑ دیا۔ یار بیلیوں نے کہا تھا کہ میں یہ مکان کرائے پر چڑھا دوں لیکن میں نے انکار کر دیا۔ یہ میرے پتا کی محنت سے بنایا ہوا گھر ہے۔''
جواباً میں نے اثبات میں سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔ تبھی اسے یاد آیا تو وہ کھسیانے انداز میں کہنے لگا۔ ''سرکار! میں نے بھی تسی کو باتوں میں لگا دیا۔ تسی ٹھہرو، میں صفائی کر دیتا ہوں۔ پھر باقی کے کام کرتے ہیں۔''
دیال سنگھ نے ٹرنک میں سے ایک کپڑا نکالا اور اس نے پہلے چارپائی صاف کی، پھر میز۔ پھر اس نے چارپائی پر ایک بستر بچھا دیا، آخر میں مجھ سے بولا۔ ''سرکار! تسی بیٹھو میں ٹیکسی میں دیکھتا ہوں شاید اس میں دوائی ہو۔''
اس کے جانے کے بعد میں بستر پر جیسے گر سا گیا تھا۔ میرا لباس گرد آلود ہونے کے ساتھ ساتھ جگہ جگہ خون کے قطروں سے بھی رنگا ہوا تھا۔ آج کی رات میرے لیے نہایت کٹھن اور مارا ماری میں گزری تھی۔ افسوس اس بات کا تھا کہ رادھا میرے ہاتھوں سے نکل گئی لیکن جب جوتی کا خیال آتا تو میرے وجود میں سکون کی لہر دوڑ جاتی۔
تھوڑی دیر کے بعد دیال سنگھ آیا تو وہ خالی ہاتھ تھا۔ کہنے لگا۔ ''سرکار! میرے پاس دوائی ختم ہو چکی ہے پر تسی چنتا نہ کرو، صبح جیسے ہی کوئی دکان کھلتی ہے میں سب سے پہلے تسی کے لیے دوائی لے آؤں گا۔''
میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ مجھے بھوک بھی لگی ہوئی تھی لیکن جانتا تھا کہ اس وقت دیال سنگھ کھانے کا کہیں سے بھی بندوبست نہیں کر سکتا۔ بعد ازاں اس نے خود ہی پوچھ لیا۔ ''سرکار! تسی کو بھوک تو لگ رہی ہوگی، پر تسی چنتا نہ کرو، قریب میں ہی میری بے بے کا گھر ہے، میں ابھی تسی کے لیے کھانا بنوا آتا ہوں۔ تسی آرام کرو۔''

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی دیال سنگھ باہر چلا گیا اور میں نے آنکھیں میچ لیں۔ صد شکر کہ گولی میرے بازو سے رگڑ کھا کر نکل گئی تھی اگر بازو میں گھس جاتی تو بارود کا زہر پھیلنے کا خدشہ بڑھ جاتا۔ نیند تو آنکھوں سے کوسوں دور تھی لیکن دماغ کو آرام دینے کی خاطر میں نے ہر سوچ کو دماغ سے محو کر دیا۔ شاید ایک ڈیڑھ گھنٹا ہی آرام کیا تھا کہ وہ میرے لیے کھانا پکوا لایا اور ساتھ ہی چائے بھی بنوا لایا۔ چار پانچ چپاتیوں کے ساتھ شوربا تھا۔ ہم دونوں نے مل کر کھانا کھایا اور پھر چائے پی۔ دیال سنگھ کھانا نہیں کھانا چاہتا تھا لیکن میرے اصرار پر وہ مجبور ہو گیا تھا۔

صبح کا پرنور اجالا پھیل رہا تھا۔ نماز فجر کے لیے کب اذانیں ہوئیں مجھے ہوش ہی نہ رہا تھا۔ دیال سنگھ نے بتایا تھا کہ اُس علاقے میں مسلمان اور ہندوؤں کے علاوہ سکھ بھی رہتے ہیں۔ اپنی بے بے کے بارے میں اس نے بتایا تھا کہ وہ اس کی منہ بولی بہن ہے۔ وہ ودھوا ہے اور اپنے دو بچوں کے ساتھ رہتی ہے۔ اس کے بچے اسے ماما جی کہتے ہیں۔

''اس نے پوچھا نہیں تھا کہ تم اتنا سارا کھانا کس کے لیے بنوا کر جا رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔ ہم کھانے سے فراغت کے بعد باتیں کر رہے تھے۔

''پوچھا تھا۔'' دیال سنگھ نے جواباً کہا۔ ''میں نے کہا کہ دہلی سے میرا یار بیلی آیا ہے اسی کے لیے کھانا بنوانے آیا ہوں۔''

میں نے سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔ وہ اپنی بے بے کے بارے میں اور بھی باتیں بتاتا رہا اور میں خاموشی سے سنتا رہا۔ نو بجتے ہی وہ میرے لیے میڈیسن لینے چلا گیا۔ جاتے وقت اس نے تاکید کی تھی کہ میں دروازہ اندر سے بند کر لوں۔ کوئی بلی اندر گھس سکتی ہے۔ میں نے اس کے جاتے ہی دروازہ اندر سے بند کیا اور حبس زدہ کمرے میں بستر پر ایک بار پھر دراز ہو گیا۔ حبس ختم کرنے کے لیے میں نے ایگزاسٹ فین چلا دیا تھا جس سے کمرے کے ماحول میں قدرے بہتری آئی تھی۔ کمرے کی دیواریں سپاٹ تھیں اور ان پر ہلکا ہلکا نیلا رنگ کیا گیا تھا۔ میں چھت والے پنکھے کو گھورتے ہوئے نیند کی وادی میں اتر گیا۔ آنکھ اس وقت کھلی جب دیال سنگھ آ گیا تھا اور ہلکی ہلکی آواز میں دروازہ بجا رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ مجھے آوازیں بھی دے رہا تھا۔ ''سرکار...... دروازہ کھولو۔ میں ہوں دیال سنگھ۔''

میں نے بستر سے اتر کر دروازہ کھول دیا۔ دیال سنگھ میڈیسن کے علاوہ مرہم پٹی کا سامان بھی لے آیا تھا۔ میں نے شرٹ اتار کر ایک سائیڈ پر رکھ دی۔ سب سے پہلے میں نے اسپرٹ سے اپنا زخم صاف کیا، زخم صاف کرنے کے دوران میرے منہ سے ٹیسیں خارج ہوئی تھیں لیکن میں ضبط کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ زخم صاف کرنے اور مرہم پٹی کرنے میں دیال سنگھ نے مدد کی۔ میں نے دوبارہ گرد اور خون آلود شرٹ پہن لی۔

''اچھا سرکار، اب تسی آرام کرو۔'' دیال سنگھ نے کہا۔ ''میں دوپہر کو آؤں گا تو تسی کے لیے کھانا لیتا آؤں گا۔''

وہ جانے لگا تو میں نے اسے روکا۔ ''سنو دیال سنگھ۔''

وہ مڑ کر مجھے استفہامیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ میں نے پتلون کی جیب سے پیسے نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔ ''آتے وقت میرے لیے ایک نیا سوٹ خریدتے آنا۔''

''سرکار! اس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔'' وہ بولا۔ ''میرے پاس چند سوٹ ہیں، وہ میں لیتا آؤں گا۔ تسی کو

''اردو میں مقالہ نگاری کا آغاز 1845ء کے آس پاس ہو چکا تھا مگر اس کی مقبولیت کا عہد، 1857ء کے بعد سے شروع ہوا۔ دہلی کالج کے نصاب میں مختلف مضامین شامل تھے۔ امتحان کے پرچوں میں ایک پرچہ مقالہ نگاری سے متعلق بھی ہوا کرتا تھا۔ اس دور کی ادبی انجمنوں نے بھی مقالہ نگاری کو رواج دینے میں ہاتھ بٹایا۔ ایسی انجمن دہلی سوسائٹی کے نام سے 56ء میں خدمات انجام دے رہی تھی۔ اس کی روح رواں ماسٹر پیارے لال تھے۔ انجمن میں تقریروں کے علاوہ اصلاحی مقالے بھی پڑھے جاتے تھے۔ خود ماسٹر پیارے لال بہت اچھے مقالہ نگار تھے۔ پنجاب کے رسالہ ''اتالیق'' میں ان کے مقالے اکثر چھپتے رہے ہیں۔ اسی دور کے مقالوں کے عنوانات دیکھنے سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ذہنوں کے لیے تصنیف و تالیف سے زیادہ مقالہ نگاری ہی مفید مطلب ثابت ہوئی۔ اس دور کی ''ایسے نگاری'' سے ہم لاعلم ہیں۔ گمان غالب یہ ہے کہ انگریزی ادب کے زیر اثر ''Essay'' بھی ضرور لکھے جاتے ہوں گے۔''

بالکل فٹ آئیں گے۔"

"نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "پہلے ہی تمہارے مجھ پر بہت احسانات ہیں۔ جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔"

دیال سنگھ ہچکچایا پھر میرے دوبارہ کہنے پر اس نے پیسے لیے اور چلا گیا۔ میں نے اندر سے دروازہ بند کر دیا اور بستر پر دراز ہو کر سو گیا۔

دیال سنگھ دوپہر کو آیا تھا وہ میرے لیے دو نئے سوٹ اور کھانے پینے کی چیزیں لایا تھا۔ میں جاگا تو میرا سر بھاری ہو رہا تھا۔ میں نے ایک سوٹ منتخب کر کے پہن لیا۔ ایک سوٹ میں نے وہیں ٹرنک کے اوپر رکھ دیا تھا۔ میرے کہنے پر دیال سنگھ میرے پرانے کپڑے ایک شاپر میں ڈال کر دور کسی گڑھے میں پھینک آیا۔ نیند لینے اور کھانے پینے کے بعد میں اب خود کو پہلے سے زیادہ چاق و چوبند اور پُرجوش محسوس کر رہا تھا۔ مجھے رادھا چاہیے تھی کیونکہ وہی مجھے رتن کمار کے ٹھکانے تک پہنچا سکتی تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ رادھا کہاں گئی ہوگی لیکن وہ چراغ پا ضرور ہوگی۔ اس کے ہرکارے مجھے تلاش کر رہے ہوں گے۔ دیپک کو بھی جوتی کی موت کا پتا چل چکا ہوگا۔ اس کی کیا حالت ہوئی ہوگی، میں پردۂ چشم پر دیکھ سکتا تھا۔

غیظ و غضب کی وجہ سے دیپک کا وجود کپکپایا ہوگا، آنکھیں خونِ کبوتر کی طرح سرخ ہوں گی، اس کا بس نہیں چل رہا ہوگا ورنہ وہ میری گردن ہی دبوچ لے۔

"سرکار! کیا سوچ رہے ہو؟" دفعتاً دیال سنگھ کی آواز میری سماعت میں پڑی تو میں خیالوں کی دنیا سے باہر نکل آیا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ چائے بنا لایا تھا۔ وہ کب واپس آیا تھا مجھے خبر ہی نہیں ہو سکی تھی۔

"کچھ نہیں۔" میں نے مختصراً جواب دیا اور بھاپ اڑاتی چائے کا کپ اٹھا لیا۔

"سرکار! طبیعت کا سناؤ۔" دیال سنگھ نے اپنا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔ چائے کا ایک سپ لینے کے بعد اس نے میری طبیعت پوچھی۔

"پہلے سے بہت بہتر ہوں۔" میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ "دیال سنگھ! کیا میرا ایک اور کام کر دو گے؟"

"تسی حکم کرو سرکار۔" اس نے تابعداری کا مظاہرہ کیا۔ "کیا کچھ چاہیے؟"

دیال سنگھ میری یوں تابعداری کر رہا تھا جیسے میں اس کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہوں۔ مجھے ماضی یاد آ گیا۔

میرے اباجی بتایا کرتے تھے کہ جب پاکستان اور ہندوستان الگ الگ ہوئے تھے تو مسلمانوں کی نسل کشی کرنے میں ہندو بلوائیوں کے ساتھ ساتھ سکھ بھی پیش پیش تھے۔ ہم جس گاؤں میں رہتے تھے وہاں سکھوں نے حملہ کر دیا تھا اور بہت ساری مسلمان لڑکیوں کو اغوا کر کے لے گئے تھے ان میں میرے اباجی کی سگی خالہ بھی شامل تھی۔ اباجی تو پاکستان پہنچ گئے تھے لیکن خالہ کا کچھ پتا نہیں چل سکا تھا۔ دیال سنگھ بھی سکھ تھا لیکن اس کا میرے ساتھ رویہ معاندانہ نہیں تھا۔ شاید یہ وجہ تھی کہ میں نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ میں ہندو نہیں مسلمان ہوں اور میرا تعلق پاکستان سے ہے۔ میں رتن کمار کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے بعد وطنِ مالوف ہو جاؤں گا۔ دیال سنگھ کو بتانے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ اگر اسے پتا چل بھی گیا تو بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ میں نے دیال سنگھ کی طرف دیکھا تو وہ میرے بولنے کا منتظر تھا۔

"مجھے ایک نیا فون اور سم چاہیے۔" میں نے کہا۔

"مل جائے گا سرکار۔" دیال سنگھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور حکم......"

"پوچھو گے نہیں کہ مجھے فون اور سم کیوں چاہیے؟" میں نے اسے ٹٹولنے والے انداز میں کہا۔ کبھی کبھی مجھے دیال سنگھ کی شخصیت دوہری اور مشکوک لگتی تھی۔ مجھے لگتا تھا جیسے وہ میرے ساتھ کھیل کھیل رہا ہے اور اپنے تئیں مجھے بے وقوف بنانے کی بھرپور کوشش کر رہا ہے۔

"فون ضرورت کے لیے ہی ہوتا ہے سرکار۔" دیال سنگھ نے کہا۔ "تسی جس پاکھنڈی کے خلاف لڑ رہے ہو یہ بہت بڑا کام ہے سرکار۔ مجھ سے تسی کے لیے جو ہو سکا میں کروں گا۔ توانوں شام تک نیا فون مل جائے گا سرکار۔"

پھر دیال سنگھ نے اپنے وعدے کے مطابق مجھے شام تک نیا فون لا کر دیا۔ اس میں سم بھی تھی۔ رات کو میں نے چھوٹی بہن مرینہ کو فون کیا لیکن اس کا فون بند تھا۔ مجھے شانزے کا بھی فون نمبر یاد نہیں آ رہا تھا۔ میں رات گئے تک فون نمبر یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن دماغ سے سب کچھ گویا محو ہو چکا تھا۔ میں نے یہ فون دیال سنگھ سے رابطے کے لیے لیا تھا۔ زامو کے فون سے سم نکال کر میں نے ضائع کر دی تھی۔ فون کو میں نے پتھر سے توڑ کر اس کی باقیات گندے نالے میں پھینک دی تھی۔ اب مجھے یہ فکر نہیں تھی کہ رتن کمار یا دیپک، زامو کے سیل فون سے ٹریس کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔

اُس رات مجھے جوتیا بھی یاد آئی تھی۔ اس کا بھی رابطہ نمبر

یاد نہیں تھا البتہ ہاروے اس سے رابطے میں تھا۔ ہاروے کا خیال آتے ہی میں سوچ میں پڑ گیا کہ اس سے کیسے رابطہ کروں؟ اینڈرسن ہی اس سے رابطے کا بہترین ذریعہ تھا لیکن مسئلہ وہی تھا، مجھے اینڈرسن کی کوٹھی نہیں مل رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ ایک بار پھر کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ شاید اس بار قسمت یاوری کرے۔ چنانچہ میں اگلے دن ایک بار پھر اینڈرسن کی رہائش گاہ تلاش کرنے کا فیصلہ کر کے حبس زدہ کمرے میں بستر پر لیٹ گیا۔

رات میں حبس زیادہ بڑھا تو میں نے کھڑکی کھول دی لیکن اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ مجبوراً مجھے چارپائی باہر صحن میں ہی نکالی پڑی تھی۔ باہر ہوا تو چل رہی تھی لیکن حبس نہیں تھا۔ دیال سنگھ کے پاس پیڈسٹل فین تو موجود تھا لیکن وہ خراب تھا۔ میں سو گیا۔ مچھر بھی مجھے سونے نہیں دے رہا تھا۔ بہرکیف میں ساری رات مچھروں سے جنگ کرتے ہوئے سوتے جاگتے میں گزار دی تھی۔ صبح ہونے سے پہلے ہی میں چارپائی کمرے میں لے گیا اور سو گیا۔ کچھ ہی دیر آنکھ لگی تھی کہ دیال سنگھ ناشتا لے کر پہنچ گیا۔

''رات کیسی گزری سرکار؟'' میں فریش ہو کر کمرے میں آیا تو دیال سنگھ نے پوچھا۔

''مچھروں سے جنگ کرتے ہوئے گزری۔'' میں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا تو دیال سنگھ چونک پڑا۔

''اوہو، سرکار کیا تسی باہر سوئے تھے؟''

''ہاں۔ کمرے میں بہت حبس تھا۔'' میں نے جواباً کہا اور منہ ہی منہ میں بسم اللہ پڑھ کر ناشتا شروع کیا۔

''پیڈسٹل فین بھی خراب ہے سرکار۔'' دیال سنگھ نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ''میں معافی چاہتا ہوں سرکار۔''

''ارے کوئی بات نہیں دیال سنگھ۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''چلو ناشتا شروع کرو۔''

''میں آج ہی پیڈسٹل فین کا بندوبست کر دوں گا۔'' دیال سنگھ نے ناشتا شروع کرتے ہوئے کہا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ دیال سنگھ میرے لیے ایک اچھا دوست تو ثابت ہو رہا تھا لیکن اس کی شخصیت ہنوز مجھے تجسس میں ڈال رہی تھی۔

ناشتا کرنے کے بعد میں نے اس سے کہا۔ ''دیال سنگھ! مجھے چیتن روڈ پر تو ڈراپ کر دو۔ میں تمہیں کرایہ دوں گا۔''

''سرکار۔ کیسی بات کر رہے ہو۔'' دیال سنگھ نے کہا۔ ''میں تسی سے پیسے کیوں لوں گا؟ نہ سرکار۔ ویسے بھی میں اسی طرف ہی جا رہا ہوں۔ میں نے تسی کو پہلے بھی بتایا تھا کہ اس طرف میری ایک سواری رہتی ہے جو ہر باری مجھے ہی فون کر کے بلاتی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔''

''ویسے کوئی کام ہے اس طرف؟''

''ہاں۔ ایک دوست سے ملنا ہے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ اس نے بھی سر ہلا دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں دیال سنگھ کے ساتھ اس کی ٹیکسی میں بیٹھا چیتن روڈ کی طرف جا رہا تھا۔ میں حتی الامکان ہوشیار اور چوکنا تھا۔ کسی بھی وقت رتن کمار کے ہرکارے یا دیپک سے سامنا ہو سکتا تھا۔ چیتن روڈ پر پہنچ کر میں اتر گیا اور دیال سنگھ ایک گلی میں ٹیکسی لے گیا۔ میں نے راستے میں ایک کیپ خرید لی تھی جسے سر پر جما کر میں اینڈرسن کا گھر تلاش کرنے لگا۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اینڈرسن کو تلاش کیے بغیر واپس نہیں جاؤں گا۔ پین کلر میڈیسن کھانے کی وجہ سے بازو میں تکلیف کم تھی۔ میں آوارہ گردی کرتا ہوا اندازے سے ایک کالونی کی گلی میں داخل ہو گیا۔ گلی میں لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ میں قرب و جوار میں دیکھتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ میں کچھ ہی دور گیا تھا کہ دفعتاً میری نظر ایک ٹیکسی کے پاس کھڑے ڈرائیور پر پڑی تو میرے دماغ میں ایک جھماکا سا ہوا۔ میں پہلی ہی نظر میں اس ٹیکسی ڈرائیور کو پہچان گیا تھا۔ وہ وہی تھا جس نے مجھے روی کالونی میں مطلوبہ جگہ پر اتارا تھا۔ اسی کو اینڈرسن نے ہی بلایا تھا۔

وہ کسی سواری کا سامان اتار رہا تھا۔ ٹیکسی سے قدرے فاصلے پر ایک نوجوان لڑکی اور ادھیڑ عمر آدمی کھڑا تھا۔ لڑکی نے گلے میں منگل سوتر پہنا ہوا تھا۔ ماتھے پر بندیا بھی تھی۔ ڈرائیور نے ٹیکسی کی ڈگی سے دو بیگ نکال کر زمین پر رکھے اور ڈگی بند کر کے ان کی طرف متوجہ ہوا۔ ادھیڑ عمر آدمی نے اسے پیسے دیے تو وہ دھنیہ واد کہتا ہوا ڈرائیونگ سیٹ کی طرف بڑھا۔ قبل اس کے وہ ٹیکسی میں بیٹھتا، میں اس کے پاس پہنچ گیا۔

''بات سنو۔'' میں نے کہا تو اس نے بے اختیار چونک کر میری طرف دیکھا۔

''جی بابو۔ کہیں جانا ہے۔'' ڈرائیور نے میرا سرتاپا جائزہ لینے کے بعد پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھے کچھ پوچھنا ہے۔''

''جی پوچھیے۔''

''شاید تمہیں یاد ہو۔'' میں نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ''کچھ عرصہ پہلے تم نے مجھے مسٹر اینڈرسن کی رہائش گاہ سے پک کیا تھا۔ ہے یاد؟''

ڈرائیور سوچ میں پڑ گیا۔ میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ اسے یاد آجائے۔ شاید قبولیت کا وقت تھا ڈرائیور کو یاد آ گیا تھا۔ کہنے لگا۔ ''ہاں مجھے یاد آ گیا ہے۔ مسٹر اینڈرسن کو کہیں جانا ہوتا ہے تو وہ اکثر مجھے ہی فون کرتے ہیں۔ کیا کوئی مسئلہ ہو گیا ہے؟''

''نہیں۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''دراصل مجھے ان کے گھر جانا ہے لیکن میں لوکیشن بھول چکا ہوں۔ کیا تم اس سلسلے میں میری مدد کر سکتے ہو؟''

''کیوں نہیں جناب۔'' وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا۔ ''آئیے میرے ساتھ، میں آپ کو ان کے گھر ڈراپ کر دیتا ہوں۔ ان کا گھر قریب میں ہی ہے۔''

میں اس کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے سر سے منوں بوجھ اتر گیا ہو۔ ٹیکسی دو تین گلیوں سے ہوتی ہوئی جب ایک کشادہ گلی میں داخل ہوئی تو مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ اینڈرسن کی رہائش گاہ اسی گلی میں تھی۔ لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ ڈرائیور نے ٹیکسی ایک کوٹھی کے گیٹ پر روکی تو میں گیٹ کو پہچانتا ہوا نیچے اتر گیا۔ میں نے ڈرائیور کو کرایہ دینا چاہا تو اس نے لینے سے انکار کر دیا اور چلا گیا۔ میں نے کندھے اچکائے اور گلی کراس کر کے اینڈرسن کی کوٹھی کی طرف بڑھا۔ میں کال بیل بجانا ہی چاہتا تھا کہ دفعتاً ذیلی دروازہ کھلا اور اینڈرسن باہر نکلا تو میں نے بیل بجانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

''گڈ مارننگ۔'' میں نے کہا۔

جواب میں اس نے بھی گڈ مارننگ کہا اور پوچھا۔ ''کس سے ملنا ہے؟''

''مسٹر اینڈرسن!'' میں نے کہا۔ ''میں آپ سے ہی ملنے آیا ہوں۔''

اینڈرسن چونکا اور میرا سرتاپا جائزہ لینے کے بعد بولا۔ ''ینگ مین! تمہاری آواز سنی سنائی سی محسوس ہو رہی ہے۔''

''جی آپ نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں...... مورس۔''

''مورس؟'' اس نے زیرِ لب دُہرایا۔

''آپ کو یاد ہوگا کچھ عرصہ قبل مسٹر ہاروے نے ایک مہمان کو آپ کے ہاں بھیجا تھا۔'' میں نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی۔ ''بوڑھا......''

وہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور صد شکر کہ اسے یاد آ گیا تھا۔ وہ چونکتے ہوئے کہنے لگا۔ ''ہاں، ہاں مجھے یاد آ گیا۔ لیکن......''

''میں وہی مورس ہوں۔'' میں نے اس کی بات قطع کرتے ہوئے کہا۔ ''بحالتِ مجبوری میں نے اپنا گیٹ اپ بدلا ہوا تھا۔ میں کافی دنوں سے آپ کا گھر تلاش کر رہا تھا لیکن مجھے نہیں مل رہا تھا آج اتفاق سے وہی ٹیکسی ڈرائیور مل گیا جو مجھے یہاں سے پک کر کے لے گیا تھا۔ میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ مجھے مسٹر ہاروے کا رابطہ نمبر چاہیے۔ مجھ سے ان کا رابطہ نمبر کھو گیا ہے۔''

''مجھے مسٹر ہاروے نے بعد میں بتا دیا تھا۔'' اینڈرسن مسکراتے ہوئے بولا۔ ''آؤ...... باہر کیوں کھڑے ہو۔ اگر مسٹر ہاروے کو پتا چل گیا کہ میں نے تمہیں باہر کھڑے کھڑے ہی جانے دیا تھا تو وہ مجھ پر ناراض ہوں گے۔''

وہ مجھے اندر لے گیا۔ اس کی بیوی بیلا گھر کے کام کاج میں مصروف تھی۔ مجھ پر نظر پڑی تو کام چھوڑ کر ہماری طرف آ گئی۔ مجھے غور سے دیکھتے ہوئے اینڈرسن سے استفسار کیا۔ ''یہ کون ہے؟''

''مورس۔''

''مورس......'' اس کی حیرت بھی دیدنی تھی۔

''تمہیں بتایا تو تھا کہ مسٹر ہاروے......''

اینڈرسن کی بات پوری ہی نہ ہوئی تھی کہ بیلا کے چہرے پر چمک ابھر آئی۔ ''اوہو...... تو یہ ہے وہ ینگ مین مورس۔'' کہنے کے ساتھ ہی اس نے عالم از خود رفتگی مجھ سے لپٹ کر یوں بھینچ لیا جیسے میں اس کا صدیوں سے بچھڑا ہوا بچہ ہوں۔ مجھے گھٹن سی محسوس ہوئی۔

''آنٹی! میری پسلیاں نہ ٹوٹ جائیں۔'' میں نے ازراہ تفنن کہا تو بیلا کھسیانے انداز میں ہنستے ہوئے مجھ سے علیحدہ ہو گئی اور میں نے شکر کا سانس لیا۔

''مائی بوائے! میں نے تمہیں بہت یاد کیا تھا۔'' بیلا کہنے لگی۔ ''ہم تو تمہیں بوڑھا ہی سمجھتے رہے تھے لیکن تم تو ینگ نکلے۔ تمہیں دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔''

میں نے اینڈرسن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''انکل!

میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ بس مجھے مسٹر ہاروے کا سیل نمبر دے دیں، میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔ میرے دشمن میری تاک میں ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ آپ کے گھر کی نگرانی کر رہے ہوں اور آپ لوگ مشکل میں پھنس جائیں۔ پلیز مجھے نمبر دیں۔'' کہنے کے ساتھ ہی میں نے سیل فون نکال لیا۔

بیلا کو شاید میرے بارے میں نہیں پتا تھا تبھی اس نے چونکتے ہوئے استفسار کیا۔ ''کک۔ کون ہیں تمہارے دشمن؟ اور تم سے کیا چاہتے ہیں مائی بوائے۔''

میں نے اینڈرسن کی طرف دیکھا تو وہ بھی تذبذب میں پڑ گیا تھا۔ ازیں پیش میں کچھ بولتا، اینڈرسن نے بات کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''بیلا! ہیں کچھ لوگ۔ تم پریشان نہ ہو۔ ہم سنبھال لیں گے۔''

بیلا کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ اینڈرسن کی بات سے مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ اس نے بولنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ دفعتاً دروازے پر زور زور سے دستک ہونے لگی۔ دستک دینے والے کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ وہ بہت عجلت میں ہے۔ ہم تینوں نے بیک وقت ہی چونک کر دروازے کی طرف دیکھا تھا۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں ہی بیلا کا چہرہ عرق آلود ہو گیا تھا اور وہ متوحش دکھائی دینے لگی تھی۔

''کون ہو سکتا ہے؟'' میں نے اینڈرسن کی طرف دیکھا۔

''شاید کراسٹی آئی ہو گی۔'' اس نے اندازاً کہا اور مڑ کر گیٹ کی طرف بڑھ گیا جبکہ میں ایک ستون کی آڑ میں ہو گیا۔ بیلا اپنی جگہ پر ہی کھڑی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے پیر فرش کے ساتھ چپک گئے ہوں۔ اینڈرسن نے دروازہ کھول دیا۔ آنے والی کراسٹی تھی۔ وہ بھی متوحش تھی۔ اس کے اندر آنے کے بعد اینڈرسن نے دروازہ بند کیا اور اس کے پیچھے پیچھے آنے لگا۔ کراسٹی غصے میں تھی۔ اینڈرسن اس سے پوچھ رہا تھا۔ ''کیا ہوا ہے کراسٹی۔ تم غصے میں کیوں ہو؟''

''پاپا! دو لڑکے میرے پیچھے پڑ گئے تھے۔'' کراسٹی بتانے لگی۔ ''عجیب اور فحش آوازیں کس رہے تھے۔ میرے منع کرنے کے باوجود وہ باز ہی نہیں آ رہے تھے۔ وہ مجھ سے انکل موریس کے بارے میں پوچھ رہے تھے، میں نے انہیں بتایا کہ انکل موریس ہمارے گھر میں نہیں رہتے لیکن وہ یقین ہی نہیں کر رہے تھے۔ جب میری بات نہیں مانی تو مجھے اغوا کرنے کی کوشش کی۔''

کراسٹی کی بات سن کر میرا دل یکبارگی جیسے کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ میرے اعصاب تن چکے تھے۔ میرا قیاس بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ رتن کمار کے ہرکاروں نے اینڈرسن کی کوٹھی پر نظر رکھی ہوئی تھی اور انہیں یقین تھا کہ موریس اس کوٹھی ضرور آئے گا۔ میں نے اینڈرسن اور بیلا کے چہروں پر بھی خوف اور پریشانی کے ملے جلے تاثرات ابھرتے دیکھے۔ اس کے بولنے سے پہلے ہی کراسٹی نے اس بار استفسار کیا۔ ''کون ہو سکتے ہیں وہ لوگ، اور انہیں انکل موریس سے کیا چاہتے ہوں گے؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' اینڈرسن نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر لمحاتی توقف کے بعد پوچھا۔ ''کیا وہ لڑکے گھر تک آئے تھے؟''

''نہیں۔'' کراسٹی جواباً بولی۔ ''میں نے شور مچا دیا تھا جس کی وجہ سے وہ بھاگ گئے تھے۔ کیا آپ کا انکل موریس سے رابطہ ہوا، کہاں ہیں وہ؟ آپ انہیں بتا دیں کہ کچھ لوگ ان کو تلاش کر رہے ہیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' اینڈرسن نے کہا۔ ''تم اپنے کمرے میں جاؤ۔''

کراسٹی اپنے کمرے میں چلی گئی اور میں ستون کی آڑ سے نکل کر ان کے پاس پہنچ گیا۔ اینڈرسن اور بیلا کے چہروں پر خوف اور پریشانی کے تاثرات ہویدا تھے۔ میں نے اینڈرسن کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''انکل! میں شرمندہ ہوں کہ میری وجہ سے آپ لوگ پریشانی میں گھر گئے ہیں۔ آپ مجھے مسٹر ہاروے کا سیل نمبر دے دیں میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔''

''بیٹا! کہاں جاؤ گے؟''

''ایک دوست ہے دیال سنگھ۔'' میں نے دیال سنگھ کا نام لیتے ہوئے کہا۔ ''ان دنوں میں اسی کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں۔''

''اچھا رکو، میں مسٹر ہاروے کا نمبر لکھ کر دیتا ہوں۔'' اینڈرسن نے کہا اور مڑ کر اندرونی کمرے میں چلا گیا جبکہ بیلا بھی مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتی ہوئی اینڈرسن کے پیچھے پیچھے ہی چلی گئی۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اینڈرسن باہر آ گیا۔ وہ ایک کاغذ پر مسٹر ہاروے کا نمبر لکھ کر لایا تھا۔ اس نے مجھے نمبر دیتے ہوئے کہا۔ ''میری مسٹر ہاروے سے بات ہو گئی

ہے۔ وہ تمہاری کال کے منتظر ہیں۔''

میں نے شکریہ ادا کر کے کاغذ پتلون کی جیب میں رکھا اور مڑ کر گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ اینڈرسن بھی میرے پیچھے تھا۔ میں کوٹھی سے باہر نکل کر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا مین سڑک کی طرف بڑھا۔ ابھی میں چالیس، پچاس گام کی دوری پر تھا کہ مجھے اپنے عقب سے شور سنائی دیا۔ میں نے بے اختیار مڑ کر دیکھا تو وہ چار، پانچ لوگوں کا غول تھا جو دوڑتا ہوا میری طرف ہی آرہا تھا۔ میں اپنی جگہ سُن ہو کے رہ گیا۔

میں سمجھ گیا تھا کہ یہ وہی لڑکے تھے جنہوں نے کراسٹی سے میرے بارے میں پوچھا تھا۔ اس سوچ نے میرے اعصاب چٹخا دیے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ رتن کمار مجھے چاروں طرف سے گھیرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ میرے پاس سوچنے کا وقت نہیں تھا بلکہ یہ وقت جلد فیصلے اور اس پر عمل پیرا ہونے کا متقاضی تھا۔ وہاں سے فرار ہونے کا فیصلہ کرتے ہی میں نے بہ سرعت مڑ کر مخالف سمت دوڑ لگا دی۔

''وہ بھاگ رہا ہے۔ پکڑو اسے۔ پکڑو۔'' مجھے عقب سے آواز سنائی دی۔ میں نے ارادی طور پر مڑ کر دیکھا تو وہ میرے پیچھے دوڑے چلے آرہا تھا۔ شاید ان کے ہاتھوں میں ریوالور بھی تھے کیونکہ ایک نے گولی بھی چلا دی تھی جو میرے قریب سے گزرتی ہوئی فضا میں غائب ہو گئی تھی۔ گولی چلنے سے وہاں آتے جاتے لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی اور جس کا جدھر منہ تھا اس نے اسی طرف پناہ کے لیے دوڑ لگا دی۔ دوڑنے کے ساتھ ساتھ میں راہ مفر بھی دیکھ رہا تھا۔ میرے عقب سے ایک تواتر سے گولیاں چلنا شروع ہو گئیں۔ آتشی برسات سے بچنے کی خاطر مجھے پہلی گلی دکھائی دی تو میں اسی گلی میں گھس گیا۔

وہ گلی کافی لمبی اور چوڑی تھی۔ میں رکا نہیں، بھاگتا رہا۔ وہ تو بلا کی طرح اچانک نازل ہوئے تھے۔ یوں بھاگنے کی وجہ سے ٹانگیں شل ہو گئی تھیں لیکن دشمن موت کی صورت میں پیچھے پڑے تھے۔ دفعتاً میرا پیر رپٹا اور میں اچھل کر منہ کے بل گر گیا، عین اسی لمحے گولی چلی اور فضا مرتعش ہوئی۔ صد شکر کہ اچانک گرنے کے باعث میرا چہرہ زمین سے رگڑ نہیں کھا گیا تھا ورنہ چہرہ زخمی ہو جاتا۔

میں نے اٹھنے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہ کی اور درانہ وار دوڑ لگا دی۔ اس طرح کی صورت حال سے پہلے بھی میرا کئی بار واسطہ پڑا تھا لیکن اِس وقت صورت حال مختلف تھی۔ وہ بدبخت پانچ منش تھے اور میں اکیلا۔ کالونی کے لوگوں نے اپنے اپنے گھروں کے دروازے بند کر لیے تھے۔ ماؤں نے دہل کر بچوں کو چھپا لیا تھا اور جو گلیوں میں موجود تھے وہ کونوں کھدروں میں چھپ گئے تھے۔ میرے پاس ریوالور ہوتا تو میں بھی ان پر جوابی فائرنگ کرتا۔ اب میں زگ زیگ کے انداز میں بھاگ رہا تھا کیونکہ دشمن جان تواتر سے مجھ پر فائرنگ کر رہے تھے۔ کئی گولیاں میرے قدموں کے قریب زمین پر لگی تھیں اور پختہ فرش کے کئی ذرے میری ٹانگوں پر لگے تھے۔ ایک لمحے کے لیے تو میں بری طرح بدکا تھا لیکن بہ سرعت میں نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

کچھ ہی فاصلے پر بائیں طرف ایک گلی دکھائی دی تو میں اس گلی میں مڑ کر دوڑتا چلا گیا۔ میرا سانس پھول گیا تھا۔ دشمن سر پر تھے اس لیے چند لمحوں کے لیے بھی میں سستانے کا متحمل نہیں تھا۔ جس گلی میں، میں دوڑ رہا تھا وہ آگے ایک بڑی گلی سے مل رہی تھی اور وہ گلی مین روڈ کی طرف جا رہی تھی۔

میں پوری رفتار سے دوڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مین گلی میں پہنچتے ہی میں نے مین سڑک پر پہنچنے میں ذرا بھی دیر نہ لگائی کیونکہ یہ زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ مین سڑک پر پہنچتے ہی مجھے ایک پلازا دکھائی دیا تو میں بلا تامل پلازے میں گھستا چلا گیا۔ مجھے یقین تھا کہ دشمنوں میں سے کسی کی نظر بھی مجھ پر نہیں پڑی ہوگی اور میں بہ آسانی پلازے کے دوسرے گیٹ سے نکل کر ایک اور مین سڑک پر پہنچ گیا تھا۔

مسلسل دوڑنے کے باعث میرا سانس اکھڑ چکا تھا۔ لمبے لمبے سانس لینے کے باعث میرا سینہ پچک اور پھول رہا تھا۔ راہ گیر مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے گزر رہے تھے۔ ایک بار تو میں نے رکوع کے بل جھک کر اپنا سانس اعتدال پر لانے کی کوشش کی تھی اور میں کافی حد تک کامیاب بھی ہو گیا تھا۔ خطرہ ابھی بھی سر پر منڈلا رہا تھا اس لیے میں جلد سے جلد وہاں سے رفو چکر ہونا چاہتا تھا تا کہ کسی محفوظ جگہ پر پہنچ کر دیال سنگھ کو کال کروں گا اور اس کے ساتھ اس کے ٹھکانے پر پہنچ جاؤں گا۔ قبل اس کے کہ میں پیش قدمی کرتا، دفعتاً ایک کار میرے سامنے آ کر رکی، میں نے بے اختیار چونک کر کار کی طرف دیکھا تو اگلے ہی پل مجھے اپنے دماغ میں چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہوئیں اور پورے جسم میں سنسناہٹ کی ایک لہر دوڑتی چلی گئی۔

(لمحہ بہ لمحہ بدلتے واقعات پر مشتمل داستان جاری ہے)

فیملی اسپتال

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم!
ایک اور سچ بیانی کے ساتھ حاضر ہوں۔ یہ سچ بیانی سنتے ہی میں نے اسے سرگزشت کے لیے قلمبند کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس سچ بیانی میں نام مقام بدل دیے ہیں تاکہ ان کرداروں میں سے کسی کو اعتراض نہ ہو۔ اسے صرف اس وجہ سے کہانی کی شکل دی ہے کہ لوگ سمجھ لیں، قسمت کسی کا بھی ساتھ دے سکتی ہے بشرط یہ کہ آپ ایماندار ہوں۔ راہ حق پر ہوں۔ اُمید ہے کہ یہ سبق آموز سچ بیانی قارئین کو بھی پسند آئے گی۔
غلام قادر
(کراچی)

میں سویرا ہوں، پانچ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی ہوں۔ لوگ مجھے ڈاکٹر سویرا منیر کے نام سے پہچانتے ہیں۔ میری کہانی اس وقت شروع ہوتی ہے جب میرے بھائی سجاد چھ برس بعد امریکا سے واپس آرہے تھے۔ چھ

برس پہلے وہ سٹی یونیورسٹی آف نیویارک میں اسکالرشپ حاصل کرکے گئے تھے۔ انہوں نے کراچی سے میڈیکل میں ٹاپ کرنے کے بعد امریکن یونیورسٹی میں داخلہ اور اسکالرشپ کے لیے اپلائی کیا تھا جو ان کی قابلیت دیکھتے ہوئے منظور کرلی گئی تھی۔

ائرپورٹ پر رخصت ہوتے ہوئے سجاد بھائی نے ہمیں تسلی دی تھی ”چار برس کی تو بات ہے یوں پلک جھپکتے گزریں گے کہ پتا بھی نہیں لگے گا۔“

وہ امریکا چلے گئے اور ہارٹ سرجری میں اسپلائزیشن کی تعلیم حاصل کرنے لگے تھے۔

چار سال گزر گئے لیکن وہ واپس نہ آئے۔ جب ابا نے ان سے اصرار کیا تو انہوں نے بتایا کہ تعلیم تو مکمل ہوگئی ہے لیکن اسکالرشپ کی شرط تھی کہ وہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد کم از کم دو برس وہاں پڑھائیں گے۔ ہم سب کے پاس انتظار کرنے کے علاوہ کوئی راستہ بھی نہیں تھا اس لیے صبر کرلیا۔

ان چار برسوں میں سجاد بھائی فون کرتے رہے تھے اور کچھ نہ کچھ رقم بھی بھیج دیتے تھے لیکن جب سے انہوں نے جاب شروع کی تھی اس کے بعد رقم بہت زیادہ ہوگئی تھی۔ ابا نے رقم زیادہ آنے کے باوجود اخراجات میں کوئی اضافہ نہیں کیا اور رقم بچاتے رہے اور جب رقم اتنی ہوگئی تو انہوں نے گلشن میں چار سو گز کا ایک گراؤنڈ پلس ون مکان لے کر ہمیں اس نواحی بستی کے ایک سو بیس گز کے مکان سے وہاں شفٹ کردیا۔ مکان خریدنے سے پہلے انہوں نے بھائی سے بات کی تو بھائی نے کہا اگر رقم کم ہو رہی ہو تو میں اور بھیج دیتا ہوں لیکن ابا نے کہا۔ ”جو رقم تم بھیجتے رہے ہو اسی میں سے میں نے مکان خریدا ہے۔“

سجاد بھائی جب امریکا جارہے تھے تب ہم تینوں بہنیں اسکول میں تھیں۔ بڑی بہن کا جیسے ہی میٹرک کا نتیجہ آیا تو تایا اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر آگئے لیکن ابا نے اعتراض کیا۔ ”لڑکا بینک ملازم ہے ہمیں یہ رشتہ منظور ہوگا اگر آپ کا بیٹا بینک کی نوکری چھوڑ دے گا۔“

ابا کے اعتراض کے بعد تایا واپس تو ہوگئے لیکن جاتے جاتے کہہ گئے۔ ”بھائی تمہیں بینک کی نوکری پر اعتراض کیا ہے؟“

”بینک سودی کاروبار کرتا ہے اور سود اسلام کے مطابق حرام ہونے کے ساتھ اسے اللہ سے جنگ قرار دیتا ہے۔“ ابا نے کہا تھا۔

تایا یہ کہتے ہوئے چلے گئے تھے۔ ”مولوی صاحب یہ لاکھوں لوگ جو بینکوں میں نوکری کرتے ہیں کس کس کی نوکری چھوڑنے کے لیے کہوگے۔“ تایا کی بڑبڑاہٹ اتنی

بلند تھی کہ ابا سمیت ہم سب نے سنی تھی لیکن ابا نے جواب دینے کی بجائے خاموشی اختیار کرلی تھی۔

اسی اتوار جب بھائی کا فون آیا تو ابا نے تمام گفتگو ان کے گوش گزار کردی اس پر بھائی نے کہا۔ ''ابا میں آپ کی بات سے سو فیصد متفق ہوں لیکن تایا کی بات بھی غلط نہیں ہے۔''

''میں دیکھ رہا ہوں کہ امریکی ماحول تم پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ اللہ پر توکل کرنا بھی کوئی چیز ہے۔ حرام کو حرام سمجھنے کے باوجود اسے جاری رکھنا گناہ کبیرہ ہے اور اللہ سے جنگ کرنے والے سے میں اپنی بیٹی کا رشتہ کسی طور پر نہیں کرسکتا۔'' ابا کا جواب تھا اور بھائی نے خاموشی اختیار کرلی تھی۔ بات تقریباً بگڑ چکی تھی کہ اچانک ہی ابا کے ایک دوست نے جس کی ٹریولنگ ایجنسی تھی اور ان کا اصل کام قافلوں کو زیارتوں اور عمرہ پر لے جانا تھا انہوں نے ابا سے کہا کہ مجھے ایک ایسا پڑھا لکھا شخص دیں جو بینک کے کام نمٹا سکے۔ ابا نے اسی شام تایا سے رابطہ کیا اور تایا نے تنخواہ اور کمیشن کا سن کر ہامی بھرنے میں دیر نہیں کی اور اسی ہفتہ بہن کی منگنی ہوگئی اور دو ماہ بعد سب سے بڑی بہن ہاجرہ اپنے گھر کو سدھاریں۔ ابا نے بہت اچھے جہیز کا بندوبست کیا تھا اس کے لیے رقم بھائی نے ہی بھیجی تھی۔ بڑی بہن کی شادی کے چند روز بعد دوسری بہن کا رشتہ آگیا۔ ساجدہ یوں بھی پڑھنے میں زیادہ سنجیدہ نہیں تھیں نویں میں بھی وہ ایک پیپر کلیئر نہیں کرسکی تھیں ان کی زیادہ دلچسپی کچن اور کپڑوں کی سلائی میں تھی۔ وہ محلے کی اکثر لڑکیوں کے کپڑے بلامعاوضہ سیتی تھیں۔ جب انہوں نے میٹرک سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا تو سابقہ محلہ ہی کے ایک گھر سے پیغام آیا مگر ابا نے فوراً ہی وہ رشتہ منظور نہیں کیا۔ عبدالغنی نامی یہ لڑکا پولیس میں انسپکٹر تھا، ابا نے اعتراض اس کی ملازمت پر کیا تھا۔ اس پر اکبر کی والدہ نے جو رشتہ لے کر آئی تھیں کہا۔ ''مولوی صاحب میری بات کا یقین کریں غنی نے آج تک ایک روپیا بھی رشوت نہیں لی۔'' انہوں نے پورے یقین کے ساتھ کہا تھا۔

''آپ یقیناً غلط بیانی نہیں کر رہی ہیں لیکن میں مستقبل کی بات کر رہا ہوں۔'' ابا نے کہنا شروع کیا اور عبدالغنی کی والدہ نے پوری توجہ سے سنا۔

''میرا کہنا یہ ہے کہ اب تک تو آپ کے بیٹے نے رشوت نہیں لی لیکن شادی کے بعد جب ضروریات بڑھیں گی اور بچوں کے بعد ضروریات مزید بڑھیں گی تو ان بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے وہ مجبور ہو جائے گا کہ رشوت لے اور اللہ کا فرمان ہے کہ رشوت لینے اور دینے والے کا ٹھکانا دوزخ کے علاوہ اور کہیں نہیں۔'' ابا کی بات پر غنی کی والدہ نے کہا:

''بھائی میں آپ سے اختلاف نہیں کروں گی لیکن یہ کہنا چاہتی ہوں کہ پولیس کی نوکری تو غنی نے اپنے شوق میں کرلی مگر ہماری فیصل آباد میں زمینیں بھی ہیں۔ غنی کے ابا کے بعد میں اپنی سسرال منتقل ہونے پر مجبور ہوگئی تھی اور اسی وجہ سے غنی پی ایس سی کے بعد سندھ پولیس میں شامل ہوگیا تھا ورنہ غنی کے والد نے کبھی نوکری نہیں کی تھی اور ہمارا گزارہ زمینوں کی آمدنی پر ہی ہوتا تھا۔''

''مجھے اس رشتہ پر کوئی اعتراض نہ ہوگا اگر آپ کا صاحبزادہ پھر سے زمینیں آباد کرے۔'' ابا نے کہا۔ اس کے ایک ہفتہ بعد ہی غنی کی والدہ نے اطلاع دی کہ ان کے بیٹے نے پولیس کی نوکری چھوڑ دی ہے اور فیصل آباد منتقل ہوگیا ہے۔ کچھ عرصے بعد انہوں نے اطلاع دی کہ غنی نے زمینوں پر مکمل کنٹرول حاصل کرلیا ہے اور زرعی بینک سے قرضہ لے کر ٹریکٹر بھی لے لیا ہے۔

ابا نے اس اطلاع پر کوئی خاص ردعمل ظاہر نہیں کیا صرف اتنا کہا۔ ''کچھ دن مزید انتظار کرلیتے ہیں۔'' ساتھ ہی ابا نے بھائی کو فون کرکے اطلاع دے دی اس پر بھائی نے آفر کی تھی کہ میں رقم بھیج دیتا ہوں غنی سے کہیں کہ بینک کی رقم فوری طور پر واپس کردے۔ ابا نے اس کے جواب میں بھائی کو غنی کا موبائل نمبر دے دیا اور کہا۔ ''بہتر ہوگا یہ بات تم براہِ راست کرلو۔''

اگلے ہفتے بھائی کا فون آیا تو انہوں نے بتایا کہ میری غنی سے بات ہوئی اور اسے آفر بھی کی لیکن اس نے شکریہ کے ساتھ کہا۔ ''مجھے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے دیں۔''

بہن کی منگنی ہوگئی اور شادی کے لیے اگلی فصل تک کا انتظار کرنے کے لیے کہا گیا۔ بھائی کا وعدہ تھا کہ وہ دوسری بہن کی شادی میں ضرور آئیں گے لیکن وہ وعدہ وعدہ ہی رہا جس روز بھائی کو امریکا سے روانہ ہونا تھا اس روز ان کا فون آگیا۔ ''امتحانات شروع ہونے والے ہیں اس لیے انہیں چھٹیاں نہیں مل رہی ہیں۔''

ساجدہ کی شادی کے وقت میں آٹھویں جماعت پاس کرکے نویں میں آچکی تھی تب بھائی سے میری بات ہوئی تو

انہوں نے کہا۔ ''سویرا مجھے تم سے بہت زیادہ اُمیدیں ہیں اس لیے خوب دل لگا کر تعلیم پر توجہ دو۔''

بھائی کی بات سن کر میں نے کہا۔ ''کیا فائدہ ابا کالج تو جانے نہیں دیں گے میٹرک کے بعد میری بھی شادی کردیں گے۔'' میں یہ کہتے ہوئے روہانسی ہوگئی تھی۔

''تم محنت کرو ابا سے میں بات کرلوں گا اُمید ہے کہ وہ تمہاری تعلیم میں رکاوٹ نہیں بنیں گے باقی کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دو۔'' بھائی نے کہا۔

میں نے بھائی کی بات گرہ میں باندھ لی اور تعلیم پر اس قدر توجہ دی کہ مجھے اور کسی بات کا ہوش نہیں رہا تھا۔ نویں میں اسکول میں اوّل رہی تھی اس پر بھائی سے بات ہوئی تو انہوں نے کہا اسکول میں ٹاپ کرنا بڑی بات تو ہے لیکن اتنی بڑی بات نہیں کہ تم اس نشہ میں گم ہو جاؤ۔ میٹرک میں پوزیشن لاؤ تو تمہارے راستے کی تمام دیواریں خود بخود گر جائیں گی۔ بھائی کی پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی تھی۔ ابا نے میرا رزلٹ دیکھتے ہوئے کالج میں داخلہ کی اجازت دے دی اور میں نے کالج جانا شروع کردیا۔ ابھی سیکنڈ ائر میں تھی کہ خالہ اپنے بیٹے کا رشتہ لےکر آگئیں تو اماں نے فوراً ہی اپنی رضامندی ظاہر کردی لیکن ابا نے کہا۔ ''ابھی سویرا چھوٹی ہے اور پڑھ بھی رہی ہے اس لیے اپنی بہن سے کہو کہ انتظار کرلے۔''

ابا کا لہجہ اتنا دو ٹوک تھا کہ اماں کو اس کے آگے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی اور خالہ کسی حد تک مایوس ہو کر چلی گئیں۔ میں راستے کی دیوار ہٹ جانے پر خوش تھی۔

بھائی کی بات گرہ میں باندھ رکھی تھی اسی لیے کالج میں پڑھائی کی طرف توجہ کم نہ ہوئی۔ میٹرک میں میری بورڈ میں تیسری پوزیشن آئی تھی وہ میں نے انٹر میں بھی برقرار رکھی بلکہ بہتر بنائی اور بورڈ کے امتحانات میں میری دوسری پوزیشن آنے پر میڈیکل کالج میں داخلہ یقینی ہوگیا تھا۔ اب وقت آگیا تھا کہ ابا کے سامنے اپنا مدعا رکھوں اور میں نے تمام ہمت جمع کرکے ان سے بات کرلی تو ابا کا موڈ آف ہوگیا۔

''لڑکوں کے ساتھ پڑھوگی۔'' ابا نے تلخ لہجہ میں کہا تھا۔

''ابا اس میں کیا برائی ہے۔'' میں نے آہستہ لہجہ میں کہا تھا پھر بھی ابا کی تیوریاں چڑھ گئی تھیں۔

''ابا، بھائی نے بھی تو لڑکیوں کے ساتھ پڑھا

1936ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام جب عمل میں آیا تو اس وقت تک انقلاب روس کے سیاسی اور سماجی اثرات کی لہریں ہندوستان کی سیاست اور معاشرتی ٹھہراؤ میں کافی اضطراب پیدا کرچکی تھیں۔ انجمن کے قیام سے تین برس ادھر بدنام زمانہ افسانوں کے مجموعے ''انگارے'' کی اشاعت ادبی اور فکری سطح پر پھینکا ہوا پہلا پتھر تھا جس نے اس دور میں قدیم اور جدید کی آویزش کو شعلہ فشاں کردیا۔ انجمن کے قیام کے تین برس ادھر دوسری جنگ عظیم کا چھڑ جانا، ہندوستان کے ادبی باغی ذہن کے لیے ایک اور سنہرا دور لے آیا۔ چنانچہ 1936ء سے 1946ء کے دس گیارہ برسوں میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے پلیٹ فارم سے ایک ایسے ذہنی اور فکری انقلاب کی آبیاری کا سرچشمہ جاری وساری رہا جس نے اس دور کی نئی اور پرانی، ادبی اور فکری میدانوں میں نئی نسل کی انقلابی خطوط پر پرورش کی۔ اس ماحول میں سیاست کی انقلابی روش، ایجی ٹیشنز، پکٹنگ، سول نافرمانیوں کا ایک سلسلہ جاری رہا۔ ان حالات نے ہندوستان کے ادیبوں اور شاعروں کے ادبی لہجے کو بھی متاثر کیا۔ برس ہا برس سے ان کی آنکھیں تبدیلی اور انقلاب کے جو خواب دیکھتی چلی آتی تھیں، اب ان کی تعبیر ان کی کھلی آنکھ کے سامنے ہونے لگی تھی۔

چنانچہ انجمن ترقی پسند مصنفین سے منسلک تمام شعراء اور ادباء نے عوامی جدوجہد کی حمایت میں اپنی تخلیقی کاوشوں کا رخ موڑ دیا۔ انجمن کے بانی اراکین میں سے ڈاکٹر ملک راج آنند اور سجاد ظہیر تھے۔ سجاد ظہیر نے ترقی پسند مصنفین کے سامنے ان کے مقاصد کی واضح نشان دہی کرتے ہوئے لکھا تھا۔

''ترقی پسند تحریک کا رخ ملک کے عوام کی جانب مزدوروں، کسانوں اور درمیانی طبقے کی جانب ہونا چاہیے ان کو لوٹنے والوں اور ان پر ظلم کرنے والوں کی مخالفت کرنا اپنی ادبی کاوشوں سے عوام میں شعور، حرکت، جوش عمل اور اتحاد پیدا کرنا اور ان تمام آثار و رجحانات کی مخالفت کرنا جو جمود رجعیت اور پست ہمتی پیدا کرتے ہیں، ہم شعوری طور پر وطن کی آزادی کی جدوجہد اور وطن کے عوام کی حالت سدھارنے کی تحریکوں میں حصہ لیں اور صرف تماشائی نہ ہوں۔ ترقی پسند دانشوروں مزدوروں اور غریب کسانوں سے ملیں اور ان کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کا حصہ بنیں۔

تھا۔" میں نے دلیل دی لیکن ابا کے ماتھے کی تیوریاں کم نہ ہوئیں۔

"وہ مرد ذات تھا اس کی بات الگ تھی، تم لڑکی ہو تم پر اس طرح اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔" ابا نے کہا اور میرے خواب بکھرتے نظر آئے۔

"اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ میں میڈیکل کی تعلیم کے اخراجات برداشت نہیں کرسکوں گا۔" ابا نے اپنی مجبوریاں بیان کیں۔

"ابا، شاید اس کی ضرورت ہی نہ پڑے، مجھے جو وظیفہ ملتا تھا اس میں سے میں نے کافی رقم بچا رکھی ہے، وہ میرے داخلہ فیس اور کتابوں کے لیے کافی ہوں گی۔" میں نے کہہ تو دیا مگر جب ابا نے کہا کہ وہ سجاد بھائی سے اس سلسلے میں بات کریں گے تو امید کی ایک کرن پیدا ہوئی۔ اگرچہ ابا، بھائی سے اس بات پر ناراض تھے کہ انہوں نے دوسری بہن کی شادی میں وعدہ کے باوجود آنے سے گریز کیا تھا۔

اُمید اور نااُمیدی میں پانچ دن گزارنے کے بعد اتوار کو جب بھائی کا فون آیا تو ابا نے انہیں میری پوزیشن لینے کے بارے میں بتایا تو بھائی نے اسی وقت مجھ سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی اور میں ویڈیو کال کے لیے آگے بڑھ آئی۔

"بہت بہت مبارک ہو سویرا اب بتاؤ میڈیکل میں داخلہ کب لے رہی ہو۔" بھائی نے سوال کیا۔

"بھائی داخلہ تو آرام سے مل جائے گا لیکن ابا کے کچھ اعتراضات ہیں انہیں دور کرنا ضروری ہے۔" میں نے دبی ہوئی آواز میں کہا تھا۔

"فکر نہ کرو میری بہن، ابا کو میں منالوں گا۔" سجاد بھائی نے کہا تو ابا آگے بڑھ آئے۔

"سجاد میں ریٹائر ہوچکا ہوں اور گزارہ پنشن پر ہے۔" ابا نے کہا۔

"رقم کی تو آپ بالکل بھی فکر نہ کریں، صرف سویرا سے کہیں کہ وہ بینک میں اکاؤنٹ کھلوالے میں ہر ماہ الگ سے اس کے اکاؤنٹ میں پیسے ڈلوادوں گا۔" بھائی نے ابا کا ایک اعتراض ایک فقرہ میں رد کردیا تھا۔

"بیٹا وہاں لڑکے بھی ہوں گے۔" ابا نے اپنا اصل اعتراض دہرایا۔

"ابا مجھے ایک بات بتائیں جب اللہ کے رسول نے یہ کہا تھا کہ علم حاصل کرو چاہے اس کے لیے چین ہی جانا پڑے تو کیا انہوں نے مرد اور عورت کے درمیان تخلیص کی تھی کہ مرد جائے اور خواتین نہ جائیں۔" بھائی کی دلیل ایسی تھی کہ ابا کچھ نہ بول سکے تھے۔ بھائی نے مزید کہا کہ باپردہ رہ کر اب تو عورتیں ہوائی جہاز بھی اڑانے لگی ہیں۔

"سجاد تم میری بات سمجھ نہیں رہے ہو۔" ابا نے کہا لیکن ان کی آواز سے وہ جان نکل چکی تھی جس کے لیے وہ مشہور تھے جس کی ہم بہن بھائیوں کے ساتھ اماں کو بھی عادت ہوچکی تھی۔ ابا کی بات پتھر پر لکیر ہوتی تھی اور جب سے انہوں نے اپنی دونوں بیٹیوں کی شادی میں اپنی بات منوائی تھی اس کے بعد ان کا لہجہ بالکل ہی حتمی ہوچلا تھا صرف بھائی کی بات وہ سن لیتے تھے اور ان میں سے اکثر مان بھی لیا کرتے تھے۔ ابا سے بات کرنے کے بعد بھائی نے ایک بار پھر مجھ سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی اور مجھ سے کہا۔

"کل ہی اکاؤنٹ کھلوالو اور جیسے ہی مجھے اکاؤنٹ نمبر بھجواؤ گی میں اس میں دو ہزار ڈالر ڈلوادوں گا لیکن یہ تمہاری پڑھائی کے لیے نہیں ہوگا بلکہ اس سے تم ایک گرینڈ پارٹی ارینج کرنا جس میں رشتہ داروں کے علاوہ اپنی ٹیچرز اور کلاس فیلوز کو بھی بلالینا۔ رقم کم پڑے تو بتانا میں اور رقم بھی بھجواسکتا ہوں۔" بھائی نے گفتگو میں وقفہ دیا۔ "تمہارے تعلیمی اخراجات میں ہر ماہ تمہارے اکاؤنٹ میں ہزار ڈالر ڈال دوں گا۔" انہوں نے کہا اور میں خوشی میں یہ بھی نہ کہہ سکی کہ میرا اسکالرشپ جاری رہے گا اور اس سے میرے تعلیمی اخراجات پورے ہوتے رہیں گے۔

اگلے روز صبح میں ابا کے ساتھ بینک گئی اور اپنے نام کا اکاؤنٹ کھلوالیا۔ اس کے بعد میں میڈیکل کالج گئی اور فارم لے کر آگئی۔

"بہت خوش لگ رہی ہو۔" واپسی کے راستہ میں ابا نے مسکراتے ہوئے کہا اور میں ہنس دی تھی۔

"برسوں کی محنت کے بعد سامنے منزل نظر آرہی ہو تو خوش ہونا میرا حق بنتا ہے۔" میں نے جواب میں کہا اور ابا نے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا:

"دیکھو میرے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچے۔" اور میں صرف مسکرا دی یہ بھی نہیں کہا کہ ابا میں آپ کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔

میڈیکل کالج کی فیس میں نے جمع کرادی اور پھر چار روز بعد کلاسیں شروع ہوئیں تو میں نے میڈیکل کالج جانا

شروع کر دیا۔ دو سال خاموشی سے گزر گئے مگر جب تیسرے سال میں آئی تو خالہ ایک بار پھر بیٹے کا رشتہ لے کر آ گئیں۔ ندیم کرکٹ کا اچھا کھلاڑی تھا۔ انڈر نائنٹین کی ٹیم لیڈ کر چکا تھا۔ اگرچہ فائنل میں ٹیم ہار گئی تھی لیکن ندیم بیٹنگ اور باؤلنگ کی اوسط میں سرفہرست رہا تھا۔ اس بار خالہ زیادہ زور و شور سے آئی تھیں۔ انہوں نے آتے ہی بتایا کہ ندیم کو پی آئی اے نے جاب آفر کر دی ہے۔ اماں تو پہلے ہی بھانجے سے متاثر تھیں اب جو خالہ نے دوبارہ سے رشتے کی بات کی تو اماں صدقے واری جانے لگی تھیں۔ انہوں نے بہن سے "ان" سے بات کرنے کی بات کی مگر جب ابا سے بات کی تو ابا نے فوری طور پر انکار کر دیا:

"ندیم نے صرف بی ایس سی کیا ہے اور میری بیٹی ڈاکٹر بننے والی ہے۔" ابا نے کہا۔

"ارے بیٹی ڈاکٹر بن گئی تو اس کا بیاہ نہیں کرو گے؟" اماں اس بار بھانجے کی محبت میں ابا کے سامنے ڈٹ گئی تھیں۔

"ضرور بیاہوں گا لیکن کسی بی اے یا بی ایس سی والے سے نہیں بلکہ اس کے ہم پلہ کوئی ملا تو اس سے بیاہوں گا۔" ابا کے لہجہ میں قطعیت تھی پھر بھائی سے بات کرنے پر بات ٹل گئی۔

دو روز بعد بھائی کا فون آیا تو ابا نے اکیلے میں ان سے بات کی پھر مجھے طلب کیا گیا تو بھائی نے مجھ سے دریافت کیا کہ تمہیں تو اس رشتہ پر اعتراض نہیں۔ میں نے سر جھکا کر کہا کہ بھائی آپ اور ابا جو بھی فیصلہ کریں گے مجھے منظور ہوگا اور ابا نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی اور کہا کہ ایسی ہوتی ہی بیٹیاں۔

بھائی نے شرط رکھی تھی کہ فی الحال کوئی رسم نہ رکھی جائے اور دو سال بعد جب تعلیم مکمل ہو تو شادی کر دی جائے۔ میری قسمت کا فیصلہ ہو رہا تھا اس لیے میں خاموش نہ رہ سکی۔ بھائی ایم بی بی ایس کے بعد مجھے پوسٹ گریجویشن کرنا ہے تو بھائی ہنس دیئے تھے۔

"کر لینا پوسٹ گریجویشن بھی، میرا نہیں خیال کہ ندیم تمہیں اس سے روکے گا بلکہ میں خود ندیم سے بات کروں گا۔" بھائی نے کہا تھا۔

اس وقت تک بات آئی گئی ہو گئی لیکن اگلے روز میں کالج جانے کے لیے گھر سے نکل رہی تھی تو خالہ گلی میں مل گئیں۔

"کالج جا رہی ہو بہو۔" انہوں نے کہا اور میرے ذہن میں خطرے کی پہلی گھنٹی بجی تھی پھر جب میں کالج سے تین بجے کے قریب گھر پہنچی تو خالہ تب تک وہیں موجود تھیں۔ وہ سب اماں کے کمرے میں تھے، ندیم بھی وہیں تھا۔ میں نے پہلی بار ندیم کو غور سے دیکھا تھا خاصہ ہینڈسم اور کھلتی رنگت والا نوجوان تھا۔ پھر اماں نے مجھے الگ سے بلوا کر بتایا کہ پرسوں تمہاری منگنی ہے۔ یہ اطلاع ایسی تھی کہ میں خاموش نہ رہ سکی۔

"مگر اماں فیصلہ تو کچھ اور ہوا تھا۔" میں نے کہا۔

"فیصلہ تو کچھ اور ہی ہوا تھا مگر تمہاری خالہ کی صبح سے ضد تھی کہ جب رشتہ قبول کر لیا ہے تو کوئی چھوٹی سی رسم بھی ہو جائے۔ اس پر تمہارے ابا نے سجاد سے بات کی اور تمہاری خالہ نے اس سے بھی وہی بات کی جو صبح سے مجھ سے اور تمہارے ابا سے کر رہی تھیں۔"

"بالکل سادہ سی تقریب ہوگی صرف ہمارے اور آپ کے گھر والے ہی شریک ہوں گے۔" بھائی نے کہا تھا۔ ہماری ایک بہن تو فیصل آباد میں ہے اس پر خالہ کا جواب تھا۔ کون سا فیصل آباد دوسرے ملک میں ہے، ڈیڑھ گھنٹے کی تو فلائٹ ہے پھر میں نے تمہاری بہن اور بہنوئی سے بات کی تو انہوں نے بھی کہا کہ وہ پرسوں صبح تک پہنچ جائیں گے اور تمہارے ابا نے حامی بھر لی کہ وہ انہیں ائرپورٹ سے لے آئیں گے۔

جو کچھ ہو رہا تھا وہ میری توقعات کے مطابق نہیں تھا۔ منگنی ہو گئی مگر اس کے بعد جو ہوا اس نے مجھے بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ میں میڈیکل کے تینوں سال اوّل پوزیشن لیتی رہی تھی لیکن منگنی کے بعد ندیم کا فون آ جاتا اور دو گھنٹے سے پہلے جان ہی نہیں چھوڑتا تھا۔ اس سے میری پڑھائی میں بھی حرج ہوتا اور موضوع ہوتا تھا کرکٹ جو میرے لیے ایسا کھیل تھا جس کے بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم تھا۔ یہ بھی نہیں کہ لانگ لیگ کو لانگ لیگ کیوں کہتے ہیں یا ان سوئنگ اور آؤٹ سوئنگ بال میں کیا فرق ہوتا ہے۔

ندیم کی بدتمیزیاں اپنی جگہ لیکن ایک اور چیز جس نے مجھے زیادہ پریشان کیا وہ یہ تھی کہ وہ چھوٹی سی تقریب جس میں صرف گھر کے افراد شریک تھے اس کی ویڈیو اور تصاویر سوشل میڈیا پر وائرل کر دی گئی تھیں اور پھر وہ تصاویر اخبارات نے بھی شائع کیں۔ ندیم ایک ابھرتے ہوئے کھلاڑی کی وجہ سے چھوٹا سا وی آئی پی تو تھا ہی اور میڈیا کے

لیے اس کی ایک حیثیت کم ہی سہی لیکن تھی تو سہی، اس پر غضب یہ ہوا کہ کچھ ٹی وی چینلو نے ندیم کو اس کی منگنی کے حوالے سے بلوایا تو اس نے اس کی تردید نہیں کی بلکہ کہا کہ سویرا میری کزن ہے اور میری بچپن سے خواہش تھی کہ وہ میری شریک حیات بنے ساتھ ہی اس کا کہنا تھا کہ وہ مجھے بچپن سے چاہتا تھا جبکہ اس کا اظہار اس نے کبھی نہیں کیا تھا۔ میری کلاس فیلوز کے لیے یہ بڑی باتیں تھیں۔ اب وہ مجھے ندیم کے نام سے چھیڑنے لگی تھیں، خاص طور پر میری کلاس فیلو روبینہ جوان سب سے آگے تھی لیکن مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ ایک بار اس نے مجھ سے کہا۔ ''وی آئی پی بن کر بچپن بھول نہ جانا۔'' اور میں حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

''وی آئی پی اگر بنے گا تو ندیم بنے گا میں تو زیادہ سے زیادہ اس کی بیوی ہوں گی۔''

روبینہ ایک امیر باپ کی بیٹی تھی، بڑی سی گاڑی میں کالج آتی تھی اور جتنا وقت وہ کلاس میں ہوتی اس کی گاڑی اور ڈرائیور اس کے منتظر رہتے تھے۔ اس دوران قائداعظم ٹرافی شروع ہوگئی اور ندیم کی پرفارمنس اس میں بہت بہتر رہی۔ اخبارات میں اس کی قومی ٹیم میں شمولیت کی پیش گوئیاں شروع ہوگئیں لیکن میرے لیے اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ روبینہ سمیت بہت سی لڑکیاں مجھے آکر اس سلسلہ میں بات کرنا چاہتی رہیں لیکن میں انہی ٹالتی رہی۔ اب میرا فائنل ائر شروع ہو چکا تھا اور مجھے اپنی پہلی پوزیشن برقرار رکھنے کے لیے زیادہ محنت کرنی تھی۔ اس تمام عرصہ میں میری سجاد بھائی سے بات ہوتی رہی تھی اور وہ میری کارکردگی سے بہت خوش تھے لیکن مجھے ان کی خوشی سے زیادہ رمیز کی فکر تھی۔ رمیز مجھ سے سینئر تھا اور اس نے دو برس پہلے میڈیکل میں ٹاپ کیا تھا۔ مجھے جب کوئی چیز سمجھ نہ آتی تو میں اس کے پاس چلی جاتی اور وہ پوری توجہ سے میری مشکل حل کر دیتا لیکن ندیم سے میری منگنی کی خبروں کے ساتھ اس کا رویہ اکھڑا اکھڑا رہنے لگا تھا۔ فائنل ائر میں ایک چیز سمجھنے میں اس کے پاس گئی تو اس نے عجیب سے انداز میں کہا۔

''میرے پاس کیوں آئی ہو۔''

میں حیرت زدہ رہ گئی اور دھیمے لہجے میں بولی ''رمیز ایسا کیوں کہہ رہے ہو تمہارے پاس نہ آؤں تو کہاں جاؤں۔''

اس نے اکھڑے لہجے میں کہا۔ ''اپنے منگیتر سے کیوں نہیں پوچھ لیتیں جو تمہاری محبت کا ٹی وی پر دم بھرتا ہے۔''

جواب میں، میں یہ نہ کہہ سکی کہ وہ کرکٹ کا کھلاڑی ہے اسے میڈیکل کی کیا سمجھ ہوگی۔

میں کچھ بھی کہے بغیر وہاں سے اٹھ آئی تو رمیز کچھ دیر بعد میرے پاس آیا اور بولا۔ ''میں لائبریری جا رہا ہوں وہیں آجاؤ۔''

میں جانا نہیں چاہتی تھی لیکن میں چلی گئی جہاں رمیز میرا منتظر تھا۔

پہلے تو رمیز نے اپنے رویہ کی معذرت کی پھر کہا یہ وہ سوال تھا جس پر میں بھی الجھ گیا تھا لیکن ہماری سرجری کی استاد نے میری یہ مشکل حل کر دی تھی۔

میں رمیز سے وہ مشکل حل کرا کے واپس آئی تو مجھے احساس ہوا کہ رمیز کی ناراضگی بلاوجہ نہیں تھی۔ میں اس رات اسی ادھیڑ بن میں رہی اور اگلے روز کالج بھی وقت پر نہ پہنچ سکی لیکن کالج کے گیٹ کے ساتھ ہی ندیم کو گاڑی میں دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ''چلو جلدی سے کار میں بیٹھ جاؤ۔'' اس نے حکم دینے والے انداز میں کہا تھا۔

مجھے پہلی بار اس کے اس انداز پر غصہ آگیا تھا میں نے کہا۔ ''ندیم ہوش میں تو ہو۔''

میرا لہجہ تلخ تھا مگر ندیم نے برا مانے بغیر کہا۔ ''آج فائنل ہے اور میں اپنی ٹیم کے کھلاڑیوں سے وعدہ کر کے آیا ہوں کہ میں اپنی منگیتر کو لے کر آرہا ہوں۔''

میرا پارہ چڑھ گیا۔

''بھاڑ میں گیا تمہارا فائنل۔'' میرے تلخ لہجہ کے ساتھ آواز بھی کچھ بلند ہوگئی تھی۔ ''کس بنیاد پر تم نے وعدہ کر لیا تھا۔'' میں نے کہا۔ ندیم کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے تھے۔ ''تم نے مجھ سے کئی بار باہر ملنے اور ہائی ٹی پر جانے کی بات کی تھی اور میں ہر بار انکار کرتی رہی تھی، اس کے باوجود مجھے بتائے بغیر تم نے مجھے لے جانے کی بات کر دی۔'' میں اب واقعی غصہ میں آچکی تھی۔

''سویرا تم میری منگیتر ہو میری ہونے والی بیوی ہو۔'' ندیم اپنی بات پر ڈٹا رہا تھا۔

''میں منگیتر ہوں تمہاری زرخرید نہیں کہ تم جب چاہو مجھے ساتھ لے کر گھومتے رہو۔'' میں نے کہا۔ ''میں تم سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں اور آج پھر دہرا رہی ہوں کہ ایک کزن کی حیثیت سے میں تمہیں کالج کی کینٹین میں چائے اور

اسنیک کی آفر کرسکتی ہوں لیکن تمہارے ساتھ پبلک مقام پر نہیں جاؤں گی اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔''
''تو تم نہیں جاؤ گی؟'' ندیم نے سوال کیا اور میں نے اسے گھور کر دیکھا۔
''آخری فیصلہ کا مطلب ہے کہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔'' میں نے کہا۔ ندیم تلملاتا ہوا چلا گیا۔ میں اسے وہاں سے جاتا دیکھتی رہی اس کے ساتھ ہی میری نظر رمیز پر پڑی تھی جو اس وقت کالج پہنچا تھا اور اپنی موٹر سائیکل کھڑی کررہا تھا۔ ندیم کے جانے کے بعد میں کلاس میں آگئی جہاں دن بھرا الجھن کا شکار رہی۔ زیادہ الجھن مجھے روبینہ نے دی تھی جو میرے کلاس میں داخل ہوتے ہی میرے پاس آئی تھی۔
''ندیم بہت ناراض گیا تھا، کیا بات تھی؟'' اس کا سوال تھا۔
''اس کا آج فائنل میچ تھا اور وہ اپنے ساتھی کھلاڑیوں سے وعدہ کرکے آیا تھا کہ وہ اپنی منگیتر کو لے کر آئے گا۔'' میں نے مختصراً اسے بات بتائی تھی۔
''تو چلی جاتیں اس میں حرج کیا تھا۔'' روبینہ نے کہا تو میں اسے گھور کر رہ گئی تھی۔
''پانچ سال ہوگئے تمہیں میرے ساتھ کلاس میں کبھی تم نے مجھے کلاس سے غیر حاضر دیکھا؟'' میں نے پلٹ کر سوال کیا۔
''یہ تو سوچنا چاہیے تھا کہ ندیم کی کتنی بے عزتی ہوگی۔'' روبینہ نے میری ذہنی کیفیت کو سمجھے بغیر کہا تھا۔
''منگیتر ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں اس کی جائز اور ناجائز خواہشات کے سامنے سر جھکادوں۔'' میں نے کہا تو وہ مجھے صرف گھور کر رہ گئی۔ ''اگر واقعی وہ مجھے لے جانا چاہتا تھا تو رات فون پر مجھے بتادیتا تاکہ میں بھی ذہنی طور پر تیار ہوتی لیکن اس نے مجھے بتائے بغیر ساتھیوں سے وعدہ کرلیا۔'' میں نے کہا۔
روبینہ اثبات میں سر ہلا کر بولی۔ ''یہ اس کی غلطی تھی۔''
اس واقعہ کے ہفتہ بعد ہمارے فائنل امتحان شروع ہوگئے اور میں ان میں مصروف ہوگئی۔ بھائی کے فون اب تقریباً روز آتے تھے اور وہ میرے پرچوں کے بارے میں تفصیل معلوم کرتے تھے اور میں ان کے سوالوں کے جواب دیتی رہی تھی۔ جس روز میرا آخری پرچہ تھا اس روز میں پیپر دے کر آئی تو خالہ گھر پر موجود تھیں۔ ماں نے بتایا کہ وہ شادی کی تاریخ لینے آئی ہیں۔ میں الجھ کر رہ گئی تھی کہ ابا نے کہا۔
''میں سجاد سے بات کرکے ہی تاریخ دوں گا۔''
جواب میں خالہ نے کہا۔ ''اب تو سویرا کے امتحانات بھی ختم ہوگئے اب کیا پریشانی ہے۔'' تو ابا مسکرا دیئے:
''پریشانی کوئی نہیں ہے آپ بھی خاطر رکھیں۔ میں سجاد سے بات کرکے ہی جواب دینے کی پوزیشن میں آؤں گا۔'' انہوں نے کہا اور خالہ اس طرح سے سر ہلا کر چلی گئیں جیسے بات ان کی سمجھ میں آگئی ہو۔
اسی شام ابا نے بھائی سے بات کی اور انہیں صورتِ حال بتائی تو بھائی نے کہا۔ ''میں اور میری بیوی بارہ روز بعد پاکستان آرہے ہیں پھر بات کریں گے۔''
بھائی کی بات سن کر ہم سب سکتے میں آگئے تھے۔ اماں سب سے پہلے بولیں۔ ''تم نے وہاں شادی کرلی اور ہمیں خبر تک نہیں دی۔''
''سوزن اور میں ایک ساتھ پڑھے ہیں، سوزن اب کارڈیک سرجن ہے اور میں کارڈیک فزیشن ہوں۔ جہاں تک شادی کے بارے میں آپ کو بتانے کی بات ہے تو میں آپ کو بتاؤں کہ سوزن کی والدہ کینسر کی مریضہ تھیں اور ان کی حالت بگڑتی چلی گئی تھی پھر جب ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تو ہمارے پاس کوئی راستہ نہیں تھا کہ ایک مرتی ہوئی عورت کی خواہش کا احترام نہ کریں باقی جو سوالات ہیں وہ ہمارے پاکستان آنے پر کرلیجیے گا۔'' بھائی نے تفصیل میں جانے سے گریز کیا تھا اور ہم سب خاص طور پر ابا صدمہ سے دوچار تھے۔
ہمارے لیے غم اور خوشی ایک ساتھ آئے تھے۔ خوشی بھائی کی چھ برس بعد واپسی کی تھی تو صدمہ ان کی شادی کا تھا۔
''سوزن نام ہے اس کا تو یہ کنفرم ہے کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔'' ہم سب لاؤنج میں تھے جب ابا نے تبصرہ کیا۔
''اب اس نے شادی کرہی لی ہے تو ہم کیا کرسکتے ہیں۔'' اماں نے کہا۔
''کیوں نہیں کرسکتے۔'' ابا کا لہجہ بلند تھا اور تلخ بھی۔ ''لوگ کیا کہیں گے کہ مولانا عبدالجبار کی بہو ایک کرسچن ہے۔'' پھر کچھ وقفہ کے بعد بولے وہاں مسلم لڑکیاں بھی تو تھیں کسی مسلم لڑکی سے کرلیتا۔''
''آپ کی بات کو میں غلط نہیں کہہ رہی لیکن میں پھر اپنا سوال دہراؤں گی۔ شادی تو اس نے کرلی ہے، اب ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔'' اماں نے کہا تو ابا کا پارہ مزید چڑھ گیا۔

''کیوں نہیں کر سکتے۔'' ابا نے کہا پھر ایک مختصر وقفہ کے بعد بولے۔ ''میں اس سے کہہ دوں گا کہ میرے پاس دو راستے ہیں ایک تو یہ کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ الگ مکان لے کر رہے۔'' ابا نے کہا۔

''مت بھولیں کہ یہ مکان بھی اسی کی بھیجی ہوئی رقم سے لیا گیا ہے۔'' اماں بھی بحث پر آمادہ نظر آئی تھیں مگر ابا بھی پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

''دوسری صورت یہ ہے کہ میں دو کمروں کا مکان لے کر اس میں منتقل ہو جاؤں۔'' ابا نے کہا اور ہم سب حیرت سے انہیں دیکھنے لگے۔ ہم سب ہی ان کی عادت سے واقف تھے وہ جو کہتے تھے اس پر عمل ضرور کرتے تھے۔

بارہ روز اسی کشمکش میں گزر گئے۔ دونوں شادی شدہ بہنیں بھائی کی آمد کے دو روز قبل ہی ہمارے گھر آ گئی تھیں۔ ان کے شوہر اور اولاد بھی ان کے ہمراہ تھی۔ گھر میں رونق تھی لیکن ساتھ ہی ایک صدمہ کی فضا بھی تھی۔ بھائی نے اپنی آمد کے لیے جس فلائٹ کا بتایا تھا وہ شام سات بجے کے قریب آ رہی تھی۔ ہم سب سات بجے سے بہت پہلے گاڑیوں میں سوار ائر پورٹ پہنچ گئے تھے۔ ہمارے قافلے میں ندیم بھی اپنی کار کے ساتھ شامل تھا۔ اماں نے اس سے سوال کیا کہ تمہاری ماں نہیں آئی تو ندیم نے جواب دیا، میں خود انہیں چھوڑ آیا کہ لوگ زیادہ ہو جائیں گے۔ اس پر اماں نے کہا۔ ایک عورت سے کون سا فرق پڑ جاتا مگر ندیم نے انہیں جواب دینے سے گریز کیا۔

فلائٹ کی آمد کا اعلان ہوا تو ہم سب وہاں پہنچ گئے جہاں سے ان کی آمد متوقع تھی پھر میں نے بھائی کو دیکھا وہ پہلے سے کہیں زیادہ اسمارٹ نظر آ رہے تھے۔ بھائی ٹرالی میں سامان رکھے آ رہے تھے اور ان سے دو قدم آگے ایک گوری تھی۔ ابا نے بھائی کو دیکھ لیا تھا اور وہ ہم سے آگے بڑھ کر اس دروازے تک پہنچ گئے تھے جہاں سے انہیں باہر آنا تھا۔ میں بھی ان کے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی تھی مگر بھائی سے پہلے وہ گوری باہر نکل آئی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس نے اسکارف اوڑھ رکھا تھا۔ وہ ابا کی طرف بڑھی اور پورے ادب کے ساتھ اس نے السلام علیکم کہا اور پھر کہا۔ ''آئی ایم فاطمہ ڈاٹر ان لا۔''

ابا ہکا بکا اسے دیکھتے رہ گئے تھے۔ ''مگر مجھے تو تمہارا نام کچھ اور بتایا گیا تھا۔'' ابا نے کہا۔

''سوزن میرے والدین نے نام رکھا تھا مگر جب میں نے اسلام قبول کر لیا تو میرا نام فاطمہ رکھا گیا۔ اب تمام دستاویزات پر یہی نام ہے۔'' اس نے کہا اور اس کے ساتھ ہی مسکرا دی تھی۔ اسی دوران بھائی بھی ہمارے پاس پہنچ گئے تھے۔

''تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ تم نے اسے مسلمان کر لیا تھا۔'' ابا نے بھائی کو مخاطب کیا اور بھائی ہنس دیے تھے۔

''یہ ایک سرپرائز تھا کہیے کیسا رہا میرا سرپرائز۔'' بھائی نے مسکراتے ہوئے کہا اور ابا نے انہیں گلے سے لگا لیا۔

''مجھے اپنی تربیت پر ہمیشہ ناز رہا تھا اور آج تم نے اسے صحیح ثابت کیا۔'' اس کے ساتھ ہی تمام لوگ بھی آگے بڑھ آئے۔ سب سے پہلے اماں نے بھائی اور فاطمہ کو گلے لگا لیا اور پھر ہم سب باہر کی جانب چل پڑے جہاں سے تمام مرد گاڑیاں لینے پارکنگ کی طرف بڑھے تھے مگر ندیم وہیں رک گیا اور بھائی سے سرگوشی کی۔ ''بہت خوبصورت بیوی منتخب کی ہے۔'' ندیم آواز دبانے میں کامیاب نہ ہو سکا، فاطمہ نے سن لیا اور اس نے مجھ سے کہا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے تو میں نے اس کا ترجمہ کر کے اسے بتایا۔ فاطمہ نے ندیم کا شکریہ ادا کیا۔

جب گاڑیاں آئیں تو ہم سب ان میں سوار ہونے لگے جس کے بعد ندیم اپنی کار لینے گیا جب وہ آیا تو اس کی کار میں بھائی اور بھابی کا سامان لادا گیا اور یہ قافلہ گھر کی جانب روانہ ہوا۔

میں، بھائی اور بھابی ابا کی کار میں تھے۔ بھائی ابا کے ساتھ اگلی سیٹ پر تھے جبکہ میں اور فاطمہ پچھلی سیٹ پر تھے۔

''اب تمہارا میڈیکل تو سمجھو ہو گیا آگے کیا ارادہ ہے؟'' کار چلی تو فاطمہ نے مجھ سے سوال کیا۔

''میں بھائی کو بتا چکی ہوں کہ میں گائنی میں پوسٹ گریجویشن کرنا چاہتی ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''دس از ویری گڈ۔'' بھابی نے کہا اور میں خوش ہو گئی۔

راستہ بھر بھائی ابا کے موبائل سے مختلف نمبرز ڈائل کرتے رہے اور اپنی آمد کی اطلاع دیتے رہے اور ساتھ ہی انہیں نئے گھر کا پتا سمجھاتے رہے۔ اس کا انکشاف ہمارے گھر پہنچنے کے بعد ہوا کہ وہ راستہ میں کس سے باتیں کر کے انہیں آمد کی اطلاع اور گھر کا پتا سمجھاتے رہے تھے۔ ہم گھر پہنچے تو ابا نے گراؤنڈ فلور پر ہی بھائی اور بھابی کا سامان رکھوا

دیا۔ چونکہ اوپری منزل میں دو بہنیں اور ان کے بچے مقیم تھے، میرا کمرا بھی اس زد میں آ گیا تھا لیکن مجھے اس کا کوئی افسوس نہیں تھا۔ ہم عصر کے بعد گھر پہنچے۔ مغرب کی اذان ہوئی تو بھابی نے ابا سے پوچھا۔ ''مجھے جاء نماز مل سکتی ہے۔''

ابا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کیوں نہیں۔''

ابا نے جاء نماز میرے حوالے کی اور میں نے اسے قبلہ رو بچھا دیا، بھابی نے نماز شروع کی میں نے انہیں نماز پڑھتا چھوڑ کر اماں کے کمرے کا رخ کیا، وہیں وضو کر کے نماز پڑھی، دوبارہ سے اپنے کمرے میں آ گئی جہاں بھیا اور بھابی محفل سجائے بیٹھے تھے۔ ندیم بھی وہیں تھا اس کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے اور کچھ ہی دیر بعد اس نے اس کا اظہار بھی کر دیا۔ ''آپ لوگ کتنے دنوں کے لیے آئے ہیں۔''

بھائی نے کہا۔ ''ہم مستقل طور پر آ گئے ہیں۔''

بھائی کے جواب سے ندیم کے چہرے پر تشویش کی جھلک میں اضافہ ہو گیا، حیرت مجھے بھی ہوئی تھی۔ میں تو خاموش رہی لیکن ندیم چپ نہ رہ سکا۔ ''وہاں کی زندگی چھوڑ کر آپ یہاں کیسے رہ سکیں گے۔''

بھائی ہنس دیئے تھے۔ ''ندیم، میں یہیں سے گیا تھا۔ امریکا تو چھ برس ہی رہا ہوں، باقی تمام عمر تو میں نے یہیں بسر کی ہے۔''

بھائی کے جواب کے بعد ہی ندیم کے چہرے کی تشویش کچھ کم ہوئی لیکن وہ پھر بھی پیچھے نہ ہٹا۔ ''میں آپ کی نہیں آپ کی وائف کی بات کر رہا ہوں۔''

ندیم کے جواب پر فاطمہ نے میری جانب نظر اٹھائی تو میں نے ترجمہ کر کے انہیں بتایا کہ ندیم کیا کہہ رہا ہے۔

''میں نے سجاد کے لیے جب اپنا مذہب تبدیل کر لیا تو یہاں رہنے میں کیا قباحت ہے۔'' فاطمہ نے جواب میں کہا لیکن ندیم کے لیے ترجمہ نہیں کرنا پڑا تھا۔

یہ عقدہ تو کچھ دیر بعد کھلا کہ بھائی نے وہ فقرہ کیوں کہا تھا کیونکہ کچھ ہی دیر بعد گیٹ سے بیل کی آواز آئی تو میں اٹھ کر گیٹ تک گئی، وہاں ایک ایسا شخص موجود تھا جسے میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے گیٹ میں موجود کھڑکی سے انہیں دیکھا تو انہوں نے کہا۔ ''ڈاکٹر سجاد کا گھر یہی ہے۔''

میں نے گیٹ کھول دیا اور انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر بھائی کے پاس گئی۔

''بھائی آپ کے کوئی مہمان آئے ہیں۔'' تو بھائی نے حلیہ پوچھا۔ میں نے بتا دیا۔

''این آئی سی وی ڈی کے ای ڈی آئے ہیں۔'' بھائی نے کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے ان کی بیگم بھی ان کے ساتھ اٹھ گئیں۔

اس کے بعد چار اور افراد آئے وہ سب بھی اسی ادارے کے ڈاکٹر تھے۔ میں چائے اور لوازمات لے کر ڈرائنگ روم میں گئی تو بھابی نے میرا تعارف کروایا۔ ''یہ سجاد کی بہن ہیں اور یہ بھی ڈاکٹر ہیں۔'' پانچوں نے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

''ابھی فائنل ائر کے امتحان دیئے ہیں اُمید ہے کہ پاس ہو جاؤں گی۔'' میں نے کہا۔

''یہ ہر سال ٹاپ کرتی آئی ہے اور مجھے پوری اُمید ہے کہ اس سال بھی ٹاپ کرے گی۔'' بھائی کا فقرہ سن کر ان سب نے دوبارہ سے خوشی کا اظہار کیا۔

''تب تو میں آپ کو بھی اپنے ادارے میں خوش آمدید کہنے پر فخر محسوس کروں گا۔'' ان صاحب نے کہا جو سب سے پہلے تشریف لائے تھے۔

''اس کا ارادہ گائنی میں پوسٹ گریجویشن کا ہے۔'' بھائی نے کہا کیونکہ گفتگو انگریزی میں ہی ہو رہی تھی۔

''چلیں ایک خاندان میں کوئی تو ایسا ہے جس نے اپنی فیلڈ چنی۔'' نئے آنے والوں میں سے ایک نے کہا اور سب ہنس دیئے۔

ابھی چائے کا دور چل رہا تھا کہ ابا نے ان سب کو ڈنر کی دعوت دی تو سب اپنی جگہ سے اٹھ گئے لیکن ای ڈی صاحب نے کہا۔ ''میری جانب سے معذرت کیونکہ مجھے اپنے سسرال کی ایک شادی میں جانا ہے۔'' ان کے جانے کے بعد ہم سب ڈائننگ روم میں آ گئے۔

بارہ کی میز تھی لیکن وہ بھی کم پڑ گئی کیونکہ مہمانوں کے ساتھ دونوں بہنوئیوں کو بھی والد صاحب بلا لائے تھے۔ خود ابا نے بھی ایک نشست سنبھال لی تھی۔ ڈنر شروع ہوا تو اماں نے خاص طور پر بنوائی ہوئی بغیر مرچ کی ڈش فاطمہ کے سامنے رکھی مگر فاطمہ نے بریانی پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔

''بہو اس میں مرچ تیز ہے۔'' اماں نے کہا تو بھائی ہنسنے لگے تھے۔

''اماں آپ نے بلاوجہ تکلف کیا، فاطمہ شادی کے چھ مہینوں میں مرچوں کی عادی ہو چکی ہے۔'' بھائی نے کہا۔

بھابی نے ایک بار پھر میری جانب نگاہ کی تو میں نے

انہیں بتایا کہ ان کے درمیان کیا بات ہوئی ہے۔ اس پر فاطمہ نے کہا۔

''شادی کے بعد ہم جس اپارٹمنٹ میں رہے ہیں وہیں برابر میں ایک انڈین مسلم فیملی رہتی تھی جن کا تعلق دہلی سے تھا ان کے ہاں میں نے مرچوں والے کھانے کھائے اور کچھ پاکستانی ڈشز بھی سیکھیں۔'' فاطمہ نے کہا۔

''چلیں پھر کسی روز تمہاری ڈش بھی چکھ لیں گے۔'' ابا نے کہا اور مجھے اماں کے لیے مترجم کے فرائض انجام دینے پڑے۔

بریانی کے بعد فاطمہ نے کوفتوں کی جانب ہاتھ بڑھایا اور کوفتے کھانے سے پہلے کہا۔ ''کوفتے مائی لو'' اور ہم سب مسکرا دیئے۔

اسی طرح کی گفتگو میں ڈنر ختم ہوا لیکن جاتے ہوئے مہمانوں میں سے ایک نے سوال کیا۔

''تو آپ کب سے جوائن کریں گے ڈیوٹی؟'' سوال بھائی اور بھابی دونوں سے کیا گیا تھا۔

''انٹرویو دیتے ہوئے یہ سوال آپ کے اور اب میرے بھی چیف نے یہ سوال کیا تھا اور ہمارا جو جواب تھا اس تاریخ میں ابھی پندرہ روز باقی ہیں۔'' بھائی نے جواب دیا تھا۔

''ویسے کل صبح ہم صرف اسپتال اور وہاں موجود سہولیات دیکھنے آئیں گے۔'' بھابی کا جواب تھا۔

''ضرور آئیں بلکہ کل لنچ ہماری طرف سے ہوگا اور مجھے یقین ہے کہ آپ کو تمام سہولتیں حاصل ہوں گی جو آپ وہاں چھوڑ کر آئی ہیں۔'' ایک ڈاکٹر نے کہا اور بھابی ہنس دی تھیں۔

''دیکھ لیں گے۔'' بھابی نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی تھی پھر مہمانوں کو رخصت کرنے بھائی اور بھابی گیٹ تک گئے تھے۔

''سویرا جلدی سے اچھی سی وہ چائے پلواؤ جو میں چھ برس تک یاد کرتا رہا ہوں۔'' بھائی نے کہا اور میں کچن کی طرف بغیر یہ کہے کہ جب آپ گئے تھے تب میں آٹھویں میں تھی اور اب ڈاکٹر ہو چکی ہوں۔

اسی رات جب ہم چائے سے فارغ ہو کر گپ شپ میں مصروف تھے تو ابا نے کہا، سب سے پہلے اس کا فیصلہ کرو کہ ولیمہ کہاں ہوگا اور سب ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے ابا نے جوں ہی کہا تو فاطمہ نے سوالیہ انداز میں کہا ''ولیمہ؟'' تو ابا نے کہا۔

''بیٹی تم نے کہا تھا کہ تم نے اسلام کا مطالعہ کیا ہے تو یقینی طور پر تمہیں معلوم ہوگا کہ ولیمہ شادی کے بعد کتنا اہم ہوتا ہے۔''

''ابا نکاح کو تو چھ ماہ سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا ہے، اتنی دیر سے ولیمہ۔'' بھائی نے سوال کیا تو ابا بولے۔

''ولیمہ کا مقصد اعلان ہوتا ہے۔ مدت کہیں درج نہیں ہے کہ نکاح کے اگلے روز ہی ولیمہ ہونا ضروری ہے اسے تم نکاح کا کنفرمیشن بھی کہہ سکتے ہو۔'' اس کے بعد بھائی اور بھابی کی جانب سے کوئی سوال نہیں ہوا۔

''میرا تو خیال ہے کہ سجاد کے ولیمہ والے دن سویرا اور ندیم کا نکاح بھی ہو جانا چاہیے۔'' اماں نے اپنی رائے دی۔

''وہ بھی ہو سکتا ہے پہلے اپنی بہن سے کنفرم کرلو۔'' ابا نے کہا اور اماں اسی لمحہ وہاں سے اٹھ کر فون کرنے چلی گئیں پھر انہوں نے واپسی میں دیر بھی نہیں کی، ان کے چہرے سے مایوسی صاف جھلک رہی تھی۔

''میں نے فون کیا تھا لیکن وہ کہہ رہی تھیں کہ ندیم اب اس شادی پر تیار نہیں ہے اور اس نے نہایت جلد بازی میں آج صبح اپنی... کلاس کی ایک لڑکی سے کورٹ میرج کرلی ہے۔'' اماں نے کہا۔

میرے اندر سے آواز آئی۔ ''اللہ تیرا شکر ہے۔''

''یہ کیا بات ہوئی۔'' ابا کے لہجہ میں غصہ تھا تو اماں نے گڑبڑاتے لہجہ میں کہا۔ ''ندیم کا کہنا ہے کہ جب سجاد بھائی مستقل پاکستان آگئے ہیں تو میں سویرا سے شادی کیوں کروں۔'' اماں نے کہا اور میرے دل میں لڈو پھوٹنے لگے۔

میرا اندازہ تھا کہ ندیم نے میری کس کلاس فیلو سے کورٹ میرج کی ہوگی لیکن میں نے کچھ نہ کہنے میں ہی عافیت سمجھی تھی۔

''وہ سویرا سے شادی کرنا چاہ رہا تھا یا امریکن شہریت شپ کو دلہن بنا رہا تھا۔'' بھائی کا لہجہ بھی تیز تھا۔

فاطمہ اس دوران صرف گفتگو کرنے والوں کے چہرے دیکھ رہی تھی۔ بھائی نے اسے انگریزی میں بتایا کہ کیا بات ہو رہی ہے اور فاطمہ فوری طور پر میرے پاس آئی اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''آئی ایم سوری سویرا۔'' اور میں ہنس دی تھی پھر میں نے انہیں بتایا کہ ندیم مجھے ابتدا سے ہی ناپسند تھا لیکن جس روز وہ میرے کالج مجھے لینے آیا کہ چلو آج میرا فائنل ہے تو اس روز سے مجھے اس سے نفرت ہو گئی

> افسانے پر بات کرتے ہوئے سب سے پہلے جو سوال میرے سامنے آیا، وہ یہ تھا کہ کیا افسانہ لکھنا محض ہنر کاری ہے؟ اگر ایسا ہے تو افسانہ نگار اور کارپینٹر کی کارکردگی میں، جو آری، تیشے اور رندے سے دوسروں کے بنائے ہوئے نقشے پر لکڑی کو شکلیں دیتا ہے، کیا فرق رہ جاتا ہے۔ مثال کے لیے کمہار کی کارکردگی کو بھی زیرِ بحث لایا جاسکتا ہے۔ مگر میرے نزدیک چاک کے گھومنے کے ساتھ ساتھ کمہار کا گھومتا ذہن، متحرک ہاتھ اور ایک تواتر و ترتیب کے ساتھ اس کا آگے پیچھے جھولتا جسم، اس کی ہنرکاری سے زیادہ اس کے تخلیقی استغراق کی غمازی کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر افسانہ محض ہنرکاری ہے تو کیا پوری صنف کو ادب سے باہر نہیں نکالنا پڑے گا؟ اور اگر افسانہ تخلیقی حیثیت رکھتا ہے تو اس سے ''ایسا ہو'' یا ''کیسا ہو'' جیسے لچر سوال کیوں کیے جاتے ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ تخلیق اجتماع سے متعلق ہونے کے باوجود انفرادی فعل ہے۔ میں ماضی کی نفی نہیں کرتا لیکن اگر آج کے افسانے کے لیے 1940ء کے افسانے کو ہی ماڈل بنانا ہے تو افسانے کو 40ء سے آگے ہی کیوں آنے دیا گیا... اور پھر اس کے بعد اس میں تجربوں کے امکانات کی نفی کیوں نہ کی گئی۔
>
> اقتباس: چند سوال۔ از: اعجاز راہی

تھی۔ میں نے فاطمہ سے انگریزی میں بات کی تھی، بھائی اور ابا سمجھ گئے تھے کہ میں کیا کہہ رہی ہوں اور پھر ابا نے اگلے ہی لمحہ اماں کو بھی بتادیا کہ میں نے کیا کہا ہے اور اماں مجھ پر ناراض ہوئیں کہ میں نے انہیں یہ کیوں نہ بتایا۔

''تمہیں بتانے کا کیا فائدہ تھا تمہاری آنکھوں پر تو بھانجے کی محبت کی چربی چڑھی ہوئی تھی۔'' ابا نے کہا اور اماں نے نظریں جھکالیں۔

اس رات ہم نے فیصلہ کیا کہ ولیمہ فائیو اسٹار ہوٹل میں ہوگا اور تمام رشتہ داروں سوائے ندیم اور اس کے گھر والوں کے مدعو کیا جائے گا۔ ''کچھ اپنے دوستوں کو بلوانا چاہو تو تم بھی بلوالینا۔'' بھائی نے مجھ سے کہا۔

''میری کلاس فیلوز بھی آئیں گی سوائے اس کے جس نے ندیم سے کورٹ میرج کی ہے۔'' میں نے کہا۔

''تمہیں اندازہ ہے کہ وہ کون ہوسکتی ہے؟'' بھائی نے سوال کیا۔

''اندازہ نہیں بھائی یقین ہے کہ وہ روبینہ کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوسکتی اور اس کا بھی یقین ہے کہ ندیم نے اس سے کورٹ میرج کیوں کی ہے۔'' میں نے کہا۔

''کیوں کی ہے؟'' بھائی نے سوال کیا۔

''روبینہ کا باپ بہت امیر شخص ہے اور کراچی میں تین چار کرکٹ کلبس کا اسپانسر بھی ہے اسی لیے اس کی کرکٹ بورڈ میں خاصی جان پہچان ہے۔ ندیم کو فرسٹ کلاس کھیلتے ہوئے تین برس ہوگئے لیکن اب تک قومی ٹیم میں جگہ نہیں بنا سکا ہے۔ ندیم یہ سمجھ رہا ہے کہ روبینہ کے والد کی سفارش اسے قومی ٹیم میں شامل کروادے گی۔'' میں نے کہا۔

ہماری گفتگو اس بار بھی انگریزی میں ہوئی تھی اس لیے فاطمہ سمجھ رہی تھی تبھی اس کی زبان سے نکلا ''سیلفش۔''

''پرچی والا کرکٹر زیادہ نہیں چلتا۔'' بھائی نے جواب میں کہا اور میں صرف سر ہلا کر رہ گئی۔

اگلے روز بھائی بھابی کے ساتھ اسپتال چلے گئے اور ابا مجھے لے کر ہوٹل پہنچ گئے جہاں انہوں نے بکنگ کروائی پھر وہاں سے پریس جانے کا ارادہ کیا۔

میں نے کہا۔ ''ابا اس ہوٹل کا کھانا چکھ نہ لیں۔'' اور ابا مسکرا دیے۔

''سجاد اور اس کی بیوی تو اسپتال میں لنچ پر مدعو تھے اس لیے ہم یہاں کھالیتے ہیں۔'' ہم وہاں ڈائننگ ہال میں ہی تھے کہ سامنے سے ندیم اور روبینہ آتے ہوئے نظر آئے۔

روبینہ اور ندیم نے بھی ہمیں دیکھ لیا اور روبینہ نے ہماری طرف قدم بڑھائے۔ ندیم اس سے ایک قدم پیچھے تھا۔ روبینہ میرے پاس آگئی۔

''سوری سویرا یہ سب کچھ اتنی جلدی میں ہوا کہ ہم کسی کو مدعو نہ کرسکے۔'' روبینہ نے کہا تھا۔

''کورٹ میرج میں کب مہمانوں کو بلایا جاتا ہے۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''بہرحال مبارک ہو تم دونوں کو۔''

میرے لہجے میں طنز دونوں نے محسوس کیا تھا تبھی ندیم بولا۔ ''میرے ساتھ تو ہوٹل آنے سے انکاری تھیں اب خود یہاں آگئی ہو۔'' ندیم کے لہجے میں بھی طنز تھا۔

''تم تو جانتے ہو لیکن تمہاری بیوی کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں اپنے والد کے ساتھ آئی ہوں۔'' میرے لہجے کی کاٹ روبینہ کے چہرے پر واضح نظر آئی تھی پھر وہ

دونوں وہاں رکے نہیں اور باہر کی جانب چل دیے، میں ابا کے پاس آ گئی۔

"اچھا ہی ہوا کہ وہ بدنصیب مجھ سے ملے بغیر چلا گیا۔" میں قریب آئی تو ابا نے کہا۔ ہم ہوٹل سے نکل کر ابا کے جاننے والے کے پریس پہنچے اور ابا نے ولیمہ کے کارڈ کا آرڈر دیا تو معلوم کیا کہ کب کارڈ ملیں گے تو انہوں نے جواب دیا۔ "پرسوں لے جایئے گا۔"

ہم وہاں سے نکل کر گھر کی جانب چل دیے تھے کہ ابا کے موبائل پر بھائی کی کال آ گئی شاید انہوں نے پوچھا تھا کہ کہاں ہیں۔ ابا کا جواب سن کر میں نے اندازہ لگایا تھا کہ بھائی نے کیا پوچھا ہوگا۔

"سجاد کہہ رہا ہے کہ ہم اسپتال آ جائیں اور انہیں بھی لیتے ہوئے گھر جائیں۔" ابا نے کار بھائی اور بھابی کے اسپتال کی طرف موڑ دی۔

ہم اسپتال پہنچے تو گیٹ پر موجود شخص ہمیں لے کر فرسٹ فلور پر ای ڈی کے کمرے میں پہنچا۔ ای ڈی نے چاہا کہ ہمارے لیے بھی کھانے کا آرڈر دے لیکن ابا نے بتایا کہ وہ ہوٹل بک کروانے گئے تھے وہیں پر کھا کر آ رہے ہیں تو ای ڈی نے کہا چائے تو پی لیں گے اور ابا سے پہلے میں نے کہا۔ "کیوں نہیں؟"

ای ڈی صاحب نے چپراسی سے کہا دو چائے بڑھا دو۔ وہ لوگ بھی اسی وقت لنچ سے فارغ ہوئے تھے اور چائے کے انتظار میں تھے۔

چائے کے دوران ہی ابا نے وہاں موجود لوگوں کو ولیمہ کی دعوت دی اور کہا کارڈ پرسوں ملیں گے وہ بھی پہنچ جائیں گے اور سب نے بے تکلفی سے کہا۔ "کارڈ نہ بھی آئیں تب بھی ہم آئیں گے۔"

گھر واپسی پر وہی پوزیشن تھی جب ہم ائرپورٹ سے آئے تھے۔ مجھے موقع مل گیا اور میں نے چپکے چپکے سرگوشیاں کر کے بھابی کو ندیم کی تمام بدتمیزیاں بتا دیں۔ مجھے اُمید تھی جب بھی موقع ملے گا تو بھابی اپنے شوہر کو یہ سب بتا دیں گی۔

ہم گھر پہنچے تو خالہ منگنی کی انگوٹھی واپس کرنے آئی ہوئی تھیں ساتھ ہی ان کا مطالبہ تھا جو انگوٹھی مجھے پہنائی تھی وہ بھی واپس کی جائے۔ اماں نے مجھے خالہ کی آمد کے بارے میں بتایا تو ایک لمحہ کی تاخیر کیے بغیر میں نے انگوٹھی اتار کر خالہ کے حوالے کر دی۔

"تمہیں کوئی افسوس تو نہیں ہے؟" اماں نے مجھ سے سوال کیا تو میں نے قہقہہ لگایا۔

"افسوس کیسا میں تو بہت خوش ہوں ایک خودغرض اور مطلبی شخص کے ساتھ زندگی گزارنے سے بچ گئی۔" میں نے کہا۔ "یہ منگنی کی انگوٹھی میں نے آپ کی ضد اور ابا کے مان کی وجہ سے پہنی تھی۔ رب العزت کا احسان ہے کہ یہ رشتہ میں نے نہیں بلکہ آپ کے بھانجے نے توڑا ہے۔"

"شکر تو ہم نے ادا کرنا ہے کہ ایک زبان دراز لڑکی ہماری بہو نہ بن سکی۔" خالہ نے یہ کہا اور مزید کچھ کہے گھر سے چلی گئیں۔

ابا آئے تو اماں نے انہیں تمام باتیں بتا دیں، ابا کو میں نے طیش کے عالم میں دیکھا۔ انہوں نے پوری بات سکون سے سنی اور اماں سے کہا۔ "تمہاری بہن میرے ہی گھر میں میری بیٹی کو بدزبان کہہ گئی اور تم پر بہن کی محبت اتنی غالب آ گئی کہ تم نے یہ برداشت کر لیا۔ میں ابھی جا کر اس سے حساب لوں گا۔" ابا یہ کہتے ہوئے باہر کی جانب بڑھے ہی تھے کہ بھائی سامنے سے آ گئے۔

"کیا ہوا یہ شور کس بات کا ہے۔" انہوں نے ابا سے سوال کیا تو ابا نے انہیں پوری تفصیل بتا دی۔

"اماں یہ سب کہہ کر وہ چلی گئیں اور آپ سنتی رہیں۔" بھائی نے اماں سے سوال کیا اور اماں خاموشی سے باپ بیٹے کو دیکھتی رہیں۔ اتنے میں بڑی بہن اور ان کے شوہر بھی اوپر سے آ گئے۔ بہن کا سوال بھی وہی تھا جو بھائی نے کیا تھا اور جواب ابا نے انہیں بھی وہی دیا تھا جو بھائی کو دیا تھا۔ سب سننے کے بعد بہنوئی بولے دیکھیں میرے جذبات بھی شاید وہی ہوں جو سجاد اور آپ کے ہیں لیکن آپ دونوں خود پر قابو رکھیں۔

"اس بےعزتی کو برداشت کرنے کا کوئی دوسرا راستہ ہے آپ کے پاس تو بتائیں۔" بھائی نے بہنوئی کو مخاطب کیا۔

"ہم سب کمرے میں بیٹھ کر ٹھنڈے دل کے ساتھ اس مسئلہ کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں یقینی طور پر کوئی حل نکل ہی آئے گا۔" انہوں نے کہا لیکن ان کی آواز اور لہجہ پُرسکون تھا۔ پھر ہم سب اماں کے کمرے میں جمع ہوئے اور بہنوئی نے بات شروع کی۔ "سب سے بہترین حل تو یہ ہوتا کہ ولیمہ والے دن سویرا کا نکاح ہو جاتا۔ ندیم اور اس کی ماں پر ایک زوردار طمانچہ ہوتا یہ نکاح۔ لیکن دو دن میں سویرا کا ہم پلہ رشتہ کہاں سے تلاش کریں گے۔" بہنوئی نے کہا تو

میرے ذہن میں رمیز کا نام گونجا۔
''مجھے اجازت دیں میں ایک فون کرلوں۔'' میں نے پہلی بار زبان کھولی تو بہنوئی نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا تھا۔
''کسی شادی دفتر کو فون کروگی۔'' انہوں نے کہا تو میں نے نفی میں گردن ہلا کر رمیز کے نمبر ڈائل کرنا شروع کردیئے۔ دوسری جانب سے فون اٹھاتے ہی میں نے کہا۔
''ہیلو رمیز کہاں ہو۔''
رمیز نے میری آواز پہچان لی۔ ''بولو سویرا کوئی ایمرجنسی۔''
''میں نے یہ پوچھا تھا کہاں ہو۔'' اور رمیز ایک لمحہ کے لیے گڑبڑا گیا تھا میں نے اپنے موبائل کا مائیک آن کردیا تھا تاکہ سب سن سکیں۔
''میں اس وقت ڈیوٹی پر ہوں اور شاید مزید آدھا گھنٹا رہوں ایک سیریس کیس آیا تھا ڈائیریا کا، اسے ڈرپ لگائی ہوئی ہے آدھے گھنٹے میں ختم ہوجائے گی۔'' رمیز نے کہا۔
''آدھے گھنٹے میں تمہیں یہاں میرے گھر پہنچنا ہے رمیز۔'' میں نے کہا۔
''مگر تمہارا گھر ہے کہاں؟'' رمیز کی آواز کمرے میں گونجی تھی۔
''میں لوکیشن بھیج رہی ہوں تم کسی ساتھی ڈاکٹر کے حوالے مریض کو کرو اور جلد سے جلد پہنچنے کی کوشش کرو۔'' میرے لہجے کی تیزی کو رمیز نے بھی محسوس کیا تھا۔
''تم لوکیشن بھیجو میں جلد سے جلد پہنچنے کی کوشش کروں گا۔'' رمیز نے کہا اور لائن کاٹ دی۔
''یہ رمیز کون ہے؟'' بھائی نے مجھ سے سوال کیا۔
''مجھ سے دو سال سینئر تھے مجھ سے پہلے انہوں نے پوزیشن اور گولڈ میڈل لیا تھا۔ اب پیڈیاٹرک وارڈ میں آرایم او ہیں اور ساتھ ساتھ پوسٹ گریجویشن کی تیاری بھی کررہے ہیں۔'' میں نے رمیز کا تعارف کرایا۔
''تمہیں یقین ہے کہ اتنی جلدی میں وہ تم سے نکاح کے لیے ہاں کہہ دے گا۔'' اس بار سوال کرنے والے ابا تھے۔
''ابا میں آپ کی طرح تجربہ کار تو نہیں لیکن آنکھیں پڑھنا سیکھ گئی ہوں۔ ندیم سے منگنی سے پہلے رمیز سے مدد لیا کرتی تھی اور رمیز نے کبھی مجھ سے کوئی چھچھوری بات نہیں کی مگر جس روز ندیم نے کالج آکر بدتمیزی کی اور ساتھ لے جانے پر اصرار کیا اس وقت رمیز وہیں موجود تھے اس سے پہلے جب میں نے ان کے ایک مسئلہ پر مدد مانگی تو انہوں نے مجھے روکھا جواب دیا لیکن کچھ ہی دیر بعد آکر سوری بھی کیا اور کہا میں لائبریری جارہا ہوں وہیں آجاؤ میں تمہارا مسئلہ حل کردوں گا۔'' میں نے تفصیل بتائی۔
''رہائش کہاں ہے اس کی؟'' ابا نے سوال کیا۔
''مجھے پوری طرح تو علم نہیں لیکن سنا ہے کہ ناگن چورنگی کے پاس کوئی یوپی سوسائٹی ہے جہاں رمیز اپنے والدین اور ایک بہن کے ساتھ رہتے ہیں۔'' میں نے کہا۔
بڑی بہن ہنستے ہوئے بولی۔ ''ابھی سے احترام سے نام لے رہی ہے میری بنو کہ وہاں رہتے ہیں۔'' بڑی بہن نے مزاحیہ انداز میں کہا۔
''کوئی مجھے بھی تو بتائے کہ یہ سب کیا ہورہا ہے۔'' فاطمہ بھابی نے بھائی سے سوال کیا۔
''تم ایسا کرو کہ اردو کا کورس جوائن کرلو تاکہ ہم سب کی خاص طور پر میری جان چھوٹ جائے ترجمہ کرتے ہوئے۔'' بھائی کا انداز مذاق اڑانے والا تھا لیکن بھابی مسکراتی رہیں۔
''سیکھ لوں گی اردو بھی لیکن ابھی تو کوئی بتائے کیا مسئلہ ہے۔'' فاطمہ بھابی نے کہا اور بھائی اسے انگریزی میں سمجھانے لگے، فاطمہ پوری توجہ سے سنتی رہی تھیں۔
''مجھے تو بتائی گئی باتوں سے رمیز اور ندیم میں بہت فرق نظر آرہا ہے۔'' انہوں نے کہا۔
''نتیجہ پر چھلانگ نہ لگاؤ ابھی وہ آجائے اس سے مل کر دیکھ لیتے ہیں کہ وہ کس قابل ہے، سویرا کے لائق ہے بھی یا نہیں۔''
''زندگی میں صرف ایک بار نتیجہ پر چھلانگ لگانے کی غلطی کی تھی لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اس پر پچھتانا نہیں پڑرہا ہے۔'' فاطمہ بھابی نے جواب دیا۔
''ابھی ہماری گفتگو کسی نتیجہ پر نہیں پہنچی تھی کہ گیٹ سے گھنٹی کی آواز آئی اور بھائی مین گیٹ کھولنے چلے گئے۔ لوٹے تو ان کے ساتھ رمیز تھے۔ ان کے چہرے پر حیرت تھی۔
''ایسی بھی کیا ایمرجنسی ہے۔'' رمیز نے کوریڈور میں چلتے ہوئے میرے قریب آکر سرگوشی کی۔
''کمرے میں چلو سب پتا لگ جائے گا۔'' میں نے جوابی سرگوشی کی اور پھر اس کمرے میں پہنچ گئے جہاں تمام لوگ جمع تھے۔ رمیز ان میں سے بیشتر لوگوں سے واقف نہیں

تھے اس لیے میں نے باری باری ان سب کا تعارف کروایا اور آخر میں رمیز کا تعارف میں وہ کچھ دہرایا جو چند منٹ پہلے کہا تھا۔

''رمیز بیٹے میرے پاس تمہارے لیے ایک سرپرائز اطلاع ہے۔'' ابا نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''جی آپ بتائیں میں ہمہ تن گوش ہوں۔'' رمیز نے کہا۔

''سویرا اور ندیم کی منگنی ختم ہو چکی ہے۔'' ابا نے کہا تھا اور میں نے دیکھا رمیز کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر آ کر گزر گئی۔

''تمہیں یہ سن کر افسوس تو ہوا ہوگا؟'' بھائی نے سوال کیا۔

''افسوس کیسا میں تو سویرا کے بچ جانے پر خوش ہوں۔'' رمیز کے الفاظ سے اس کے دلی جذبات کا احساس ہو رہا تھا۔

''بہتر ہوگا کہ آپ لوگ انگریزی میں بات کریں تاکہ میں سمجھ بھی سکوں اور وقت آنے پر اپنی رائے بھی دے سکوں۔'' فاطمہ بھابی نے کہا۔

''شی از رائٹ۔'' رمیز نے بھابی سے متفق ہونے کا اظہار کیا اور اس کے بعد وہاں انگریزی میں گفتگو شروع ہوگئی۔ بھائی نے کہا۔

''سویرا نے بتایا کہ تم بچوں کے وارڈ میں آر ایم او ہو اور اسی میں پوسٹ گریجویشن کرنا چاہتے ہو۔'' بھائی نے گفتگو میں حصہ لیا تو رمیز نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اگر میں تمہیں امریکا میں تمام سہولتیں دلوا دوں تو کیا تم امریکا سے پوسٹ گریجویشن کرنا پسند کرو گے؟'' بھائی نے سوال کیا۔

''معاف کیجیے گا میں کسی صورت میں اپنا ملک نہیں چھوڑ سکتا۔'' رمیز نے کہا اور میں خوش ہوگئی۔ رمیز نے مقابلہ میں پہلا راؤنڈ جیت لیا تھا۔

''مگر رمیز امریکا کی ڈگری کی اپنی ایک حیثیت ہے؟'' فاطمہ بھابی نے کہا۔

''معافی چاہتا ہوں میں آپ کو اپنے ملک کے تعلیمی نظام اور یہاں کی ڈگری کے بارے میں اظہار خیال کی اجازت نہیں دے سکتا۔ یہ میرا ملک ہے اور اس کی گندم کھا کر ہم جوان ہوئے ہیں۔ یہ دھرتی ہماری ماں ہے اور کوئی بھی غیرت مند بیٹا اپنی ماں کی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔'' رمیز کا جواب تھا اور بڑی مشکلوں سے میں نے خود کو اچھلنے یا زوردار یاہو کا نعرہ لگانے سے روکا تھا۔

''ایک آخری بات۔'' فاطمہ بھابی نے پھر سے لب کھولے۔ ''سویرا تمہارے نزدیک کیسی لڑکی ہے؟'' بھابی نے سوال کیا۔

''سویرا ایک خوش شکل، قابل اور بہترین ڈاکٹر ہیں۔'' رمیز کا جواب تھا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم سویرا کو اپنی شریکِ حیات بنانے پر تیار ہو۔'' فاطمہ بھابی نے کہا۔

''سویرا میری کیا کسی بھی شخص کی آئیڈیل ہو سکتی ہے لیکن جہاں تک سویرا کا شریکِ حیات بننے کا سوال ہے یہ اختیار میرے والدین کے پاس ہے۔'' رمیز نے بہت محتاط انداز میں جواب دیا تھا۔

''کب مل سکیں گے تمہارے والدین سے۔'' ابا نے کہا۔

''کبھی بھی مل سکتے ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ابا کو دو سال پہلے فالج ہو گیا تھا اور وہ بیڈ پر ہیں لیکن میں انہیں ٹیکسی میں لے آؤں گا۔'' رمیز نے کہا۔

''اگر ہم تمہارے گھر چلیں۔'' فاطمہ نے کہا۔ بھابی کو ہمارے رسم و رواج کا ادراک نہ تھا کہ ہمارے معاشرے میں شادی کا پیغام لڑکے والے دیتے ہیں۔ پھر بھی کسی نے مداخلت نہ کی اور سب نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کیونکہ حالات کا یہی تقاضہ تھا۔

''بخوشی چلیں لیکن میں پہلے ہی بتا دوں کہ میرا گھر اتنا عالیشان نہیں ہے نہ ہی وہاں ڈرائنگ روم ہے بس ایک چھوٹا سا ایک سو بیس گز کا مکان ہے جو ابا نے دو برس پہلے اپنی گریجویٹی سے بنوایا تھا۔'' رمیز نے کہا۔

''وہ کرتے کیا تھے؟''

''بابا ایک پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر رہ چکے ہیں۔'' رمیز نے کہا، اس کی آواز میں باپ کے لیے پورا احترام تھا۔

''چلیں گاڑیاں نکالیں۔'' بھائی نے کہا۔

''میرا خیال ہے سویرا کو بھی ساتھ لے لیں کیونکہ رمیز کے والد اسٹروک پیشنٹ ہیں، وہ بھی دیکھ لیں گے۔''

بھابی کی بات پر سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر ابا کی آواز گونجی۔ ''وقت اور قدریں بدل رہی ہیں، میرا ووٹ بھی فاطمہ کے ساتھ ہے۔'' اور میں باہر جانے

کی بجائے اندر اس کمرے کی جانب بھاگی جو پہلے میرا کمرا تھا مگر اب بھائی اور بھابی کے قبضہ میں تھا۔

''کیوں چلی آئیں وہاں سے۔'' بھابی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ''یہ مشرقی لڑکیاں بھی عجیب شرمیلی ہوتی ہیں۔''

''جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے، پہلی بار سسرالیوں سے ملنے جارہی ہوں، یوں سر جھاڑ اور منہ پھاڑ تو نہیں جاسکتی۔'' میں نے کہا اور بھابی نے ہنسنا شروع کردیا۔

''جو کچھ سجاد اور دیگر لوگوں نے مشرقی لڑکیوں کے بارے میں بتایا تھا وہ آج سب غلط ثابت ہوگیا۔'' بھابی نے کہا اور اپنی بات پر خود ہی ہنس کر داد دی۔

میں نے ہلکا سا میک اپ کیا۔ بال سنوارے اور لپ اسٹک لگا کر بھائی کے ساتھ گیٹ سے باہر آگئی جہاں دو گاڑیوں میں ہم لوگ سوار ہوچکے تھے۔

''رمیز کہاں ہیں ؟'' میں نے بھائی سے سوال کیا۔

''وہ یہ کہہ کر گیا ہے کہ میں ناظم آباد پر بورڈ آفس والے پل پر انتظار کروں گا۔''

''سجاد، سچ پوچھو تو مجھے لڑکا بہت پسند آیا ہے غریب ہے لیکن خوددار بھی ہے اور ملک سے محبت کرنے والا بھی ہے۔'' فاطمہ بھابی نے کہا۔

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ آپ کو اس کی کیا بات پسند آئی لیکن مجھے تو اس کی اسمارٹنس دل کو بھاگئی۔ سویرا کے ساتھ اس کی جوڑی کچھ سجے گی۔'' باجی نے کہا۔

باتوں میں وقت کا پتا ہی نہ چلا اور ہم رمیز جو بورڈ آفس سے ہمارے آگے چل رہا تھا اس کی رہنمائی میں اس کے گھر کے سامنے پہنچ گئے جہاں ایک سترہ، اٹھارہ برس کی لڑکی باہر کھڑی تھی۔ رمیز ہمیں لے کر گھر میں داخل ہوا جہاں برآمدے میں چند کرسیاں اور ایک تخت رکھا ہوا تھا۔ تخت پر ایک ادھیڑ عمر خاتون موجود تھیں جن کے تعارف کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ پہلی ہی نظر میں پہچانی جارہی تھیں کہ وہ رمیز کی والدہ ہیں۔ رمیز نے ہم سب کا تعارف کروایا باقی سب تو کرسیوں پر بیٹھ گئے اور میں نے اپنے لیے ایک کونا تلاش کرلیا۔

''امی یہ ہیں ڈاکٹر سویرا۔'' رمیز نے سب سے آخر میں میرا تعارف کروایا۔

''وہاں کونے میں کیوں کھڑی ہو بیٹی یہاں میرے برابر بیٹھو۔'' انہوں نے دائیں جانب کھسک کر جگہ بنائی اور میں ان کے برابر جاکر بیٹھ گئی۔ ابھی میں پوری طرح بیٹھ بھی نہیں سکی تھی کہ رمیز کی والدہ کی پشت پر چھوٹی سی چارپائی پر لیٹے ایک نحیف شخص پر نظر پڑی، میں نے انہیں سلام کیا تو انہوں نے نحیف آواز میں سلام کا جواب دیا اور لرزتا ہاتھ اٹھایا تو آگے بڑھ کر میں نے اپنا سر قریب کردیا۔ انہوں نے ہاتھ میرے سر پر رکھا اور دعا دی۔

پھر باری باری تمام لوگ ان کے قریب آئے اور سب نے انہیں سلام کیا۔

''بہن جی میں بغیر کسی تمہید کے مطلب کی بات پر آتا ہوں۔'' ابا نے گفتگو کا آغاز کیا۔ ہم اس لیے حاضر ہوئے تھے کہ ہمیں آپ کا بیٹا پسند آگیا ہے اور ہم اسے اپنا بیٹا بنانے کی خواہش لے کر حاضر ہوئے ہیں، اسی لیے رسم توڑ کر ہم لوگ خود آگئے ہیں کہ بھائی صاحب ہمارے ہاں جا نہیں پاتے اور رمیز نے کہا تھا کہ میری شادی کا فیصلہ میرا نہیں میرے والدین کا ہوگا۔'' ابا نے مختصر ترین الفاظ میں اپنی آمد کا مقصد بتادیا۔

رمیز کی والدہ نے کہا۔ ''یہ تو ہماری بلکہ رمیز کی خوش قسمتی ہے کہ اسے آپ جیسے لوگوں کا ساتھ مل رہا ہے۔''

ابھی گفتگو یہیں تک پہنچی تھی کہ بارہ تیرہ برس کا ایک لڑکا کھلے دروازے سے صحن میں آگیا اور اتنے سارے لوگوں کو دیکھ کر کچھ جھجک سا گیا تو رمیز کی اماں نے کہا۔ ''یہ شاپر اجالا کو کچن میں دے دو۔'' پھر ہم سب کی طرف مڑ کر بولیں۔ ''یہ برابر کے گھر کا لڑکا ہے رشید، نویں جماعت میں آیا ہے۔''

رشید جس طرف بڑھا تھا بھائی کی آنکھ کا اشارہ دیکھ کر میں اس کے پیچھے چل پڑی تھی۔ اجالا وہی لڑکی تھی جو گھر کے باہر ہماری منتظر تھی۔ اس نے مجھے کچن میں آتا دیکھ کر کہا۔ ''سویرا آپ ہیں۔'' اور میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔ تو اس نے کہا۔ ''آپ بہت خوبصورت ہیں۔''

میں ہنس دی تھی۔ ''خوبصورتی دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتی ہے کسی کو گلاب خوبصورت محسوس ہوتا ہے اور کوئی موتیا پسند کرتا ہے۔''

رشید نے چھوٹے سے کچن کے سلیب پر وہ بڑا سا شاپر رکھا۔ اصل میں وہ بڑے شاپر کے اندر ایک چھوٹا شاپر تھا۔ بڑے شاپر میں ٹھنڈی بوتلیں تھیں اور چھوٹے شاپر میں بازار کے سموسے بسکٹ تھے۔ اجالا نے چھوٹے شاپر کے سموسے بسکٹ ٹرے میں سجانا شروع کیے تو میں نے کہا۔ ''یہ بوتلیں

رہنے دو ہم چائے والے لوگ ہیں تم مجھے کیتلی یا برتن دے دو میں چائے بنا دیتی ہوں۔''

اجالا نے نہ صرف ایک پتیلی مجھے پکڑائی بلکہ اسی ریک کی جانب اشارہ کیا جہاں چائے کے کپ تھے۔ میں نے چائے بننے کے لیے رکھی اور ساتھ ہی ایک برتن میں چھوٹے سے فریج سے دودھ نکال کر گرم ہونے کے لیے رکھ دیا۔ اجالا ٹرے میں سموسے سجا کر صحن میں لے گئی۔ اب میرے کان پوری طرح باہر کی گفتگو کی طرف لگ گئے۔ جہاں ابا کہہ رہے تھے کہ رمیز بیٹا اپنی والدہ کو تفصیل بتا دینا لیکن ہماری خواہش ہے کہ اتوار کو میرے بیٹے کا ولیمہ ہے اسی میں تمہارا اور سویرا کا نکاح بھی ہو جائے۔

''اتوار میں تو کل چار دن ہیں اتنی جلدی تو شیروانی بھی نہیں سل سکے گی۔'' رمیز کی ماں نے کہا۔

''شیروانی کی فکر آپ چھوڑ دیں کل صبح تم سجاد کے ساتھ چلے جانا، ہمارا درزی ایک روز میں شیروانی سی دے گا۔'' ابا نے کہا۔

''اور کارڈ۔'' رمیز کی ماں نے کہا۔

''کارڈ تو مشترکہ ہوں گے ہم نے ولیمہ کے کارڈز کے آرڈر دیئے ہوئے ہیں صرف ایک سطر کا اضافہ ہونا ہے وہ بھی ہو جائے گا۔'' ابا ہر رکاوٹ کو دور کیے جا رہے تھے اور میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا میں نے دوسری ٹرے میں چائے کی پیالیاں رکھیں اور لا کر اسی میز پر رکھ دیں جو درمیان میں رکھی تھی۔ چائے ابھی پوری طرح ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ ابا نے موبائل پر نمبر ملانا شروع کر دیا۔ ''انصاری صاحب پریس ابھی تو بند نہیں کیا۔'' پھر دوسری جانب سے جو کہا گیا وہ سننے کے بعد کہا۔ ''میں بس چالیس منٹ میں آپ کے پاس حاضر ہو رہا ہوں۔'' ادھر سے جو کہا گیا وہ ہم نے نہیں سنا اور وہاں سے نکل آئے۔

باہر آتے ہی ابا نے کہا۔ ''اب باقی لوگ گھر جائیں میں اور سویرا پریس جا رہے ہیں تاکہ کارڈ میں اضافہ کروا دیں۔''

کار اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھی تو میں نے کہا۔ ''ابا ایک غلطی ہو گئی ہے۔''

''اب کیا غلطی ہو گئی۔'' ابا کے لہجے میں حیرانی سے زیادہ پریشانی تھی۔

''ہم نے رمیز کے والد کا نام تو معلوم ہی نہیں کیا۔'' میں نے کہا تو ابا مسکرا دیئے۔

''یہ کوئی ایسی غلطی نہیں کہ سدھاری نہ جا سکے۔'' ابا نے کہا اور ساتھ ہی کہا رمیز کو فون کر کے اس کا پورا نام اور اس کے والد کا نام معلوم کر لو، میں نے رمیز کا نمبر ڈائل کر دیا۔

''اب کیا مسئلہ ہو گیا مسز رمیز۔'' دوسری جانب سے رمیز کی شرارت بھری آواز آئی۔

''تمہیں اپنے والد کا نام معلوم ہے۔'' میں نے بھی اس کی شرارت کا جواب شرارت سے دیا تھا۔

''میرا پورا نام رمیز الدین ولد عزیز الدین ہے۔'' رمیز نے کہا۔ پھر اس کی شرارت آمیز آواز آئی۔ ''حیرت ہے جس سے شادی کر رہی ہو اس کا پورا نام اور اس کے والد کا نام بھی نہیں جانتیں۔'' رمیز نے کہا اور میں نے اس کی شرارت روکنے کے لیے فوری لائن کاٹ دی۔

پھر اتوار کا دن بھی آ گیا۔ میں اور ابا جب کارڈ میں ترمیم کروانے پریس گئے تو ہوٹل بھی چلے گئے۔ مہمان کی تعداد میں اضافہ کے ساتھ ڈشز بھی بڑھا دیں اور ویلکم جوس کا بھی اضافہ کر دیا جو اضافی پیسے تھے وہ بھی ابا نے فوری ادا کر دیئے اور زور دے کر کہا کہ ہال کے اندر کی ڈریسنگ اعلیٰ درجے کی ہونی چاہیے۔ ہال میں دو اسٹیج کا آئیڈیا بھی انہی کا تھا۔ جمعہ کو جا کر بوتیک سے میرے لیے شرارہ سوٹ پسند کیا گیا اور پارلر والی خاتون سے بھی بات کر لی۔

اتوار کو پہلے میرا اور رمیز کا نکاح ہوا اور پھر بھائی اور فاطمہ کے ولیمے کا آغاز ہو گیا۔ نکاح کے بعد رخصتی کا مرحلہ تھا لیکن یہاں پر مسئلہ ہو گیا۔ رمیز چاہتا تھا کہ میں رخصت ہو کر اس کے گھر جاؤں اور بھائی کی ضد تھی کہ انہوں نے جو تین سو گز کا مکان لیا ہے رخصتی اس گھر میں ہو۔ آخر کار میں نے بھائی کو اپنی ضد سے پیچھے ہٹنے پر تیار کر لیا۔ رمیز جہیز لینے سے بھی انکاری تھا لیکن میرے زور دینے پر وہ فریج اور اے سی ڈی لینے پر تیار ہو گیا اور میں رخصت ہو کر یو پی سوسائٹی میں آ گئی۔ گھر رمیز کے دوستوں نے سجا لیا تھا۔ اس کے بعد کے پندرہ دن پلک جھپکتے میں گزر گئے۔

بھائی اور بھابی نے اسپتال جانا شروع کر دیا اور ساتھ ہی رمیز کو مجبور کیا کہ وہ آٹھ سو سی سی کار کا تحفہ قبول کریں۔ اس کے لیے انہوں نے پہلی قسط ادا کر دی اور رمیز کو تیار کیا کہ بعد کی قسطیں وہ ادا کرے۔

میرا میڈیکل کا رزلٹ آیا تو میں نے توقع کے مطابق ٹاپ کیا تھا اور میری ہاؤس جاب بھی شروع ہو گئی۔ ہاؤس جاب کے دوران مجھے ایک معقول رقم بھی ملنے لگی تھی۔ اب

میں، اجالا اور رمیز ایک ساتھ نکلتے۔ پہلے اجالا کو ڈراپ کرتی اور رمیز کو ڈراپ کرنے کے بعد اپنے ہاؤس جاب پر آجاتی۔ اجالا نے بھی بی اے کی تعلیم کے ساتھ محلہ کی بچیوں کی ٹیوشن شروع کردی تھی۔ رمیز نے اوپر کی ادھوری منزل کی تعمیر شروع کروادی تھی۔ گھر سے غربت کے اندھیرے آہستہ آہستہ دور ہونے شروع ہوئے لیکن ایک آفت یہ آئی کہ رمیز کے والد صاحب کا انتقال ہوگیا۔ چھوٹی بہن فیصل آباد واپس جاچکی تھی اور ابا تینوں بیٹیوں کے فرض سے سبکدوش ہونے پر خوش تھے۔ میں اور رمیز ہر چھٹی کا دن ابا کے گھر گزارتے تھے۔ میں نے رمیز کو اس پر بھی تیار کرلیا تھا کہ اجالا بھی ہمارے ساتھ جائے۔ رمیز کی والدہ کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ انہوں نے اس فیصلے کی تائید کی تھی۔ اجالا سے میری بہت اچھی نبھ رہی تھی۔ خود رمیز کی امی میں بھی روایتی ساس والی کوئی بات نہیں تھی بلکہ انہوں نے میرے یوں ہر چھٹی والے دن میکے میں گزارنے پر کوئی اعتراض کرنا تو دور کی بات ناک بھویں بھی نہ چڑھائیں۔ میرا گائنی کی پوسٹ گریجویشن میں داخلہ بھی ہوا اور میں نے فرسٹ ائر کے امتحانوں کی تیاری بھی شروع کردی تھی۔ میری مصروفیات بہت بڑھ گئی تھیں۔ صبح گھر سے نکلنے سے پہلے میں کھانا بنا کر نکلتی تھی جسے دوپہر میں رمیز کی امی گرم کرلیتی تھیں۔ کھانا بنانے میں اجالا میری پوری مدد کرتی۔ اسی دوران رمیز کا پیڈیاٹرک میں پوسٹ گریجویشن مکمل ہوا تو اسے ایک نجی اسپتال میں جاب آفر ہوئی جس کی وجہ سے ہمارے ہاتھ ذرا کھل گئے اور رمیز نے اوپر کی ادھوری منزل پر کام میں تیزی پیدا کروادی۔ رمیز کا ارادہ تھا کہ اوپری منزل مکمل ہوتے ہی ہم اوپر شفٹ ہوجائیں گے لیکن میں اس کی حامی نہیں تھی۔

''اماں بیمار رہنے لگی ہیں اس لیے ہمیں ان سے زیادہ دور نہیں ہونا چاہیے۔'' میں نے رائے دی اور وہ پہلی جمعرات تھی جو شادی کے بعد ہم دونوں میں بحث ہوئی تھی۔ میرے گھر والوں نے مکمل میری حمایت کی تھی۔ اس پر رمیز کچھ تلخ ہوگئے تھے۔

''دور کہاں جارہے ہیں ایک سیڑھی کا ہی تو فاصلہ ہے نیچے بیل رکھ دیں گے اور جیسے ہی گھنٹی بجے گی ہم سیڑھیاں اتر کر آجائیں گے۔'' اس بحث کو میں نے یوں ختم کیا کہ اجالا کے ٹیوشن پڑھنے والی لڑکیوں میں اضافہ ہورہا تھا۔ اب تک وہ سائنس کی طالبات کو انکار کردیتی تھی لیکن جب سے میں نے اس کی شاگردوں کو پڑھانا شروع کردیا تھا تعداد میں اضافہ ہوتا جارہا تھا اور ورانڈہ جہاں وہ ٹیوشن پڑھاتی تھی چھوٹا پڑنے لگا تھا تو میں نے اوپر کے مکمل کمرے میں اجالا کو منتقل ہونے کا مشورہ دیا اور اگلے ہی روز وہ سب وہاں منتقل ہوگئے۔

رمیز کے علم میں یہ بات آئی تو انہوں نے کچھ ناراضگی ظاہر کی لیکن میرے سمجھانے پر مان گئے۔ اب اجالا جو پہلے اپنی والدہ کے کمرے میں سوتی تھی اس نے بھی اپنا سامان اوپری حصہ میں منتقل کرلیا۔ ٹیوشن کی لڑکیوں کے لیے آسانی یہ ہوگئی کہ اب وہ دن کے کسی حصے میں آجاتی تھیں۔ انہیں انتظار ہوتا تھا تو صرف اجالا کے کالج کی واپسی کا ہوتا تھا۔ اجالا بی اے کے فائنل ائر میں آئی تو رشتوں کی ایک کھیپ آنی شروع ہوگئی مگر میں اور رمیز کسی رشتہ پر تیار نہیں ہوتے تھے۔ رمیز کی امی اس پر ناراض بھی ہوتیں۔ ''ارے کیا لڑکی کو یوں ہی بٹھائے رکھو گے۔''

رمیز کی امی کہتیں اور میں انہیں سمجھاتی۔ ''اجالا انگریزی میں ایم اے کرنا چاہتی ہے اس لیے اس کی راہ میں رشتہ کی دیوار نہ بنائیں۔'' میں کہتی اور رمیز کی امی مان جاتیں۔

میں اس روز اپنے میکہ میں تھی جب بھائی نے اطلاع دی، ندیم نیوزی لینڈ جانے والی ٹیم میں منتخب ہوگیا ہے۔

''چلیں جس مقصد کے لیے اس نے روبینہ سے شادی کی تھی اسے حاصل کرلیا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے تبصرہ کیا۔ پھر اسی شام روبینہ کا فون آیا اور اس نے اپنے طور پر مجھے خوشخبری دی۔ ''ندیم کا سلیکشن ہوگیا ہے۔'' اس نے کہا اور میں نے مسکرا کر اسے مبارکباد دی۔ ''دوسری خوشخبری یہ ہے کہ میں ان کے ساتھ جارہی ہوں۔'' روبینہ نے بتایا۔

''چلو تم نے بھی اپنا ٹارگٹ حاصل کرلیا۔'' میں نے کہا اور روبینہ کچھ بوکھلاسی گئی تھی۔

''مجھے کبابوں کے جلنے کی بو آرہی ہے۔'' اس نے کہا اور میں نے قہقہہ لگایا:

''یہ بُو سال بھر پرانی ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور روبینہ نے لائن کاٹ دی۔

نیوزی لینڈ میں دو ٹیسٹ، تین ون ڈے اور تین ٹی ٹوئنٹی کی سیریز تھی۔ ندیم کو پہلے ٹیسٹ میں کھیلنے کا موقع مل گیا مگر بیٹنگ میں وہ پہلی اننگز میں چوتھی گیند پر سلپ میں کیچ دے کر صفر پر آؤٹ ہوا اور دوسری اننگز میں دو رنز بنا کر وکٹ کیپر کے ہاتھوں کیچ ہوگیا اس کے بعد اسے کسی میچ میں شامل نہیں

کیا گیا۔ مہینا بھر کا یہ ٹور اختتام پذیر ہوا تو ندیم پر منفی تبصروں کی بھر مار تھی اور شاید یہی وجہ تھی کہ جب ایک ماہ بعد ویسٹ انڈیز کی ٹیم پاکستان آرہی تھی تو اسے سولہ کھلاڑیوں میں بھی جگہ نہ ملی۔ پورے ٹیسٹ میں اس نے سولہ اوور کیے تھے اور بیالیس رنز دے کر کوئی وکٹ نہیں لی تھی۔ پھر ہم تک یہ اطلاع بھی آئی کہ ندیم اپنی سسرال شفٹ ہو گیا ہے۔

اماں کی ملاقات ایک شادی میں خالہ سے ہوئی تو انہوں نے شکایتوں کے انبار لگا دیئے تھے۔ ''پندرہ پندرہ دن باپ کے گھر رہتی تھی کہتی تھی تمہارے اس کبوتر کے کابک میں میرا دم گھٹتا ہے۔'' خالہ نے کہا تھا جب گھر میں ہوتی تب بھی ندیم کو ناشتے سے لے کر کھانا سب میں ہی دیتی تھی وہ مہارانی تو صبح جینز چڑھا کر باپ کی دی ہوئی گاڑی لے کر نکل جاتی اور شام گئے گھر آتی۔ روز کی تفصیل یہ ہوتی کہ آج وہاں پارٹی ہے، آج اس کی دوست کی سالگرہ ہے۔ آج اس کے گھر شادی کی سالگرہ کی پارٹی ہے۔ پھر بقول اماں انہوں نے میرے بارے میں بھی تفصیل جاننے کی کوشش کی تو اماں نے انہیں بتایا کہ سویرا پوسٹ گریجویشن کر رہی ہے اور پہلے برس تو اس نے یہاں بھی ٹاپ کیا ہے اب آخری برس ہے انشاء اللہ اس میں بھی کامیاب ہو جائے گی بلکہ اسے تو ابھی سے نوکریوں کی آفر ہے کہ ہمیں جوائن کرلو اور اس کا ارادہ ہے کہ وہ کوئی ٹیچنگ اسپتال جوائن کرے گی۔

اماں نے بتایا تو خالہ بولیں۔ ''ہائے میرے بیٹے کی پھوٹی قسمت ہیرے کو چھوڑ کر پتھر کو چن لیا۔'' خالہ کے تبصرے سے مجھے کوئی خوشی نہیں ہوئی کیونکہ میری کچھ دوسری کلاس فیلوز بتا چکی تھیں کہ روبینہ نے ایک نجی اسپتال جوائن کیا تھا لیکن اسے فارغ کر دیا گیا کہ وہ صبح آٹھ بجے کی ڈیوٹی پر گیارہ بجے آتی تھی اس حد تک تو وہ برداشت ہوتی رہی لیکن ایک کیس اس نے اس طرح خراب کیا کہ اسپتال والوں کو لواحقین سے جان چھڑانی مشکل ہو گئی۔

ویسٹ انڈیز کے دورہ پاکستان کے بعد پاکستانی ٹیم کا دورہ زمبابوے تھا جو چار برس کی پابندی کے بعد پہلا ٹیسٹ کھیل رہی تھی۔ ندیم کا نام دورہ کرنے والی ٹیم میں شامل تھا لیکن ایک کمزور ٹیم کے سامنے بھی ندیم کوئی کارکردگی نہیں دکھا سکا۔ وہ تینوں ٹیسٹ کھیلا لیکن ایک اننگز میں اس نے چالیس اسکور کیا اور سلپ میں کیچ آؤٹ ہوا۔ بولنگ میں بھی وہ ناکام رہا۔ تین ٹیسٹ میں وہ صرف ایک سو اسی رنز دے کر ایک وکٹ حاصل کر سکا۔

بھائی جو امریکا میں بھی کرکٹ فالو کرتے رہے تھے انہوں نے مجھے ندیم کی کارکردگی کی رپورٹ دی اور کہا۔ ''یہ سب تمہاری بددعاؤں کا اثر ہے۔''

''بھائی میں نے بھی اس کے لیے کیا کسی کے لیے بھی بددعا نہیں کی بلکہ میں تو ندیم کی احسان مند ہوں کہ اس نے مجھے چھوڑا اور مجھے رمیز جیسا محبت کرنے والا شوہر اور ایسی سسرال ملی۔'' میں نے کہا۔

اسی شام بھابی نے مجھے بتایا کہ انہیں کام کرتے ہوئے اچانک چکر سے آتے ہیں۔ ان کے چہرے پر تشویش تھی تو میں نے کہا۔ بھابی یہ کوئی بیماری نہیں بلکہ آنے والی خوشخبری کی نوید ہے۔ میں نے کہا اور ان کے چہرے کی تشویش میں کمی آئی۔

''میرا اندازہ بھی یہی ہے لیکن جب تک ٹیسٹ نہ ہو جائے میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔'' فاطمہ بھابی نے کہا۔

''ٹیسٹ میں کون سا گھنٹا لگتا ہے ابھی چلتے ہیں انشاء اللہ آدھے گھنٹے میں خوشخبری لے کر واپس آجائیں گے۔'' میں نے کہا۔

''سجاد کو بھی ساتھ لے لیں۔'' انہوں نے سوال کیا اور میں ہنس دی۔

''بھائی امراض قلب کے فزیشن ہیں، گائنی کے بارے میں ان کا علم اتنا بھی نہیں ہے جتنا آپ جانتی ہیں۔'' میں نے کہا۔

پھر ہم دونوں اسپتال پہنچیں جبکہ ابا، اماں اور بھائی پوچھتے رہ گئے کہ کہاں جا رہے ہو۔ اماں نے تو یہ بھی کہا میں کھانا لگا رہی ہوں اور تم دونوں جا رہی ہو، میں نے مسکرا کر انہیں الوداع کہا۔

''آپ ڈنر ٹیبل سجائیں آپ کے کھانے کی ابتدا تک ہم واپس آجائیں گے۔'' بھابی یہ کہتے ہوئے میرے ساتھ کار میں آگئیں۔

اسپتال میں ٹیسٹ ہوئے اور دس منٹ میں رپورٹ پازیٹو آگئی۔ میں نے بھابی کو گلے لگا لیا ان کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے تھے۔ اسپتال سے واپسی پر ہم مٹھائی کی دکان پر گئے میں نے مٹھائی لی اور گھر واپس آگئی جہاں ڈائننگ ٹیبل پر ہمارا انتظار ہو رہا تھا۔

میرے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبا دیکھ کر وہ سب حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ میں نے میز پر مٹھائی کا ڈبا رکھا اور اس میں سے ایک گلاب جامن نکال کر ابا کی جانب ہاتھ بڑھایا اور کہا۔

''ابا سب سے پہلے آپ منہ میٹھا کیجیے۔'' ابا کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''ابا کا منہ میٹھا تو کروا رہی ہو لیکن یہ تو بتاؤ کہ کس خوشی میں۔'' انہوں نے الجھن آمیز انداز میں سوال کیا۔

''ابا آپ دادا بننے والے ہیں۔'' میں نے کہا تو ابا کی آنکھوں میں خوشیاں ناچنے لگیں۔

''اتنی بڑی خوشخبری اور تم صرف ایک گلاب جامن پر ٹرخا رہی ہو۔'' ابا نے مٹھائی کا ڈبا اپنی جانب کھسکاتے ہوئے کہا۔

''ابا احتیاط کریں آپ کو شوگر ہو جائے گی۔'' بھائی نے کہا تو ابا بولے۔

''ایسی کی تیسی ڈاکٹری کی آج تو میں جی بھر کر مٹھائی کھاؤں گا۔'' انہوں نے کہا اور ہم سب ہنس دیئے تھے۔

اسی روز بھائی اور بھابی کا سامان نیچے شفٹ کیا گیا اور اس کمرے میں پہنچایا گیا جو کبھی میرا کمرا تھا اور جس میں امریکا سے واپسی پر بھائی اور بھابی کچھ دن رہے تھے۔ یہ سب میری ہدایات پر ہو رہا تھا تو بھائی بولے۔

''جہاں یہ سب دیکھ رہی ہو اس سے کہو کہ اسپتال سے بھی چھٹیاں لے۔'' بھائی نے کہا۔

''ابھی صرف ابتدا ہے چھٹیاں لے سکتی ہیں لیکن آخر کے دو ماہ میں باقی اسپتال اور کلینک میں انہیں لفٹ کی سہولت ہے وہ استعمال کریں۔'' میں نے کہا۔

''اللہ خیر کرے بطور گائنا کولوجسٹ یہ تمہارا پہلا کیس ہوگا۔'' بھائی نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''اللہ خیر کرے گا سب کچھ نارمل ہوگا اور یہ بھی بتا دوں کہ دو ماہ بعد میرا فائنل امتحان ہے اور پندرہ دن رزلٹ کے لگا لیں تو ڈھائی ماہ بعد میں کنفرم گائنا کولوجسٹ ہو جاؤں گی۔'' میں نے کہا اور ابا نے زور سے کہا انشاء اللہ، سب نے ان کی تائید کی۔

اس کے بعد کے تمام مراحل آسانی سے حل ہوتے چلے گئے۔ ڈلیوری نارمل تھی لیکن میں تھیٹر میں موجود رہی۔ بھائی کی بیٹی کی پیدائش پر خوشی دیدنی تھی۔ الٹرا ساؤنڈ ٹیسٹ کی رپورٹ میں نے پہلے ہی اپنے گھر والوں کو دے دی تھی جس پر ابا اور اماں دونوں نے کہا تھا۔ ''بیٹا ہو یا بیٹی کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' ابا ایک قدم آگے بڑھ گئے تھے۔ ''بیٹی اللہ کی رحمت ہوتی ہے اس پر ناراض ہونے والے اللہ کی ناراضگی مول لیتے ہیں۔''

ان دو ماہ میں بھابی نے اسپتال سے چھٹی لے رکھی تھی میں ہر روز ان کے پاس جاتی اور رمیز بھی شام کو آجاتے، ہم ڈنر کے بعد اپنے گھر آجاتے۔ ان دو مہینوں میں میری بھابی سے ڈھیروں باتیں ہوئی تھیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ امریکی معاشرہ میں برسوں گزارنے اور پاکستانی معاشرے میں چند ماہ گزارنے کے بعد آپ کو کیا فرق محسوس ہوا تو فاطمہ مسکرا دی تھی پھر اس نے جواب دینا شروع کیا۔ ''جب ہم ہیوسٹن میں تھے تو ہمارے پڑوس میں ایک مسلم فیملی رہتی تھی اس خاندان میں سب ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے تھے، وہ ایک اکائی تھے۔ اس خاندان میں بزرگوں کی عزت تھی بلکہ وہاں کے بزرگوں کے ذہن میں اولڈ ہاؤس جانے کا ڈر تھا۔

پھر جب ہم نیویارک منتقل ہوئے تو میری ملاقات سجاد سے ہوئی پھر ان سے ملاقاتیں بڑھیں اور سجاد نے مجھے بتایا کہ معاشرہ کی اکائی خاندان ہوتا ہے۔ ابتدا میں یہ بات میری زیادہ سمجھ میں نہیں آئی کیونکہ میں جس معاشرہ میں بڑی ہوئی تھی وہاں خاندان کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ سجاد نے ہی مجھے اسلام کی طرف راغب کیا۔ مجھے بچپن سے یہ بتایا گیا کہ یسوع مسیح روح القدس کی اولاد ہے۔ سجاد سے ابتدا میں اسی موضوع پر گفتگو ہوتی تھی اور سجاد نے میرے ہر سوال کے مدلل جوابات دیئے۔ میں اسلام کی جانب متوجہ ہوتی گئی اس کے ساتھ ہی میں نے خود بھی اسلام کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ پھر ایک دن میں دائرہ اسلام میں داخل ہو گئی اور پوری تندہی سے اس راستہ پر چل پڑی۔ میں نے سجاد کو پرپوز کیا اور ہمارا نکاح اسلامی طریقہ سے ہوا۔

فاطمہ اور اس کی بیٹی گھر منتقل ہوئے تو ابا نے کہا۔ ''بچی کا نام کیا رکھنا ہے؟'' ابا نے سوال بیٹے سے کیا تھا لیکن جواب فاطمہ نے دیا تھا۔

''ہم نے بچی کا نام تعبیر سوچ لیا تھا۔ یہ میرا اور سجاد کا مشترکہ فیصلہ تھا اور یہ اس روز کی بات ہے جب سویرا نے الٹرا ساؤنڈ کی رپورٹ دکھائی تھی۔''

''بہت خوبصورت نام ہے، اور اس نام میں ایک پوری تاریخ پنہاں ہے۔'' ابا نے کہا ان کے لہجہ میں خوشی کا بھرپور تاثر تھا۔

پوتی کی پیدائش پر ابا نے ایک بھرپور دعوت کا اہتمام بھی کیا اور اس میں خاندان کے تمام افراد مدعو کیے گئے تھے، وہیں ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ ندیم نے روبینہ کے والد کا دفتر

جوائن کرلیا ہے اور پی آئی اے کی نوکری بھی چھوڑ دی بلکہ یوں کہہ لیں کہ ایک طرح سے ندیم نے گھر دامادی کی نوکری کرلی تھی۔ زمبابوے کے دورے میں ناکامی کے بعد فرسٹ کلاس میں نمایاں کارکردگی نہیں دکھائی تھی۔ سال بھر میں اس کے نام پر صرف ایک ہاف سنچری تھی اور وکٹیں بھی بہت کم رہی تھیں۔

میں نے اپنا پوسٹ گریجویشن مکمل کیا تو مجھے سرکاری نوکری آفر ہوئی جسے قبول کرنے میں کوئی دیر بھی نہیں کی اس کے ساتھ ہی ایک نجی اسپتال سے کنسلٹینٹ کی آفر آئی جو میں نے قبول کرلی۔ اب ہمارے گھر کے حالات بدل گئے تھے۔ آمدنی بہت بڑھ چکی تھی۔ رمیز کی پرائیویٹ پریکٹس بھی عروج پر تھی اور میرے نجی اسپتال کے مریض بھی دن بدن بڑھتے جارہے تھے۔ رمیز نے کبھی مجھ سے میری آمدنی کی تفصیل نہیں پوچھی۔ اجالا کی ٹیوشن بھی عروج پر تھی اسی دوران ایک روز بھائی اور بھابی ہمارے گھر آگئے تو رمیز نے کہا۔ ''آپ نے کیوں تکلیف دی ہمیں بلوا لیتے۔''

بھائی مسکرا دیے۔ ''ضروری بات کرنی تھی اور اتوار میں کافی دن ہے۔'' بھائی نے مسکراتے ہوئے کہا اور میں نے دیکھا کہ بھابی کے چہرے پر بھی مسکراہٹ تھی۔

''ایسی کیا بات ہے کہ آپ سے اتوار کا انتظار بھی نہ ہوا۔'' رمیز نے کہا۔

''اکبر کا چھوٹا بھائی امریکا جارہا ہے اور آپا نے اپنے دیور کے لیے اجالا کے رشتہ کی بات کی ہے۔'' بھائی نے کہا۔

''مگر اجالا نے انگلش میں ایم اے کرنے کے لیے داخلہ لے لیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''انہیں بھی جلدی نہیں ہے۔'' فاطمہ بھابی نے کہا۔

''آپ یہ کہہ رہی ہیں کہ وہ دو سال انتظار کرلیں گے؟'' رمیز کا لہجہ سوالیہ تھا۔

''آپا کی سسرال والے چاہتے ہیں کہ اصغر کے پاؤں میں نکاح کی بیڑیاں ڈال دی جائیں۔'' بھائی نے کہا۔

''ہمیں کچھ سوچنے کا موقع دیں گے؟'' رمیز نے سوال کیا۔

''آپ کے پاس وقت ہے اصغر اتوار کی شام کی فلائٹ سے جارہا ہے۔'' بھائی نے کہا اور رمیز کی بجائے میں نے جواب دیا۔

''ہم اس لیے تو اجالا کا رشتہ نہیں کرسکتے کہ وہ امریکا جارہا ہے۔'' میں نے کہا تو بھائی نے مجھے حیرت سے دیکھا تھا۔

''کم از کم تمہیں یہ بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔'' بھائی نے کہا۔ ''تم آپا کی سسرال کے بارے میں اچھی طرح واقف ہو اور پھر اصغر ڈاکٹر ہے، یہاں جنرل سرجن ہے اور مزید تعلیم کے لیے امریکا جارہا ہے اور پھر وہ اکبر کا بھائی ہے جس سے ہماری بہن کو کسی بھی طرح کی شکایت نہیں ہے۔''

''آپ کی اور سویرا کی گارنٹی پر میں اس رشتہ پر تیار ہوں صرف اماں کی منظوری لے لوں پھر جس روز آپ کہیں گے نکاح ہوجائے گا۔'' رمیز نے کہا۔

''میں تو سجاد سے کہہ رہی تھی کہ اب ہمیں اسپتال بنالینا چاہیے۔ ماشاءاللہ گھر میں ہی اتنے ڈاکٹر ہیں کہ باہر سے کسی ڈاکٹر کی مدد نہیں چاہیے ہوگی۔'' فاطمہ بھابی نے کہا تو رمیز بھی خاموش نہ رہ سکے۔

''آپ نے تو میرے منہ کی بات کہہ دی۔'' رمیز نے کہا۔

اتوار کو اصغر کی روانگی تھی اور ہفتہ کو اجالا کا نکاح ہوگیا۔ اسے پارلر جانے کی ضرورت ہی نہ پڑی اس کا میک اپ میں نے ہی کردیا تھا اس پر اجالا نے کہا۔ ''بھابی آپ غلط فیلڈ میں چلی گئیں آپ کو تو اپنا پارلر کھولنا چاہیے تھا۔'' اور میں ہنس دی۔

''ابھی تو تمہارے بھائی نے میرے بھائی کو اسپتال کھولنے کا مشورہ دیا ہے دیکھو اس کا کیا ہوتا ہے اس کے بعد پارلر کے بارے میں بھی سوچ لیں گے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اسپتال کی زمین خرید لی گئی اور ہم نے اسپتال کی تعمیر میں اپنا حصہ بھی ڈالا۔ اسپتال کے دو حصے تھے ایک امراض قلب کے لیے مخصوص تھا اور دوسرا حصہ زچہ و بچوں کے لیے مختص کردیا گیا۔ دونوں حصوں کی ایڈمنسٹریشن کے لیے آپا کے شوہر جو اس وقت ٹریولنگ ایجنسی میں تھے ان کی خدمات حاصل کرلی گئیں۔ اسپتال کا افتتاح ابا نے کیا تھا اور انہی کی تجویز پر اسپتال کا نام فیملی اسپتال رکھا گیا۔

اصغر دو سال کی بجائے تین برس میں واپس آیا اور پھر اجالا کی رخصتی عمل میں آگئی جو اس وقت تک ایم اے کرچکی تھی۔

اصغر کی آمد سے پہلے ہی ''فیملی اسپتال'' نے شہر کے نجی اسپتالوں میں ایک مقام بنالیا تھا۔ اصغر نے بھی ہمارا اسپتال جوائن کیا اور اسپتال میں مریضوں کی تعداد بڑھ گئی۔

++

مہاجر بلوچ

محترم و مکرم مدیر سرگزشت
سلام مسنون!
یہ سرگزشت داؤد بلوچ کی ہے جسے میں نے الفاظ کا پیرہن دے کر کہانی کی شکل میں ڈھال دیا ہے۔ اُمید ہے اس دلچسپ روداد کو سرگزشت کے قارئین ضرور پسند کریں گے۔ اس روداد میں آپ کو بہت سی عجیب و غریب باتیں ملیں گی جس کی وجہ سے میں نے اسے منتخب کیا ہے۔

احمد جعفری
(کراچی)

جس زمانے میں پاکستان کی تحریک اپنے عروج پر تھی اس وقت میں شملہ ملٹری اکیڈمی میں سیکنڈ لیفٹیننٹ کی ٹریننگ حاصل کر رہا تھا۔ آرمی میں ملازمت کرنا میرا شوق تھا۔ مجھے ملازمت کی ضرورت نہیں تھی۔ میرے والد جیکب آباد سندھ کے نزدیک ایک گاؤں میں اپنے قبیلے کے سردار تھے اور سیکڑوں ایکڑ زمین کے مالک تھے، وہ میری ملازمت کے سخت مخالف تھے لیکن میری ضد، پھر میرا ذوق و شوق دیکھ کر انہوں نے ملازمت کی اجازت دے دی تھی۔

میری ابتدائی تعلیم سر سید خان ثانی یعنی حسن علی آفندی کے قائم کردہ سندھ مدرستہ الاسلام کراچی میں ہوئی پھر میں نے اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا، یہیں سے میں نے انٹر تک تعلیم حاصل کی تھی۔ ان دنوں آرمی کی ٹیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا دورہ کررہی تھی۔ اس ٹیم نے چھ طلبا کو آرمی سروس کے لیے سلیکٹ کیا تھا ان چھ میں، میں بھی شامل تھا۔ ہمیں بھی ابتدائی تربیت کے لیے شملہ اکیڈمی بھیج دیا گیا۔

شملہ انتہائی خوب صورت ہل اسٹیشن اور مرکزی حکومت کا گرمائی کیپیٹل تھا۔ شملہ کی ایک پہاڑی پر اکیڈمی کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ نہایت خوب صورت جگہ تھی۔ دہلی سے ٹرین شملہ ٹاپ تک جاتی تھی اس میں دو انجن لگے ہوتے تھے۔ ٹرین پہاڑی سلسلے میں بل کھاتی موڑ کاٹتی ہوئی ٹاپ تک پہنچتی تھی۔ بڑا دیدہ زیب منظر ہوتا تھا۔

شروع، شروع میں اکیڈمی کے سخت رولز، ریگولیشنز اور ڈسپلن سے مجھے وحشت ہوتی تھی پھر آہستہ آہستہ میں وہاں کی ٹف لائف کا عادی ہوگیا۔ اکیڈمی میں اس وقت 220 کیڈٹس تھے جن میں صرف 26 کیڈٹ مسلمان تھے۔ اکثریت سکھ، ہندو اور کرسچن تھے۔

اکیڈمی میں تین ہفتوں کی چھٹیاں ہونے والی تھیں میں سوچ رہا تھا کہ یہ چھٹیاں کہاں گزاری جائیں۔ جیکب آباد میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ اسی اثنا میں مجھے میرے ایک دوست حمید احمد کا خط ملا۔ حمید علی گڑھ یونیورسٹی میں فائنل ایئر کا طالب علم تھا اور میرا بہت اچھا دوست تھا میری اس سے خط و کتابت ہوتی رہتی تھی۔ وہ راجستھان کے کسی گاؤں میں پوسٹ ماسٹر تھا۔ اس نے لکھا تھا۔ ”آجاؤ دوست۔ کچھ راجواڑوں کی سرزمین بھی دیکھو۔“

میں چھٹی کے پہلے دن دہلی پہنچا وہاں سے جے پور اور جے پور سے چھوٹی لائن کی ٹرین کے ذریعے سیکر کی طرف روانہ ہوا۔ سیکر بہت چھوٹا سا شہر تھا مگر یہ بھی ایک نیم خودمختار ریاست کا درجہ رکھتا تھا اور ریلوے کا آخری اسٹیشن تھا۔ یہاں سے اونٹ گاڑیاں اور اونٹ مختلف قصبوں کی طرف جاتے تھے۔ میں نے اسٹیشن پر رات کا کھانا کھایا اور ایک اونٹ کرائے پر لے کر بساؤ کی طرف روانہ ہوگیا اونٹ والے نے اونٹ کی پیٹھ پر آرام دہ سیٹ بنائی ہوئی تھی۔ اس کا اونٹ بھی میرے برابر چل رہا تھا۔ بساؤ بہت چھوٹا سا قصبہ تھا۔ آبادی پانچ ہزار کے قریب تھی۔ یہ بھی ایک ریاست تھی۔ یہاں کے راجا کے بہت لطیفے مشہور تھے۔

جب ہمارے اونٹ بساؤ قصبے کی فصیل میں داخل ہورہے تھے اس وقت صبح ہونے والی تھی۔ ساربان نے مجھے عین پوسٹ آفس کے بڑے گیٹ کے سامنے اتارا۔ ”لوجی تھاری منجل آگئی۔“ میں نے اسے تین روپے دیے۔ بہت خوش ہوا اور ہاتھ جوڑ کر شکریہ ادا کرکے دونوں اونٹ لے کر چلا گیا۔

پوسٹ آفس کا لکڑی کا بنا ہوا بڑا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ بیچ میں چوکیدار چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا، ویسے پوسٹ آفس چوبیس گھنٹے کھلا رہتا تھا۔ ایک تار بابو اور ایک پوسٹ مین رات کو بھی ڈیوٹی پر رہتے تھے۔ اس کی وجہ تھی، بساؤ چھوٹا سا گاؤں تھا مگر یہاں بڑے بڑے سیٹھوں کے آبائی گھر تھے۔ ایک ایک سیٹھ کی کئی کئی ملیں احمد آباد، بمبئی اور کلکتہ میں تھیں۔ جب سیٹھ لوگ چھٹیوں پر گاؤں آتے تھے تو ان کے منشی کئی کئی ٹیلی گرام بھیجتے تھے۔ پوسٹ مین بڑی خوشی سے ان کی حویلی میں ٹیلی گرام ڈلیور کرنے جاتے تھے۔ وہاں ٹپ ملتی تھی۔ ایک روپیا یا دو روپے۔ ایک روپے کی بڑی ویلیو تھی۔ باجرے کا آٹا ایک روپے کا 18 سیر ملتا تھا اور گندم کا آٹا ایک روپے میں 15 سیر۔ باجرہ وہاں کی مین غذا تھی۔ یہ سب باتیں مجھے اپنے دوست حمید احمد نے ملاقات میں بتائی تھیں۔

میں اپنا چھوٹا سا سوٹ کیس لے کر اندر داخل ہوا اور چوکیدار سے کہا۔ ”اندر جاکر پوسٹ ماسٹر حمید سے کہو کہ آپ کے دوست داؤد بلوچ آئے ہیں۔“

حمید کا گھر آفس سے ملا ہوا پیچھے کی جانب تھا۔ دو منٹ کے بعد ہی حمید کرتہ پاجامہ پہنے آنکھیں ملتا ہوا آگیا۔ ”ارے بلوچ تو۔“ مجھ سے بڑی گرم جوشی سے گلے ملا۔ ”تو واقعی فوجی ہے۔ بھلے آدمی مجھے ٹیلی گرام کردیتے۔ میں تجھے سیکر ریلوے اسٹیشن پر ریسیو کرتا، چلو اندر آجاؤ۔“ پھر حمید نے چوکیدار سے کہا۔ ”راجوان کا بکسا مہمان خانے میں جاکر رکھو۔“

پوسٹ آفس کا احاطہ بہت وسیع تھا۔ ایک جانب پوسٹ مینوں اور دیگر اسٹاف کے کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ دوسری جانب تین اونٹ بندھے ہوئے تھے۔ قریب ہی ایک چھوٹی سی اونٹ گاڑی تھی اور چار سائیکلیں کھڑی تھیں۔

گھر میں بالکل شروع میں مہمانوں کے لیے بڑا سا کمرا بنا ہوا تھا جہاں ایک پلنگ پر صاف ستھرا بستر بچھا ہوا

تھا۔ حمید نے کہا۔ ''یار بلوچ پہلے تم نہالو پھر ناشتا کر کے سو جانا۔ رات بھر کا سفر کر کے آئے ہو وہ بھی اونٹ پر۔ شام کو تم سے گپ شپ ہوگی۔'' پھر حمید نے زور سے آواز دی۔ ''او آچکی۔ آچکی۔ جلدی سے آؤ۔''

فوراً ہی پندرہ سولہ سال کی لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ لڑکی صحت مند، سانولی رنگت، بڑی بڑی آنکھوں میں کاجل لگا ہوا تھا۔ گھاگھرا ٹائپ کا لہنگا، اوپر بنیان جیسا آدھی آستین کا کرتہ تھا۔ لڑکی میں غضب کی کشش تھی۔

''جی بابوجی۔'' اس نے میری طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''دیکھو آچکی۔ یہ میرے مہمان اور دوست ہیں۔ ان کے غسل خانے کی دونوں بالٹیوں میں پانی بھر دو۔ نہانے والا نیا صابن رکھو اور ایک صراحی میں پینے کا پانی بھر کر میز پر رکھ دو۔ اس کے بعد بہت ہی اچھا ناشتا بناؤ۔ یہ میرے دوست ہیں ان کی اچھی طرح خدمت کرنی ہے، سمجھ گئی ناں آچکی۔''

''جی بابوجی۔ پہلے پانی بھروں گی، میز پر صراحی رکھوں گی، اچھا سا ناشتا بناؤں گی پھر کھدمت کروں گی۔''

''جاؤ، شاباش۔''

اس کے جانے کے بعد میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''یار حمید یہ کیسا نام ہے آچکی۔''

حمید بہت ہنسا۔ ''یار یہ شگون والا نام ہے۔ یہ چھ بہنیں ہیں، بھائی کوئی نہیں ہے۔ آچکی سب سے چھوٹی ہے۔ جب یہ پیدا ہوئی تو اس کے ماں باپ نے دعا مانگی۔ ''تو نے لڑکیوں کی فوج دے دی۔ اب بس کر مولا...... بس یہ آچکی۔ اس کے بعد اس کا نام آچکی ہوگیا۔ کسی کے گھر میں لگا تار لڑکے پیدا ہو رہے ہوں تو وہ شگون والا نام رکھتا ہے۔ ''بس کر اللہ'' یا ''بس کر بھگوان۔''

گاؤں میں نہ بجلی تھی نہ نلکوں سے پانی سپلائی ہوتا تھا۔ ماشکی روزانہ مشک میں پانی لا کر سیمنٹ کی بڑی ٹنکی بھر دیتا تھا۔ ماشکی کی تنخواہ دو روپے ماہوار تھی۔

حمید نے کہا۔ ''یار بلوچ میرے بیوی بچے تو روہتک گئے ہوئے ہیں، پورا گھر اس لڑکی نے سنبھالا ہوا ہے۔ اس کی تنخواہ بھی دو روپے ماہوار پلس کھانا کپڑا وغیرہ۔ کبھی کبھی رات کو اسے روک لیتا ہوں۔'' حمید آنکھ مار کر ہنسا۔ ''اچھا میں چلا آفس سائڈ پر تم ناشتا کر کے سو جانا۔''

میں غسل خانے سے نہا دھو کر نکلا تو آچکی ناشتے کی سینی لے آئی۔ گرم، گرم اصلی گھی والے پراٹھے۔ انڈوں کا خاگینہ تھا۔ باجرے کی گرم روٹی کو گڑ میں اچھی طرح گوندھ کر بنایا ہوا میٹھا جو بڑا مزیدار تھا۔

میں نے خوب ڈٹ کر ناشتا کیا پھر آچکی کو آواز دی وہ فوراً حاضر ہوگئی۔ میں نے کہا۔ ''آچکی ناشتا بہت اچھا تھا۔ باجرے کی روٹی کا میٹھا ملیدہ تو بہت ہی مزیدار تھا۔'' میں نے توقف کیا پھر اس کی جانب دیکھ کر بولا۔ ''اچھا آچکی، چائے پلاؤ گی؟''

آچکی بہت خوش ہوئی۔ ''ابھی لاتی ہوں صاحب۔''

جب وہ چائے لے کر آئی تو میں نے کہا۔ ''آچکی سامنے کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ باتیں کریں گے۔'' جب وہ اپنا لہنگا سنبھال کر کرسی پر بیٹھ گئی تو میں نے پوچھا۔ ''آچکی تم نے پڑھنا لکھنا بھی سیکھا ہے یا نہیں؟''

''کونی (نہیں، نہ) صاحب۔'' اس نے انکار میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہاں مسلمانوں میں پڑھنے لکھنے کا رواج نہیں ہے۔ سیٹھ لوگوں نے یہاں بہت بڑا اسکول بنایا ہوا ہے جس میں آس پاس کے گاؤں کے لڑکے بھی پڑھنے آتے ہیں۔ اسکول میں صرف دو مسلمان لڑکے ہیں وہ بھی راجا صاحب کے دیوان جی کے بیٹے ہیں۔ بابوجی کے بچے تو ابھی بہت چھوٹے ہیں۔ ہم چھ بہنیں ہیں۔ چار کی سادی بیاہ ہوگیا ہے، میں اور مجھ سے بڑی بہن ابھی بن بیاہی ہیں پر مھاری سگھائی ہوگئی ہے۔ ہم دونوں بہنیں پاس والے گاؤں میں بیاہ کر جائیں گی۔''

''آچکی اس گھر میں کیا کام کرتی ہو؟''

''پورا کام۔ روٹی، سالن بنانا۔ سب بابوجی کی گھر والی نے سکھایا ہے۔ مھارے (ہمارے) گھر میں تو باجرے کی روٹی اور سرسوں کے ساگ کی ہانڈی بنتی ہے۔ روزانہ کمروں کی صفائی کرتی ہوں۔ یہاں ٹیلوں پر سانپ اور بچھو بہت ہیں۔ گھر میں گھس آتے ہیں۔ میں ڈرتی نہیں ہوں جھاڑو سے مار دیتی ہوں۔ آج کل باجی اور بچے اپنے نانا نانی کے گھر گئے ہوئے ہیں کام کم ہے۔ بابوجی کبھی، کبھی رات کو روک لیتے ہیں۔'' آچکی نے شرماتے ہوئے کہا۔

''اچھا۔ تمہارا امنگیتر ناراض نہیں ہوتا؟''

''کونی صاحب۔ ابھی نانی کا نکوڑا کونی۔''

میں نے حیرت سے دیکھا۔ ''یہ کیا کہا تم نے۔ نانی کو کیا ہوگیا؟''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''صاحب یہ ہماری بولی کے لف۔ فظ ہیں۔ اس کا مطلب ہے۔ ہمارا گھر تمہاری نانی کا

گھر نہیں ہے کہ تمہارا حکم چلے۔“

”مگر تمہاری زبان۔ بولی تو کافی صاف ہے۔“

”دو سال سے یہاں کام کر رہی ہوں۔ باجی نے ٹوک ٹوک کر میری بولی صاف کی ہے۔“

مجھے زور کی نیند آرہی تھی۔ مجھے پتا ہی نہ چلا کہ آچکی کب گئی۔ میں گہری نیند میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

میری آنکھ کھلی تو شام کے چار بج رہے تھے۔ میں غسل خانے میں گھس گیا اور کافی دیر تک نہاتا رہا۔ جب غسل خانے سے باہر آیا تو حمید تار بابو کو کام سونپ کر آ گیا تھا۔ اس نے کہا۔ ”لیفٹیننٹ بلوچ! میں دوپہر میں روٹی کھانے گھر والے حصے میں آیا تو تم گہری نیند سو رہے تھے۔ میں نے تمہیں اٹھانا مناسب نہیں سمجھا۔ اب بولو روٹی ابھی کھاؤ گے یا چائے پیو گے؟“

”یار حمید، ابھی کھانا نہیں کھاؤں گا۔ واقعی میں اتنی گہری نیند سو رہا تھا کہ ٹینک بھی مجھ پر سے گزر جاتا تو مجھے پتا نہیں چلتا۔“

”ہاں بھئی، آرمی والے ہونا۔ ٹینک کی مثال ہی دو گے۔“

آچکی نے اندر آ کر ہمارے سامنے چھوٹی سی تپائی رکھ دی پھر چائے کی ٹرے اٹھا لائی۔ چائے کے ساتھ گڑ اور تلوں والے بسکٹ تھے۔ چائے بھی بہت اچھی تھی جو ان بسکٹوں کے ساتھ اور بھی اچھی لگ رہی تھی۔

حمید نے کہا۔ ”یار بلوچ یہاں گھومنے گھمانے اور تفریح کی ایک ہی جگہ ہے وہ یہ ریت کے ٹیلے۔ شام کو ریت ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ سب بچے بڑے وہیں جاتے ہیں اور خوب ہلا گلا کرتے ہیں۔ چائے کے بعد وہاں چلیں گے۔“

چائے پی کر ہم دونوں دوست ریت کے ٹیلوں کی طرف روانہ ہوئے۔ جس گلی سے گزرتے تھے لوگ ”نمستے بابو جی“، ”سلام بابو جی“ کہتے تھے۔

”یار حمید، تیری تو یہاں بڑی عزت ہے۔“

”ہاں بلوچ، راجواڑوں میں پوسٹ ماسٹر اور ریلوے کے اسٹیشن ماسٹر کی بڑی عزت کی جاتی ہے۔ یہ دونوں محکمے بڑی سرکار کے محکمے کہلائے جاتے ہیں۔ بڑی سرکار یعنی انگریزوں کی سرکار۔ یہاں راجواڑے میں چھوٹی بڑی پچاس ریاستیں تو ہوں گی۔ سب سے امیر ریاست جے پور کی ہے، وہاں کا راجا، مہاراجا سوائے جے سنگھ (شیر ببر) کہلاتا ہے یعنی دیگر ریاستوں کے راجا ”ایک“ ہیں تو مہاراجا جے پور ”سوا ایک“ ہے۔ بساؤ ریاست کا راجا بہت غریب ہے۔ نہ کوئی ٹیکس نہ دوسرا کوئی آمدنی کا ذریعہ۔ بس یہاں کے سیٹھ لوگ اسے روپیا دیتے رہتے ہیں۔ نوکروں کو چھ چھ ماہ تک تنخواہ نہیں ملتی۔ اس راجا کے بہت لطیفے مشہور ہیں۔“

ہم باتیں کرتے ہوئے ٹیلوں تک پہنچ گئے۔ ہر طرف اونچے نیچے ریت کے بے شمار ٹیلے تھے۔ یہاں میلہ سا لگا ہوا تھا۔ ایک طرف کبڈی کا میچ ہو رہا تھا تو دوسری طرف کشتی کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ ایک چھوٹے ٹیلے پر شرط لگا کر پتنگوں کے پیچ لڑائے جا رہے تھے۔ چھوٹی بچیاں لڑکیوں کا پسندیدہ کھیل ”پیل دوج“ کھیل رہی تھیں۔ بڑی رونق تھی۔

ہم بھی ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ کر بیٹھ گئے۔ ریت ٹھنڈی تھی ہوا بھی ٹھنڈی چل رہی تھی۔ میں بہت انجوائے کر رہا تھا۔ ریت کے ٹیلے ہمارے سندھ میں بھی ہیں مگر ایسی رونق وہاں نہیں ہوتی تھی۔

میں نے کہا۔ ”ہاں حمید تم راجا کے لطیفوں کی بات کر رہے تھے وہ بھی بتاؤ یار۔“

حمید بات شروع کرنے سے پہلے ہنس پڑا یہ اس کی عادت تھی۔ ”بلوچ ایک دفعہ یہاں کا راجا سورج طلوع ہونے سے ذرا پہلے ایک اونچے درخت پر چڑھ کر بیٹھ گیا یہاں عام طور پر گھروں میں لیٹرین نہیں ہوتے ہیں۔ صبح سویرے سب لوگ نمٹنے کے لیے یعنی فراغت کے لیے ٹیلوں پر جاتے ہیں۔ ایک طرف مرد، دوسری طرف عورتیں سب سے پہلے عورتیں گروپ کی شکل میں، پیتل کی لٹیا ہاتھ میں لیے نکلتی ہیں۔ عورتیں جب اس درخت کے نیچے سے گزرنے لگیں تو انہوں نے راجا صاحب کو درخت پر بیٹھے دیکھا۔ ان کی تو چیخ نکل گئی۔ ”ہے بھگوان۔ راجا جی پیڑ پر کیوں بیٹھ گئے ہو۔ بھگوان کے لیے نیچے اتر آؤ۔“ راجا نے کہا۔ ”نیچے اتر کر کا کریں۔ کھانا (خزانہ) خالی پڑا ہے، نوکروں کو پگار کہاں سے دیویں۔ سب مھاری سکل دیکھے ہیں پر ہم کا کریں۔ ہم نیچے کوئی آویں گے بس اوا وپر بھگوان کے کنے جائیں گے۔“

سب عورتیں پلٹ کر گھر کی طرف بھاگیں اور اپنے مردوں سے کہنے لگیں۔ ”تم یہاں مجے (مزے) سے بیٹھے ہو، مھارے بھگوان سمان راجا جی پیڑ پر چڑھے بیٹھے ہیں، وہ بولے ہیں کھجانہ خالی پڑا ہے بس ہم مر کر بھگوان کنے جائیں

گے۔“

پورے گاؤں میں کھلبلی مچ گئی۔ سیٹھ لوگ بھی نکل آئے۔ سب مرد درخت کے نیچے کھڑے ہو کر راجا کی منت کرنے لگے۔ راجا نے صاف انکار کر دیا۔ ”ہم نے ایک باری بول دیا ہے۔ ہم مرنے کے لیے اوپر بیٹھے ہیں ہمیں نیچے اتارنا ہے تو روپیا بوریوں میں بھر کر لاؤ ہمارے لیے سیڑھی بناؤ اس پر اتریں گے ورنہ بس مر جائیں گے۔“

”چنانچہ سیٹھوں نے روپیا بوریوں میں بھر کر سیڑھی بنا دی۔ راجا جی ان بوریوں پر اترے۔“

میں نے یہ قصہ سن کر قہقہہ لگایا۔ ”یار یہ راجا تو بڑا دلچسپ بندہ ہے۔ کسی دن اس سے ملواؤ۔ اچھا حمید یہ بتاؤ یہاں کتنے مسلمان ہیں۔“

”یار بلوچ، یہاں کی آبادی پانچ چھ ہزار ہے، ان میں تقریباً ایک ہزار مسلمان ہیں۔ ہندو مسلمانوں میں بڑا میل ملاپ ہے۔ دیوالی، ہولی، عید اور محرم میں بڑی رونق ہوتی ہے۔ یہاں شیعہ مسلک والوں کا ایک بھی گھر نہیں ہے لیکن یہاں محرم بڑی شان سے منایا جاتا ہے۔ پہلی محرم سے نو محرم کی رات تک اونٹ کی کھال کی بنی ہوئی بہت بڑی نوبت بجائی جاتی ہے۔ دس محرم کو تعزیوں کا جلوس نکالا جاتا ہے۔ شام کو راجا کے سامنے پٹے بازی (لٹھ بازی) کا مقابلہ ہوتا ہے۔ راجا سب کو ایک روپیا دو روپیا انعام دیتا ہے اس کے بعد قیمتی سامان اور چڑھاوے اتار کر تمام تعزیے ایک گڑھے میں دفن کر دیے جاتے ہیں۔ ہاں بلوچ یہاں ہولی والے دن بڑا زبردست میلا ہوتا ہے۔ ہولی کے تہوار میں ابھی دس دن ہیں اس سے پہلے تمہیں ایک اور چیز دکھانی ہے مگر اس کے بارے میں ابھی کچھ نہیں بتاؤں گا۔“

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر میں نے پوچھا۔ ”اچھا حمید ایک بات بتاؤ۔ آج کل پاکستان کی تحریک چل رہی ہے۔ جداگانہ الیکشن ہونے والے ہیں۔ یہاں کے مسلمان کیا سوچتے ہیں؟“

”یار بلوچ یہاں کے مسلمان زیادہ پڑھے لکھے نہیں ہیں لیکن پاکستان کی تحریک سے خوب واقف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم یہیں رہیں گے۔ راجا ہمارا حمایتی ہے لیکن پاکستان کے لیے ووٹ ہم مسلم لیگ کو ہی دیں گے۔ یہاں ٹینشن کے جراثیم پیدا ہونے شروع ہو گئے ہیں لیکن کسی بڑے دنگے فساد کی اُمید نہیں۔ یہاں کا راجا کہتا ہے کہ ہم راجپوت ہیں مغلوں سے ہماری رشتے داری تھی۔ کوئی مسلمانوں پر ہاتھ نہ اٹھائے۔“

سورج غروب ہونے والا تھا۔ ہم ٹیلوں سے اتر کر گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں، میں نے پوچھا۔ ”حمید، آچکی تو تمہاری گھریلو ملازمہ ہے یہ بتاؤ کہ اس چھوٹے سے گاؤں کے آفس میں کتنا اسٹاف ہے؟“

حمید حسبِ عادت پہلے ہنسا۔ ”بساؤ کو چھوٹا سا گاؤں مت سمجھو۔ بیس پچیس کوس کے دائرے میں جتنے بھی چھوٹے چھوٹے گاؤں، بستیاں ہیں ان کو بھی ہمیں سروس پرووائیڈ کرنی ہوتی ہے۔ ہمارے پاس تین اونٹ ہیں ان کا خرچا بھی سرکار دیتی ہے، چار سائیکلیں ہیں۔ تین پوسٹ مین ہیں اور ایک تار بابو۔ ایک چھوٹی سی اونٹ گاڑی ہے جو تیسرے دن سیکر ریلوے اسٹیشن جاتی ہے یہاں سے ڈاک لے جاتی اور یہاں کی ڈاک وہاں سے لاتی ہے۔ اس کا ساربان بھی سرکاری ملازم ہے۔ خوب صحت مند ہے۔ شراب اور عورت کا رسیا ہے۔ تنخواہ ملتے ہی شراب خریدتا ہے مہینے میں ایک یا دو دفعہ کسی عورت کو گھیر گھار کے اپنے کوارٹر میں لے جاتا ہے مگر اس میں دو باتیں اچھی ہیں۔ پوسٹ آفس کے احاطے میں رہنے والی کسی بھی عورت کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ دوسرے کھرا اور ایمان دار آدمی ہے۔ ڈاک کے تھیلوں میں منی آرڈر کے پیسے اور ملازمین کی تنخواہیں آتی ہیں۔ ہر دفعہ کہتا ہے۔ ”اچھی طرح دیکھ لو بابو جی۔ ہر تھیلے پر سرکاری مہر (سیل) لگی ہوئی ہے۔ منے چوری چکاری کونی کرنی۔ اکیلا منش ہوں سرکاری پگار میں اچھی گجر بسر ہو رہی ہے۔“

جب ہم باتیں کرتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے تو رات ہو چکی تھی۔ آچکی نے لالٹین روشن کر کے ہر کمرے میں رکھ دی تھیں۔ صحن میں ایک بڑا سا تخت بچھا تھا اس پر بھی ایک روشن لال ٹین رکھی ہوئی تھی۔

آچکی نے کہا۔ ”بابو جی۔ دن میں بھی صاحب جی نے روٹی نہیں جیمی (کھائی) تھی۔ اب بھوک لگ رہی ہو گی۔ تخت پر روٹی لگا دوں۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں آچکی بہت بھوک لگی ہے جلدی سے اسی تخت پر کھانا لگا دو۔“

آچکی نے تخت پر پہلے دستر خوان بچھایا۔ پانی کی صراحی اور دو گلاس رکھے اور کھانا لگا دیا۔ ہم ہاتھ دھو کر کھانے بیٹھ گئے۔ بکرے کا بھنا ہوا گوشت تھا۔ میٹھے کدو کی ترکاری تھی۔ اچار تھا اور میٹھے میں سویاں تھیں۔ آچکی نے

کہا۔ ''لوجی کھانا جیمو۔'' ہم نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔

''یار حمید بھابی نے اسے اچھی طرح ٹرینڈ کر دیا ہے۔ ہر ڈش لاجواب ہے۔ چپاتیاں بھی اس نے اچھی بنائی ہیں اس کے ہاتھ میں سواد ہے۔'' میں تعریفی انداز میں بولا۔

حمید حسبِ عادت پہلے ہنسا۔ ''آچکی میں بھی بہت سواد ہے۔ رات ادھر ہی رکے گی۔ بس تم احتیاط کرنا۔ ابھی اس کا بیاہ نہیں ہوا ہے۔ میرا مطلب ہے اسے کسی پرابلم میں جتلا مت کرنا۔''

کھانا کھا کر حمید نے کہا۔ ''آج میں نے تار بابو کی چھٹی کر دی ہے۔ رات کو میں آفس میں چارپائی بچھا کر لیٹوں گا۔ یہ مورس کی (ٹیلی گرام کا انسٹرومنٹ) رات بھرٹی ٹانگ ٹی ٹانگ کرتا رہتا ہے۔ جب بساؤ۔ بساؤ کرتا ہے تو مجھے اٹھنا پڑتا ہے۔ اس کی ٹی ٹانگ، ٹی ٹانگ کو سمجھنا بہت مشکل ہے، لوگ سال سال بھر ٹریننگ لیتے ہیں پھر بھی فیل ہو جاتے ہیں۔ سنو جب جاپان نے ہتھیار ڈالے تھے تو ہماری تو چاندی ہو گئی۔ اتفاق سے اس دن سب بڑے بڑے سیٹھ کسی کے مرن کے سلسلے میں بساؤ میں جمع تھے۔ مارکیٹ میں بھونچال آیا ہوا تھا۔ سیٹھوں کے منشی لگاتار ٹیلی گرام بھیج رہے تھے۔ یہاں سے بھی تار جا رہے تھے۔ ایک دن میں تین، تین سو ٹیلی گرام۔ پانچ بجے کے بعد لیٹ فیس لاگو ہوتی تھی۔ ایک ورڈ پر تین پائی (ایک پیسے سے بھی بہت چھوٹا سکہ)۔ یہ لیٹ فیس ہمیں ملتی تھی مجھے اور تار بابو کو دو ہفتے میں پچیس پچیس روپے لیٹ فیس کے ملے تھے۔''

باتیں ختم ہوئیں تو حمید بیچ کا چھوٹا سا دروازہ کھول کر آفس والے پورشن میں چلا گیا اور آچکی میرے کمرے میں آگئی۔

☆☆☆

دوسرے دن ناشتا کرتے ہوئے حمید نے کہا۔ ''یار بلوچ تو بڑے موقع پر آیا ہے۔ یہاں سے پندرہ بیس کوس کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ آبادی کوئی ہزار کے قریب ہو گی۔ سب مسلمان ہیں۔ دو دن پہلے وہاں سے ایک اونٹنی سوار اپنی ڈاک دینے آیا تھا۔ وہ بتا رہا تھا کہ وہاں آنے والے جمعہ کو ایک قاتل کو موت کی سزا دی جائے گی۔ پنچایت نے فیصلہ کیا ہے۔ تم وہ سزا ضرور دیکھنے جانا۔''

''حمید اس میں دیکھنے والی کیا بات ہو گی، پھانسی ہو گی یا تلوار مار کر گردن کاٹ دی جائے گی۔''

''نہیں بلوچ تم دیکھو گے تو تمہارے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔ دو سال پہلے میں وہ سزا دیکھنے گیا تھا۔ بس نہ پوچھو کیا ہوا۔ دو دن تک بخار میں پڑا رہا۔ میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا تمہیں احمدا ساتھ لے جائے گا۔ احمدا ہیڈ پوسٹ مین ہے۔ اونٹ پر رات بھر کا سفر ہے۔ جمعہ کی نماز کے بعد سزا دی جاتی ہے۔ ایسی سزا دنیا میں کہیں نہیں دی جاتی ہو گی۔ تم جمعرات کی رات کو نکل جانا۔ تم بھی یاد کرو گے کہ بابو حمید نے کیا دکھا دیا۔''

☆☆☆

احمد علی عرف احمدا تقریباً چالیس سالہ ہیڈ پوسٹ مین تھا۔ ہنس مکھ اور باتونی۔ میں اور احمدا رات کا کھانا کھا کر دو اونٹوں پر سوار ہوئے اور اس پُراسرار بستی کی جانب روانہ ہوئے۔

رات کو صحرا بہت ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ احمدا نے ایک کھیس ٹائپ کی چادر مجھے دی اور ایک خود اوڑھی۔ ہم اونچے نیچے ٹیلوں پر سفر کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ چاند کی روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ احمدا اپنی رام کہانی سنا رہا تھا۔ اس کی دو بیویاں تھیں۔ دونوں ایک ہی کوارٹر میں سکون سے رہتی تھیں۔ پہلی بیوی کی کوئی اولاد نہیں تھی جبکہ دوسری بیوی کے دو بچے تھے دونوں لڑکے۔ ایک کی عمر دو سال، دوسرے کی چار سال تھی۔ پہلی بیوی کو بڑی اماں کہتے تھے۔ پہلی بیوی ایک سیٹھ کے گھر میں کام کاج کرنے جاتی تھی گھر واپس آکر دونوں بچوں کو سپارہ پڑھاتی تھی۔

احمدا نے بتایا۔ ''صاحب جی جب کسی سیٹھ کے باپو یا ماتا کا مرن ہو جاتا ہے تو وہ پورے گاؤں کا نوتا کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ تین دن تک رات کا کھانا پورے گاؤں والوں کو کھلاتا ہے۔ کھانا شام 5 بجے سے شروع ہوتا اور رات گئے تک جاری رہتا ہے۔ سب لوگ لائن سے زمین پر بیٹھ جاتے ہیں، ہر ایک کے سامنے ایک رومال رکھ دیا جاتا ہے۔ کئی لوگ بالٹیوں میں لڈو اور نمکین کچوریاں لے کر آتے ہیں اور ہر ایک کے سامنے چار لڈو اور چار کچوریاں رکھتے جاتے ہیں۔ لوگ خوب کھاتے ہیں جب تک پیٹ نہیں بھر جاتا، ان کے سامنے لڈو اور نمکین کچوریاں آتی رہتی ہیں۔ کچھ لوگ رومال میں بھر کر گھر لے جاتے ہیں۔ عام لوگوں میں ہندو، مسلمان کی کوئی چھوت چھات نہیں ہے۔''

احمدا کی باتیں بڑی دلچسپ تھیں، سفر باتیں کرتے کرتے گزر گیا۔ میں نے سوچا کہ احمدا کو آچکی کے بارے

میں بتاؤں پھر کچھ سوچ کر میں نے یہ مناسب نہ سمجھا۔ میری گزشتہ رات آچکی کے ساتھ بہت اچھی گزری تھی۔

جب ہم اس بستی کی حدود میں داخل ہوئے اس وقت فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ ہم نے مسجد کے سامنے اونٹ روکے اور ان کے چارے پانی کا انتظام کر کے نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں داخل ہو گئے۔

نماز کے بعد ہمارا تعارف گاؤں کے پنچ سے کرایا گیا۔ وہ لمبی سفید داڑھی والا عمر رسیدہ آدمی تھا۔ وہ پہلے ہمیں اپنے گھر لے گیا۔ اچھا سا ناشتا کرایا۔ ہم نے اسے یہاں آنے کا مقصد بتایا تو اس نے کہا۔

''اچھا تمہیں بساؤ کے بابو جی نے بھیجا ہے۔ تم لوگوں میں اتنی ہمت ہے کہ وہ سزا دیکھ سکو۔ بابو جی نے دیکھی تھی تو تین دن تک ان پر تپ چڑھی رہی، پھر اس نے اپنے متعلق بتایا۔ ''یہ بہت چھوٹا سا گاؤں ہے۔ آبادی کوئی ایک ہزار ہو گی۔ سب مسلمان ہیں۔ صدیوں پہلے ہمارے بزرگوں کے بزرگ عربستان سے مار پیٹ کر نکالے گئے تھے۔ کوئی کدھر گیا کوئی کدھر گیا۔ ہمارا قبیلہ ادھر آ گیا۔ یہاں کا راجا بہت اچھا ہے۔ اس نے یہاں گاؤں بسانے کی اجازت دے دی۔ دو میٹھے پانی کے کنویں ہیں۔ مویشی بھی پالتے ہیں۔ تھوڑی سی کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ یہاں رہتے ہوئے بھی بہت عرصہ گزر گیا۔ اب یہ بھی یاد نہیں کہ ہم کون سے عربستان سے نکالے گئے تھے۔ عربی زبان بھی بھول بھال گئے۔ صرف قرآن کی عربی پڑھنا جانتے ہیں۔ وہ پرانی سزا کا رواج ابھی تک چل رہا ہے پر یہ آخری سزا ہے۔ انگریزی سرکار ناراض ہے، بولتی ہے بند کرو ایسی سزا ورنہ تمہیں یہاں سے بھی نکال دیا جائے گا۔''

جب پنچ خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔ ''بزرگوار یہ تو بتاؤ یہ سزا کس کو اور کیوں دی جا رہی ہے؟''

''وہ آدمی اسی بستی کا ہے۔ اس نے رات میں ایک عورت کو زبردستی اونٹ پر بٹھایا اور ٹیلوں پر لے گیا۔ اس عورت کی عزت لوٹی اور جان سے مار کر اس کی لاش ریت میں دبا دی۔ جرم کہیں چھپتا ہے، ہمارے پالتو کتوں نے دوسرے دن ہی اس لڑکی کی لاش کا پتا لگا لیا۔ کچھ لوگوں نے اس آدمی کو اونٹ پر لڑکی کو لے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ آدمی پکڑا گیا۔ جرم بھی قبول کر لیا۔ پنچایت نے اسے موت کی سزا سنا دی۔ جمعہ کی نماز کے بعد اسے سزا دی جائے گی۔ تم لوگ پوری رات کا سفر کر کے آئے ہو۔ ابھی سو جاؤ۔ نماز سے پہلے تمہیں جگا دیں گے۔''

ہم لوگ واقعی تھکے ہوئے تھے پھر بھرپور ناشتا کیا تھا اس لیے لیٹتے ہی سو گئے۔ جمعہ کی اذان سے پہلے ہمیں اٹھا دیا گیا۔ پہلے ہم نے کھانا کھایا پھر وضو کر کے نماز کے لیے مسجد روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

وہ بہت وسیع احاطہ تھا چاروں طرف چھ فٹ اونچی چار دیواری تھی۔ صرف ایک دروازہ تھا۔ وہاں سو کے قریب لوگ جمع تھے۔ سب مرد تھے۔ عورتوں اور بچوں کا داخلہ منع تھا۔ مجرم کے گھر والوں پر بھی پابندی تھی۔

احاطے کے بیچ میں کوئلے دہک رہے تھے کوئلوں کے اوپر ایک توا رکھا ہوا تھا جو آگ کی تپش سے سرخ ہو رہا تھا۔ پاس ہی ایک کرسی پر مجرم بیٹھا ہوا تھا۔ ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے، آنکھوں پر پٹی تھی۔ اس کے سامنے تپلی سی تپائی پر ایک سروتا نما کوئی اوزار تھا۔ سروتے کا نچلا حصہ چھ انچ چوڑا اور دو فٹ لمبا تھا۔ اوپر والا لمبا سا ہینڈل تھا۔ اوپر والے حصے کی موٹائی نیچے کی طرف آتے آتے باریک اور تیز دھار والی ہو گئی تھی۔

میں اور احمد اجمع کے ساتھ سب سے آگے کھڑے حیرت سے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ سب لوگ دائرہ بنائے خاموش کھڑے تھے۔ بیچ میں کافی جگہ تھی۔ دو آدمی سروتے کے قریب اور دو آدمی آگ میں سرخ ہوتے ہوئے توے کے قریب کھڑے تھے ان کے ہاتھ میں لمبے لمبے چمٹے تھے۔ ہر طرف خاموشی تھی۔

کچھ دیر کے بعد آگ کے پاس کھڑے ہوئے آدمیوں نے کہا۔ ''سردار توا گرم ہو کر لال انگارہ ہو گیا ہے۔ حکم دیجیے۔'' یہ سن کر پنچ نے جیب سے سفید رومال نکال کر لہرایا۔ اشارہ ملتے ہی دو آدمیوں نے مجرم کے ہاتھ کھولے اور اسے اٹھا کر اس کی گردن سروتے میں پھنسا دی پنچ نے اب لال رومال نکال کر لہرایا۔ ان دو آدمیوں نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا اور سروتے کا اوپر والا ہینڈل پکڑ کر زور سے نیچے کی طرف دبا دیا۔ ''اوخ'' کی آواز کے ساتھ مجرم کا سر کٹ کر نیچے گر گیا۔ جو دو آدمی آگ کے قریب کھڑے تھے انہوں نے فوراً بڑے چمٹوں سے توے کو پکڑا اور مجرم کی کٹی ہوئی گردن پر رکھ دیا۔ خون جلنے کی بُو آئی، تو گردن سے بالکل چپک گیا تھا۔ سر کٹا مجرم کرسی سے اٹھا اور اِدھر اُدھر بھاگنے لگا لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔ خون بدن سے بہے تو

جان نکلے۔ سر کٹا احاطے میں ناچتا پھر رہا تھا۔

لوگ ڈر کر پیچھے ہوگئے۔ کچھ لوگوں نے منہ پھیر لیے۔ ہم پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے میرے رونگٹے کیا سر کے بال بھی کھڑے ہو گئے تھے۔ ہم دونوں بیٹھ کر الٹیاں کرنے لگے۔ یہ خوفناک منظر پانچ چھ منٹ تک جاری رہا۔ تو الال سے کالا ہوگیا اور گردن سے سلپ ہو کر نیچے گر پڑا۔ ساتھ ہی مجرم کا دھڑ بھی ٹھنڈا ہوگیا۔ کارندوں نے مجرم کا سر اور دھڑ ایک ترپال میں لپیٹا اور احاطے سے نکل گئے۔

احمد اور میری یہ سین دیکھ کر کیا حالت ہوئی۔ میں بیان نہیں کرسکتا۔ ہم دونوں اونچی اونچی آواز میں ''اللہ۔ اللہ'' پکارتے ہوئے بیچ کی بیٹھک کی طرف بھاگے اور وہاں بچھے ہوئے فرش پر گر گئے۔ ہمارے دل دھڑک رہے تھے۔ سانس پھولی ہوئی تھی۔ پندرہ منٹ تک مجھ سے کچھ بولا ہی نہیں گیا پھر میں نے احمد سے کہا۔ ''یار میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ تمہارا چہرہ بھی سفید پڑا ہوا ہے۔ بس یار۔ یہاں سے نکل چلو۔ اونٹوں کو چارا پانی پلاؤ۔ رات کا کھانا ساتھ لے لو۔ بس روانہ ہو جاؤ۔''

''صاحب ابھی تو بہت گرمی ہے۔ شام تو ہو لینے دیں۔''

''نہیں یار۔ بس نکل چلو۔ دو گھنٹے کے بعد شام ہو جائے گی۔''

ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ ایک چھوٹی سی لڑکی ہاتھ میں سینی تھامے اندر داخل ہوئی۔ سینی ہمارے سامنے رکھ کر واپس چلی گئی۔ سینی پر دو لارج سائز گلاس تھے۔ احمد نے ایک گلاس اٹھا کر ایک گھونٹ بھرا۔ ''صاحب یہ جو کا ستو ہے ٹھنڈا ہے۔ آپ اسے ضرور پئیں۔''

میں نے بھی گلاس اٹھا کر ایک گھونٹ بھرا ستو واقعی ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ ستو پی کر ہمارے حواس کچھ قابو میں آئے۔

ہم ایک گھنٹے کے بعد وہاں سے روانہ ہوگئے۔ گرمی اور دھوپ تھی مگر قابلِ برداشت تھی۔ رات کو ایک جگہ چادر بچھا کر ہم نے کھانا کھایا جو کی روٹیاں تھیں۔ کئی قسم کے اچار تھے۔ روٹی کھا کر ہم تھوڑی دیر کے لیے وہیں لیٹ گئے۔ ریت ٹھنڈی ہوگئی تھی۔ ہوا میں بھی ذرا سی خنکی آ گئی تھی۔

میں نے کہا۔ ''احمد! اگر تم مجھے سو روپے بھی دو تو میں ایسی سزا دوبارہ نہ دیکھوں۔ میری توبہ۔''

احمد ہنسا۔ ''صاحب میری تنخواہ بائیس روپے ہے۔ میں سو روپیا کہاں سے دوں گا۔ ہم تین پوسٹ مین ہیں۔ ہمیں سیٹھوں سے جو ٹپ ملتی ہے وہ ہم ایمانداری سے آپس میں برابر برابر بانٹ لیتے ہیں۔ میری پہلی والی لوگائی (بیوی) بھی کام کرتی ہے اللہ کا شکر ہے بہت اچھی گذر بسر ہو رہی ہے۔''

''احمد! میں تمہیں بتاتا ہوں۔ ہمارے علاقے میں بھی قبیلے کا سردار بڑی سخت سزائیں دیتا ہے۔ لوگوں کی پوری پوری فیملی کو اپنی نجی جیل میں بند کر دیتا ہے۔ ان سے بیگار میں کام لیتا ہے۔ ان کی بیوی بیٹیاں سردار کی حویلی میں کام کرتی ہیں۔ رات کو سردار کے پاؤں دباتی ہیں۔ ذرا سی غلطی پر لڑکی کو برہنہ کرکے الٹا لٹکا دیتے ہیں۔ شادی کے لیے اگر کوئی لڑکی اپنی پسند کا اظہار کرے تو اسے قبر میں زندہ دفن کر دیتے ہیں۔ میرے قبیلے میں البتہ میرے زور دینے پر یہ سزائیں ختم ہوگئی ہیں۔''

''صاحب، بابو جی بتا رہے تھے کہ آپ ان کے ساتھ علی گڑھ میں پڑھتے تھے۔''

''ہاں احمد۔ تمہارے بابو جی مجھ سے بہت سینئر تھے مگر ہم دونوں میں بڑی گہری دوستی تھی بعد میں خط و کتابت بھی ہوتی رہی۔''

☆☆☆

سورج طلوع ہونے سے پہلے ہم بساؤ پہنچ گئے۔ میں سیدھا جوتے اتار کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ ہلکا ہلکا بخار محسوس ہو رہا تھا۔ دماغی ٹینشن میں نیند کی ایک گولی پانی سے نگلی اور لمبی تان کر سو گیا۔

پانچ گھنٹے کی نیند نے اچھا اثر دکھایا پہلی والی صورتِ حال ختم ہوگئی تھی۔ نہا کر غسل خانے سے نکلا تو آچکی ناشتے کی سینی لے آئی۔ ''لو صاحب ناشتا جیم لو۔''

''ہاں آچکی بہت بھوک لگی ہے۔ اتنی بھوک کہ دل کرتا ہے تمہیں بھی کھا لوں۔''

آچکی شرما گئی۔ ''بابو جی ناشتا جیمنے آئے تھے مجھے منع کر دیا تھا کہ آپ کو کوئی اٹھاؤں۔ سونے دوں۔''

ناشتا کر کے ایک دفعہ پھر سو گیا۔ ایک بجے حمید نے اٹھایا۔ ''اٹھ جا فوج کے شہزادے۔ کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔''

میں ہاتھ منہ دھو کر آ گیا۔ آچکی نے کھانا لگا دیا تھا۔ حمید نے کہا۔ ''کہو بلوچ سزا کا سین دیکھا کیسا لگا۔''

''او بھائی حمید علیگ۔ تیرے ساتھ میری کیا دشمنی تھی کہ تو نے مجھے وہاں بھیجا۔ دماغ میں وہ سین جم کر رہ گیا ہے۔ مجھے سکون بخش گولی کھانی پڑی۔ بس میں دو دن کے بعد شملہ واپس چلا جاؤں گا۔''

حمید ہنس پڑا۔ ''آچکی تمہیں جانے دے گی تو جاؤ گے ناں۔ ویسے یار بلوچ میری بھی ایسی ہی حالت ہوئی تھی۔ دو دن تک بخار میں پڑا رہا۔ میں نے بعد میں اس پر ریسرچ بھی کی تھی۔ ریسرچ کیا، اسکول میں پڑھی ہوئی کتاب کی یاد آگئی تھی اس میں لکھا تھا کہ کوئی سو سال پہلے کسی عرب ملک کے ساحلی پہاڑی علاقے سے ایک بہت بڑے قبیلے کو مار پیٹ کر نکالا گیا تھا۔ وہ قبیلہ تتر بتر ہو کر افریقا اور ایشیاء میں پھیل گیا۔ معلوم ہوتا ہے یہ لوگ بھی اسی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ انگریزی سرکار نے اس سزا پر پابندی لگا دی ہے۔ اچھا سنو چار دن کے بعد ہولی کا تہوار منایا جائے گا۔ وہ تمہیں دکھانا ہے۔ سب کوفت دور ہو جائے گی۔''

کھانا کھا کر حمید آفس والے پورشن میں چلا گیا۔ آچکی نے پوچھا۔ ''صاحب جی۔ یہ بابو جی کون سی سزا کا جکر (ذکر) کر رہے تھے۔''

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''رات کو آنا خوب اچھی طرح سمجھا دوں گا۔''

آچکی شرما کر کھانے کے برتن اٹھانے لگی۔

☆☆☆

ہولی والے دن صبح ہی سے گاؤں میں بہت رونق تھی۔ پوسٹ آفس میں مٹھائی کی اتنی ٹوکریاں آئیں کہ پورا برآمدہ بھر گیا۔ حمید نے آچکی کو بلا کر کہا۔ ''آچکی، دو ٹوکریاں اندر گھر میں لے جاؤ۔ ایک ٹوکری تم اپنے گھر لے جانا دوسری ٹوکری یہیں گھر میں رکھنا۔'' آچکی خوشی خوشی دو ٹوکریاں اندر لے گئی۔

ہر ٹوکری میں مٹھائی کے اوپر پانچ عدد ہرے پان کے پتے رکھے ہوئے تھے۔ حمید نے کہا۔ ''یار بلوچ ہندوؤں میں پان پوجا پاٹ میں کام آتے ہیں پان کے پتے کا مطلب ہے ہریالی، خوشحالی۔ ٹوکرا بھیجنے والے نے یہ میسج دیا ہے کہ تمہارے گھر میں ہمیشہ خوشحالی رہے۔'' پھر اس نے اسٹاف کو مخاطب کر کے کہا۔ ''یہاں بہت ٹوکریاں ہیں جس کا جو دل چاہے اپنے کوارٹر میں لے جائے۔''

سب سے پہلے اونٹ گاڑی کا ساربان آگے بڑھا اس نے ایک ٹوکری اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''بابو جی مٹھائی سے شریر (بدن) میں بہت طاقت آتی ہے۔ مجھے تو اس کی سب سے زیادہ جرورت (ضرورت) ہے۔'' حمید اس کی بات کا مطلب سمجھ کر ہنس پڑا۔ تھوڑی دیر میں پورا برآمدہ صاف ہو گیا۔

باہر گلی میں لوگوں کے جلوس جس میں لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی، رنگ کھیلتے ہوئے گزرنے لگے۔ لڑکیاں لال گھاگھرا اور پیلے رنگ کی کرتی پہنے ہوئے تھیں۔ وہ گانا بھی گا رہی تھیں۔ ''تمھارے سنگ۔ بھیگو رنگ۔ ریت رنگ رنگیلی آئی۔

ہم دونوں دوست باہر نکل کر پوسٹ آفس کے گیٹ کے سامنے کھڑے ہو کر تماشا دیکھنے لگے۔ ہم دونوں سفید کرتہ اور سفید پاجامہ پہنے ہوئے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ ہم مسلمان ہیں کسی نے بھی ہمارے اوپر لال پیلا رنگ نہیں پھینکا۔ میں بہت انجوائے کر رہا تھا۔ ایک نوخیز سانولی سلونی لڑکی میرے طرف آئی اس کے ہاتھ میں ایک تھیلی تھی۔ اس نے سفید رنگ کا خوشبودار پاؤڈر میرے دونوں گالوں پر ملا اور ہنستی ہوئی چلی گئی۔ اس کی نرم گرم نازک ہتھیلیوں میں بڑا کرنٹ تھا۔

بابو حمید نے کہا۔ ''بلوچ تجھ سے لڑائی ہو جائے گی۔ اس تتلی نے میرے گالوں پر پاؤڈر کیوں نہیں ملا۔'' ہم دونوں ہنس پڑے۔

جلوس کے آخر میں ایک اونٹ گاڑی تھی جس پر ایک بہت لمبا سا بت رکھا ہوا تھا جو پھونس کا بنا ہوا تھا۔ اس کا سر مٹکا رکھ کر بنایا گیا تھا۔ بہت بھیانک شکل تھی۔ لڑکے اس پر پتھر پھینک رہے تھے۔ سادھو ان کو منع کر رہے تھے۔ ''بالکوں ابھی نہیں رات کو اس کی اچھی طرح خبر لینا۔''

میں نے حمید کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس نے کہا۔ ''یار بلوچ۔ یہ پرہلاد کی پھوپی کا مجسمہ ہے جس نے اپنے باپ کو خدا ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ باپ نے بیٹے کو بہن کے مشورے پر زندہ جلانے کا حکم دیا تھا۔ رات میں اس پر شراب پھینک کر اسے آگ لگائی جائے گی۔ بڑا دلکش منظر ہوتا ہے تجھے تو میں ضرور لے کر جاؤں گا۔''

☆☆☆

رات کو ہم دونوں وہ میلہ دیکھنے گئے۔ بہت بڑا احاطہ تھا۔ روشنی کا بھی اچھا انتظام تھا۔ چاروں طرف لوگ زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بیچ میں پچیس مرد اور پچیس عورتیں ایک

دائرہ بنائے ہوئے کھڑے تھے۔ ہر ایک کے ہاتھ میں تین فٹ لمبا سفید رنگ کا ڈنڈا تھا۔ ان کے درمیان میں دو نوجوان سادھو ڈھول لیے کھڑے تھے۔

عورتیں لال رنگ کا لہنگا پہنے ہوئے تھیں جو گھٹنوں سے ذرا سا نیچے تک آیا ہوا تھا اور اوپر پیلے رنگ کی ٹائٹ کرتی تھی۔ ان کی کمر اور پیٹ چار پانچ انچ تک کھلا ہوا نظر آرہا تھا۔ مرد لال رنگ کی قمیص اور لال رنگ کا پاجامہ پہنے ہوئے تھے۔ کمر میں سنہرے رنگ کی تین انچ چوڑی پٹی بندھی ہوئی تھی۔

میں حیران حیران سا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ یکا یک بڑے سادھو کے اشارے پر ڈھول بجنا شروع ہوا اس کے ساتھ ہی مردوں اور عورتوں کے دائرے میں حرکت پیدا ہوئی۔ عورتیں سیدھے ہاتھ کی طرف کھڑے مرد کے ڈنڈے پر اپنا ڈنڈا مارتی تھیں پھر فوراً پلٹ کر الٹے ہاتھ پر کھڑے مرد کے ڈنڈے پر مارتی تھیں۔ ساتھ ساتھ مرد اور عورتیں گا رہی تھیں۔ ''لگے ڈنکا لگے گید ڈ، لگے ڈنکا لگے گید ڈ'' جوں جوں ڈھول بجنے میں تیزی آتی گئی۔ ڈنڈے ٹکرانے میں بھی تیزی آتی گئی۔ پھر ڈھول میں اور تیزی آگئی اور عورتیں پھرکی کی طرح گھوم گھوم کر ڈنڈے مارنے لگیں۔ ان کا گھاگرا کبھی ایک طرف سے اٹھ کر ایک طرف کی ٹانگ دکھاتا کبھی دوسری طرف کی ٹانگ۔

عورتیں ہنس رہی تھیں ان کی آنکھوں میں شوخی تھی۔ مرد بھی ہنس رہے تھے۔ ساتھ ساتھ گانا بھی چل رہا تھا۔ جوں جوں ڈھول میں تیزی آتی گئی عورتیں بھی پھرکی بن گئی تھیں۔ مردوں کی بھی یہی حالت تھی۔

یکا یک ڈھول خاموش ہوگیا۔ عورتوں مردوں کا رقص بھی تھم گیا۔ پسینے کے قطرے عورتوں کی پیشانی اور گالوں پر موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ پورے گراؤنڈ میں بیٹھے لوگوں نے پُرجوش تالیاں بجائیں۔

میں بت بنا یہ مسحور کن منظر دیکھ رہا تھا۔ اس شو کے بعد وہ اونٹ گاڑی والا مجسمہ دس بارہ آدمی اٹھا کر احاطے کے بیچ میں لے آئے۔ لڑکوں نے اس پر تھوکا۔ پتھر مارے، جوتے مارے اور اس پر شراب انڈیل دی گئی۔ ایک سادھو نے اس مجسمے کو آگ لگادی۔ مجسمہ جلنے لگا۔

حمید نے کہا۔ ''یار بلوچ بس اب کھسک لو۔ یہ لونڈے شراب میں دھت ہیں۔ کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ آج پوری آزادی ہے۔''

میں نے واپس لوٹتے ہوئے کہا۔ ''یار حمید مزہ آگیا میری تمام کوفت ٹینشن ہوا ہوگئی۔ حمید اس میں مسلمان بھی تھے کیا۔''

''ہاں یار مگر صرف تماشا دیکھنے والوں میں مسلمان تھے۔ خوشی کا تہوار ہے۔ سب ہی لوگ شریک ہوتے ہیں۔ تم نے دہلی میں دیکھا ہوگا۔ کرسمس کے موقع پر ہر بازار، ہر دکان سجی ہوئی ہوتی ہے حالانکہ ہندوستان میں کرسچن بمشکل ڈیڑھ دو پرسنٹ ہوں گے۔''

ہم تھوڑی دور ہی گئے ہوں گے کہ پیچھے سے پٹاخوں کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم نے مڑ کر دیکھا، پورا آسمان آتش بازی سے جگمگا رہا تھا۔

☆☆☆

دوسرے دن میں نے حمید سے کہا۔ ''یار میری چھٹیاں ختم ہونے میں صرف پانچ دن رہ گئے ہیں اب مجھے اجازت دو۔ یہاں میرا جو وقت گزرا وہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ خاص طور پر آچکی۔ ہاں یاد آیا۔ اسے کچھ پیسے دوں۔ تمہارا کیا مشورہ ہے۔''

''او بھائی فوجی۔ ایسی غلطی مت کرنا۔ بہت برا مانے گی۔ ہاں کوئی تحفہ توشہ تمہارے پاس ہو تو اسے دے دینا۔ روپیا پیسا مت دینا۔ وہ کوئی پیشہ ور لڑکی تھوڑی ہے۔ وہ اپنی سمجھ کے مطابق میرے مہمان کی خدمت کر رہی ہے۔''

میں سوچ میں پڑ گیا پھر میں نے کہا۔ ''میرے پاس ایک چھوٹا سا ریڈیو ہے۔ بیٹری والا وہ دے دیتا ہوں۔ چار بیٹریاں فالتو بھی ہیں اور بھی بھیج دوں گا مگر یہاں ریڈیو سگنل آتے بھی ہیں یا نہیں۔''

''آتے ہیں یار۔ ہر سیٹھ کے گھر میں ریڈیو ہے۔''
''بس تو یار۔ تم اسے چلانا سکھا دینا۔''

حمید نے کہا۔ ''رات کو وہ تمہارے پاس آئے گی تم ہی اسے پوری رات سکھاتے رہنا۔'' یہ کہہ کر حمید نے حسبِ عادت قہقہہ لگایا۔

☆☆☆

راجواڑوں کی ریگ زاروں میں چھٹیاں گزار کر، بھولی بھالی نوعمر آچکی کی یاد دل میں بسائے میں شملہ پہنچ گیا۔ اکیڈمی کے معمولات پھر سے شروع ہوگئے۔ سخت رولز، ریگولیشن اور ڈسپلن۔

میں اپنے ہم خیال کیڈٹس کے ساتھ سٹرڈے نائٹ دہلی میں گزارتا تھا۔ اس گروپ میں سب ہی مذاہب کے

لوگ شامل تھے۔ مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی، سب مل جل کر دہلی میں خوب انجوائے کرتے تھے۔ ہماری راتیں اس بازار میں گزرتی تھیں جہاں دن سوتے ہیں۔ راتیں جاگتی ہیں۔

دہلی میں تقریباً روزانہ ہی مسلمانوں کے جلوس نکلتے تھے جن کے شرکاء گلا پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگاتے تھے۔ ''سینے پر گولی کھائیں گے۔ پاکستان بنائیں گے۔ بٹ کے رہے گا ہندوستان، بن کے رہے گا پاکستان۔''

میرے غیر مسلم دوست مذاق اڑاتے تھے۔ ہنستے تھے۔ ''دیکھو کتنے بے وقوف لوگ ہیں۔ ان کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ان کے علاقے پاکستان کی حدود میں نہیں آئیں گے پھر بھی پاگل بنے ہوئے ہیں۔ اگر پاکستان بن گیا تو ان کا بہت برا حشر ہوگا۔''

کچھ عرصے بعد اعلان ہوا کہ مسلمانوں کے لیے جداگانہ الیکشن کا سسٹم بنایا گیا ہے۔ مسلم لیگ کا ایک ہی نعرہ تھا۔ ''پاکستان کے لیے مسلم لیگ کو ووٹ دو۔''

ان ہی دنوں میں کانگریس کے ایک بڑے لیڈر۔ بلب بھائی پٹیل کا بیان موضوع بحث بنا ہوا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ ''پاکستان کا قیام ناممکن ہے۔ مسلم لیگ الیکشن ہار جائے گی۔ اگر پاکستان بن گیا تو مسلمانوں کا ایک طبقہ ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر ایک بڑے ملک کا مالک بن جائے گا جبکہ دوسرا طبقہ جس کے علاقے پاکستان میں نہیں آئے ہوں گے وہ بالکل تباہ ہوجائے گا۔ ان کا کاروبار، ان کی زمینیں، مکانات، ان کا مستقبل سب کچھ تباہ ہوجائے گا۔ ان کا اتنا قتل عام ہوگا کہ زمین، دریا، نہریں سب خون سے سرخ ہوجائیں گی۔ کوئی انسان کوئی منش، دوسروں کے لیے اتنی قربانیاں نہیں دے سکتا۔ ایسی قربانی تو صرف دیوتا دے سکتے ہیں۔ نادان دیوتا۔''

اس لیڈر کا کہنا آدھا سچ ثابت ہوا، مسلم لیگ اقلیتی علاقوں سے بھی بھاری اکثریت سے کامیاب ہوگئی۔ پاکستان کا قیام صاف نظر آرہا تھا۔

دوسری طرف، مسلمانوں کو مسلم لیگ کو ووٹ دینے کی سزا کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ خونی فسادات۔ بہار، مغربی بنگال، دہلی میں مسلمان قتل کیے جارہے تھے۔ ہر طرف آگ لگی ہوئی تھی۔

اس کا اثر شملہ ملٹری اکیڈمی میں بھی پڑا۔ غیر مسلم ساتھیوں کے تیور بدل گئے۔ شملہ کے مین بازار میں، دو مسلم کیڈٹ قتل کردیے گئے۔

اردو شاعری میں ریختی کی صنف ضرور ایسی صنف تھی جس میں عورتوں کی زبان و بیان کے ساتھ ان کے طرز احساس کی عکاسی بخوبی ہوسکتی تھی لیکن یہ صنف اخلاقی انحطاط کے اس دور میں وجود میں آئی جب مردوں نے گھر میں نارمل زندگی گزارنا چھوڑ دی تھی۔ لذت کوشی کے دوسرے طریقے اختیار کرلیے تھے اور عورتیں گھروں میں گھٹ گھٹ کر جنسی گھٹن کا شکار ہورہی تھیں۔ یہ صنف شاعری مردوں نے ایجاد کی تھی اسی لیے اس میں انہوں نے عورتوں کی زبان میں اپنی تفریح طبع کے لیے عورتوں کے ان معاملات کا ذکر کیا جن سے ان کی جنسی ناآسودگی کا اظہار ہوتا تھا...اور اس طرح یہ صنف شاعری ابتذال، رکاکت اور فحاشی کی نذر ہوگئی۔

☆☆☆

افسانچے لکھنا بھی بڑا جوش آفرین معلوم ہوتا ہے، مانو میرے ذہن کی شاخوں پر رنگ برنگے پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ جھول رہے ہوں...... ہاں، مجھے معلوم ہے کہ بعض نقادوں کو ابھی افسانچے کی صنف قبول کرنے میں تامل ہے۔ مگر اس صنف کا پرگو اختصار...... مجھے یقین ہے۔ دوسری زبانوں کی طرح اردو میں بھی اپنا لوہا منوا کر رہے گا۔ ہماری زندگی بھی اپنی چھوٹی چھوٹی کہانیوں میں بٹ کر ہماری سمجھ میں زیادہ آنے لگتی ہے۔ اس لحاظ سے ممکن ہے کہ کوئی بالکل مختصر اور متناسب کہانی شروع ہونے سے پہلے ہی کہیں سے شروع ہورہی ہو اور اسے پڑھنے والا اس کے خاتمے کے بعد بھی آپ ہی آپ اسے بڑھاتا چلا جائے۔ افسانچے کا تناسب چست اور صحیح ہو تو قاری کو اس سے آزادانہ ایک طویل کہانی بننے کا موقع فراہم ہوجاتا ہے جس سے اس کی تخلیقی شرکت کا ایک پورا باب کھل جاتا ہے۔ یہ بڑی اہم بات ہے۔

باؤنڈری کمیشن کے بعد تو فسادات انتہا کو پہنچ گئے۔ خاص طور پر ایسٹ پنجاب میں قیامت برپا ہوگئی۔ گاؤں کے گاؤں جلا دیے گئے۔ مردوں کا قتل عام ہوا۔ سینکڑوں عورتیں، لڑکیاں لاپتا ہوگئیں۔ بچوں کے سینے میں بلم مار دیے گئے۔ پوری پوری ٹرینیں کاٹ دی گئیں۔ لاشوں سے بھری ہوئی ٹرینیں لاہور پہنچ رہی تھیں۔ بچے کچے لوگ قافلوں کی شکل میں پیدل ہی پاکستان کی جانب روانہ ہوئے لیکن صرف خوش قسمت لوگ ہی زندہ سلامت پاکستان پہنچ سکے۔ قیامت سی قیامت تھی۔

ان حالات کے پیش نظر میں نے فیصلہ کیا کہ اب یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ میں اپنے غیر مسلم ساتھیوں کی آنکھوں میں خون دیکھ رہا تھا۔ ''تم نے ہماری پوتر بھارت ماتا کے ٹکڑے کر دیے ہم تمہارے ٹکڑے کر دیں گے۔ یہ دھرتی تو اتنی پوتر ہے کہ اس کی مٹی سے تلک لگایا جائے۔''

میں نے اپنا سامان چھوٹے سے سوٹ کیس میں رکھا۔ اپنے ریزگنیشن کی دو کاپیاں بنائیں چھٹی کی بنا پر اکیڈمی کے کمانڈر کا کمرا بند تھا۔ اس کے دروازے کے نچلے حصے سے ایک کاپی کمرے میں کھسکائی۔ دوسری کاپی بائی پوسٹ بھیجنے کے لیے اپنے پاس رکھ لی۔ اپنا سروس ریوالور پتلون کی جیب میں رکھا اور خاموشی سے اکیڈمی ایریا سے نکل آیا۔

شملہ ریلوے اسٹیشن سے آخری ٹرین میں بیٹھا اور دہلی روانہ ہوگیا۔ میں عام طور پر شملہ، دہلی ٹرین رائڈ کو بہت انجوائے کرتا تھا۔ میرا ذہن پراگندہ تھا کہ آگے کیا ہوگا۔

صبح سویرے ٹرین دہلی کے وسیع پلیٹ فارم میں داخل ہوئی۔ یہاں بہت چہل پہل تھی۔ پلیٹ فارم پر گورے فوجی جمع تھے۔ بمبئی جانے والی ٹرین کا انتظار کر رہے تھے تاکہ وہاں سے شپ کے ذریعے انگلستان جاسکیں۔

میں نے ایک چائے کے اسٹال پر ناشتا کیا قریب ہی ایک بک شاپ تھی جہاں انگریزی اور اردو کے اخبارات اور کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ دکان کا نام تاج الدین بک ڈپو تھا۔ میں نے وہاں سے دو اخبار خریدے اور دکان کے مالک سے باتیں کرنے لگا۔

تاج الدین نے بتایا۔ ''بھائی میاں دہلی کے پرانے علاقوں کی بہت بری حالت ہے۔ صرف وہ محلے محفوظ ہیں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ باقی محلوں میں مار کٹائی ہو رہی ہے۔ پولیس بلوائیوں کا ساتھ دے رہی ہے۔ مسلمان ہمایوں کے مقبرے کے احاطے میں جمع ہو رہے ہیں یا مسلم اکثریتی محلوں کی طرف شفٹ ہو رہے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''میں ٹرین کے ذریعے سندھ جانا چاہتا ہوں۔''

''بھائی میاں ایسا غضب بھی مت کیجیو۔ ٹرینیں روک روک کر مسلمانوں کو قتل کیا جا رہا ہے۔ ابھی انتظار کرو۔ اللہ کرے حالات ٹھیک ہو جائیں۔ میری دکان کے اوپر ایک کمرا بنا ہوا ہے چاہو تو اس میں ٹھہر جاؤ۔ اسٹیشن میں امن ہے۔ دوسرے شہروں سے ٹرین کے ذریعے گوروں کی پلٹنیں (پلاٹون) یہاں آرہی ہیں'' بمبئی جانے کے لیے۔ یہاں امن ہے۔''

میں اسٹیشن پر ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے خطرہ تھا کہ ملٹری پولیس میری تلاش میں یہاں آسکتی تھی چنانچہ میں نے شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا۔

تاج الدین سوچ میں پڑ گیا۔ ''بھائی یہاں ہوٹل بھی غیر محفوظ ہیں۔ دہلی کی جامع مسجد کے اطراف میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ میں بھی وہاں رہتا ہوں۔ میرے پڑوس میں ماسٹر عنایت حسین کا بہت بڑا مکان ہے۔ چھوٹی سی فیملی ہے، ایک بیٹی اور ایک بیٹا۔ وہ تمہیں اپنے مہمان خانے میں ٹھہرا لیں گے میں رقعہ لکھ دیتا ہوں پہلے میں تمہارے لیے سواری کا انتظام کرتا ہوں۔''

تاج الدین نے چائے کے اسٹال کی طرف نظر دوڑائی۔ وہاں ایک نوجوان کھڑا ہوا چائے پی رہا تھا۔ ''لو بھائی میاں تمہارا کام بن گیا۔ او فیضو اکیلے اکیلے چائے پی رہا ہے کبھی مجھے بھی پوچھ لیا کر۔ چائے پی کر ادھر کو آئیو۔ بہت ضروری کام ہے۔''

چائے ختم کر کے فیضو تاج الدین کے پاس آیا۔

''ہاں بولو کیا کام ہے۔''

''دیکھ فیضو۔ یہ بھائی میاں ماسٹر عنایت حسین کے گھر جانا چاہتے ہیں۔ ان کو حفاظت سے اپنے تانگے میں ان کے گھر تک پہنچا دے۔''

اسٹیشن کے باہر صرف تین چار تانگے تھے۔ میں تانگے میں، فیضو کے ساتھ اگلے حصے میں بیٹھا۔ فیضو نے کہا۔ ''فکر مت کریو بھائی میاں۔ میرے کنے (پاس) مضبوط لٹھ ہے۔ پٹے بازی کا کھلاڑی ہوں۔ دو چار کی کھوپڑیاں توڑ کر مروں گا۔ بھائی میاں پر آنچ نہیں آنے دوں گا انشاء اللہ۔ اس غریب کو کیا معلوم کہ میری پتلون کی ایک جیب میں بھرا ہوا پستول ہے دوسری جیب میں کارتوسوں کی تھیلی ہے۔

سڑکوں پر بہت کم ٹریفک تھا۔ دہلی کی رونق کہاں گئی۔
جب ہمارا تانگہ جامع مسجد جانے والی سڑک پر مڑنے لگا تو آٹھ دس لڑکوں کے ایک گروپ نے ہمارا تانگہ روک لیا۔ سب کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ ''ارے یہ تو اپنا فیضو ہے۔ فیضو سواری کو کدھر لے جا رہا ہے۔ چہرے مہرے سے تو اجنبی دکھے ہے۔''
فیضو نے کہا۔ ''بھائی میاں ماسٹر عنایت کے مہمان ہیں۔ ان ہی کے کنے لے جا رہا ہوں چلو ہٹو رستہ چھوڑ و۔''
سب لڑکے اِدھر اُدھر ہو گئے۔ جب فیضو نے مجھے ماسٹر صاحب کے مکان کے سامنے اتارا تو میں نے اسے زبردستی پانچ روپے دیئے۔ وہ کرایہ لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔
ماسٹر عنایت صاحب باہر ہی ایک مونڈھے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں تاج الدین کا رقعہ دیا۔ پڑھ کر بڑی محبت سے گلے ملے۔ ''آؤ میاں صاحبزادے اندر آ جاؤ۔ اپنا گھر سمجھ کر یہاں رہو۔''
ان کا گھر پرانے طرز کا مگر بہت بڑا تھا ایک طرف مہمان خانہ بنا ہوا تھا۔ ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ ایک ملٹری جیپ دروازے کے سامنے آ کر رکی۔ جیپ سے ایک لمبے قد کی لڑکی اتری۔ لڑکی نے خاکی ساڑی پہن رکھی تھی۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ''اف ابا۔ یہ آرمی کی یونیفارم بالکل آرام دہ نہیں ہے۔'' اس نے ابا کے پاس ایک اجنبی نوجوان کو کھڑے دیکھا تو ٹھٹک گئی اور ابا کی طرف دیکھنے لگی۔
ماسٹر عنایت نے کہا۔ ''بیٹی یہ لیفٹیننٹ داؤد بلوچ ہیں۔ کچھ عرصے ہمارے یہاں رہیں گے۔''
لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ویلکم لفٹی بلوچ میرا نام نسیم ہے۔ آرمی اسپتال میں ڈاکٹر ہوں۔ معلوم ہوتا ہے۔ آپ ابھی آئے ہیں۔ آپ مہمان خانے میں آرام سے بیٹھیے۔ میں بھی چینج کر کے آتی ہوں پھر آپ سے باتیں ہوں گی۔ میں باتونی لڑکی ہوں۔ مریض کہتے ہیں کہ ہمارا مرض آدھا تمہاری باتوں سے ٹھیک ہو جاتا ہے۔''
مہمان خانے میں پرانے ٹائپ کا چوڑا پلنگ تھا۔ الماری تھی۔ چار کرسیاں تھیں۔ کمرے کے قریب ہی غسل خانہ تھا۔ میں نے غسل کر کے کپڑے چینج کیے اور پلنگ پر لیٹ گیا۔
ڈاکٹر نسیم لمبے قد کی، سرخ و سفید رنگ۔ بڑی بڑی آنکھیں، گھنے بال۔ ڈاکٹر نسیم مجموعی طور پر نہایت جاذبِ نظر لڑکی تھی۔ نہایت ہنس مکھ۔
مہمان خانے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر نسیم شلوار قمیص میں ملبوس کمرے میں داخل ہوئی۔ اٹھ جایئے لیفٹیننٹ بلوچ۔ کھانے پر آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔''
اس زمانے میں ڈائننگ ٹیبل کا رواج نہیں تھا۔ سب لوگ پلنگ پر بیٹھ کر یا فرش پر دسترخوان بچھا کر کھانا کھاتے تھے۔
یہاں بھی برآمدے میں دسترخوان بچھا ہوا تھا جس پر سالن کی قابیں اور پلیٹیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں پانی کا جگ اور گلاس رکھے ہوئے تھے۔ کھانا شروع ہوا۔ بکرے کے گوشت کا اسٹو تھا اور بھنڈی کا سالن تھا۔ ایک کپڑے میں گرم گرم چپاتیاں تھیں۔
ڈاکٹر نسیم نے کہا۔ ''لفٹی داؤد بلوچ بالکل تکلف نہیں کرنا۔ اسے اپنا گھر سمجھ کر یہاں رہیے۔''
''ڈاکٹر نسیم صاحبہ۔ اب میں لیفٹیننٹ نہیں ہوں۔ استعفیٰ دے کر آیا ہوں۔ ہاں پاکستان جا کر کچھ سوچوں گا۔''
ماسٹر صاحب کے چھوٹے بیٹے نے کہا۔ ''بلوچ بھائی پاکستان تو ہم سب جائیں گے۔ کیوں باجی؟''
''ہاں بھئی جب مسلمانوں نے پاکستان بنایا ہے تو سب کو وہاں جانا چاہیے۔ اب یہاں کون رہنے دے گا۔''
ماسٹر صاحب بولے۔ ''بلوچ میاں۔ یہ جو لڑکی آپ پلنگ پر بیٹھی دیکھ رہے ہیں۔ یہ بچی ہمارے یہاں برسہا برس سے کام کر رہی ہے۔ شادی شدہ ہے۔ اس کا شوہر روزانہ کہیں نہ کہیں سے گوشت لے آتا ہے۔ قسائی لوگ گھروں میں بکرے ذبح کر رہے ہیں۔ گھر میں مرغیاں پلی ہوئی ہیں ان کا گوشت اور انڈے بھی مل جاتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے ورنہ پورا شہر بند پڑا ہے۔''
کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔
میں نے کہا۔ ''ہمارے گھر میں بھی اسی طرح دسترخوان بچھا کر پوری فیملی کھانا کھاتی ہے۔ میرے تمام سگے اور سوتیلے بھائی بہن بھی دسترخوان پر ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ میرے بابا اور ان کی تین بیویاں بھی ساتھ بیٹھتی ہیں۔''
نسیم ایک دم ہنس پڑی۔ ''تین بیویاں۔''
''ہاں ڈاکٹر نسیم۔ وہاں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کا عام رواج ہے۔ میری ایک بیوی ہے جو مجھ سے آٹھ سال بڑی ہے۔''
''تو بلوچ صاحب۔ آپ دوسری شادی کب کر رہے ہے

ہیں؟''

میں ہنس کے خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے کہا۔ ''ویسے تو ڈاکٹر نسیم وہاں کے حالات۔ خاص طور پر ہمارے گاؤں کے حالات بہت خراب ہیں۔ اسکول، اسپتال کا تو دور دور تک نام ونشان بھی نہیں ہے۔ قبائلی سسٹم ہے۔ دشمنی نسل در نسل چلتی ہے۔ تعلیم بہت کم ہے۔ قبیلے کے سردار کا حکم قانون کا درجہ رکھتا ہے۔ سخت سزائیں دی جاتی ہیں۔ پوری پوری فیملی نجی جیل میں بند کر دی جاتی ہے۔ ان سے بیگار لی جاتی ہے۔ بیٹیاں اگر شادی کے لیے اپنی پسند کا اظہار کریں تو ان کو قبر میں زندہ دفن کر دیا جاتا ہے۔ میرے بابا اپنے قبیلے کے سردار ہیں۔ میں ان کا سب سے بڑا بیٹا ہوں اور تعلیم یافتہ ہوں۔ میرے زور دینے پر البتہ ہمارے قبیلے میں یہ سزائیں ختم کر دی گئی ہیں۔

ڈاکٹر نسیم نے کہا۔ ''بلوچ صاحب۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم وہاں جا کر اسکول، کالج، یونیورسٹی، اسپتال سب بنائیں گے۔ تعلیم عام کریں گے۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''انشاء اللہ۔'' ماسٹر عنایت نے بہت دیر کے بعد گفتگو میں حصہ لیا۔ پھر اٹھ کر نماز پڑھنے کے لیے جامع مسجد چلے گئے۔

☆☆☆

مجھے وہاں رہتے ہوئے کئی مہینے گزر گئے۔ پاکستان کا وجود عمل میں آ گیا تھا۔ میں پاکستان جانے کی فکر میں تھا۔ حالات بدستور خراب تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ دارالحکومت ہونے کی وجہ سے دہلی میں حالات پر جلد قابو پا لیا جائے گا مگر قتل وغارت گری بڑھتی جا رہی تھی۔

ایک دوپہر ڈاکٹر نسیم مجھے دو منزلہ گھر کی چھت پر لے گئی۔ شہر کے کئی علاقوں سے دھواں اٹھتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ بلوائی لوٹ مار کر کے گھروں کو آگ لگا رہے تھے۔

میں بڑی دکھی نظروں سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر نسیم نے کہا۔ ''مسٹر داؤد بلوچ۔ پولیس بلوائیوں کو سپورٹ کر رہی ہے۔ مسلمان گھروں کی تلاشی لے کر لائسنس یافتہ ہتھیار ضبط کر لیے گئے ہیں۔ لاٹھیاں تک پولیس لے گئی ہے۔ یہاں مسلمانوں کے کچھ محلے مثلاً قرول باغ یا کارخنداروں کے محلوں کے باسی بڑے جنگجو ہیں مگر خالی ہاتھ ہیں۔ مسلمان ہزاروں کی تعداد میں ہمایوں کے مقبرے کے احاطے میں جمع ہو رہے ہیں۔ وہاں ہیضے کی وبا پھیل گئی ہے۔ روزانہ درجنوں لوگ مر رہے ہیں۔ ہم ڈاکٹر لوگ اس وبا پر قابو پانے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

ڈاکٹر نسیم خاموش ہوئی تو میں دکھی ہو کر سیڑھیوں سے نیچے اترتا چلا گیا۔

دہلی شاید آٹھویں بار اجڑ رہی تھی۔

☆☆☆

اس باتونی ڈاکٹر لڑکی سے بہت بے تکلفی ہو گئی تھی۔ وہ ڈیوٹی سے فارغ ہو کر آتی تھی تو ہم مہمان خانے کے برآمدے میں بیٹھ کر ہر موضوع پر بات کرتے تھے۔ گھنٹوں بحث کرتے تھے۔ میرے دل میں اس کے لیے محبت کے جراثیم پیدا ہونے لگے تھے۔

ایک دن ہمت کر کے میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔ ''ڈاکٹر نسیم ایک بات بتایئے۔ تم پڑھی لکھی ہو پھر آرمی اسپتال میں ڈاکٹر بھی ہو۔ نہایت خوبصورت بھی ہو۔ منگنی ہو چکی ہے یا نہیں۔ یہ بہت ذاتی ٹائپ کا سوال ہے، برا لگے تو شٹ اپ داؤد بلوچ بھی کہہ سکتی ہو۔''

''کیسی بات کرتے ہو داؤد۔ جس گھر میں لڑکی ہو وہ بھی خوش مزاج ڈاکٹر۔ وہاں رشتے تو آتے ہی رہتے ہیں۔ منگنی شنگنی ابھی نہیں ہوئی ہے۔ آپ حالات تو دیکھ ہی رہے ہیں۔ ان حالات میں کیسی منگنی کیسی شادی۔ لوگوں کے چہرے وحشت سے سفید پڑے ہوئے ہیں۔ ابھی تو مجھ سے دو سال بڑے بھائی شرافت حسین کی بھی شادی نہیں ہوئی ہے۔ وہ برٹش نیوی میں انجینئر ہے۔ آج کل مدراس میں جہاز پر ہیں، یہ ہوئی بات نمبر ایک۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم سب لوگ آپ کو مہمان نہیں گھر کا ایک فرد سمجھتے ہیں۔ آپ کو جو کچھ بھی کہنا ہے بلاتکلف کہیں۔''

''نسیم تم نے ہمت دلائی ہے تو میں اپنے اور اپنے خاندان کے بارے میں کھل کر بتاتا ہوں، میری شادی سولہ سال کی عمر میں اپنی تایازاد سے ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے آٹھ سال بڑی ہے۔ شادی کے آٹھ سال کے بعد اللہ نے ہمیں اولاد کی نعمت دی۔ بیٹا ابھی ڈیڑھ سال کا ہے یہ ہوئی بات نمبر ایک۔''

ڈاکٹر نسیم مسکرائی۔ ''میری نقل کر رہے ہو۔ ہار جاؤ گے۔ ہاں بات نمبر دو کیا ہے وہ بھی فرما دیں۔''

''نسیم میں اپنے خاندان کے بارے میں۔ وہاں کے رسم و رواج کے بارے میں کھل کر کئی دفعہ بتا چکا ہوں۔ ہمارے یہاں اگر کوئی لڑکا کسی لڑکی سے ڈائریکٹ ایسی بات

کرتا ہے تو اس کی اتنی پٹائی ہوتی ہے کہ سر بھی گنجا ہو جاتا ہے۔ محترمہ ڈاکٹر نسیم صاحبہ۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں آپ کے والد صاحب سے درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ وہ مجھے، داؤد بلوچ کو اپنی دامادی میں قبول کرلیں ظاہر ہے کہ وہ آپ سے صلاح کریں گے۔ آپ کا کیا جواب ہوگا۔ اقرار یا انکار۔"

نسیم ڈاکٹر سہی بہرحال لڑکی تھی۔ اس کا چہرہ شرم سے سرخ ہوگیا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے کہا۔ "دیکھئے بلوچ صاحب۔ ہمارے اور آپ کے معاشرے میں بڑا فرق ہے۔ زبان کا بھی فرق ہے۔ اب پاکستان بن گیا ہے۔ ہمیں اس فرق کو مٹا کر ایک قوم بننا ہے۔ پاکستانی قوم۔ آپ میرے والد صاحب سے بات کرلیں۔ ظاہر ہے کہ وہ مجھ سے مشورہ کریں گے میری مرضی پوچھیں گے میں انکار نہیں کروں گی لیکن میری کچھ شرطیں ہیں۔"

میں نے سوالیہ نظروں سے نسیم کی طرف دیکھا۔

"شرط نمبر ایک۔ آپ کو قبیلے کی سرداری سے کوئی واسطہ نہیں ہوگا۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ قبائلی دشمنیوں میں الجھے رہیں۔"

میں نے کہا۔ "منظور۔ سو فیصد منظور۔"

"شرط نمبر دو۔ آپ اپنی بیوی کو طلاق نہیں دیں گے بلکہ اس کا اس کے بچوں کا پورا پورا خیال رکھیں گے۔ شریعت کا بھی یہی حکم ہے۔"

"میں اس کو طلاق دے بھی نہیں سکتا۔ اس کے بھائی میرے ٹکڑے ٹکڑے کردیں گے۔ مجھے آپ کی یہ شرط بھی منظور ہے۔ تیسری شرط بتائیے۔"

"تیسری شرط...... جب شادی ہوگی تو اللہ اولاد کی نعمت بھی انشاء اللہ عطا کرے گا۔ بیٹا ہو یا بیٹی۔ آپ ان کی اعلیٰ تعلیم کا پورا پورا بندوبست کریں گے جہاں تک بھی وہ تعلیم حاصل کرنا چاہیں۔ بولیے منظور ہے۔"

"کیسی بات کررہی ہو ڈاکٹر نسیم۔ میں نے علی گڑھ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی ہے۔ تعلیم کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ میرے فلسفے میں غربت لعنت نہیں مجبوری ہے لیکن جہالت ایک لعنت ہے۔ اور فرمائیے۔"

"میں آپ کے بابا اور امی کو سلام کرنے آپ کے طریقے کے مطابق ان کے پاؤں چھونے، ان کی دعائیں لینے آپ کے گاؤں ضرور جاؤں گی لیکن ہمارا مستقل قیام کراچی یا حیدرآباد میں ہوگا۔ وہاں میں اپنا کلینک قائم کروں گی۔ ہوسکتا ہے کہ ایک چھوٹا سا اسپتال آپ کے گاؤں میں بھی بناؤں مگر یہ لونگ ٹرم منصوبے ہیں آخری بات۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا آپ کے بار بار گاؤں کا چکر لگانے پر۔ اپنی پہلی بیوی بچوں سے ملنے پر مگر آپ سرداری منصب سے کوسوں دور رہیں گے۔ یہ میری سب سے کڑی شرط ہے۔ بولیے منظور ہے آپ کو۔"

"منظور ہے، منظور ہے، منظور ہے، کہیں تو اسٹیمپ پیپر پر لکھ کر دے دوں۔"

☆☆☆

جامع مسجد میں عشا کی نماز پڑھ کر ماسٹر عنایت حسین کے ساتھ گھر واپس آیا تو کھانا کھا کر ان کو مہمان خانے میں لے گیا۔ ان سے بالکل کھل کر تفصیل سے بات کی۔ وہ معاشرتی غیر یکسانیت اور سرداری نظام کی خراب شہرت کی وجہ سے بہت ہچکچا رہے تھے آخر میں انہوں نے یہ کہہ کر بات ختم کردی کہ میں نسیم بیٹی کی رائے معلوم کروں گا پھر تمہیں آگاہ کروں گا۔

☆☆☆

آئندہ جمعہ کو میرا نکاح نہایت سادگی سے ڈاکٹر نسیم سے ہوگیا۔ گلی کے صرف چند لوگ شریک تھے۔ نسیم کا بڑا بھائی جو نیوی میں انجینئر تھا وہ شریک نہ ہوسکا مگر اس کی طرف سے دعائیں اور نیک خواہشات کا پیغام مل گیا تھا۔ دہلی کی تاریخی جامع مسجد کے ایک مولوی صاحب نے ہمارا نکاح پڑھایا۔ انہوں نے بڑی لمبی دلگداز دعا مانگی جس کو سن کر حاضرین کے منہ سے بے ساختہ "سبحان اللہ" کے الفاظ نکلے۔ دعا کا لب لباب یہ تھا۔ "یا اللہ آج مختلف تہذیبوں اور مختلف زبان بولنے والے تیرے بندوں کا ملاپ ہوا ہے، یا اللہ اس ملاپ کو ہمیشہ قائم رکھ۔ نیک و صالح اولاد عطا فرما۔ دولہا دلہن کے ارادوں کو کامیاب کر۔ نوزائیدہ ملک (بعض مجبوریوں کی بنا پر انہوں نے پاکستان کا نام نہیں لیا) میں زبان و مکاں (مقام۔ علاقہ) کی تفریق کو ختم کردے۔ سب تیرے ہی نام لیوا ہیں۔ آمین"

☆☆☆

اب پاکستان شفٹ ہونے کا کٹھن مرحلہ درپیش تھا۔ ریل سے سفر کرنا بہت خطرناک تھا۔ ایم ایم اصفہانی صاحب کی قائم کردہ پاکستان کی پہلی ائرلائن۔ اورینٹ ائرویز کی روزانہ دو فلائٹیں دہلی سے کراچی جارہی تھیں جن میں سیٹ ملنا بہت بڑا مسئلہ تھا۔ یہ مسئلہ بھی نسیم کی ڈاکٹر سہیلیوں کی مدد

سے حل ہوا۔ ہمیں چار دن بعد کی فلائٹ میں سیٹیں مل گئیں۔

ماسٹر عنایت صاحب نے ایک بڑے کمرے میں گھر کا سامان رکھ کر تالا لگا دیا۔ گھر میں کام کرنے والی لڑکی کو چھ ماہ کی تنخواہ دے کر رخصت کر دیا۔ گھر کی چابیاں ایک پڑوسی کے حوالے کر کے کہا کہ عظمت صاحب آپ چاہیں تو اس گھر کو فساد زدہ محلوں سے آئے ہوئے لوگوں کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔

ملٹری کی ایک جیپ نے ہمیں بحفاظت ائرپورٹ پہنچا دیا۔ میرے سسر ماسٹر صاحب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ دہلی۔ ہائے دہلی جہاں مسلمانوں نے صدیوں تک حکومت کی تھی۔ منفرد تہذیب۔ برصغیر میں شہرت رکھنے والی دہلی ان سے چھوٹ رہی تھی۔

☆☆☆

ڈکوٹا ٹائپ کا چھوٹا جہاز۔ صرف 75 مسافروں کی گنجائش تھی۔ دہلی سے کراچی تک سوا دو گھنٹے کی اڑان تھی۔ میرے برابر میں میری بیوی ڈاکٹر نسیم بیٹھی تھی۔ پچھلی دو سیٹوں پر میرے سسر ماسٹر عنایت صاحب اور ان کا چھوٹا بیٹا تھا۔ نسیم کے بڑے بھائی نے پاکستان کے لیے آپشن دیا تھا اس کی بحری راستے سے کراچی آمد متوقع تھی۔

جوں ہی جہاز نے ٹیک آف کیا سب نے اللہ اکبر اور پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگایا۔

حیدرآباد کے محلے گاڑی کھاتا میں ہمارا ایک مکان تھا جس کی چھوٹی سی انیکسی میں ایک ملازم کی فیملی رہتی تھی۔ ہمارا ارادہ سردست اسی مکان کو آباد کرنے کا تھا۔ کلینک کھولنا اور میرے گاؤں میں چھوٹا سا میڈیکل سینٹر قائم کرنا لونگ ٹرم منصوبے تھے۔

☆☆☆

ہماری پاکستان آمد کے واقعہ کو عرصہ گزر گیا۔ اللہ سائیں نے نسیم کو تین اولادوں سے نوازا تھا۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ دونوں بیٹے پاکستان میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے نیویارک، امریکا میں مقیم ہیں۔ بیٹی کراچی کے ایک بڑے اسپتال میں ہاؤس جاب کر رہی ہے۔ اب ہمارا مستقل قیام کراچی میں ہے۔

ڈاکٹر نسیم کے والد کا انتقال ہو گیا ہے۔ ان کے قائم کردہ دو ہائی اسکول ایک انجمن کے زیرِ نگرانی برائے نام فیس کے عیوض تعلیم عام کر رہے ہیں۔

میرے بابا بھی انتقال کر چکے ہیں اب میرا سوتیلا بھائی لطیف بلوچ قبیلے کا سردار ہے۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ مجھے سردار بننے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں پہلی دفعہ اپنی نئی بیوی نسیم کو بابا سے ملوانے لے گیا تھا تو ڈاکٹر نسیم نے ہمارے رواج کے مطابق ان کو سلام کیا اور ان کے پیر چھوئے۔ میری ماں کے پیروں کو بھی ہاتھ لگایا تھا۔ بابا سائیں نے نسیم کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی تھی جس کا مطلب تھا کہ انہوں نے نسیم کو ہمارے خاندان کی بہو کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔ نسیم نے بابا کو اپنے آئندہ منصوبے کے متعلق بتایا۔ بابا بہت خوش ہوئے تھے اور اپنی طرف سے ہر قسم کی مدد کا وعدہ کیا تھا۔

آج ہمارے گاؤں میں بابا کی عطا کردہ زمین پر پچیس بیڈز کا ذیشان (میرے بابا کا نام) میڈیکل سینٹر قائم ہے۔ تین میل وزیٹنگ ڈاکٹرز اور چار لیڈی وزیٹنگ ڈاکٹر اس سینٹر سے منسلک ہیں۔ گاؤں میں لطیف بلوچ (میرا سوتیلا بھائی۔ قبیلے کا سردار) بوائیز اینڈ گرلز اسکول ہے۔

یہ سب ڈاکٹر نسیم کے خواب و خواہش کا حصہ تھے جن کو اللہ سائیں نے عملی شکل عطا فرمائی میں خود کنسٹرکشن کے کاروبار سے منسلک ہوں میرے دو روشن خیال دوست اس کاروبار میں شریک ہیں۔ ہمارے ہر پروجیکٹ میں صرف پچیس پرسینٹ کورڈ ایریا ہے باقی پچھتر پرسینٹ پر لان۔ درخت پھول پھلواری اور کاروں کا پارکنگ لاٹ ہے۔

☆☆☆

کبھی کبھی میں گہری سوچ میں ڈوب جاتا ہوں۔ میرے ذہن میں گزرے واقعات کی فلم ری پلے ہونے لگتی ہے۔ شملہ ملٹری اکیڈمی۔ راجواڑوں کا دورہ۔ بھولی بھالی آچکی کی کھدمت (خدمت) اقلیتی علاقوں کا مسلم لیگ اور پاکستان کے لیے جوش و خروش۔ بہار۔ مغربی بنگال۔ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتل عام۔ ملٹری اکیڈمی میں غیر مسلم ساتھیوں کی آنکھوں میں میرے لیے نفرت۔ پھر دہلی میں پناہ کی تلاش۔ آگ میں جلتی ہوئی اجڑتی ہوئی دہلی کو دیکھنا۔ یہ سنی سنائی باتیں نہیں ہیں آنکھوں دیکھا حال ہے۔ اگر میں ٹرین کے ذریعہ آتا تو خون میں نہائی ہوئی ٹرین میری بھی لاش، دوسری لاشوں کے ساتھ لیے لاہور ریلوے اسٹیشن پہنچتی۔ میری لاش کئی ٹکڑوں میں بٹی ہوتی۔

ایک لحاظ سے ''میں بھی ایک مہاجر ہوں۔ بلوچ مہاجر۔''

++

انوکھی چوری

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم!
میں نے اس سچ بیانی میں جو کچھ بیان کیا ہے اسے نظر میں رکھ کر آس پاس کا جائزہ لیں۔ یقین کریں ایسے کئی کردار آپ کو بھی نظر آجائیں گے۔ میں نے جس عقلمندی سے اپنا گھر بچایا ہے اس پر غور ضرور کریں۔

راحت وفا راجپوت
(لاہور)

''یار میری بیگم ذرا بدھو سی ہے وہ اتنی گہرائی میں جا کر سوچنے کی عادی نہیں ہے۔'' یہ آواز میرے شوہر بابر کی تھی، میں جو ان کے لیے چائے لے کر آرہی تھی اپنا ذکر سن کر دروازے پر ہی رک گئی۔ غالباً وہ کسی دوست سے فون پر بات کر رہے تھے۔

''یار یہ جو سسرال میں تقریبات ہوتی ہیں نا، یہ دل بہلانے کا سب سے بہترین سبب ہیں۔'' وہ یہ کہہ کر ذرا رکے پھر سانس لے کر بولے۔ ''وہ اس طرح کہ میں نے بیگم اور سسرال میں اپنا ایسا امیج بنایا ہوا ہے کہ میری سالیاں، بیگم اور کزنز، بیگم کی دونوں بھابیاں مجھ سے جھجک رکھنے کا تکلف نہیں کرتیں۔ وہ کھلے عام ہنسی مذاق کر لیتی ہیں۔ ان کے سامنے میرا امیج ایک شریف، کم گو اور زن مرید شخص کا

ہے۔ میں وہاں جا کر بیگم اور سسرالیوں کی ہر بات پر "یس" کہتا ہوں۔ ان کے کام نمٹانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس بات سے بیگم بھی راضی رہتی ہیں اور سسرال والے بھی خوش۔ میں بھی انجوائے کرتا ہوں۔" وہ رک کر دوسری طرف دوست کی بات سننے لگا۔

"او میرے بھائی انجوائے اس طرح کہ مجھے بے ضرر سمجھا جاتا ہے۔ سسرالی خواتین میرے سامنے ہر موضوع پر بات کر لیتی ہیں۔ دوپٹا لینے کا تکلف بھی نہیں کرتیں۔ میں ان کے بیڈروم میں بھی چلا جاتا ہوں بلکہ بیگم کی بھابیاں خود کہتی ہیں کہ میں ان کے کمرے میں جا کر آرام کر لوں، بے تکلفی سے میرے قریب بھی بیٹھ جاتی ہیں۔ سالیاں لاڈ کرتی ہیں، بائیک پر کوئی چیز لینے جانا ہو تو بھی مجھ پر لد کر بیٹھ جاتی ہیں اور جب کوئی موٹر سائیکل پر میرے پیچھے بیٹھ کر ہاتھ میرے کندھے پر رکھتی ہے تو......

آگے کی بات سن کر میرے وجود میں جیسے آگ بھڑک اٹھی۔ ان کی باتیں مزید بے باک ہو رہی تھیں۔ میں پلٹ کر کچن میں چلی آئی۔ دل چاہ رہا تھا بابر کو گولی مار دوں۔ کس قدر رکمینہ اور منافق شخص ہے جو میرے گھر والوں کے اعتبار کا فائدہ اٹھا رہا ہے۔

میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ میری بہنوں، بھابیوں اور خاندان کی دوسری عورتوں کو کسی اور ہی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

"بانو چائے لے آؤ۔" بابر نے زور سے آواز دی۔ میں وہیں بیٹھی رہی۔

"کیا بات ہے بانو؟" کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد وہ خود ہی کچن میں چلا آیا۔ "طبیعت تو ٹھیک ہے۔" وہ فکر مند سا میرے قریب آیا۔ میں نے بے زاری سے آنکھیں بند کر لیں۔ اس شخص کا منافق چہرہ دیکھنے کو میرا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔

☆☆☆

بابر سے میری شادی کو دو سال ہونے والے تھے۔ یہ رشتہ شادی دفتر والوں نے کروایا تھا۔ بابر کے والد نہیں تھے، دو بہنیں تھیں۔ ایک بڑی جس کی شادی ہمارے ساتھ ہی ہوئی تھی۔ ایک چھوٹی تھی جو میٹرک میں تھی۔ والدہ حیات تھیں۔ بابر کسی فیکٹری میں سپروائزر تھے۔ معقول تنخواہ تھی۔ ان کے مقابلے میں میرا میکہ مالی طور پر آسودہ تھا۔ ابا کی کپڑے کی دکان تھی۔ دونوں بھائی اچھی جگہ جاب کر رہے تھے اور شادی شدہ تھے۔ دو بہنیں تھیں جو کہ کالج میں تھیں۔

بابر کا رشتہ سب کو اچھا لگا تھا۔ چھوٹی سی فیملی تھی۔ شریف اور سادہ لوگ تھے۔ میری بڑی نند اسی شہر میں بیاہی تھی۔ اماں بہت پیار کرنے والی خاتون تھیں، روایتی ساسوں والی ان میں کوئی بات نہیں تھی۔ چھوٹی نند گڑیا بھولی بھالی لڑکی تھی۔ میری بہت عزت کرتی تھی۔ خود بابر ایک آئیڈیل شوہر تھے۔ مجھ سے دیوانہ وار محبت کرتے تھے۔ میری ہر خواہش پورا کرنے کی کوشش کرتے۔ میرے کہے بغیر ہر اتوار کو میکے لے جاتے۔ میرے گھر والے مجھے خوش دیکھ کر مطمئن تھے۔

بابر وہاں جا کر بالکل گھر کے فرد کی طرح گھل مل جاتے تھے۔ پورے گھر میں پھرتے۔ ہر کام میں آگے آگے رہتے۔ میری امی ابو کا ہر حکم بجا لاتے۔ میرے بھائیوں کے سامنے انکساری سے رہتے۔ میری بھابیاں اور دونوں بہنیں بے تکلفی سے ان سے بات کرتی تھیں۔ اپنے کام کروا لیتی تھیں۔ وہ بھی ماتھے پر شکن لائے بغیر ان کے کام کرتے تھے۔ یہ تو مجھے اب خبر ہوئی تھی کہ ان کی نیت کس قدر خراب تھی۔ وہ میرے اور میرے گھر والوں کی سادگی سے کھیل رہے تھے۔

اس رات مجھے نیند نہیں آئی۔ بابر تو سو گیا میں سوچتی رہی اور خون کھولاتی رہی۔

☆☆☆

میں نے بابر پہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ مجھے اس کی بدنیتی کا پتا چل گیا ہے، مگر میرا دل بجھ سا گیا تھا۔ اماں سے میں نے بخار کا بہانہ کر دیا تھا۔ چند دن کے لیے میکے جانے کی بات کی تو بابر نے کہا۔ "تمہارے بغیر کیسے رہوں گا۔ میرا دل نہیں لگے گا۔" کوئی اور وقت ہوتا تو اس کی اتنی محبت پر اتراتی مگر اب مجھے کوفت ہو رہی تھی۔

انہی دنوں امی کا فون آ گیا۔ مجھ سے چھوٹی بہن کی شادی طے ہو گئی تھی۔ اس کی منگنی کو سال ہو چکا تھا۔ اب لڑکے والے اصرار کر رہے تھے اس لیے ایک ماہ بعد شادی رکھ دی گئی تھی۔ اس کا جہیز امی نے بنا رکھا تھا۔ کھانے اور فرنیچر کے پیسے الگ رکھے ہوئے تھے سو پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ امی نے مجھے اور بابر کو مشورے کے لیے بلایا تھا۔

بابر بہت خوش تھا۔ اگلے دن ہم شام کے وقت امی کی طرف چلے گئے۔ اس بار میری نظر بابر پر ہی تھی اور کچھ ہی

دیر میں مجھے اندازہ ہوگیا کہ بابر نے جو مجھے بدھو کہا تھا وہ غلط نہیں تھا۔ میں واقعی بدھو تھی۔ امی کے گھر جا کر بابر کو بھول ہی جاتی تھی۔ اسے کھانا بھی بھابیاں دیتی تھیں۔ میں امی کے ساتھ باتیں کرتی رہتی یا سو جاتی۔ رات گئے تک محفل جمتی۔ لوڈو اور کیرم کھیلا جاتا۔ اب بہت سی باتیں یاد آرہی تھیں۔ کھیلتے ہوئے کسی اچھے شاٹ پر وہ بھابی کے آگے ہاتھ کرتا۔ بھابی یا میری بہن ہاتھ پر ہاتھ مار کر اس کا ساتھ دیتیں۔ ایسے کئی سین تھے جو مجھے یاد آرہے تھے۔ میری بہنوں کو آئس کریم کھلانے لے جاتا۔ کسی بھابی کو ٹیلر کے پاس یا بازار جانا ہوتا تو فوراً موٹر سائیکل نکال لیتا۔

اس رات شادی کے انتظامات کے بارے میں بات کرنے کے بعد امی ابو تو سونے کے لیے چلے گئے۔ باقی سب ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ہنسی مذاق کرنے لگے۔ شادی کی تیاریوں پر بھی بات ہوتی رہی۔

میری بہن عالیہ جس کی شادی تھی وہ الگ صوفے پر بیٹھی تھی اور سب کی باتوں اور چھیڑ چھاڑ سے شرما رہی تھی۔ اچانک بابر اٹھا اور جا کر عالیہ کے قریب بیٹھ گیا۔

''ہاں تو میری گڑیا نے مجھ سے کیا گفٹ لینا ہے شادی کا۔'' اور اپنا ہاتھ عالیہ کے کندھے پر پیچھے سے پھیلا کر اسے اپنے قریب کرلیا۔ میرا دھیان اسی کی طرف تھا۔ عالیہ نے سر جھکا لیا۔ میں نے دیکھا کہ بابر اس کا سر اپنے کندھے پر رکھ کر کمر تھپک رہا ہے۔ اس کا ہاتھ عالیہ کی کمر پر پھیل رہا تھا۔

''بھئی جو کہو گی ملے گا۔ بڑا بہنوئی ہوں۔'' وہ ہنسنے لگا۔ غصے کی شدید لہر میرے وجود میں دوڑ گئی۔

میں کھڑی ہوگئی۔ ''عالیہ میرے ساتھ آؤ، ضروری بات کرنی ہے۔'' میں نے زور سے کہا تو عالیہ جلدی سے اٹھ کر میرے پاس آگئی۔ میں نے بابر کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ ایسا چور تھا کہ اس کو پکڑنا ممکن ہی نہیں تھا۔

میں عالیہ کا ہاتھ پکڑ کر باہر آگئی اور اِدھر اُدھر کی بات کرنے لگی۔

بارہ بج گئے، میں اکثر رات ادھر ہی ٹھہر جاتی تھی بلکہ بابر کا ہی اصرار ہوتا تھا کیونکہ ہم ہفتے کی رات کو آیا کرتے تھے اور اتوار کی شام کو واپس جاتے تھے۔

لیکن آج میں نے دل پر جبر کر کے کہا۔ ''گھر چلو میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔'' میں نے ضدی لہجے میں کہا۔ بابر چپ سا ہوگیا۔

میں بھابیوں سے مل کر ابو کے کمرے میں ان کو خدا حافظ کہنے گئی۔ بھائی اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ جب میں واپس آئی تو ڈرائنگ روم میں بابر نہیں تھا۔ میں سمجھی شاید واش روم میں گیا ہے کچھ دیر انتظار کے بعد میں نے باہر نکل کر دیکھا تو بابر بھابی کے کمرے کے دروازے پر کھڑا تھا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔

''آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟'' میں نے عام سے لہجے میں ہی پوچھا۔

''میں بھابی کو خدا حافظ کہنے آیا تھا۔'' وہ گڑ بڑا کر تیزی سے باہر کے دروازے کی طرف چلا گیا۔ میں نے آگے ہو کر کمرے میں دیکھا۔ بھابی اپنے بیڈ پر بیٹھی چہرے اور گردن کا مساج کر رہی تھیں۔ بغیر دوپٹے کے ہی تھیں۔ یعنی بابر کب سے کھڑا انہیں دیکھ رہا تھا۔ اشتعال کی آندھی میرے اندر چلنے لگی۔

میں بابر سے کچھ پوچھتی تو وہ نہ صرف مکر جاتا بلکہ برا بھی مان جاتا اس لیے خون کے گھونٹ پی گئی۔

☆☆☆

عالیہ کی شادی کے سلسلے میں امی کا اصرار تھا کہ میں پندرہ دن پہلے ان کی طرف چلی جاؤں۔ میں چلی جاتی تو بابر بھی رات کو ادھر ضرور آتا اور آدھی رات تک ڈرائنگ روم میں بیٹھتا۔ پہلے بھی ایسے ہی ہوا کرتا تھا۔ طرح طرح کی سوچوں نے مجھے بیمار کردیا۔ بابر کا جرم ایسا تھا کہ فرد جرم عاید ہی نہیں کی جاسکتی تھی۔ وہ ایسا مشاق کھلاڑی تھا کہ پتا ہی نہیں چلنے دیتا تھا کہ اگلے ہی لمحے وہ کیا کرنے والا ہے۔ ابھی ہمارا بچہ بھی نہیں تھا کہ اس کی طرف مصروف ہو جاتی۔ اس مسئلے کا کوئی حل سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

امی نے بھائی کے ہاتھ چند شادی کارڈ بھیجے تھے کہ میں اپنی طرف سے جس کو بلانا چاہوں بلالوں، اور ایک کارڈ میری بڑی نند کے لیے بھی تھا۔

میں اور بابر دونوں شادی کا کارڈ دینے باجی کی طرف گئے۔ باجی بہت اچھے گھر بیاہی گئی تھیں۔ ان کے شوہر شاہد گورنمنٹ آفیسر تھے۔ بہت باوقار شخصیت تھی۔ میں ان سے ذرا بزرو ہو کر ہی بات کرتی تھی بلکہ میں ہر غیر مرد جو کے ہماری فیملی سے باہر تھا اس سے جھجک کر بات کرتی تھی۔ شاہد بھائی سے حال چال پوچھنے کے علاوہ کم ہی بات ہوتی تھی۔ باجی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہم چائے پی رہے تھے۔ باجی نے کارڈ لے کر شادی میں آنے کا وعدہ کیا مگر شاہد بھائی

ذرا خاموش تھے۔ پتا چلا کہ انہی تاریخوں میں ان کے تایازاد کی بھی شادی تھی اسی لیے وہ اقرار کرتے ہوئے ذرا تذبذب میں تھے۔

باجی ہمارے لیے کھانے کا انتظام کرنے اٹھ گئیں۔ شاہد بھائی اور بابر باتیں کر رہے تھے۔ اچانک میرے ذہن میں بجلی سی چمکی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر شاہد بھائی کے قریب صوفے پر جا بیٹھی۔

''شاہد بھائی پلیز آپ نے ہماری طرف ہی آنا ہے۔ دیکھ لیں میں ناراض ہو جاؤں گی۔'' شاہد بھائی حیرانگی سے میرا منہ دیکھ رہے تھے۔ میں نے کبھی ایسی بے تکلفی کا مظاہرہ کیا نہیں تھا نا۔ میں نے بابر کو دیکھا اس کے چہرے پر ناگواری تھی۔

اب آیا اونٹ پہاڑ کے نیچے میں نے سوچا اور پھر مسکرا مسکرا کر شاہد بھائی سے باتیں کرنے لگی۔ پہلے تو وہ جھجک کر جواب دیتے رہے پھر وہ بھی ہنسی مذاق کے موڈ میں آ گئے۔

اس دن مجھے ایک اور بات کا بھی ادراک ہوا کہ مردوں کو ترغیب دینے میں ہم عورتوں کے رویے کا بھی ہاتھ ہوتا ہے۔ دانستہ یا نادانستہ طور پر عورتیں مردوں کو بڑھاوا دیتی ہیں۔

غرض کہ اس دن شاہد بھائی بھی اپنے وقار کا چولا اتار کر کھل گئے۔ باجی اور بابر کچھ ناگواری اور کچھ حیرت سے مجھے دیکھتے رہے۔

گھر واپس آتے ہوئے اور سونے تک بابر خاموش ہی رہا۔ میں نے بھی کچھ نہیں پوچھا۔

اگلے دن کی بات ہے میں نے اماں سے بازار جانے کی اجازت لی اور گڑیا کو بھی ساتھ لے جانے کو کہہ دیا۔ گڑیا نے بھی میری بہن کی شادی میں شریک ہونا تھا اور اس کے لیے بھی شاپنگ کرنا تھی۔ میں نے اماں سے کہہ دیا کہ واپسی پر میں امی کی طرف چلی جاؤں گی۔ رات کو بابر مجھے لے لیں گے۔ اماں نے اجازت دے دی۔

گڑیا بہت کم میرے میکے جاتی تھی اور جب جاتی تو اماں ساتھ ہوتی تھیں۔ آج پہلی بار میں اسے شاپنگ کے بعد اپنے گھر لے آئی۔ گڑیا بہت خوش تھی اسے میں نے کافی چیزیں لے کر دی تھیں۔

رات کو سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ شادی کے بارے میں ڈسکس کر رہے تھے کہ بابر آ گیا۔ گڑیا اس وقت میری چھوٹی بہن سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ اسے موبائل پر کپڑوں کے ڈیزائن دکھا رہی تھی۔ اس کا دوپٹا سر سے ڈھلک کر کندھے پر آ گیا تھا۔ اسے خبر نہیں ہوئی، بابر کی نظر سب سے ہوتی ہوئی جیسے ہی گڑیا پر پڑی۔ اس کا مسکراتا چہرہ سمٹ گیا۔

سب بابر سے ملنے لگے۔ بھابی اس کے لیے کھانا لینے اٹھ گئیں اور وہ میرے پاس بیٹھ گیا۔

''گڑیا کو ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی؟'' آہستہ اور غصیلی آواز میں اس نے پوچھا۔

''تو کیا ہوا۔ اماں سے پوچھ کر لائی ہوں۔'' میں نے بھی غصے سے جواب دیا۔ وہ گڑبڑا گیا۔

''نہیں میرا یہ مطلب نہیں تھا'' وہ یہ کہہ کر چپ ہو گیا۔

''ہم سب کھانا کھا چکے تھے۔ بابر نے کھانا کھا لیا تو بڑے بھیا کہنے لگے۔ بھئی ہماری بٹی گڑیا بہت دنوں بعد گھر آئی ہے تو میں آئس کریم لاتا ہوں۔ ہاں بیٹے کون سا فلیور پسند ہے تمہیں؟'' وہ گڑیا کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

بابر نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

''بھیا آپ ایسا کریں گڑیا کو ساتھ لے جائیں وہ اپنی مرضی سے پسند کر کے لے آئے گی۔'' میں نے اونچی آواز میں کہا۔

''میں لے آتا ہوں آئس کریم۔'' بابر جلدی سے کھڑے ہو گئے۔

''نہیں یار تم بیٹھو، آؤ بچے تم ساتھ ہی آ جاؤ۔'' بھیا نے گڑیا سے کہا۔

بابر کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ میری بہنوں کو اصرار کر کر کے ساتھ موٹر سائیکل پہ بٹھاتا تھا اور اب اپنی بہن کی اتنی فکر کہ رنگ ہی زرد پڑ گیا۔

''نہیں آپ اپنی مرضی سے لے آئیں۔'' گڑیا نے جواب دیا تو بھیا چلے گئے۔ بابر نے گہری سانس لی۔ اس دن نہ تو اس نے ہنسی مذاق کیا اور نہ رات ٹھہرنے کی ضد کی بلکہ آئس کریم کھاتے ہی کھڑا ہو گیا۔ میں اور گڑیا بھی پیچھے نکل آئیں۔

جو چور ہوتا ہے وہ دوسروں کو بھی چور ہی سمجھتا ہے۔ بابر کے دل میں چور تھا اسی لیے وہ اپنی بہن کو میرے بھائی کے ساتھ نہیں بھیجنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

یہ میری بہن کی شادی سے ایک ہفتہ پہلے کی بات ہے۔ باجی کے شوہر شاہد بھائی بہت گھبرائے ہوئے ہمارے

گھر آئے۔ باجی اُمید سے تھیں تو ان کا بی پی بہت لو رہتا تھا چونکہ وہ دونوں الگ رہتے تھے اس لیے شاہد بھائی ہی ان کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ اس دن باجی بے ہوش ہوگئی تھیں اور وہ محلے کی لیڈی ڈاکٹر کو باجی کے پاس چھوڑ کر اماں کو لینے آئے تھے۔ وہ سخت گھبرائے ہوئے تھے۔ اماں نے تسلی دی کہ ایسی حالت میں اس طرح ہو جاتا ہے فکر نہ کرو۔ مگر وہ خود نڈھال ہوگئی تھیں۔ ان کی اپنی حالت بگڑ رہی تھی۔ میں نے اماں سے کہا کہ میں چلی جاتی ہوں آپ کی اپنی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔

شاہد بھائی موٹر سائیکل پر آئے تھے۔ میں ان کے ساتھ بیٹھ کر باجی کے گھر آ گئی۔ باجی ہوش میں آ گئی تھیں۔ ڈاکٹر کو گھر بلا لیا تھا اس نے دوائیاں دیں۔ ڈرپ لگائی۔ ادھر میں نے بھی کھانا بنا لیا تھا۔ باجی بہت شکر گزار ہو رہی تھیں۔ اماں کو تسلی کا فون کر دیا تھا اور پھر بابر کو فون کیا کہ میں باجی کی طرف ہوں مجھے شام کو لے جائیں۔ ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی میں نے فون بند کر دیا۔

شام کو بابر آ گئے۔ ان کے چہرے پر سخت سنجیدگی تھی۔ باجی کا حال احوال پوچھا اور مجھے چلنے کا کہا۔ ''بیٹھو یار کھانا کھا لو۔ آج بھابی نے بہت اچھا کھانا بنایا ہے اور میں تو بھئی بہت شکر گزار ہوں ان کا میری بیگم کا بہت خیال رکھا انہوں نے۔'' شاہد بھائی مسکرا کر بولے۔

''نہیں میری اپنی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔'' واپسی پر بابر نے کوئی بات نہیں کی۔ اماں کو باجی کا حال بتا کر میں اپنے کمرے میں آ گئی۔

''تم شاہد بھائی کے ساتھ کیوں گئی تھیں مجھے فون کر دیتیں میں لے جاتا۔'' وہ غصے سے بولے۔

جواب تو میرے پاس بڑا شاندار تھا مگر میں نے برداشت کرتے ہوئے بڑے آرام سے کہا۔ ''باجی کی طبیعت بہت خراب تھی۔ وہ اماں کو لینے آئے تھے مگر اماں خود بلڈ پریشر بڑھا بیٹھی تھیں باجی کی حالت کا سن کر.. پھر ان کی اجازت سے ہی گئی تھی۔''

''بہر حال۔ آئندہ احتیاط کرنا۔'' وہ کھل کر کچھ نہیں کہہ رہے تھے۔ حالانکہ میں کسی بدلے کی نیت سے یا بابر کو سبق سکھانے کے لیے شاہد بھائی کے ساتھ موٹر سائیکل پر نہیں بیٹھی تھی۔ پھر بھی بابر تڑپ اٹھا تھا۔ یعنی اپنی بہن اور بیوی کے لیے اصول الگ ہیں اور دوسروں کی بہنوں اور بیویوں کے لیے الگ اصول۔

☆☆☆

میں نے ٹھنڈے دل سے سوچا تو بابر کی ساری حرکات کے پیچھے میرے گھر والوں اور میرا بھی ہاتھ تھا۔ میں یہ دکھانے کے لیے کہ بابر میرے کہنے میں ہے، بھابیوں کے سامنے اترانے کے لیے بابر کو ہر اتوار لے آتی تھی اور میری والدہ کو پہلے دن سے ہی داماد کو اس کی جگہ پر ہی رکھنا چاہیے تھا اور اپنی بہو اور بیٹوں کو مناسب فاصلہ رکھنے کو کہنا چاہیے تھا۔ مگر میری اور میرے گھر والوں کی نیت صاف تھی۔ بابر کو گھر کا فرد سمجھ لیا۔ یہی غلطی ہوئی تھی۔ اب مجھے سمجھ آئی تھی کہ شاہد بھائی آتے تھے تو اماں گڑیا کو زیادہ ان کے پاس بیٹھنے نہیں دیتی تھیں نہ ہی گڑیا ان سے کوئی فرمائش کرتی تھی۔

بابر جیسے مرد بدنیت اور کمینی فطرت کے ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں اور آنکھوں کی چوری تو میں دیکھ ہی چکی تھی۔ ان کی سوچ کی گندگی کی حد کہاں تک تھی یہ اندازہ مشکل تھا۔

عالیہ کی شادی کے دن بہت کم رہ گئے تھے۔ امی ابو اور بھائیوں کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا کہ ان کے گھر آ کر رک جاؤں۔ بابر بھی بہت بے چین تھا اور میں بہانے بنا بنا کر تھک چکی تھی۔

بابر کا بھرم اپنے میکے میں کھونا نہیں چاہتی تھی نہ ہی یہ بات کسی سے شیئر کر سکتی تھی۔ میں جانتی تھی کہ میں میکے چلی گئی تو بابر بھی وہیں ڈیرا لگا لے گا اور شادی والے گھر میں اس کی بدنیتی کی تسکین کے لیے بہت مواقع ہوں گے۔

میں نے گڑیا کو اپنے ساتھ لے جانے کی بات کی تو بابر نے سختی سے منع کر دیا۔ اماں بھی بیٹے کے سامنے چپ رہ گئیں۔ میں اس دو غلے شخص کی مکاری پر پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔ بابر کو اگر بتا دیتی کہ تمہاری نیت جان گئی ہوں تو وہ غصے میں آ جاتا یا میرے میکے والوں کو بتا دیتا اور وہ مجھے ہی غلط کہتے۔ سوچ سوچ کر میرا دماغ شل ہونے لگا تھا۔

عالیہ کی شادی کی ساری خوشی اور جوش مدھم پڑ گیا تھا۔ بابر اپنے لیے بہت اچھی شاپنگ کر کے آیا تھا۔

''کیا ارادہ ہے، یہی تو دن ہیں وہاں ہلا گلا کرنے کے۔ انجوائے کرنے کے۔ کب چلنا ہے؟ میں نے ایک ہفتے کی چھٹی بھی لے لی ہے۔'' وہ اپنے کپڑے دکھا رہا تھا۔

انجوائے کے لفظ پر مجھے غصہ آ گیا۔ ''اور ہاں بھابی نے کہا تھا ڈانس والے گانے یو ایس بی میں کروا لاؤں تو میں نے بہت شاندار گانے بھروائے ہیں۔'' وہ بولے جا رہا تھا۔ بمشکل میں نے اپنے آپ کو روکا، خیر اسی شام میں اپنے میکے

آ گئی۔ سب نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔

اس رات مایوں کی تقریب تھی۔ اماں اور گڑیا نے صرف برأت میں شامل ہونا تھا، یہ بابر کا آرڈر تھا۔ مایوں کی مناسبت سے سب تیاری ہو رہی تھی۔ بابر نے سفید کلف والی شلوار قمیص پہنی تھی اور پیلے رنگ کا دوپٹا گلے میں ڈال رکھا تھا۔ میرا دھیان اسی کی طرف تھا۔ وہ وقت سے پہلے ہی تیار ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ گھر میں مہمان خواتین بھی موجود تھیں۔ سب سے وہ بے تکلفی سے بات کر رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ڈھیر سارے گجرے لے آیا تھا اور سب لڑکیوں کو دے رہا تھا۔ کئی تو اس سے ہی گرہ لگوا رہی تھیں اور میں سوچ رہی تھی ہم عورتوں کو اپنے رشتوں میں حدود کا خیال خود رکھنا چاہیے۔

سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے بابر کو یہاں سے نکالوں۔ دل دھاڑیں مار مار کر رونے کو چاہ رہا تھا۔

بھابی سب کے لیے چائے بنانے کچن کی طرف گئیں تو بابر بھی کچھ دیر بعد اٹھ کر کچن پہنچ گیا۔ مجھے پتنگے لگ گئے یا اللہ میری عزت رکھنا کوئی بھی بات کسی کو قابلِ اعتراض لگی تو ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا کیونکہ بابر کی جرأتیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ میں اپنے آپ کو کوس رہی تھی۔ اس سب کی ذمہ دار میں خود ہی تھی کیونکہ جس طرح لڑکا اپنے گھر میں بیوی کا امیج بناتا ہے اسی طرح لڑکی بھی اپنے میکے میں شوہر کا امیج بناتی ہے۔

میں اچانک ایسے بھابی کو آواز دیتے کچن کی طرف گئی جیسے عجلت میں ہو۔ بھابی چائے بنا رہی تھی، دوپٹا برتنوں کے ریک پر پڑا تھا۔ تنگ قمیص اور پیلے لہنگے میں بھابی کی کمر چھپی پڑی تھی۔ بابر کپ ٹرے میں لگا رہا تھا۔

''بھابی مجھے اپنی پیلی چوڑیاں نہیں مل رہیں۔'' میں نے بابر کو نظر انداز کر کے پوچھا۔

''وہ میری ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی ہیں۔'' بھابی نے جواب دیا۔ میں باہر آ گئی۔

بھابی سے رشتہ ایسا تھا کہ کچھ کہنا خطرناک تھا۔ وہ کچھ اور سمجھ جاتیں یا کہتیں کہ مجھ پر الزام لگا رہی ہو۔ میں بڑے کمرے میں آ گئی۔ وہاں عورتیں بیٹھی تھیں۔ ایک ہنگامہ تھا۔ میں بھی ایک طرف بیٹھ گئی۔ بھابی چائے لے آئیں۔ بابر نے بھی ایک ٹرے پکڑ رکھی تھی۔

میرے پاس رشتے کی ایک نانی بیٹھی تھیں میری امی کی خالہ تھیں اور بہت عرصے بعد آئی تھیں۔

''اے بانو۔ یہ تمہارا گھر والا ہے؟'' نانی نے بابر کی طرف اشارہ کیا۔

''جی نانی۔'' میں نے جواب دیا۔

''ارے تو کیا اسے کچھ ''کسر'' ہے؟'' وہ رازداری سے بولیں۔

''جی کیا مطلب ''کسر'' ہے؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''بھئی زنانہ سا لگتا ہے۔ میں کب سے دیکھ رہی ہوں عورتوں میں ہی گھسا ہوا ہے۔ سارے مرد اور لڑکے باہر والے کمرے میں ہیں یہ ادھر ہی پھرتا رہتا ہے اور لڑکیوں سے ہنسی مذاق بھی کر رہا ہے!'' نانی کی بات سے میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

''ابھی تک بچہ وچہ بھی نہیں ہوا۔ اس کا ٹیسٹ وغیرہ کروایا ہے؟'' نانی انکشاف کرتی جا رہی تھیں۔

''ارے نہیں نانی جی، بس ان کی عادت گھل مل کر رہنے کی ہے۔ میرے گھر کو اپنا ہی سمجھتے ہیں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''اچھا۔ صرف عورتوں سے ہی گھل مل کر رہتا ہے۔ مردوں سے نہیں۔'' نانی کی بات نے مجھے لاجواب کر دیا۔ اسی وقت کچھ اور مہمان آ گئے۔ سب ملنے ملانے لگے۔

میں اٹھ کر امی کے کمرے میں آ گئی۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے ایک بچے کو آواز دے کر کہا کہ بابر کو بلا لائے۔ وہ بچہ بابر کو بلانے گیا تو میں بیڈ پر بیٹھ کر رونے لگ گئی۔ رونا تو مجھے پہلے بھی آ رہا تھا۔ بابر آیا تو میں زاروقطار رو رہی تھی۔

''کیا ہوا بانو کیوں رو رہی ہو؟''

میں اور شدت سے رونے لگی۔

''کیا ہوا ہے، کسی نے کچھ کہا ہے؟'' وہ میرے پاس بیٹھ کر چپ کرانے لگا۔ کافی دیر بعد میری سسکیاں رکیں تو میں نے اپنا منہ صاف کیا۔

''اب بتاؤ، کیوں رو رہی تھیں کسی نے کچھ کہا ہے۔ کوئی چیز لینی ہے؟'' وہ بڑے پیار سے پوچھنے لگا۔

''آپ کی وجہ سے رو رہی ہوں۔ آپ کی وجہ سے میری بے عزتی ہوئی ہے۔'' میں پھٹ پڑی۔

''میری وجہ سے؟'' وہ حیران ہوا۔ ''میں نے کیا کیا ہے؟'' بڑی معصومیت سے پوچھا۔

''وہاں بڑے کمرے میں سب عورتیں آپ کا مذاق اڑا رہی تھیں۔'' میں نے ذرا ڈرامائی انداز میں کہا۔ اسے ایک دم شاک سا لگا۔

''کیوں؟ کیسا مذاق؟''

''وہ کہہ رہی تھیں۔'' میں ذرا رکی۔ ''کہہ رہی تھیں تمہارا شوہر زنانہ ٹائپ ہے۔''

بابر کو جیسے ڈنک لگا۔ ''کیا۔ کس نے کہا ہے؟''

''سب کہہ رہی تھیں۔ عورتوں میں گھسا رہتا ہے ہنسی مذاق بھی عورتوں جیسا کرتا ہے اسے چیک کراؤ اسے کچھ ''کسر'' ہے!''

''یہ کیا بکواس ہے؟'' وہ کھڑا ہو گیا۔ اس کی مردانگی پر بڑی سخت چوٹ لگی تھی۔ شرمندگی سے اس کے ماتھے پر پسینا آ گیا۔

''تم نے منہ نہیں توڑا ان کا۔'' اسے شدید غصہ آ گیا۔

''میں کیا کہتی۔ آپ نے اپنا تماشا خود بنوایا ہے۔ سارے مرد اور لڑکے باہر کاموں میں لگے ہوئے ہیں اور آپ اندر عورتوں میں گھسے ہوئے ہیں اور یہ سب کو گجرے کیوں دے رہے تھے؟'' میں نے بھی غصے سے کہا۔

وہ ذرا چپ رہا میں بولی۔ ''مجھے سب میں ذلیل کرا دیا۔'' اور پھر رونے لگی۔ ''کہہ رہی تھیں ابھی تک بچہ بھی نہیں ہو رہا۔ کوئی نہ کوئی کمی ہے اس میں۔'' میں نے تابوت میں آخری کیل بھی ٹھونک دی۔

وہ تلملا اٹھا۔ ''میں ابھی پوچھتا ہوں جا کر۔''

''جائیں اور تماشا لگائیں جن کو نہیں پتا اس بات کا ان کو بھی بتائیں۔''

وہ اپنے سر کے بال نوچنے لگا۔ ''دیکھو بانو میں تو اپنے آپ کو اس گھر کا داماد نہیں بیٹا سمجھتا ہوں اسی لیے ہر کام میں شامل ہوتا ہوں۔ پھر تم بھی تو خوش ہوتی تھیں یہ دیکھ کر کہ میں تمہارے گھر میں روایتی داماد بن کر نہیں آتا۔''

''وہ سب ٹھیک ہے مگر آپ کی سیلف ریسپیکٹ سے بڑھ کر میرے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ میں برداشت نہیں کروں گی کہ کوئی آپ کا مذاق اڑائے۔'' میں پھر رونے کی تیاری کرنے لگی۔

''اچھا، اچھا۔ اب چپ کر جاؤ۔''

''ٹھیک ہے آپ گھر جائیں۔ میں امی ابو سے کہہ دوں گی کہ اماں کی طبیعت خراب ہے اس لیے آپ انہیں ڈاکٹر کے پاس لے جانے گئے ہیں۔ کل مہندی کا فنکشن ہے آنے کی ضرورت نہیں یہ عورتوں کا ہی ہے۔ برات والے دن اماں اور گڑیا کو لے کر آیئے گا۔'' میرے پروگرام پر اس کا چہرہ لٹک گیا۔

''کیونکہ اب کسی نے بات کی تو میں اپنی بہن کی شادی کا بھی لحاظ نہیں کروں گی اور یہاں سے چلی جاؤں گی۔ اب آپ نے جب بھی یہاں آنا ہے ایسا رویہ رکھنا ہے کہ کوئی آپ پر انگلی نہ اٹھا سکے۔ آپ کو اچھا لگے گا کہ کوئی آپ کو زنانہ ٹائپ کہے۔''

بابر کی ساری ہوا نکل چکی تھی وہ گھر چلا گیا۔ امی ابو کو میں نے اماں کی بیماری کا کہہ کر مطمئن کر دیا۔ رسم شروع ہوئی۔ ڈانس کرنے کی باری آئی تو بھابی بابر کو ڈھونڈنے لگیں کہ اسی کے پاس ڈانس والے گانے تھے۔ مجھے ہنسی آ رہی تھی۔ بابر صاحب تو بے چارے گھر میں لیٹے تلملا رہے ہوں گے۔ ساری شاپنگ، پروگرام، دھرے کے دھرے رہ گئے۔ ساری انجوائے منٹ سر پر پڑ گئی۔ برات والے دن اماں اور گڑیا کے ساتھ آیا۔ ہال میں ایک کرسی پر بیٹھا رہا، عورتوں والے حصہ میں نہیں آیا۔ کئی کاموں کے لیے آوازیں دیں۔ بس جب عالیہ کا دولہا ساتھ بیٹھا تو مجھے اور بابر کو بھی بٹھایا۔ جب بھی سنجیدگی سے بیٹھا رہا۔ میں نے اپنی بہن کی شادی پوری طرح انجوائے کی کیونکہ میرے دل سے خلش نکل چکی تھی۔

☆☆☆

میں نے میکے جانا بہت کم کر دیا تھا اور رات تو بالکل نہیں رہتی تھی۔ بابر بھی اب اصرار نہیں کرتا تھا، دوسرے عالیہ کا شوہر میرے گھر والوں کے سامنے بہت لیے دیئے انداز میں رہتا تھا وہ کسی سے بھی زیادہ بے تکلف نہیں ہوتا تھا۔ اسے دیکھ کر بھی بابر سنبھل گیا تھا۔

میں نے بابر کو احساس دلائے بغیر اور اپنے گھر والوں کو بھی بتائے بغیر یہ معاملہ حل کر لیا تھا۔ میرا رشتہ بھی خراب نہیں ہوا۔ میکے میں بھی بابر کی عزت قائم رہی۔ مگر میرے دل میں بابر کا وہ مقام نہیں رہا جو پہلے تھا۔ آگہی عذاب ہوتی ہے۔ مجھے یہ احساس ہی شرمسار کر دیتا ہے کہ میرا شوہر بدنیت اور بدنظر ہے۔

آپ کے اردگرد بھی ایسے انوکھے چور موجود ہوں گے۔ محلے میں، رشتہ داروں میں، آفس میں جو بظاہر بے ضرر ہوتے ہیں مگر اندر سے چور ہوتے ہیں۔ ان چوروں پر کوئی حد نہیں لگتی۔ یہ پکڑ میں نہیں آتے اس لیے ہوشیار رہیے اور کسی اپنے یا بیگانے کو ایسی چوری کرنے کی اجازت نہ دیجیے... ورنہ آپ کو احساس بھی نہیں ہوگا اور یہ چور آپ کا بہت کچھ لوٹ لیں گے۔

++

مدیر محترم

السلام علیکم!

یہ خود میری کہانی ہے۔ اسے میں سرگزشت کے لیے صرف اس وجہ سے بھیج رہا ہوں کہ کوئی اور میری طرح غلط سمت کا راہی نہ بن جائے اور اسے اپنی بیوی کے ہاتھوں ایسے عجیب انتقام کا سامنا کرنا پڑے۔ میرے ساتھ جو کچھ ہوا، میں جس کرب سے گزر رہا ہوں، خدا دشمن کو بھی ایسا دن نہ دکھائے۔ ایک چھوٹی سی مگر اہم گزارش ہے کہ میرا اصل نام کہانی پر نہ دیں، جو نام لکھا ہے وہی ڈالیں۔

معظم علی عباسی

(کراچی)

میں معظم علی عباسی ہوں، لوگ مجھے اسی نام سے پہچانتے ہیں لیکن میرے بارے میں عام لوگ صرف اتنا ہی جانتے ہیں جتنا اخبارات میں آتا رہا ہے لیکن لوگ یہ نہیں جانتے کہ میں نے کتنی گھناؤنی اور گناہ بھری زندگی گزاری ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میری زندگی کا سفر ختم ہونے میں صرف چند ماہ یا چند دن باقی ہیں۔ مجھے اچھی طرح سے علم ہے کہ جب آخرت میں مجھ سے سوال ہوں گے تو میرے پاس کوئی جواب نہیں ہوگا اور میں جہنم کی آگ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جھونک

دیا جاؤں گا لیکن ایسی زندگی بسر کرنے کا تمام تر ذمہ دار میں نہیں ہوں بلکہ اس کے اعلیٰ ذمہ دار میرے والدین خاص طور پر میرے والد اور بڑا بھائی اعظم ہیں۔

ہم دو ہی بھائی تھے، اعظم بڑا تھا اور میں چھوٹا تھا۔ اعظم مجھ سے پانچ برس بڑا تھا۔ اعظم سے پہلے تین بہنیں پیدا ہوئیں لیکن ان میں سے دونوں تین تین ماہ سے زیادہ نہیں رہ سکی تھیں۔ اعظم کی پیدائش سے پہلے ابا نے اماں کے لیے کراچی کے ایک بڑے اسپتال میں انتظام کیا تھا پھر جب اعظم تین ماہ سے زیادہ زندہ رہا تو ابا نے آس پاس کے گاؤں میں خوب مٹھائی تقسیم کی۔ اعظم کی پیدائش سے پہلے ابا نے کون سی درگاہ کے چکر نہیں کاٹے، کون سا پیر تھا جس کے آستانے پر انہوں نے حاضری نہیں دی۔ اعظم پانچ برس کا ہوگیا تو اماں پھر سے حاملہ ہوگئیں لیکن اس بار ابا نے نہ کوئی منت مانی نہ آستانوں پر حاضری دی۔ قدرت کو میری پیدائش منظور تھی تو میں پیدا ہوگیا۔ میری پیدائش پر نہ خوشیاں منائی گئیں نہ مٹھائیاں بانٹی گئیں۔ میں کچھ بڑا ہوا تو اعظم اس وقت اسکول جانے لگا تھا۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ اعظم پڑھائی میں بہت اچھا تھا۔ پہلی جماعت سے لے کر میٹرک تک اس کی کلاس میں ہمیشہ اوّل پوزیشن آتی رہی تھی۔ ہمارا اسکول ایک ہی تھا۔ ہر سالانہ تقریب میں اعظم اسٹیج پر ہوتا اور انعام وصول کرتا جبکہ میں عام طالبعلموں کے ساتھ تالیاں بجاتا تھا۔

اعظم اسکول کے بعد کالج میں داخل ہوا تو وہاں بھی یہی حالات رہے لیکن جس ایک بات سے مجھے نفرت تھی وہ یہ تھی کہ ابا ہمیشہ اعظم کی تعریف کرتے تھے۔ مہمانوں کے سامنے اس کے گن گاتے تھے اور ان کا اختتام اس بات پر ہوتا تھا۔

"دیکھنا میرا بیٹا ایک دن بہت بڑا افسر بنے گا۔" میرا ذکر بھولے سے بھی ان کی زبان پر نہیں آتا تھا البتہ اماں مجھے پیار کرتی تھیں۔ میں نے جب ان سے شکایت کرنی چاہی تو انہوں نے جواب میں کہا۔

"وہ ہے ہی اتنا لائق۔" ان کی بات سن کر مجھے دھچکا سا لگا تھا۔

"اماں فیل تو میں بھی کبھی نہیں ہوا۔" میرے لہجے میں احتجاج تھا۔

"فیل نہیں ہوا لیکن اوّل بھی تو کبھی نہیں آیا۔" اماں نے میرا احتجاج مسترد کردیا تھا۔ "ابھی اسی سال کی اپنی رپورٹ دیکھ لے تیرے چھیاسی فیصد نمبر ہیں اور اعظم نوّے فیصد لایا ہے۔"

"اماں چھیاسی فیصد بھی کم تو نہیں ہوتے۔" میں نے اس بار بھرپور احتجاج کرنا چاہا تھا لیکن اماں کے جواب نے میری امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔

"چھیاسی فیصد کم تو نہیں ہوتے لیکن نوّے سے تو کم ہوتے ہیں ناں۔" اماں کا جواب تھا۔

اعظم جب بی اے میں آیا تو میرے میٹرک کے امتحان تھے۔ میں پڑھائی میں جتا ہوا تھا۔ میں ہر ممکن طریقہ سے اعظم سے زیادہ نمبر لانا چاہتا تھا لیکن امتحان شروع ہونے سے ہفتہ بھر پہلے میں ٹائیفائڈ کا شکار ہوگیا۔ ابا، اماں اور اعظم کا مشورہ تھا کہ اس برس امتحان نہ دوں لیکن میں نے ضد کی کہ میں امتحان ضرور دوں گا کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ میری تیاری مکمل ہے۔ آخر کار ابا نے میری ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور ڈرائیور سے کہا کہ میرے ساتھ امتحانی مرکز جائے اور واپس بھی لائے۔

میں پاس ہوگیا لیکن اعظم کے نمبروں کو کراس نہ کرسکا۔

اب لعن طعن کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوگیا۔

میں کالج پہنچا تو وہاں مجھے کرکٹ کا شوق ہوگیا۔ کالج کی کرکٹ ٹیم کے جو کوچ تھے وہ خود بھی اپنے زمانے میں فرسٹ کلاس کھلاڑی رہے تھے۔ ابتدا میں میری توجہ بیٹنگ کی طرف تھی لیکن کوچ کے مشورہ پر میں نے تیز گیند کرانی شروع کی۔

میں گراؤنڈ میں پہنچنے والا پہلا شخص ہوتا تھا اور جب تک نیٹ لگتی اور باقی کھلاڑی آتے میں اکیلا ہی گیند کرواتا رہتا۔ میرا شوق دیکھ کر کوچ صاحب نے بھی مجھ پر خاص توجہ دینی شروع کردی تھی۔

اعظم نے اس کی شکایت ابا سے کردی۔ "سائنس لے تو لی ہے لیکن کالج میں اس کی توجہ کھیل کی طرف زیادہ ہے کہتا ہے فاسٹ بولر بنوں گا۔" اعظم ابا کا چہیتا تھا ایسا کیسے ہوسکتا تھا کہ وہ میری شکایت کرے اور ابا اس پر توجہ نہ دیں۔ وہ اگلے روز کالج پہنچے اور پرنسپل کے کمرے میں کوچ کو بلوالیا۔

"آپ میرے بیٹے کو کیوں تباہی کی طرف دھکیل رہے ہیں۔" ابا کے لہجے میں غصہ ہی غصہ تھا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" کوچ صاحب نے پورے ادب سے ابا کو مخاطب کیا تھا۔

"کیا تم نے اسے فاسٹ بولر بننے کا مشورہ نہیں دیا؟" ابا نے تلخ لہجے میں کہا تھا۔

"مشورہ میں نے ہی دیا تھا لیکن معظم کے لانبے قد اور

چوڑے شانوں کی وجہ سے دیا تھا۔'' کوچ صاحب کا لہجہ اب بھی نرم ہی تھا۔

''وہ اولاد میری ہے یا تمہاری۔'' ابا ایک دم سے ہتھے سے اکھڑ گئے تھے میں چاہتا تھا کہ وہ ڈاکٹر بنے لیکن تم کسی اور ہی راہ پر لگا رہے ہو تم نے وہ کہاوت نہیں سنی پڑھو گے لکھو گے تو بنو گے نواب اور کھیلو گے کودو گے تو ہو گے خراب۔'' ابا نے پرانی کہاوت دہرائی۔

''عباسی صاحب یہ پرانی کہاوت ہے اب یہ کہاوت بدل رہی ہے کھیل میں بھی بہت پیسا ہے۔'' کوچ نے دلیل دینے والے انداز میں کہا لیکن ابا تو کچھ اور ہی سوچ کر آئے تھے۔ وہ اچانک اپنی جگہ سے اٹھ گئے اور پرنسپل صاحب کو مخاطب کیا:

''آج کے بعد معظم نے اگر کرکٹ کھیلی تو میں اپنے تمام دوستوں کو روک دوں گا کہ وہ آپ کے کالج کی امداد روک دیں۔'' اور یہ کہتے ہوئے ابا غصہ میں وہاں سے نکل آئے۔ میں اس وقت پرنسپل کے کمرے کی طرف ہی جا رہا تھا لیکن ابا نے مجھے نہیں دیکھا البتہ میں نے ان کی بڑبڑاہٹ سن لی تھی۔

''بڑا آیا ہے کہتا ہے کھیل میں بھی بڑا پیسا ہے اور خود یہاں لیکچری دے رہا ہے۔'' ابا یہ کہتے ہوئے چلے گئے اس وقت تو میں نہیں سمجھا کہ ابا کے ارشادات کس کے بارے میں تھے لیکن ان کے پیچھے کوچ صاحب آئے تو انہوں نے پوری تفصیل بتا دی۔ میں نے ان سے معذرت کرنی چاہی تو وہ ہنس دیئے۔

''تم کس بات پر معافی مانگ رہے ہو۔'' انہوں نے مجھے تھپکی دیتے ہوئے کہا تھا۔ ''مجھے افسوس ہے تو صرف اس بات کا کہ ہمارا کالج اس سال چیمپئن نہیں بن سکے گا ورنہ مجھے یقین تھا کہ اگر تم کالج کی ٹیم سے کھیلو تو ہم یقینی طور پر انٹر کالجیٹ جیت جائیں گے۔''

ان کا مجھ پر اعتماد دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی تھی پھر انہوں نے مجھے بتایا کہ بڑے کھلاڑیوں کے راستوں میں یہ چھوٹے چھوٹے اسپیڈ بریکر آتے ہیں جو انہیں عبور کر لیتا ہے وہی بڑا کھلاڑی بن جاتا ہے۔

''مگر سر۔ وہ ابا تو دھمکی دے کر گئے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''کالج کی ٹیم سے نہیں کھیلے تو کیا ہوا میں تمہیں کلب میں لے جاؤں گا وہاں سے کھیلنا۔'' انہوں نے مجھے اُمید دلائی۔ ساتھ ہی انہوں نے مجھے کلب کا پتا بھی دیا جو شہر سے باہر تھا۔

اگلے روز میں ایک دوست کی موٹر سائیکل پر کلب پہنچا جہاں سے میری ٹریننگ کا نیا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ سلسلہ چھ ماہ تک جاری رہا۔ ان چھ مہینوں میں اعظم نے بی اے کر لیا اور اس نے ضد شروع کی کہ بیرون ملک جا کر بیرسٹر بننا چاہتا ہے۔ ابا کے لیے اعظم کی ہر خواہش پوری کرنا لازمی ہوتا تھا لیکن اس ضد کا دوسرا حصہ یہ تھا کہ وہ جانے سے پہلے تانیہ سے منگنی کرنا چاہتا ہے تاکہ جب وہ چار برس بعد آئے تو فوراً ہی اس کی اور تانیہ کی شادی ہو جائے۔

تانیہ اور ثانیہ ہماری پھوپی کی بیٹیاں تھیں۔ تانیہ بڑی آنکھوں اور خوبصورت چہرے والی ایک خوبصورت لڑکی تھی جو مجھے بھی پسند تھی تانیہ اس سے کچھ سال چھوٹی تھی لیکن اس کا دبتا ہوا رنگ تھا۔ قد بھی تانیہ کی طرح نہیں تھا اور آنکھیں بھی چھوٹی تھیں بالکل جاپانی لڑکیوں کی طرح سے۔

جس روز اعظم کی منگنی تھی اس روز میں نے اماں سے شکایت کی تو انہوں نے روکھے لہجے میں کہا۔ تانیہ تجھ سے سال بھر بڑی ہے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہاری شادی ثانیہ سے کی جائے گی۔

''مگر ثانیہ مجھے بالکل بھی پسند نہیں ہے۔'' میں نے وہ بات کہہ دی جو میرے دل میں تھی۔

''مجھ سے تو کہہ دیا ہے باپ سے مت کہنا، تم نہیں جانتے کہ وہ اپنی بہن سے کتنی محبت کرتے ہیں۔''

''جبھی انہوں نے اعظم کے کہنے پر فوراً بہن سے بات کر لی اور انہوں نے بھی فوری طور پر ہاں کر دی۔'' میں نے کہا۔

''لڑکے تو پاگل تو نہیں ہو گیا۔'' اماں نے پھٹکارنے والے انداز میں کہا تھا۔ یہ وہ موقع تھا جب میں نے سوچا کہ میری کوئی حیثیت ہے بھی یا نہیں۔ اعظم کی منگنی ہو گئی اور وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر چلا گیا لیکن اس کے باہر جانے سے گھر کے ماحول میں کوئی زیادہ فرق نہیں آیا۔ گھر میں اب بھی اس کے ہی چرچے ہوتے تھے مگر اب انداز ذرا مختلف تھا۔

''چار برس کی بات ہے اس کے بعد اعظم بیرسٹر بن کر واپس آ جائے گا۔'' ابا اب بھی ہر مہمان کے سامنے اس کا ذکر کرتے تھے اور مجھے یہ احساس دلاتے رہتے تھے کہ میری اس گھر میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔ میں الجھتا تو ضرور تھا کہ میری کرکٹ ضرور جاری تھی۔ کالج سے تو نہ کھیل سکا لیکن کلب سے کھیل رہا تھا۔ میری کرکٹ کی کچھ سن گن اماں کو تھی لیکن انہوں نے ابا سے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا کیونکہ وہ اچھی طرح جانتی

تھیں کہ ابا میری کرکٹ سے کتنی نفرت کرتے ہیں لیکن تمام تر احتیاط کے باوجود میرا بھانڈا اس وقت پھوٹا جب ڈسٹرکٹ کی جانب سے کھیلتے ہوئے میں نے پہلے ہی میچ میں سات وکٹیں لی تھیں اور مین آف دی میچ قرار پایا تھا اور اخبارات نے یہ خبر میری تصویر کے ساتھ شائع کی تھیں۔ ابا شاید دنیا کے پہلے والد تھے جو میری اس بڑی کامیابی پر ناراض ہو رہے تھے۔ ''میں نے منع کیا تھا مگر تم نے کرکٹ نہیں چھوڑی اور وہ جو بڑا کوچ بنا پھرتا ہے اسے تو میں دیکھ لوں گا۔'' ابا غصہ میں چیخ رہے تھے اور میں خاموشی سے سن رہا تھا۔ ابا کی ناراضگی مزید بڑھتی لیکن اماں نے دخل دیا۔

''اب چھوڑ بھی دیں۔'' اماں نے ابا کو کہا۔

''ایک یہ ہے جس سے میں جو کچھ بھی کہوں یہ اس کا الٹ کرتا ہے اور ایک وہ میرا بیٹا ہے جو میرا اس طرح کا فرمانبردار ہے جو میرے ہر حکم پر اس طرح عمل کرتا ہے جیسے وہ اس کے لیے زندگی کا مقصد ہو۔'' پھر سانس لے کر بولے۔ ''میں نے اس سے کہا تھا کہ اسے ڈاکٹر بننا ہے بلکہ میں تو یہاں تک کہہ چکا تھا کہ اگر اس کے نمبر کم بھی ہوئے تو میں اسے پرائیویٹ میڈیکل کالج میں داخلہ کروادوں گا لیکن یہ اتنے نمبر بھی نہیں لاسکا کہ پرائیویٹ میڈیکل کالج میں داخلہ ہوجائے۔ اب دیکھتا ہوں کہ کرکٹ سے یہ کتنا کمالے گا۔'' ابا نے یہ کہا اور کمرے سے چلے گئے۔ اماں نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور میں نے ان کی ہدایت پر عمل کیا۔

ایک بار بھانڈا پھوٹ گیا تو میں نے اور زیادہ لگن سے کرکٹ کھیلنا شروع کردی۔ اب مین آف دی میچ کا اعزاز میرے لیے کوئی نئی بات نہیں رہی تھی مگر جب پہلی بار ثانیہ میرا میچ دیکھنے آئی اس روز مجھے یہ احساس ہوا کہ میری بھی کوئی اہمیت ہے۔ ثانیہ اکیلی نہیں آئی تھی اس کی بہن تانیہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ ثانیہ اپنے ساتھ آملیٹ اور پراٹھے بھی لائی تھی۔ وہ سیمی فائنل تھا۔ ہمارے سامنے جو ٹیم تھی وہ ایک سال پہلے ہونے والے ٹورنامنٹ کی فاتح تھی اور اب اپنے اعزاز کا دفاع کررہی تھی۔ ان کے پاس بڑے ناموں کی ایک لسٹ تھی۔ چھ بیٹسمین تو وہ تھے جو ٹیسٹ اور ون ڈے میں قومی ٹیم کی نمائندگی کرچکے تھے۔ ہماری ٹیم میں ان کے مقابل کا کوئی کھلاڑی نہیں تھا اور تمام ماہرین کو ہمارے ہارنے کا یقین تھا اور اسی اعتماد کے تحت ان کے کپتان نے ٹاس جیت کر بیٹنگ کرنے کا فیصلہ کیا لیکن کپتان کا فیصلہ ان کے سر سے گزر گیا۔ میرے پہلے اوور میں ان کی تین وکٹیں گر گئیں اور وہ ماہرین جو اب تک ہماری شکست کا یقین کیے بیٹھے تھے صفر پر تین وکٹیں گرنے کے بعد اپنا خیال تبدیل کرنے لگے تھے۔ پھر یہ ہوا کہ لنچ سے پہلے چیمپئن اپنی تمام وکٹیں اسّی رنز پر گنوا چکے تھے۔ ہماری جیت اب واضح ہوچکی تھی اسّی رنز کا ٹارگٹ ہم بہ آسانی پورا کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ میرے حصہ میں چھ وکٹیں آئی تھیں۔ لنچ کے وقفہ میں پویلین میں آئے تو تانیہ اور ثانیہ انتظار میں تھیں۔ ثانیہ نے لنچ پر بتایا کہ اس نے پراٹھے اپنے ہاتھوں سے میرے لیے بنائے تھے۔ ثانیہ اصرار کرتی رہی کہ میں پراٹھے اور آملیٹ ضرور کھاؤں لیکن میں نے زیادہ کھانے سے گریز کیا تھا یہ کوچ کا مشورہ تھا اس وقت جب لنچ میں مصروف تھے کوچ ہماری جانب آگئے۔ میں نے اپنی کزنز کا تعارف ان سے کروایا اور ان دونوں کا تعارف کوچ سے کروایا۔

''تم نے یہ نہیں بتایا کہ میں تمہاری منگیتر بھی ہوں۔'' تانیہ نے کہا اور کوچ نے میری جانب حیرت سے دیکھا تھا۔

''میرا ان سے کزن کے علاوہ کوئی رشتہ نہیں ہے۔'' میں نے کوچ کی آنکھوں میں ابھرتے ہوئے سوالوں کے جواب میں کہا تھا۔ ''تانیہ البتہ میرے بڑے بھائی کی منگیتر ہیں۔'' میں نے کہا اور کوچ مسکرادیے تھے۔

''بہت لکی ہیں آپ کے بھائی۔'' کوچ نے تبصرہ کیا۔ اس چھوٹے سے تبصرے نے سیدھا میرے دماغ پر اثر کیا تھا۔ کوچ بھی اعظم کو لکی کہہ رہے تھے اور میرا احساس محرومی بڑھ گیا تھا۔ اعظم کو بیرونِ ملک گئے ہوئے تین برس ہوگئے۔ ان تین برسوں میں وہ ایک بار بھی پاکستان نہیں آیا تھا۔ چوتھا برس شروع ہوا تو گھر میں اعظم اور تانیہ کی شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ وہ دن میرے لیے عجیب سے دن تھے۔ میں یہ برداشت نہیں کرپارہا تھا کہ تانیہ اعظم کی بیوی بن جائے۔ ایک فرق ضرور آیا تھا کہ اب لوگ مجھے پہچاننے لگے تھے۔

یہ انہی دنوں کی بات ہے جب مجھے ایک اور مصروفیت مل گئی تھی۔ موسیقی سے مجھے بچپن سے لگاؤ تھا۔ میرے کوچ نے مشورہ دیا تھا کہ ''تمہاری آواز بہت اچھی ہے اگر تم تھوڑا سا ریاض کرلو تو بڑے گلوکار بن سکتے ہو۔'' میں نے ان کے مشورہ پر موسیقی کی کلاسیں لینا شروع کردیں۔ نہ جانے کس طرح یہ خبر ابا تک پہنچ گئی اور انہوں نے خصوصی ڈانٹ سے نوازا۔

''کرکٹ تو میں نے کسی نہ کسی طرح برداشت کرلی لیکن اب تم میراثی بننے کی کوشش کرکے خاندان کا نام ڈبودو گے، یہ میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔'' ابا نے دھاڑتے

ہوئے کہا تھا۔

''ابا یہ میرا شوق ہے۔'' میں نے دبے لہجے میں کہا تھا۔

''یہ کیسا شوق ہے جس میں خاندان کی بدنامی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔'' ابا کا غصہ مزید تیز ہوگیا تھا۔ ''اگر تم نے اپنے اس شوق کو جاری رکھنا ہے تو تمہیں اس گھر سے جانا ہوگا اس لیے بہتر ہوگا کہ تم ابھی فیصلہ کرلو کہ تمہیں ہمارے ساتھ رہنا ہے یا اپنے شوق کو جاری رکھنا ہے۔'' ابا نے کہا اور میں ان کے سامنے سے اٹھ آیا تھا لیکن میں نے اماں کو اپنے فیصلے سے آگاہ کردیا تھا کہ میں اب موسیقی کی کلاس نہیں لوں گا اور اماں نے میرے فیصلے سے ابا کو آگاہ کردیا لیکن میرے فیصلے پر ثانیہ نے ناراضگی کا اظہار کیا تھا۔

میری کرکٹ میں کامیابیوں پر ثانیہ بہت خوش ہوتی تھی۔ میں باقاعدگی سے پھوپو کے گھر جانے لگا تھا جہاں ثانیہ کی مجھ سے قریب ہونے کی پوری کوشش ہوتی تھی لیکن میری توجہ کا مرکز ثانیہ ہی رہتی تھی۔

جس روز واپڈا نے مجھے جاب آفر کی اور میں نے اسے قبول بھی کرلیا اس روز ثانیہ نے دریافت کیا۔ ''اب تو تم برسر روزگار بھی ہوگئے ہو کیا خیال ہے میں امی اور مامی سے بات کروں کہ وہ تمہارے لیے لڑکی دیکھنا شروع کردیں۔''

''میں نے اپنے لیے لڑکی پسند کرلی ہے۔'' میں نے آہستہ لہجہ میں کہا تھا۔

''کون ہے وہ ہمیں بھی تو پتا چلے کہ وہ خوش نصیب ہے کون؟'' ثانیہ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''میرا وعدہ ہے کہ سب سے پہلے تمہیں ہی بتاؤں گا۔'' میں نے کہا۔

''کب بتاؤ گے؟'' ثانیہ کے لہجہ میں شوخی تھی۔ ''چلو بتانا بعد میں اس کی تصویر ہی دکھادو۔'' ثانیہ کا لہجہ مزید شوخ ہوتا چلا گیا تھا۔

''اپنے کمرے میں جاؤ اور جس آئینہ کو دیکھ کر تم اپنے بال سنوارتی ہو اس میں دیکھ لینا اس کی تصویر۔'' میں نے یہ کہا اور ڈرائنگ روم سے اٹھ کر باہر لاؤنج میں آگیا جہاں کچھ ہی دیر بعد ثانیہ بھی آگئی وہ غصہ میں لال ہورہی تھی۔

''میں نہیں سمجھتی تھی کہ تم اتنے گھٹیا بھی ہوسکتے ہو۔'' اس کے لہجہ میں غصہ تھا۔

''ایسا کیا ہوگیا کہ تم مجھے اس لقب سے مخاطب کررہی ہو۔'' میں نے اپنا دفاع کرنا چاہا۔

''یہ جاننے کے باوجود کہ میں تمہارے بھائی کی منگیتر ہوں تم میرے لیے اس طرح کا جذبہ رکھتے ہو تو اس پر میں تمہیں گھٹیا نہ کہوں تو اور کیا کہوں۔'' ثانیہ نے کہا۔

''اس جذبہ پر میرا کوئی کنٹرول نہیں ہے ویسے بھی کسی سے محبت کرنا کوئی غیر شرعی کام نہیں ہے۔'' میں نے کہا اور ثانیہ مزید بھڑک گئی۔

''اپنے بڑے بھائی کی منگیتر کے لیے یہ جذبہ غیر شرعی نہ سہی غیر اخلاقی ضرور ہے۔'' ثانیہ نے غصہ سے کانپتے لہجہ میں کہا تھا۔

''تم اسے اپنا منگیتر کہہ رہی ہو جس نے چار برس میں تمہیں فون تو کیا ایک خط بھی نہیں لکھا۔'' میں نے کہا اور ثانیہ مجھے گھورنے لگی تھی۔

''یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے وہ مجھے فون کرتا ہے یا نہیں اس نے مجھے خط لکھا یا نہیں تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' ثانیہ نے کہا۔

''لیکن میں تم سے محبت کرتا ہوں۔'' میں نے کسی قدر کپکپاتے لہجہ میں کہا تھا۔

''مجھے بہت پہلے اس کا اندازہ ہوگیا تھا لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ تمہاری محبت کا جواب میں بھی محبت سے دوں اور اپنی بہن کی نظروں میں ہمیشہ کے لیے رسوا ہوجاؤں۔ وہ بہن جو سوتے جاگتے تمہارے نام کی مالا جپتی ہے۔'' ثانیہ کی آواز تیز تر ہوتی چلی گئی تھی۔

''میں نے ثانیہ کو ایسی نظر سے نہیں دیکھا۔'' میں نے کہا۔ ''ایک بات تم پر واضح کردوں کہ میں ہر صورت میں تمہیں اپنی بیوی بناؤں گا چاہے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔'' یہ فقرہ میں نے اس وقت کہا تھا جب ثانیہ لاؤنج سے باہر جارہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے میرا فقرہ سن لیا تھا۔

میں نے کہنے کو کہہ تو دیا تھا لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کس طرح اپنا مقصد حاصل کرپاؤں گا۔

اس واقعہ کو پندرہ دن بھی نہیں گزرے تھے کہ اعظم کا فون آگیا کہ وہ اگلے ہفتے پاکستان آرہا ہے اور اس کے ساتھ ہی شادی کی تیاریوں میں تیزی آگئی تھی۔ وہ تیاریاں جو بہت آہستہ آہستہ رفتار سے آگے بڑھ رہی تھیں اب ان میں کئی گنا تیزی آگئی تھی۔ میں وہ سب تیاریاں دیکھ رہا تھا اور مجھے یوں محسوس ہورہا تھا کہ یہ تیاریاں میری ثانیہ کو مجھ سے ہمیشہ کے لیے چھیننے کی کوشش ہیں۔ میں صرف دیکھ رہا تھا لیکن انہیں روکنے کی سکت مجھ میں نہیں تھی۔

''کچھ تو کرنا ہوگا۔'' میرے ذہن نے سرگوشی کی تھی۔

اعظم کو میں ہمیشہ کے لیے جیتا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا ادھر شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں ادھر میں نے اپنی منصوبہ بندی شروع کر دی تھی۔ شادی روکنے کے لیے ایک ہی حل میری سمجھ میں آیا تھا میں جانتا تھا کہ کسی بڑے حادثہ سے ہی شادی ملتوی ہو سکتی ہے۔ میں ہر روز ابا اور اماں کو روز صبح گھر سے جاتے دیکھتا تھا اور پھر رات میں لدے پھدے ان کی واپسی ہوتی تھی۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ ابا بہت تیز ڈرائیو کرتے تھے۔ اپنی منصوبہ بندی کے تحت میں نے اگلے وہیل کے چاروں اسکرو ڈھیلے کر دیے تھے۔ یہ کام میں نے رات گئے اس وقت کیا تھا جب گاڑی گیراج میں کھڑی ہوئی تھی۔ اگلی صبح ابا اور اماں ایک بار پھر نکل گئے اس بار انہوں نے ڈرائیور کو ساتھ لے جانا مناسب سمجھا تھا۔ وہ تینوں گئے تو اپنی کار میں تھے لیکن ان کی واپسی ایمبولینس میں ہوئی تھی۔ پولیس نے حادثہ کی وجہ یہ بتائی تھی کہ اگلا وہیل کار سے الگ ہو گیا اور کار جو ڈرائیور چلا رہا تھا اس سے کار کنٹرول نہیں ہوئی اور ایک ٹینکر کے نیچے جا گھسی تھی۔

گھر میں ماتم برپا تھا۔ تین لاشیں گھر میں رکھی تھیں اور ہر آنکھ میں آنسو تھے۔ اعظم کو اس حادثہ کی خبر دینے کی ذمہ داری میرے سپرد کی گئی تھی۔ میں نے فون پر اسے روتے ہوئے اطلاع دی تو اس نے کہا۔ ”میں تو آج روانہ ہو رہا ہوں۔“ اس نے رندھے ہوئے لہجہ میں کہا تھا۔

اعظم کو ائرپورٹ پر میں نے ریسیو کیا تھا۔

”اب شادی کم از کم سال بھر کے لیے ملتوی ہو جائے گی۔“ اعظم نے کہا اور میں اسے حیرت سے دیکھنے لگا تھا کہ کیسا شخص ہے اتنا بڑا حادثہ ہو گیا اور اسے شادی کی پڑی ہے۔ میں نے اس سے کہا کچھ نہیں لیکن دل میں سوچا تھا۔

”پولیس نے تحقیقات کیں لیکن تحقیقات اس سے آگے نہیں بڑھیں کہ اگلے وہیل کے نٹ کسی نے ڈھیلے کر دیے تھے۔ ثانیہ کے خالو جو ڈی ایس پی تھے اس تحقیقات کے نگراں تھے۔

میں اس وقت بری طرح چونکا تھا جب ثانیہ نے مجھ سے سوال کیا کہ ”یہ سب تمہاری حرکت تھی نا۔“ لیکن میں اسے صرف گھور کر رہ گیا تھا۔

”تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ اپنے والدین کو میں نے قتل کیا ہے۔“ میں نے تلخ لہجہ میں جواب دیا تھا اور ثانیہ کچھ دیر خاموش رہی تھی۔

”میں نے یہ سوال اس لیے کیا تھا کہ خالو نے کل رات کہا تھا کہ یہ کسی گھر والے کی حرکت ہے۔“ ثانیہ نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا تھا۔ ”پھر مجھے تمہارا وہ فقرہ بھی یاد ہے کہ جو تم نے کہا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے تم مجھے اپنی بیوی بناؤ گے۔“ ثانیہ نے اپنی بات مکمل کی اور میں اسے گھور کر رہ گیا تھا۔

اگر اس نے میری بات اپنے خالو کو بتا دی تو میرا بچنا بہت مشکل ہو جائے گا۔

اعظم جہلم تک رکا اور جہلم کے اگلے روز واپس لندن چلا گیا۔ اس دوران اعظم ہمارے ساتھ رہ رہا تھا۔ میں نے اس کے موبائل کی اچھی طرح تلاشی لی تھی۔ اس کے کانٹیک لسٹ میں ایک نام ماریا بھی تھا جو مجھے بہت زیادہ مشکوک لگا تھا کیونکہ جتنے میسج ماریا نے اسے کیے تھے وہ اعظم ڈارلنگ اور اعظم مائی لو سے شروع ہوتے تھے۔ ایک بار میں نے سوچا کہ اعظم کے موبائل سے ماریا کو فون کر کے حقیقت جان لوں لیکن پھر میں نے وہ ارادہ ملتوی کر دیا کیونکہ ماریا اس کا ذکر اعظم سے ضرور کرتی کہ تمہارے فون سے مجھے معظم نامی شخص نے فون کیا تھا لیکن یہ بات میں نے ثانیہ کو ضرور بتا دی کہ لندن میں اعظم کی ایک گرل فرینڈ ہے جس کا نام ماریا ہے۔ میں نے اسے ماریا کا نمبر بھی دے دیا اور ثانیہ نے ان نمبروں پر ڈائل بھی کیا۔ دوسری جانب سے جو کہا گیا وہ ثانیہ کے لیے بھی حیران کن تھا۔ ثانیہ نے پوچھا تھا کہ ”کیا میں اعظم صاحب سے بات کر سکتی ہوں تو اس جانب سے کہا گیا آپ کو جو کچھ اعظم سے کہنا ہے آپ مجھ سے بھی کہہ سکتی ہیں۔“ اور ثانیہ کا اگلا سوال تھا۔ ”آپ کا تعارف تو ماریا نے جواب دیا میں مسز اعظم ہوں، اعظم تو پاکستان گئے ہوئے ہیں۔“ ماریا نے جواب میں کہا تھا۔ ثانیہ نے فون بند کر دیا اور میرے پاس آئی تھی۔

”تم نے تو کہا تھا ماریا اس کی گرل فرینڈ ہے لیکن وہ تو اعظم کی بیوی ہے۔“ ثانیہ نے کہا تھا۔

”اب تم کیا کہتی ہو؟“ میں نے سوال کیا اور ماریا مسکرا دی تھی۔

”شادی تو میں اعظم سے ہی کروں گی۔“ ثانیہ کا جواب تھا اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

”یہ حقیقت جاننے کے باوجود کہ اس کی ایک بیوی پہلے سے موجود ہے۔“ میں نے کہا تو وہ ہنس دی تھی۔ اس ہنسی کے جواب میں کہنا پڑا۔ ”تم مجھے یہ بتا دو کہ آخر میں کیا کروں کہ تمہیں میری محبت کا یقین آ جائے۔“

”تم یہ چاہتے ہو کہ جو کچھ اعظم نے کیا میں بھی وہی

دہراؤں۔" ثانیہ نے کہا اور میں ہنس دیا تھا۔
"اگر تم نے خود بربادی کا راستہ چنا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا تو ثانیہ نے ایک قہقہہ لگایا۔
"مجھے وہی کچھ ملنا ہے جو میری قسمت میں ہے۔" ثانیہ کا جواب تھا۔
کوئی اور شخص ہوتا تو اس کے بعد دل چھوڑ دیتا لیکن مجھ پر اس کا الٹا اثر ہوا تھا۔ میں نے ثانیہ کے اس جواب کے بعد اپنا ارادہ اور مضبوط کر لیا تھا۔
چہلم کے بعد وکیل نے مجھے بلوایا اور مجھے بتایا کہ اعظم نے تحریری طور پر اپنا حصہ لینے سے انکار کر دیا ہے یعنی اب وہ پوری جائیداد میری تھی۔
میں نے اس کے بعد ایک بار پھر ثانیہ سے بات کرنے کا فیصلہ کیا لیکن ثانیہ اب بھی اپنی بات پر ڈٹی ہوئی تھی۔
"یہ بڑوں کا فیصلہ ہے کہ میری بہن تمہاری بیوی بنے گی۔" ثانیہ نے کہا۔
"میں اس احمقانہ فیصلہ کو نہیں مانوں گا۔" میں نے کہا۔
"اگر نہیں مانو گے تو کیا کرو گے؟" ثانیہ کا انداز چیلنج کرنے والا تھا۔
"یہ تو تمہیں وقت آنے پر پتا چلے گا۔" میں نے کہا اور ثانیہ ہنسنے لگی تھی۔
"اس وقت بتانے میں حرج ہے۔" ثانیہ نے سوال کیا۔
"حرج نہ ہوتا تو بتا دیتا۔" میں نے جواب دیا جو کچھ میں نے سوچ رکھا تھا وہ ایسا نہیں تھا کہ میں اسے بتا دیتا۔
دن گزرتے رہے میں واپڈا کی جانب سے کھیل رہا تھا۔ اخبارات میں میری تصویریں چھپ رہی تھیں اور اس کے ساتھ ہی میرے کارنامے بھی اخبارات کی زینت بن رہے تھے مگر ثانیہ کسی چیز سے متاثر نہیں ہو رہی تھی۔
میں اس وقت واپڈا کے لیے میچ کھیل رہا تھا جب اعظم کا فون آیا جس میں اس نے دو روز بعد اپنی آمد کی اطلاع دی تھی۔
"کیا تم نے ماریا کو چھوڑ دیا؟" میں نے سوال کیا۔
"میں نے نہیں اس نے مجھے چھوڑ دیا اور جاتے ہوئے وہ میری بچی کو ساتھ لے گئی بلکہ میرے اکاؤنٹ کا بھی صفایا کر گئی۔" اعظم نے کہا تھا۔
میں نے ثانیہ کو یہ اطلاع دی کہ ماریا اعظم کو صرف چھوڑ ہی نہیں گئی بلکہ ساتھ ہی اسے قلاش بھی کر گئی لیکن اس نے کوئی ردِعمل نہیں دیا یہاں تک کہ جب میں نے پوچھا کہ "اب تم کیا کرو گی۔" تو اس کا جواب تھا۔
"وہی کروں گی جو پہلے کہہ چکی ہوں۔" ثانیہ کا جواب تھا۔
"میں اپنے شہر پہنچا تو گھر جانے کی بجائے ہوٹل میں قیام کیا۔ اگلے روز اعظم نے آنا تھا۔ میں نے ہوٹل سے ثانیہ کو فون کیا اور اسے اپنا کمرا نمبر بتایا۔ توقع کے عین مطابق ثانیہ آدھے گھنٹے کے اندر میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اپنا تمام کام مکمل کر چکا تھا۔ ثانیہ آئی تو میں نے کولڈ ڈرنک کا آرڈر دیا اور کمرے سے باہر جا کر میں نے ویٹر سے کولڈ ڈرنک لی اور اس میں نیند کی گولیاں شامل کر کے ثانیہ کو پیش کی۔ چار نیند کی گولیوں نے فوری اثر دکھایا اور ثانیہ وہیں بستر پر دراز ہو گئی۔ اب میرا کام شروع ہو گیا تھا۔ تین گھنٹوں بعد ثانیہ ہوش میں آئی تو جو پہلا فقرہ اس نے اپنی حالت پر غور کرنے کے بعد کہا تھا وہ یہ تھا کہ "تم نے میرا جسم تو حاصل کر لیا لیکن اس کی سزا جانتے ہو۔" اس نے کہا اور میں نے قہقہہ لگایا۔
"تم مجھ سے یہ کہہ رہی ہو کہ پولیس میں جا کر میرے خلاف رپٹ کرواؤ گی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا
"تم یہ بھول رہے ہو کہ میرے خالو ڈی ایس پی ہیں۔" ثانیہ نے کہا۔
پھر وہ ہوا جس کی میں نے توقع بھی نہیں کی تھی ثانیہ نے اپنے موبائل سے اپنے خالو کو فون کیا اور خالو نے کہا تم اپنے گھر پہنچو میں وہیں آ رہا ہوں۔
میں اور ثانیہ جب ثانیہ کے گھر پہنچے تو ڈی ایس پی صاحب ہمارے منتظر تھے۔
"یہ تم نے بہت برا کیا۔" انہوں نے مجھے مخاطب کیا تھا۔
ثانیہ کی والدہ مجھے مارنے کے لیے اٹھیں لیکن ڈی ایس پی صاحب نے انہیں روک دیا۔ "جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے اب بہتر یہی ہے کہ معاملہ کو خوش اسلوبی سے انجام تک پہنچائیں۔" ڈی ایس پی صاحب نے مشورہ دیا تھا۔
"تو کیا اس کمینے کو سزا نہیں ملنی چاہیے۔" ثانیہ نے کہا اور میں مسکراتا رہا۔
ایک گھنٹے میں ثانیہ میری دلہن بنا دی گئی اور اس کے فوراً بعد رخصتی بھی ہو گئی۔
میں حجلۂ عروسی میں پہنچا تو ثانیہ وہاں موجود تھی۔
"بزرگوں نے تمہیں قانون کی سزا سے تو بچا لیا لیکن جو

سزا میں نے تجویز کی ہے وہ تمہارے لیے اتنی اذیت ناک ہوگی کہ تم موت کی دعا مانگو گے لیکن تمہیں موت نہیں آئے گی۔

میں نے اس کا فقرہ سنا اور اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہا لیکن اس نے میرے چہرہ پر تھوک دیا۔

اگلے روز میں اور ثانیہ اعظم کو لینے ائرپورٹ پہنچے۔ ثانیہ نے بطور خاص دلہن کا لباس پہنا ہوا تھا۔ اس نے اعظم سے اپنا تعارف بھی میری مسز کے طور پر کروایا تھا۔ اعظم نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

''گھر پہنچ کر تفصیل سے بتادوں گا۔'' میں نے کہا۔

''میرے پاس بھی کہنے کے لیے بہت کچھ ہے۔'' اعظم کا جواب تھا۔

پھر ہم دونوں بھائی لاؤنج میں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

''پہلے تم اپنی سناؤ۔'' میں نے اعظم کو مخاطب کیا۔

''تم یہ نہیں پوچھو گے کہ میں نے جایداد میں اپنا حصہ کیوں چھوڑ دیا تھا۔'' اعظم نے سوال کیا۔

''میں کچھ کچھ جانتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

اس دوران جب میں بیرسٹر بن رہا تھا میری ملاقات ماریا سے ہوئی۔ بظاہر وہ ایک خوبصورت ائرہوسٹس تھی لیکن اس کی اصلیت یہ تھی کہ وہ انٹرنیشنل ڈرگ مافیا کی نمائندہ تھی میں نے اس سے شادی بھی کرلی تھی اور آہستہ آہستہ اس کے رنگ میں ڈھل گیا اسی کی منشا پر میں نے جوائنٹ اکاؤنٹ کھلوایا جس میں کوئی بھی دستخط کرکے جتنی چاہے رقم نکلوا سکتا تھا۔

''یعنی تم مکمل بیوقوف بن گئے؟'' میں نے سوال کیا۔

''ماریا کی مرضی پر میں نے لانچیں خریدیں اور ایشیائی لوگوں کو مختلف ملکوں میں بھیجنا شروع کردیا۔'' اعظم نے کہا۔

''میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ تم نے انسانوں کی اسمگلنگ کا غیرقانونی کام کیوں شروع کیا۔'' میں نے کہا۔

''ماریا کے کہنے پر میں نے لانچوں میں ڈیک کے نیچے محفوظ تہہ خانے بنوائے تھے جس میں انسانوں کی اسمگلنگ ہوتی تھی اس سے اتنی زیادہ آمدنی ہوتی تھی کہ اس کے بعد مجھے چند ہزار پاؤنڈز کی میرے نزدیک کوئی حیثیت نہیں تھی اس لیے میں نے والدین کی جایداد تمہارے نام کروادی تھی۔'' اعظم نے کہا۔ ''اس کے علاوہ مجھے اس بات کا بھی احساس تھا کہ بچپن سے تمہارے ساتھ زیادتی ہوتی رہی تھی۔''

''یہ سب کچھ کرتے ہوئے تمہیں ثانیہ کا خیال نہیں آیا۔'' میں نے سوال کیا۔

''مجھے خیال تو آتا تھا لیکن ماریا نے مجھے اس طرح جکڑا ہوا تھا کہ میں اس پر زیادہ غور نہیں کر سکتا تھا۔ بچی کی پیدائش سے میری مجبوریاں مزید بڑھ گئی تھیں۔'' اعظم نے اپنی بات مکمل کی اور آخر میں کہا۔ ''ثانیہ نے بھی تو میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔'' اعظم نے کہا۔

''ثانیہ نے مجبوری میں مجھ سے شادی کی ہے ورنہ وہ آخر وقت تک تمہارے انتظار میں تھی مگر تم تو اپنی دنیا میں محو تھے۔'' میں نے ثانیہ کا دفاع کیا تھا۔

ہماری شادی کے نو ماہ بعد ہمارے گھر میں اقرا آئی تھی لیکن ثانیہ کے رویئے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی بلکہ پہلے سے زیادہ سخت ہوگیا تھا۔ میں اقرا کو گود میں لینا چاہتا تو ثانیہ کہتی۔ ''یہ تمہارے گناہ اور ظلم کی نشانی ہے۔'' ثانیہ نے جو کہا تھا وہ اس نے ثابت کردیا تھا۔

دس سال ہوگئے ہیں۔ میں ثانیہ کے قرب کے لیے تڑپ رہا ہوں لیکن اس کے دل میں رحم نہیں آتا۔ ایک بار تو اس نے یہ تک کہہ دیا کہ یوں گڑگڑا کیوں رہے ہو، پہلی بار کی طرح مجھے بے ہوش کرکے اپنی تسکین کیوں نہیں کرلیتے اور میں نے شرمندگی سے گردن جھکالی تھی۔ اعظم کو ہماری شادی کی اندرونی کہانی کبھی نہیں معلوم ہوئی نہ میں نے اسے بتایا نہ ثانیہ نے اس سے کچھ کہا۔ پھر جب وہ امریکا امیگریشن پر جانے لگا تو ثانیہ نے اس سے کہا۔ ''اس بار دیکھ بھال کر شادی کرنا کسی امریکن ماریا کے جال میں نہ پھنس جانا۔''

اعظم نے سوال کیا۔ ''تم خوش تو ہو نا؟''

ثانیہ نے قہقہہ لگایا۔ ''اتنی خوش ہوں کہ دنیا میں شاید ہی کوئی عورت اتنی خوش ہوگی۔''

ثانیہ نے اعظم کو رخصت کردیا معلوم نہیں کہ اعظم نے اس کی بات کا کتنا یقین کیا اور کتنا نہیں کیا کیونکہ بظاہر ثانیہ کا رویّہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا کہ بیوی کا ہونا چاہیے خاص طور پر مہمانوں کے سامنے تو اس کا رویّہ اس طرح کا ہوتا ہے جیسے وہ مجھ سے بہت زیادہ محبت کرتی ہو لیکن اس کا رویّہ بیڈروم میں نفرت انگیز ہوجاتا ہے۔

واپڈا سے میں نے ریٹائرمنٹ لے لی ہے اور کرکٹ بھی چھوڑ دی ہے بلکہ میں نے اپنی کمپنی کی ایک ٹیم بنائی ہے جس کا میں کوچ بھی ہوں۔ واپڈا سے پنشن ملتی ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ رقم میرے اکاؤنٹ میں ہے اور یہ سب وائٹ منی ہے۔

++

میں جس آفس میں جاب کرتا تھا وہ میرے گھر سے بہت دور تھا۔ میرے پاس سواری نہیں تھی اس لیے کبھی بس پر تو کبھی رکشے پر جانا پڑتا تھا۔ بس سست رو سواری ہے اس لیے میں اکثر آفس سے لیٹ ہوجاتا تھا اور باس کی ڈانٹ کھانی پڑتی تھی۔ یہاں تک کہ ایک دن باس نے دھمکی بھی دے دی کہ اگر آئندہ وقت پر نہ آئے تو تمہاری سیلری بھی کٹ جائے گی، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نوکری سے بھی ہاتھ دھونا پڑ جائے۔

میں نوکری سے ہاتھ نہیں دھونا چاہتا تھا آج کل جس طرح کے حالات چل رہے تھے ان میں سرکاری نوکری تو ایک طرف پرائیویٹ نوکری ملنا بھی بہت مشکل تھا۔ میں نے بے شمار ایسے نوجوان دیکھے تھے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور ہاتھوں میں ڈگریاں لیے دفتروں کے دھکے کھانے پر مجبور تھے لیکن نوکریاں نہیں مل رہی تھیں۔ میرے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ میں نئی موٹر سائیکل خرید لیتا، چنانچہ میں نے یہ حل نکالا کہ ایک رکشا لگوا لیا تھا۔

چند دن تو رکشا والا وقت پر مجھے لینے آتا اور وقت پر آفس چھوڑ دیتا لیکن بعد میں وہ دیر سے آنے لگا۔ میں رکشے والے سے وجہ پوچھتا تو وہ مختلف بہانے بنا دیتا کہ گیس ختم ہوگئی تھی، ٹائر پنکچر ہوگیا تھا وغیرہ وغیرہ۔ آخر کار تنگ آ کر میں نے اس کا حساب برابر کیا اور اسے مکمل چھٹی دے دی۔ پھر میں نے ٹیکسی پر جانا شروع کر دیا۔

اتفاق کی ہی بات تھی کہ جب میں آفس جانے کے لیے

پچھتاوا

محترم مدیر

السلام علیکم!

آج شوکت اس دنیا میں نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ جو کچھ ہوا یہ سبق حاصل کرنے کو کافی ہے۔ انسان کو کبھی جذباتی نہیں ہونا چاہیے ورنہ حشر یہی ہوتا ہے جو فرحان کا ہوا۔

مسز سمیعہ خالد

(ملتان)
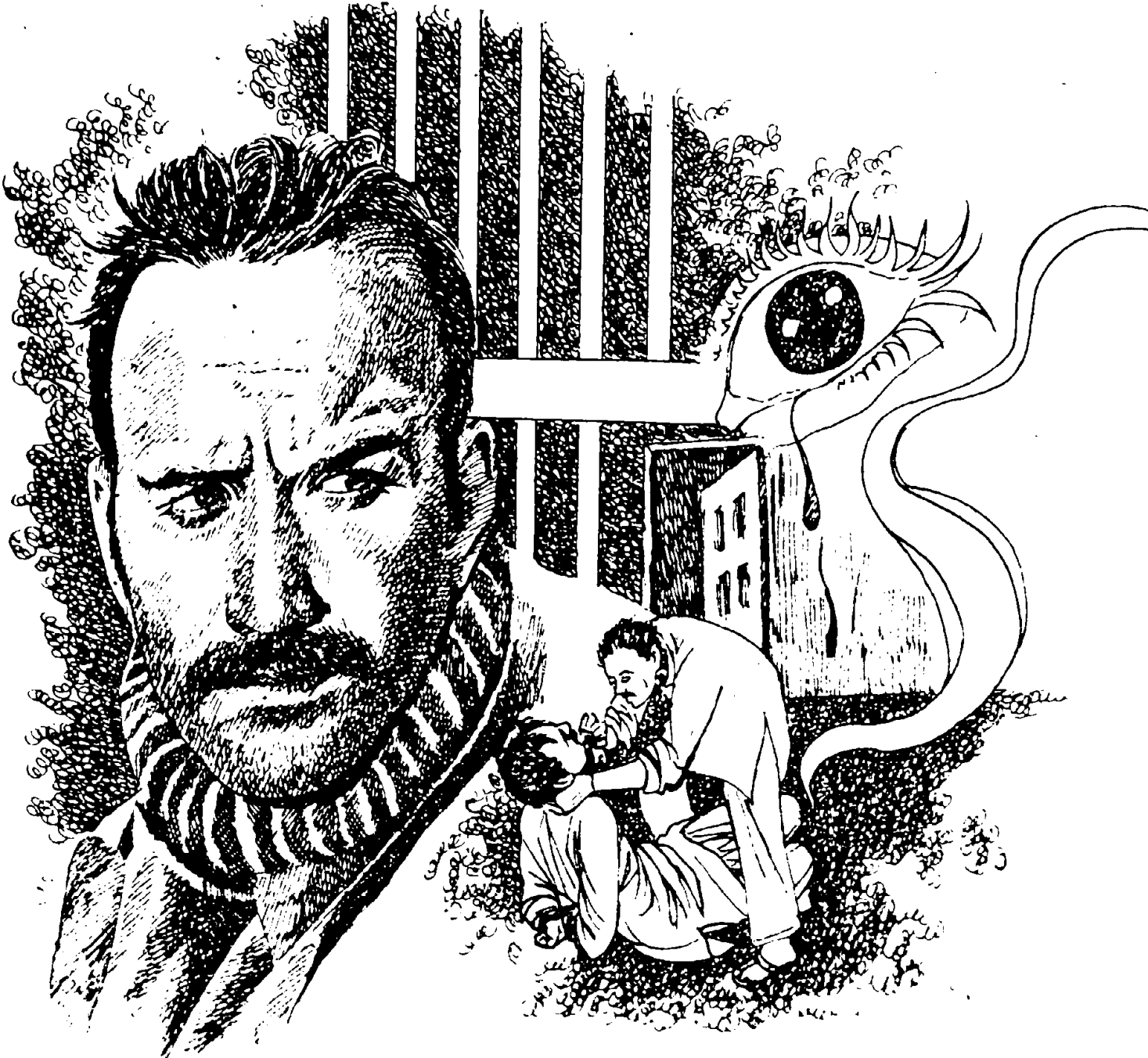
گھر سے نکل کر سڑک پر پہنچا تو مجھے وہی ٹیکسی والا مل جاتا جس میں، میں نے پہلی بار سفر کیا تھا۔ اس سے میری اچھی خاصی سلام دعا ہوگئی تھی۔

اس کا نام شوکت تھا۔ وہ نوجوان اور میرا ہم عمر تھا۔ باتونی بھی بہت تھا لیکن میں نے کبھی اس کے بولنے پر برا نہیں مانا تھا۔ باتیں کرنے سے وقت بھی کٹ جاتا تھا۔

اس روز اتوار تھا یعنی آفس سے چھٹی تھی۔ میری بیوی تنزیلہ ضد کر رہی تھی کہ میں اسے پارک میں گھمانے پھرانے لے چلوں۔ ہم رکشے پر جاتے تو اچھا خاصہ کرایہ لگ جاتا تھا اس لیے میرے دل میں خیال آیا کہ میں شوکت کو بلا لیتا ہوں وہی ہمیں پارک چھوڑ آئے گا اور لینے بھی آجائے گا چنانچہ میں نے اسے فون کیا۔

دوسری ہی بیل پر اس نے کال ریسیو کرلی۔ ''السلام علیکم فرحان بھائی۔''

''وعلیکم السلام۔'' جواباً میں نے بھی اس پر سلامتی بھیجی۔

''کہاں ہو یار۔''

''میں نہر والے پل پر ہوں۔'' شوکت نے بتایا۔

''خیریت تو ہے بھائی۔''

''یار! تمہاری بھابی پارک جانے کی ضد کر رہی ہے۔'' میں نے وجہ بتائی۔ ''تم تو جانتے ہو کہ رکشے والے بہت زیادہ کرایہ مانگ لیتے ہیں۔ اگر تم فری ہو تو آجاؤ اور ہمیں پارک میں چھوڑ دو۔ میں تمہیں کرایہ دوں گا۔''

''ٹھیک ہے فرحان بھائی، میں بیس منٹ میں آرہا ہوں۔'' شوکت نے کہا تو میں نے شکریہ کہہ کر کال کاٹ دی۔ میں نے تنزیلہ کو بتایا تو وہ خوش ہوگئی اور تیار ہونے چلی گئی۔

بیس منٹ کے بعد شوکت آگیا اور ہم میاں بیوی اس کے ساتھ پارک کی طرف روانہ ہوگئے۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر تنزیلہ بے حد خوش تھی۔ جب ہم پارک میں پہنچے تو شوکت نے کہا۔ ''فرحان بھائی! میں یہیں انتظار کرتا ہوں۔ تم لوگ سیر سپاٹے کرکے آجاؤ۔''

''دیر نہیں ہوجائے گی؟'' میں نے استفسار کیا۔

''نہیں بھائی۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں نے بھی اب گھر ہی جانا ہے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد ہم پارک سے باہر آگئے۔ شوکت منتظر تھا اس نے ہمیں گھر چھوڑ دیا تھا۔ جب میں نے اسے آنے اور جانے کا کرایہ دیا تو اس نے لینے سے انکار کر دیا، کہنے لگا۔ ''بھابی آج پہلی بار میری ٹیکسی میں بیٹھی ہے اس لیے میں آج کرایہ نہیں لوں گا۔''

شوکت کے جانے کے بعد ہم اسی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ مجھے فخر تھا کہ مجھے ایک اچھا دوست مل گیا ہے۔ اچھے دوست بھی خوش قسمت والوں کو ملتے ہیں۔

تنزیلہ سے میری شادی دو سال پہلے ہوئی تھی لیکن ہم ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ تنزیلہ میرے ابو کے دور کے رشتے دار کی بیٹی تھی۔ اس سے میری شادی میرے والدین کی مرضی سے ہوئی تھی۔

تنزیلہ میٹرک پاس تھی۔ ہم گاؤں میں ہی رہتے تھے۔ جب میری جاب لگی تو میں گاؤں سے شہر میں شفٹ ہوگیا تھا۔ شادی کے بعد میں تنزیلہ کو بھی شہر لے آیا تھا۔ میں دن کو نوکری پر ہوتا تھا اور تنزیلہ گھر پر ہوتی تھی۔

ہم نے اب کہیں بھی جانا ہوتا تھا تو میں شوکت کو فون کر دیتا تھا۔ وہ آکر ہمیں نہ صرف لے جاتا بلکہ گھر بھی چھوڑ جاتا تھا اور کرایہ بھی مناسب ہی لیتا تھا۔ میری اس سے دوستی گہری ہوتی جارہی تھی۔

شوکت غیر شادی شدہ تھا۔ اس کا باپ تو نہیں تھا صرف بوڑھی ماں تھی جس کے ساتھ وہ رہتا تھا۔ اس کی ٹیکسی اپنی تھی اور وہ روزانہ اچھا خاصہ کما لیتا تھا۔ میں نے ایک بار اس سے شادی کے بارے میں پوچھا تو اس نے ہنس کر کہا کہ ابھی تو میری عمر کھیلنے کھانے کی ہے، شادی کے لیے ساری زندگی پڑی ہے جب کرنی ہوگی کرلوں گا۔

ایک بار میں نے تنزیلہ کے کہنے پر اس کی دعوت کی۔ پہلے تو وہ ہچکچایا پھر وہ ہمارے گھر آگیا۔ ہم تینوں نے مل کر کھانا کھایا تھا، خوب باتیں کیں، چائے بھی پی پھر جب وہ جانے لگا تو اس نے تنزیلہ کے پکائے کھانوں کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ ''بھابی! یقین کریں، میں نے آج سے پہلے کبھی اتنا مزے دار کھانا نہیں کھایا، قسم سے کھانا کھا کر بہت مزہ آیا ہے، آپ کے ہاتھوں میں ذائقہ ہے۔ یہ لیں میری طرف سے انعام۔'' اتنا کہنے کے بعد اس نے ایک ہزار کا نوٹ نکال کر تنزیلہ کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

تنزیلہ ہچکچائی تو میں نے کہا۔ ''یار، اس کی کیا ضرورت ہے؟ تکلف مت کرو۔''

شوکت نے مجھے ٹوک دیا اور کہا۔ ''یار، میں آپ کو نہیں اپنی بھابی کو انعام دے رہا ہوں اس لیے آپ نہ ہی بولیں۔''

اس کی بات سن کر میں ہنس دیا پھر میرے کہنے پر تنزیلہ

نے نوٹ رکھ لیا۔ اب تو شوکت نے ہمارے گھر بھی آنا جانا شروع کر دیا تھا لیکن وہ اس وقت آتا جب میں گھر پر ہی ہوتا۔ میری غیر موجودگی میں وہ کبھی نہیں آتا تھا۔ وہ بہت اچھا اور خود دار انسان تھا اس لیے مجھے اس پر اعتماد تھا کہ وہ میرے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچائے گا۔

ایک روز اس نے ہم میاں بیوی کی اپنے گھر دعوت کی۔ میں نے اس سے کہا کہ تمہاری بیوی تو ہے نہیں جو ہمیں کھانا پکا کر کھلائے گی۔"

شوکت ہنسا اور کہنے لگا۔ "میری ماں بہت اچھے کھانے پکاتی ہے آپ کھائیں گے تو یاد رکھیں گے۔"

ہم نے اس کی دعوت قبول کر لی اور اس کے گھر چلے گئے۔ اس کی ماں سے مل کر ہمیں خوشی ہوئی۔ واقعی ان کے ہاتھ میں ذائقہ تھا۔ انہوں نے مزے دار کھانا بنایا تھا۔

شوکت کی ماں نے ایک بار تنزیلہ سے کہا۔ "بیٹی، تم ہی شوکت کو سمجھاؤ اب شادی کر لے۔ میں بوڑھی ہو چکی ہوں۔ کب دم نکل جائے کوئی پتا نہیں لیکن یہ کسی کی نہیں سنتا۔"

تنزیلہ نے کہا۔ "فرحان نے شوکت کو بہت سمجھایا ہے۔ لیکن آپ فکر مت کریں اماں، فرحان دوبارہ اس سے بات کریں گے۔"

ایک روز میں نے پھر شوکت سے اس کی شادی کا ذکر چھیڑ دیا۔ اس نے کہا۔ "میں شادی اس لڑکی سے کروں گا جس میں بھابی جیسی خوبیاں ہوں، اگر آپ کی نظر میں ایسی کوئی لڑکی ہے تو بتائیں میں شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے، ہم اپنی پوری کوشش کرتے ہیں کہ تمہیں بہت اچھی لڑکی مل جائے۔"

شوکت راضی ہو گیا اور ہم نے لڑکی کی تلاش بھی شروع کر دی۔ میں نے میرج بیورو والے سے رابطہ کیا۔ انہوں نے کئی خوبصورت لڑکیوں کی تصویریں دکھائیں، خوبیاں بھی بتائیں لیکن شوکت کو کوئی لڑکی پسند نہیں آئی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اتنی ساری لڑکیوں کی تصویریں دیکھنے کے باوجود اسے کوئی پسند نہیں آئی تھی۔

"اگر اسی طرح چلتا رہا تو پھر تمہاری پسند کی کوئی لڑکی ملنا مشکل ہے۔" میں نے کہا۔ "میری مانو تو ان لڑکیوں میں سے کوئی پسند کر لو۔"

لیکن شوکت نے انکار کر دیا۔ وقت گزرتا رہا اور ہم اس کے لیے لڑکی کی تلاش جاری رکھے ہوئے تھے۔ ایک روز میں عشاء کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکل رہا تھا کہ مجھے مبشر صاحب نے آواز دی۔ "فرحان میاں، میری بات تو سنو۔"

میں رک کر ان کی بات سننے لگا۔ وہ ہمارے محلے میں ہی رہتے تھے۔ بزرگ تھے اور پرہیزگار انسان تھے۔

"فرحان میاں! یہ جو ٹیکسی والا لڑکا تمہارے گھر آتا ہے وہ تمہارا کیا لگتا ہے؟"

مجھے حیرت ہوئی کہ انہوں نے کیوں پوچھا ہے تاہم میں نے جواباً کہا۔ "چاچا جی، وہ میرا دوست ہے لیکن میں اسے دوست کم، سگا بھائی سمجھتا ہوں۔"

مبشر صاحب نے سر ہلانے کے بعد سنجیدہ انداز میں کہا۔ "دیکھو میاں، مجھے کہنے کا حق تو نہیں ہے لیکن کہہ رہا ہوں کہ رشتے سگے ہی اعتماد کے ہوتے ہیں، مجھے تمہارا یہ دوست مشکوک لگتا ہے۔ اس سے بچ کر رہنا۔"

میں نے ان کی بات ہنس کر ٹال دی اور کہا۔ "چاچا جی، آپ بے فکر رہیں۔ آپ اسے جیسا سمجھ رہے ہیں وہ ویسا نہیں ہے۔"

مبشر صاحب نے مزید کوئی بات نہ کی اور سر ہلا کر چلے گئے اور میں گھر چلا آیا۔ اگلے روز آفس میں کام بہت زیادہ تھا اس لیے میں لیٹ ہو سکتا تھا۔ میں نے پہلے شوکت کو کال کی کہ اگر وقت مل جائے تو مجھے رات آٹھ بجے آفس سے لے لینا۔ اس نے دیر ہونے کی وجہ پوچھی تو میں نے اسے بتایا کہ آفس میں کام بہت زیادہ ہے اس لیے آج لیٹ ہو جاؤں گا اس نے وعدہ کیا کہ وہ آٹھ بجے پہنچ جائے گا پھر میں نے تنزیلہ کو بھی فون کر کے بتا دیا۔ وہ مجھ سے بات کر رہی تھی کہ اچانک مجھے فون بجنے کی آواز سنائی دی، میں چونکا اور تنزیلہ سے پوچھا۔ "یہ فون کس کا بج رہا ہے؟"

پہلے تو وہ گڑبڑا گئی پھر کہا۔ "ٹی وی چل رہا ہے اس میں فون بج رہا ہے۔"

"اوکے۔" میں نے یہ کہہ کر فون رکھ دیا اور کام میں مصروف ہو گیا۔ ٹھیک آٹھ بجے شوکت مجھے لینے آ گیا اور میں کام سے فارغ ہو کر اس کے ساتھ ہی گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ کام کی وجہ سے مجھے بھوک بھی بہت لگ رہی تھی۔ گھر پہنچ کر میں نے شوکت کو بھی کھانے کی دعوت دی لیکن وہ یہ کہہ کر چلا گیا کہ اسے ضروری کام سے کہیں جانا ہے اس لیے وہ پھر کبھی کھا لے گا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے کھانا کھایا، عشاء کی نماز پڑھی، تھوڑی دیر ٹی وی دیکھا اور پھر سونے کے لیے بیڈروم میں چلا گیا جبکہ تنزیلہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی ٹی وی دیکھتی رہی۔ اس کا پسندیدہ ڈراما لگا ہوا تھا۔ وہ ڈرامے بڑے شوق سے دیکھتی

تھی۔

نہ جانے رات کا کون سا پہر تھا کہ میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے کروٹ بدلتے ہوئے تنزیلہ کی طرف دیکھا تو وہ بستر پر نہیں تھی۔ شاید وہ واش روم میں ہوگی۔ میں نے سوچا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ جب کافی دیر گزر گئی اور تنزیلہ نہ آئی تو مجھے حیرانی ہوئی۔ وہ واش روم میں بھی اتنی دیر نہیں لگاتی تھی جتنی آج لگائی تھی، اس کا سیل فون بھی سائیڈ ٹیبل پر نہیں تھا۔ وہ رات کو سونے سے پہلے اپنا سیل فون سائیڈ ٹیبل پر ہی رکھتی تھی۔

میں بستر سے نکل کر واش روم کی طرف بڑھا۔ واش روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہ اندر موجود نہیں تھی۔ میں نے آواز دی۔ ''تنزیلہ...... تنزیہ...... کہاں ہو تم؟''

دو تین بار آوازیں دینے پر وہ فوراً ہی کمرے میں آ گئی۔ اس کی رنگت اڑی ہوئی تھی اور وہ حواس باختہ دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''رات کے اس پہر کہاں تھیں؟ خیریت تو ہے نا تمہارے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں؟''

اس نے پہلے اپنے حواس پر قابو پایا پھر وہ اٹکتے ہوئے بولی۔ ''میں باہر گئی تھی۔ دراصل مجھے کھٹکے کی آواز سنائی دی تھی، مجھے لگا کہ شاید کوئی چور گھس آیا ہے وہی دیکھنے چلی گئی تھی۔''

مجھے حیرت ہوئی اور غصہ بھی آیا۔ ''بے وقوف، تمہیں اکیلے جانے کی کیا ضرورت تھی، مجھے جگا دیا ہوتا، اگر کوئی چور ہوتا تو وہ تمہیں نقصان پہنچا سکتا تھا۔''

تنزیلہ نے کہا۔ ''ہاں آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، آئندہ ایسا ہوا تو میں آپ کو جگا دیا کروں گی۔''

میری نظر اس کے ہاتھوں پر پڑی تو میں نے پوچھا۔ ''تمہارا سیل فون کہاں ہے۔''

میری بات سن کر وہ گڑبڑائی۔ پھر کہنے لگی۔ ''وہ، وہ شاید کچن میں رکھا ہے۔ میں پانی پینے گئی تھی۔ میں لے آتی ہوں۔''

میں اس کی بے پروائی پر منہ بنا کر رہ گیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ اپنا سیل فون لے کر آئی اور ہم سو گئے۔

صبح میں اٹھا تو میرے سر میں شدید درد تھا اس لیے میں نے باس سے بات کر کے چھٹی کر لی۔ میں نے تنزیلہ کو دیکھا وہ بے چین اور پریشان پریشان سی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا تو وہ ٹال گئی۔ میں نے شوکت کو بھی فون کر کے کہہ دیا کہ آج میں آفس نہیں جا رہا اس لیے وہ مجھے لینے نہ آئے۔ میری طبیعت کی خرابی کا سن کر وہ فوراً ہی آ گیا تھا۔

''بھائی! اگر زیادہ طبیعت خراب ہے تو ڈاکٹر کے پاس لے چلوں؟'' شوکت نے پوچھا۔

''نہیں، بس سر میں درد ہے۔ گولی کھالی ہے ٹھیک ہو جاؤں گا۔'' میں نے اسے منع کرتے ہوئے کہا۔

شوکت کچھ دیر بیٹھنے کے بعد چلا گیا تو میں بستر پر آرام کرنے لگا اور تنزیلہ گھر کے کام کاج میں مصروف ہو گئی۔

دوپہر تک میری طبیعت ٹھیک ہو چکی تھی اس لیے میں نہانے کے بعد ظہر کی نماز پڑھنے مسجد چلا گیا۔ مسجد میں مبشر صاحب بھی موجود تھے جب میں نماز پڑھ کر گھر آنے لگا تو وہ بھی میرے ساتھ ہی چل دیئے۔ راستے میں مبشر صاحب نے استفسار کیا۔ ''میاں فرحان، آج آفس نہیں گئے؟''

''طبیعت خراب تھی اس لیے چھٹی کر لی ہے۔'' میں نے جواباً کہا۔ میں کبھی کبھی ان کو انکل بھی کہتا تھا۔ انہوں نے سر ہلایا۔

ہم ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوئے۔ ''میاں، میں تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''جی فرمایئے۔''

''میری بات کا برا مت منانا۔'' وہ تاسف بھرے لہجے میں کہنے لگے۔ ''جو دوست آستین کے سانپ ہوتے ہیں ان سے ہمیشہ بچنا چاہیے۔ میں تمہیں پھر یہی تاکید کروں گا۔ تمہارا دوست شوکت مجھے اچھا نہیں لگتا، اس کا کردار اچھا نہیں ہے۔''

میں نے ہنس کر کہا۔ ''مبشر صاحب، آپ خوامخواہ میرے دوست کے بارے میں بدگمان ہو رہے ہیں۔ وہ بہت اچھا اور نیک انسان ہے۔''

مبشر صاحب نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اچھے دوست کبھی دوست کی غیر موجودگی میں اس کے گھر نہیں آتے۔ وہ ہمیشہ اس وقت آتے ہیں جب ان کا دوست گھر پر ہو۔''

اُن کی بات سن کر میرے ہوش اڑ گئے۔ دماغ میں عجیب سے خیالات کسمسانے لگے۔ میں نے حیرت بھرے لہجے میں دریافت کیا۔ ''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں مبشر صاحب، میں آپ کی بات سمجھ نہیں پا رہا۔''

ہم چلتے چلتے رک گئے تھے۔ مبشر صاحب مسکرائے اور لمحہ بھر کے بعد کہنے لگے۔ ''عقل مند کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ میں نے تمہیں اشارہ دیا ہے یقیناً تم سمجھ گئے ہوگے۔ اچھا میں چلتا ہوں۔''

مبشر صاحب تو چلے گئے لیکن مجھے سوچنے پر مجبور کر گئے تھے۔ ان کی کہی گئی بات میرے دماغ میں گونج رہی تھی کہ اچھے دوست کبھی دوست کی غیر موجودگی میں اس کے گھر نہیں آتے۔ اس کا مطلب تھا کہ شوکت میری غیر موجودگی میں گھر آتا ہے۔

یہ سوچ کر ہی میرے اعصاب تن گئے اور غصے کی شدت سے کنپٹیاں سلگ اٹھیں۔ میں جلدی جلدی گھر کی طرف بڑھا۔ مجھے تنزیلہ سے پوچھنا تھا کہ کیا واقعی شوکت میری غیر موجودگی میں گھر آتا ہے لیکن پھر میں نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ غصے میں انسان اندھا ہو جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے مبشر صاحب کو غلط فہمی ہوئی ہو۔

بعض اوقات جو جیسا دکھائی دیتا ہے ویسا ہوتا نہیں ہے۔ دیکھا ہوا اور کانوں سنا بھی غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ میں گھر آ گیا۔ مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر تنزیلہ نے پوچھا۔ ”فرحان، کیا ہوا، آپ ٹھیک تو ہیں؟“

”ہاں میں ٹھیک ہوں۔“

میں اب تنزیلہ کی حرکات و سکنات کا جائزہ لینا چاہتا تھا لیکن میں نے کئی دن تک نوٹ کیا، مجھے تنزیلہ میں ایسی کوئی بات مشکوک نہ لگی جس سے مبشر صاحب کا خدشہ درست ثابت ہوتا۔

ایک روز آفس میں کام جلدی ختم ہو گیا۔ میں نے باس سے چھٹی مانگی تو انہوں نے دے دی۔ میں نے اس روز شوکت کو فون نہ کیا اور بس سے گھر روانہ ہو گیا۔ اس وقت دن کے تین بج رہے تھے۔ جب میں گھر پہنچا تو چار بجنے والے تھے۔ میرے پاس گھر کی چابی تھی۔ ایک چابی میرے پاس ہوتی تھی اور دوسری تنزیلہ کے پاس۔

میں چابی سے تالا کھول کر گھر میں داخل ہوا تو اچانک مجھے باتوں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں ٹھٹک گیا اور غور کیا تو میرے تن بدن میں آگ بھڑک اٹھی۔ وہ کوئی اور نہیں شوکت تھا اور تنزیلہ کے ساتھ.... باتیں کر رہا تھا۔ ان دونوں کے قہقہے بھی گونج رہے تھے جن سے میرے دماغ میں مرچیں بھر رہی تھیں۔ اس وقت شوکت میرے گھر میں کیا کر رہا تھا؟ میرے دماغ میں مبشر صاحب کی باتیں گونجنے لگیں۔

میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ جسے میں بہت اچھا اور نیک انسان سمجھتا تھا وہ آستین کا سانپ ثابت ہوا تھا۔ وہ میری غیر موجودگی میں میری بیوی کے ساتھ...... اس سے آگے میں نہ سوچ سکا۔ میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو مجھے ایک طرف کپڑے دھونے والا ڈنڈا پڑا مل گیا۔ میں نے وہ ڈنڈا اٹھایا اور دبے قدموں چلتا ہوا ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ میری بیوی امانت میں خیانت کرے گی۔ مجھے دھوکا دے گی۔ اس خیانت کی سزا صرف اور صرف قتل ہے۔

میں جیسے جیسے ڈرائنگ روم کے قریب ہو رہا تھا ان کی آوازیں واضح ہوتی جا رہی تھیں پھر میں اندر داخل ہو گیا۔

اندر کا منظر کچھ یوں تھا۔ تنزیلہ ایک صوفے پر تو شوکت دوسرے صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ شوکت یوں بیٹھا ہوا تھا جیسے وہ اپنے گھر میں بیٹھا ہو۔ مجھے دیکھ کر وہ دونوں ہی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ تنزیلہ کی آنکھوں میں خوف و ہراس پھیل گیا جبکہ شوکت بھی گھبرا گیا تھا۔ میں نے غصیلے لہجے میں شوکت سے کہا۔ ”لوگ مجھے تمہارے بارے میں بتاتے تھے کہ تم میری غیر موجودگی میں میرے گھر آتے ہو لیکن میں ان کا یقین نہیں کرتا تھا۔ میں کہتا تھا کہ نہیں میرا دوست بہت اچھا اور نیک انسان ہے لیکن تم تو آستین کے سانپ نکلے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اتنے گھٹیا اور گرے ہوئے انسان ہو گے، تم نے میرے گھر نقب لگائی ہے، آج میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

یہ کہہ کر میں نے ڈنڈا بلند کر لیا۔ تبھی شوکت بوکھلا کر بولا۔ ”فرحان! کوئی بھی ایسا قدم مت اٹھانا کہ تمہیں بعد میں پچھتانا پڑے، پہلے میری بات سن لو، اس کے بعد تمہارا جو جی چاہے کرنا۔“

”بکواس بند کرو۔“ میں نے سانپ کی مانند پھنکارتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی۔ میں نے تم دونوں کو اکٹھے دیکھ لیا ہے، کیا یہی کافی نہیں ہے؟“

میرے دماغ پر خون سوار ہو چکا تھا۔ تنزیلہ بھی چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔ ”فرحان! آپ پہلے شوکت کی بات سن لیں۔ خدا کے لیے۔“

میں نے غصے سے اسے زور سے دھکا دے دیا۔ وہ صوفے پر جا گری۔ میں نے غصے سے کہا۔ ”پہلے میں اس سے نمٹ لوں پھر میں تمہیں دیکھتا ہوں، تم دونوں میرے ہاتھوں مرنے سے نہیں بچ سکتے۔“

اتنا کہہ کر میں شوکت پر پل پڑا، شوکت نے اپنے بچاؤ کے لیے بہت ہاتھ پیر مارے لیکن میں اسے مسلسل ڈنڈے سے مارتا رہا۔ میرے ہوش و حواس گم ہو چکے تھے۔ ڈر کے مارے تنزیلہ بھی مجھے پکڑنے کے لیے نہیں آئی تھی۔ میں اس وقت ہوش میں آیا جب میں نے ڈنڈے مار مار کر شوکت کو موت کی نیند سلا دیا تھا۔ شوکت خون میں لت پت فرش پر پڑا تھا اور میں بری طرح ہانپ رہا تھا۔ میرا سانس بے اعتدال تھا۔ شوکت کو مارنے کے باوجود میرے اندر لگی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے تنزیلہ کی طرف دیکھا لیکن وہ ڈرائنگ روم میں موجود نہیں تھی۔ شاید وہ باہر بھاگ گئی تھی۔

میں باہر نکلنے ہی لگا تھا کہ اُسی وقت بہت سے لوگ آگئے اور انہوں نے مجھے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیا۔ شاید تنزیلہ نے ان لوگوں کو مدد کے لیے بلایا تھا۔ پولیس نے مجھے عدالت میں پیش کر دیا۔ عدالت سے مجھے عمر قید بہ مشقت کی سزا ہو گئی۔ اس وقت مجھے بہت افسوس ہو رہا تھا کہ مجھے انتہائی قدم اٹھانے سے گریز کرنا چاہیے تھا۔ اگر میں نے ان دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑ بھی لیا تھا تو پولیس کو کال کر دیتا لیکن جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا۔ غصے نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی اور میری عقل خبط ہوگئی تھی۔

تنزیلہ مجھ سے جیل میں ہر ہفتے ملنے آتی تھی لیکن میں اس سے ملاقات نہیں کرتا تھا۔ ایک روز مجھے جیل سپرنٹنڈنٹ نے کہا کہ تم اس سے مل لو، وہ تمھیں کوئی ضروری بات بتانا چاہتی ہے۔ میں اس سے ملاقات پر راضی ہو گیا۔ جب میں ملاقات والے کمرے میں پہنچا اور تنزیلہ کو دیکھا تو وہ بہت اداس اور غمگین تھی۔ میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ”تم مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہو اور کیا بتانا چاہتی ہو؟“

تنزیلہ نے کہا۔ ”فرحان! کاش آپ اُس وقت شوکت کی بات سن لیتے تو آج آپ عمر قید کی سزا نہ بھگت رہے ہوتے، آپ نے ہمارے بارے میں جو رائے قائم کی تھی وہ بالکل غلط تھی۔ میرے اور شوکت کے درمیان ایسا کوئی ناجائز تعلق نہیں تھا جس سے آپ کی امانت میں خیانت ہوتی۔ شوکت مجھے اپنی چھوٹی بہن کہتا تھا۔ اس نے میرے سر پر ہاتھ بھی رکھا تھا۔ اس نے کبھی مجھے گندی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ مجھ سے غلطی ہوئی تھی کہ مجھے آپ کو پہلے ہی سب کچھ بتا دینا چاہیے تھا۔ آپ کی بیس نومبر کو سالگرہ ہے اس روز پندرہ نومبر تھی اور ہم دونوں آپ کی سالگرہ کے حوالے سے بات چیت کر رہے تھے۔ ہم پروگرام بنا رہے تھے کہ آپ کی سالگرہ دھوم دھام سے منائی جائے اور آپ کو سرپرائز دیا جائے تاکہ آپ خوش ہو جائیں لیکن آپ کے سر پر خون سوار تھا۔ شوکت آپ کو کہتا رہا کہ بات سن لیں لیکن آپ نے نہیں سنی اور اپنے غصے اور جنون میں پڑ کر اُس بے چارے کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ میں تو آپ کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ اتنے بدگمان ہو جائیں گے۔ کم سے کم آپ مجھ سے پوچھ لیتے تو آج شوکت زندہ ہوتا اور ہم سب ہنسی خوشی زندگی گزار رہے ہوتے۔ میں آپ کی بیوی ہوں، آپ کی امانت ہوں، وہ اور عورتیں ہوں گی جو اپنے شوہروں کی امانتوں میں خیانت کرتی ہیں۔ میں ان عورتوں میں سے ہرگز نہیں ہوں۔ میرا اللہ گواہ ہے کہ میں پاکباز ہوں، میں نے ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا کہ جس سے مجھے شرمندگی ہو یا مجھے اللہ کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے، شوکت بھائی کی موت کے بعد اس کی ماں کی رو رو کر بینائی چلی گئی ہے، ان کا کمانے والا بیٹا چلا گیا ہے، آپ کے بغیر سوچے سمجھے اٹھائے گئے قدم سے دو گھر اجڑ گئے ہیں۔ کاش! آپ اس وقت شوکت بھائی کی بات سن لیتے۔“

اتنا کہنے کے بعد تنزیلہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور میں بت بنا اسے دیکھتا رہ گیا۔ میری حالت ایسی تھی جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ اس روح فرسا انکشاف پر میں ساکت رہنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیل رہا تھا اور میں شرمندگی کے سمندر میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ میرے بغیر سوچے سمجھے اٹھائے گئے قدم سے واقعی دو گھر اجڑ گئے تھے۔ ایک میرا اور دوسرا شوکت کا۔

میں نے خود کو لعنت ملامت کی۔ کاش میں اس وقت شوکت کی بات سن لیتا تو آج واقعی جیل میں نہ سڑ رہا ہوتا لیکن اب تو کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ اب مجھے عمر قید کی سزا کاٹنی تھی۔ تنزیلہ نے بتایا تھا کہ وہ گھر چھوڑ کر شوکت کے گھر شفٹ ہو گئی ہے اور اس کی ماں کے ساتھ رہ رہی ہے۔ چونکہ ان کا کمانے والا کوئی نہیں ہے اس لیے اس نے چھوٹی سی ملازمت کر لی ہے جس سے وہ اپنا اور شوکت کی ماں کا پیٹ پال سکے۔ میرے نیک چلن کی وجہ سے میری سزا کم ہو کر 10 سال ہو گئی اور جب میں 10 سال کے بعد جیل سے رہا ہوا تو میں پہلے والا فرحان نہیں تھا۔ میں بدل گیا تھا۔ میں سب سے پہلے شوکت کی قبر پر گیا اور قبر پر بیٹھ کر میں نے رو رو کر اس سے معافی مانگی۔ شاید اس طرح میرے دل کا بوجھ بھی ہلکا ہو جائے اور شوکت بھی مجھے معاف کر دے۔

میں نے شوکت کی ماں سے بھی معافی مانگی۔ انہوں نے کھلے دل کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے معاف کر دیا۔ اب میں تنزیلہ اور شوکت کی ماں کے ساتھ رہتا ہوں۔ مجھ سے جو ہو سکتا تھا میں نے کیا تھا کہ شاید اس طرح میرا اللہ بھی مجھے معاف کر دے۔ میں سوچتا ہوں کہ بہن بھائی کا رشتہ بہت مقدس ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ جو ہم دیکھتے ہیں وہ صحیح ہو، بعض اوقات آنکھوں دیکھی چیز غلط بھی ہوتی ہے، جس طرح میں شیطان کے بہکاوے میں آگیا تھا اور ایک جیتے جاگتے انسان کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے تصدیق کر لینی چاہیے ایسا نہ ہو کہ بعد میں آپ کو بھی میری طرح پچھتانا پڑے۔

++
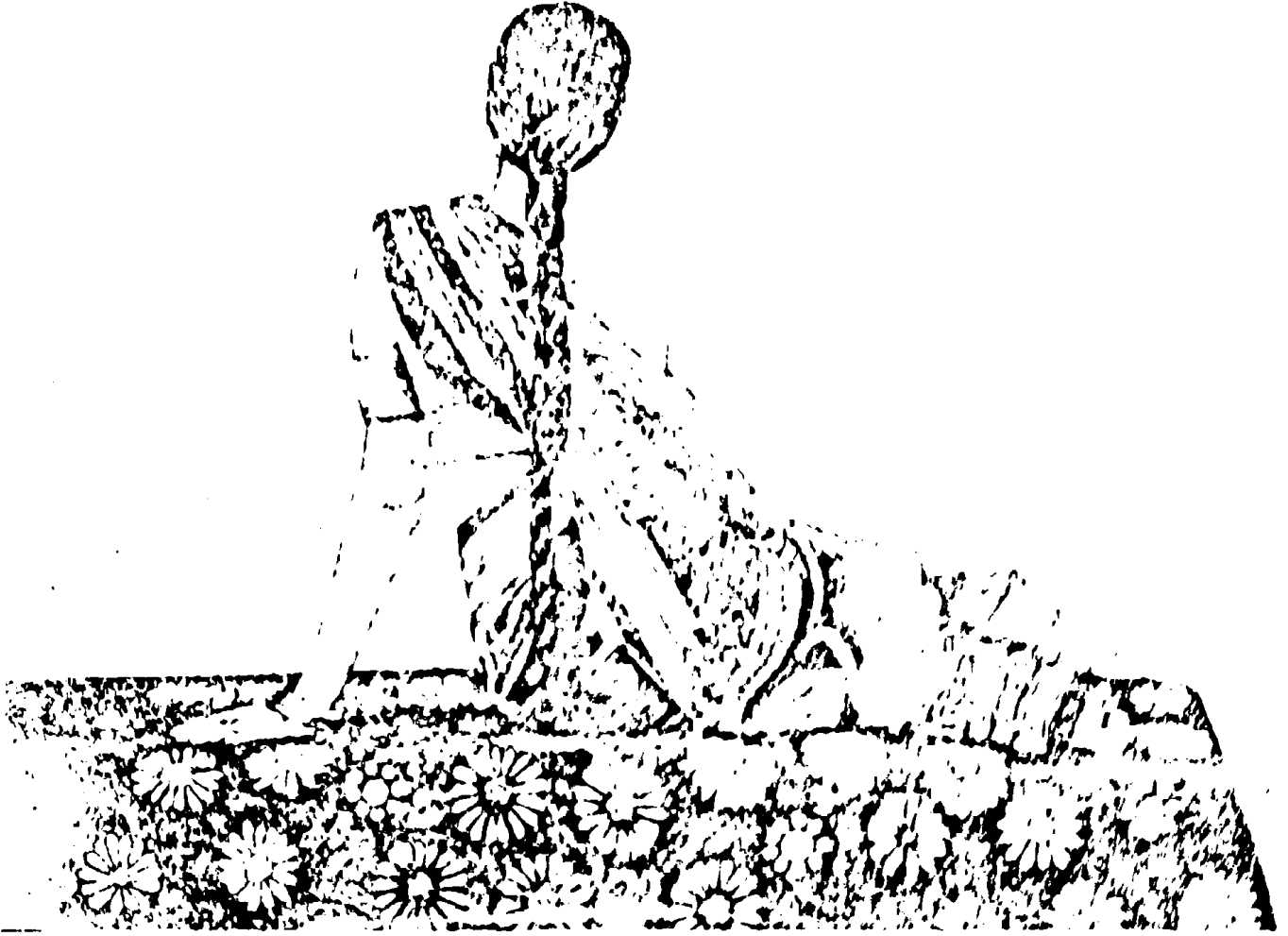
پگلی

محترم مدیر سرگزشت
السلام علیکم!
ایک ایسی سچ بیانی کے ساتھ حاضر ہوں جو کافی پرانی ہے۔ لیکن ایسے واقعات آج بھی رونما ہوتے ہیں۔ بالکل آج کی یہ کہانی لگے گی۔ یہ سچ بیانی سبق بھری ہے۔ سیکھنے والوں کے لیے بہت کچھ ہے اس میں۔

امیر حمزہ اشرف
(کوٹ رب نواز، ملتان)

ذریعہ روزگار بند ہوگیا تھا۔ کورونا کے خوف نے دہلا رکھا تھا۔ مسلسل لاک ڈاؤن نے کاروباری دنیا کو درہم برہم کردیا تھا۔ مرد حضرات گھر کے ہو کر رہ گئے تھے۔ میرے پاس بھی ان دنوں فراغت ہی فراغت تھی اس لیے میں سارا دن ڈائجسٹ پڑھتا یا سہ پہر کے وقت گھر کے صحن میں لگے نیم کے پیڑ تلے بچھی چارپائی پر بیٹھی دادی کے پاس بیٹھ کر ان کے قصے و کہانیاں سنتا۔ یہ قصے کہانیاں جھوٹے نہیں ہوتے تھے بلکہ دادی کی زندگی کے واقعات پر مشتمل ہوتے

تھے۔ قیام پاکستان کے بعد یہاں آنے اور یہاں آ کر زندگی کا نئے سرے سے آغاز اور ان سے جڑے واقعات وہ سناتیں تھی۔ اس دن بھی میں دادی کی گود میں سر رکھے لیٹا ہوا تھا۔

''آج میں تمہیں لیلیٰ کی داستان سناؤں گی۔'' دادی نے پیار سے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

''دادی یہ لیلیٰ کون تھی؟'' میں نے سوال کیا۔

''تقسیم کے بعد میرے خاندان کا مختلف شہروں اور دیہاتوں میں تھوڑا تھوڑا عرصہ عارضی پڑاؤ رہا اس کے بعد ہم نے پنجاب کے اس چھوٹے سے گاؤں علی پورہ میں قدم رکھا جس کے کھیت کھلیانوں کی ٹھنڈی و فرحت بخش فضاؤں میں لیلیٰ کی جلترنگ ہنسی گونجا کرتی تھی۔ ہمارا ٹھکانا ایک چھوٹا سا کچا مکان تھا۔ ان دنوں پکے گھروں کا رواج نہ تھا اس لیے گاؤں کے 95 فیصد لوگ کچے مکانوں میں رہتے تھے۔ لیلیٰ میرے پڑوس میں رہتی تھی۔ ہمارے گھروں کے بیچ صرف ایک دیوار تھی۔'' اتنا بتا کر دادی خاموش ہوگئی۔ ان کے جھریوں زدہ چہرے پر بیتے سالوں کی تاریخ رقم نظر آتی تھی۔ وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق تھیں شاید لیلیٰ کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔

''کیا لیلیٰ آپ کی سہیلی تھی؟'' میرے استفسار پر وہ چونک گئیں۔ لگتا تھا وہ ماضی کے دنوں کی یاد میں کھو گئیں تھی۔ گزرے حالات و واقعات کو ذہن میں ترتیب دے رہی تھیں۔ میرے استفسار پر حال میں لوٹ آئیں۔

''لیلیٰ مجھ سے چار سال چھوٹی بہن انوری کی دوست تھی۔ نہایت شوخ و چنچل تھی۔ اسے ہمارے گاؤں کی سب سے حسین دوشیزہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ میں چونکہ اس سے بڑی تھی اس لیے وہ مجھے باجی باجی کہہ کر پکارا کرتی۔ مگر لیلیٰ، انوری کے ساتھ بہت بے تکلف تھی۔'' اتنا کہہ کر دادی افسردہ ہوگئیں۔ ان کی بوڑھی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی۔

☆☆☆

سارا دن کا تھکا ہارا سورج آغوش مغرب میں اونگھ رہا تھا۔ گاؤں میں شام نے پر پھیلانے شروع کر دیے تھے۔ کھیتوں کھلیانوں میں کام کرنے والی عورتیں کب کی اپنے گھروں کو لوٹ چکی تھیں... مگر دو نفوس ان معاملات زندگی سے بے خبر کھیتوں کے بیچوں بیچ پگڈنڈی پر آمنے سامنے بیٹھی ایک دوسرے پر چلو بھر بھر پانی پھینکتے، اٹھکیلیاں کرنے میں مصروف تھیں۔ دونوں بچپن کی ہمجولی تھیں۔ بچپن سے لڑکپن اور اب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھیں۔ وقت کے ساتھ دوستی میں مزید پختگی نے جنم لے لیا تھا۔ لیلیٰ عمر کے سولہویں سال میں تھی۔ گوری رنگت، سرخ دہکتے گالوں کے درمیان ستواں ناک، گہری بھوری آنکھیں اور تراشیدہ لبوں پر جیسے پھول کی پنکھڑیں کا رس گھول کر نچوڑ دیا ہو۔ چہرے پر بچی مسکراہٹ ہر ایک کو اپنی جانب متوجہ کر لیتی تھی۔ لیلیٰ انتہا کی لاابالی تھی۔ گرمیوں کی طویل دوپہروں میں درختوں پر چڑھ کر پرندوں کے گھونسلے ٹٹولنا اور کھیتوں میں کام کرنے والی لڑکیوں اور خواتین کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنا اس کے پسندیدہ مشاغل تھے۔ وہ اپنے ساتھ انوری کو بھی گھسیٹے پھرتی۔ لیلیٰ کا باپ اسحاق شہر میں گارڈ کی نوکری کرتا تھا۔ وہ مہینے میں دو تین بار ہی گھر آتا۔ لیلیٰ کا کوئی اور بہن بھائی نہیں تھا۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کے دو چچا مشتاق اور اشفاق بھی اسی گاؤں میں مقیم تھے۔ ان کی اپنی زمینیں تھیں۔ وہ اپنی زمینیں سنبھالتے تھے۔ لیلیٰ کی پھوپی منیرہ بھی اسی گاؤں میں بیاہی گئی تھی۔ جس کی پانچ بیٹیاں اور ایک بیٹا ہاشم تھا جو اس گاؤں کے اکلوتے اسکول میں میٹرک کا طالب علم تھا۔ لیلیٰ کی ماں رضیہ نے اس کے اکلوتے ہونے کے باوجود ابتدا میں پڑھائی کے معاملے میں سختی برتی تھی جس کی بدولت لیلیٰ پانچ جماعتیں پڑھ چکی تھی۔ پانچویں کے بعد اس نے اسکول جانا ترک کر دیا۔ رضیہ نے بیٹی کو بہت سمجھایا مگر لیلیٰ کا پڑھائی میں دل نہیں لگتا تھا۔ اس کی عدم توجہی کو دیکھ کر رضیہ نے بھی اسے پڑھنے کا کہنا چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ بڑی ہوگئی تھی۔ رضیہ چاہتی تھی کہ لیلیٰ کو گھریلو کام کاج کا سلیقہ آجائے مگر اس کے کان پر جوں نہ رینگتی جب موڈ ہوتا تو کوئی کام کر لیتی ورنہ انوری کو پکڑتی اور کھیتوں کی طرف نکل جاتی اور رضیہ بیٹی کو آوازیں دیتی رہ جاتی۔

''ارے لیلیٰ تو ابھی تک گھر نہیں گئی؟'' وہ دونوں اپنی مستیوں میں مگن تھیں کہ اچانک ایک مردانہ آواز ان کے کانوں میں پڑی لیلیٰ نے گردن گھما کر دیکھا اس کے بائیں جانب کچھ فاصلے پر اس کا پھوپی زاد ہاشم کھڑا تھا۔

''کیا تجھے اماں نے بھیجا ہے؟'' لیلیٰ نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔ انوری بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''نہیں...... لیکن اندھیرا پھیل رہا ہے تجھے گھر جانے کی فکر نہیں ہے کیا؟''

''اچھا اچھا جاتی ہوں مگر تو کیا ہر وقت میرے تعاقب

میں رہتا ہے، جہاں بھی جاؤں وہیں آ دھمکتا ہے۔'' لیلیٰ نے ہاتھ نچاتے ہوئے جتلایا۔

''نن...... نہیں میں کیوں بھلا تیرا تعاقب کرنے لگا۔'' ہاشم اس کی بات سن کر گڑبڑا گیا۔ جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ وہ دونوں اس کی گڑبڑاہٹ پر کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور ہاشم بغلیں جھانکنے لگا۔

''چل انوری۔'' اس نے اپنی سہیلی سے کہا اور گاؤں کی طرف چل دی۔ ہاشم وہیں کھڑا اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا یہاں تک کہ وہ آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔

☆☆☆

وہ گھر پہنچی تو رضیہ حسبِ معمول صحن میں بنے چولہے پر روٹیاں ڈال رہی تھی۔

''چلو شکر ہے گھر کی یاد تو آئی رانی صاحبہ کو۔'' بیٹی کو دیکھتے ہی رضیہ نے کہا۔

وہ ماں کے طنز کو نظر انداز کرتی ہوئی چولہے کے پاس ہی آبیٹھی۔ گرم گرم روٹی دیکھ کر اس کی بھوک جاگ اٹھی۔ وہ روٹیوں کی طرف بڑھی تو رضیہ نے ٹوک کر کہا۔ ''ارے پہلے ہاتھ تو دھو آ پھر روٹی کھا لینا۔''

وہ ماں کی بات پر منہ بناتے ہوئے اٹھی اور صحن میں لگے نلکے کی طرف بڑھ گئی۔

وہ ہاتھ منہ دھو کر واپس آئی تو رضیہ نے بیٹی کو سالن روٹی دی۔

''صغراں آئی تھی میرے پاس تیری شکایت لگانے، تو نے آج پھر بھانے میں گھس کر اس کی بھینسوں کو کھول دیا تھا۔'' رضیہ نے لیلیٰ کو گھورتے ہوئے بتایا۔

''وہ میں نے نہیں انوری نے کھولی تھیں۔'' لیلیٰ نے صفائی پیش کی۔

''ارے تو نے کھولی یا انوری نے کھولی بات تو ایک ہی ہے نا۔'' رضیہ نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

''اماں، اور میں کیا کرتی بھلا۔ ایک گلاس لسی ہی تو مانگی تھی ماسی صغراں سے مگر انہوں نے بھی دے کر نہ دی۔'' لیلیٰ نے ڈھٹائی سے کہا اور نوالہ منہ میں رکھ کر چبانے لگی۔

''میں کہتی ہوں باز آجا اپنی ان بچکانہ حرکتوں سے ورنہ اب کی بار تیرے سارے کرتوت تیرے باپ کو بتا دوں گی۔'' رضیہ نے بیٹی کو دھمکی آمیز لہجے میں کہا مگر لیلیٰ کو اس کی بات سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ اس نے کھانے کے بعد پلو سے ہاتھ پونچھے اور کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

اگلے دن شام کو وہ ماسی صغراں کے گھر موجود تھیں۔ ماسی صغراں کی بڑی بیٹی کنیز کا نکاح تھا۔ گاؤں کی عورتیں اور لڑکیاں خوب سج سنور کر آئی تھیں۔ مرد حضرات باہر پلاٹ میں لگے ٹینٹ کے نیچے نشست کا انتظام کرنے میں معروف تھے۔ زنان خانے میں عورتیں ڈھولک کی تھاپ پر شادی کے مخصوص گانے گاتیں کنیز پر صدقے واری جا رہی تھیں۔ سکھیوں کے معنی خیز جملے کنیز کی سماعت سے ٹکراتے تو وہ آنے والے لمحات کا سوچ کر سرخ ہو جاتی۔ اس کے ساتھ اٹھکیلیاں کرتی لیلیٰ سب سے نمایاں تھی گہرے سبز رنگ کا لباس اس پر خوب جچ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد برات کی آمد کا شور مچ گیا۔ نکاح کے بعد مردوں کو ٹینٹ کے نیچے کھانا کھلایا گیا اس کے بعد عورتوں کو۔

لیلیٰ اور انوری نے وہاں جانے کی بجائے کنیز کے پاس رکنے کو ترجیح دی۔ وہ تینوں بیٹھی خوش گپیوں میں مصروف تھیں کہ کمرے میں ایک بچہ داخل ہوا اور بولا۔ ''لیلیٰ باجی تمہیں باہر کوئی بلا رہا ہے۔''

''کون ہے؟'' لیلیٰ نے پوچھا مگر وہ بچہ ''پتا نہیں'' کہہ کر بھاگ گیا۔

وہ چار و ناچار اٹھ گئی تو انوری بھی اس کے ساتھ کھڑی ہوئی۔

''ارے تو کہاں چلی کنیز کے پاس رک میں بس ابھی آئی۔'' وہ انوری کو کہہ کر باہر نکل گئی۔ صحن عبور کرتی ہوئی وہ دروازے تک آئی۔

''لیلیٰ...... لیلیٰ۔'' اس سے پہلے وہ باہر جاتی کسی نے اسے دبی دبی آواز میں پکارا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو دروازے کے دائیں طرف صحن کے تنہا اور نیم تاریک گوشے میں اسے ہاشم کھڑا نظر آیا۔ اسے ایک لمحہ میں ساری کہانی سمجھ آگئی۔ لیلیٰ چلتی ہوئی اس کے مقابل جا کھڑی ہوئی۔

''تجھے میری جاسوسی کرنے کے علاوہ کوئی کام نہیں ہے کیا؟'' ماتھے پر بل لیے دونوں ہاتھوں کو کمر پر رکھ کر وہ بولی۔

وہ بڑی عجیب نظروں سے لیلیٰ کو گھور رہا تھا۔ ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

''مجھے کس لیے بلایا ہے؟'' وہ بےزاری سے بولی۔

''بس تجھے دیکھنے کو جی چاہ رہا تھا۔'' ہاشم نے بے ساختہ کہا۔

''اس سے پہلے کیا دیدے بند کر کے میرے سامنے

آتا تھا۔'' لیلیٰ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ آج اسے ہاشم بہت بدلا بدلا سا لگ رہا تھا۔

''میرا مطلب ہے تو آج بڑی سوہنی لگ رہی ہے نا اس لیے۔'' ہاشم نے بے باک انداز میں اس کی تعریف کی۔ وہ اس کی بات سن کر جھینپ سی گئی۔

''چل ہٹ پاگل۔'' لیلیٰ نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا اور مڑ کر کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے قدم من من بھر کے ہوگئے تھے۔ اپنی بے ترتیب دھڑکنوں کو سنبھالتی ہوئی وہ کمرے میں داخل ہوگئی۔

☆☆☆

رات کو جب وہ بستر پر سونے کے لیے لیٹی تو اس کی حالت عجیب ہو رہی تھی جسے وہ کوئی بھی نام دینے سے قاصر تھی۔ دل کی زمین پر ہلچل اور ذہن میں طوفان برپا تھے۔

''بس تجھے دیکھنے کو جی چاہ رہا تھا۔''

''تو آج بڑی سوہنی لگ رہی ہے۔'' چند گھنٹوں قبل ہاشم کے کہے ہوئے جملے اس کی سماعتوں میں گونج رہے تھے آج کیا ہوا تھا ہاشم کو؟ پہلے تو اس نے کبھی اس طرح کی بات نہ کی تھی۔ وہ تو لیلیٰ سے بات کرتے وقت پسینے پسینے ہو جایا کرتا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ کنیز کے گھر سے واپسی کے بعد وہ کتنی ہی دیر آئینے کے روبرو کھڑی اپنا جائزہ لیتی رہی تھی۔ اسے پہلی بار ادراک ہوا کہ وہ حسین ہوگئی ہے۔ ہاشم کے ان دو جملوں میں کچھ ایسا اثر محسوس ہوا تھا جو اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر گیا تھا۔ جاگتی آنکھوں میں بے نام سے خوابوں نے انگڑائی لی تھی، اس کے تصور میں جب بھی ہاشم کا مسکراتا ہوا چہرہ آتا تو دل میں گدگدی سی ہونے لگتی۔ ان ہی خیالوں میں کھوئے ہوئے کب نیند اس پر مہربان ہوگئی اسے پتا نہ چل سکا۔

☆☆☆

لیلیٰ کا پھوپی منیرہ کے ہاں آنا جانا بہت بڑھ گیا۔ پھوپی منیرہ دو سال قبل اپنی بڑی بیٹیوں سونیا اور ثوبیہ کو بیاہ چکی تھیں۔ اب وہ حلیمہ اور سکینہ کی طرف سے فکر مند رہتی تھیں۔ پھوپی انہیں بھی جلد سے جلد اپنے گھروں کا کر دینا چاہتی تھیں۔ ان کے بعد ہاشم اور چھوٹی زرینہ رہ جاتے۔ ہاشم اکلوتا ہونے کی وجہ سے پھوپی منیرہ کی اُمیدوں کا مرکز تھا۔ پھوپا کی ذاتی زمینیں تو تھی نہیں اس لیے ساری عمر وہ اپنے سالوں مشتاق اور اشفاق کی زمینوں پر کام کرتے رہے۔ پھوپی منیرہ کا کنبہ بڑا اور آمدنی کم تھی اس کے باوجود روز اوّل سے ہی انہوں نے کفایت شعاری کا مظاہرہ کیا تھا اور ہمیشہ میانہ روی اختیار کیے رکھی۔ ہاشم بھی اب اکثر ماموں اسحاق کے گھر آنے لگا تھا۔ وہ دل ہی دل میں لیلیٰ کو پسند کرتا تھا۔ پہلے پہل تو معاملہ دونوں کے بیچ مسکراہٹوں کے تبادلے تک محدود رہا پھر اس روز ہاشم نے ہمت کر کے حالِ دل لیلیٰ کو کہہ سنایا۔ لیلیٰ کا مثبت ردِّعمل ملتے ہی دونوں بہت تیزی سے ایک دوسرے کے قریب ہوتے چلے گئے۔ ہاشم پیار کا جواب پیار سے ملنے پر بے انتہا خوش تھا۔ اب اسے والدین کے لیے ہی نہیں لیلیٰ کے لیے بھی اپنی منزل کو پانے کی خاطر مزید جدوجہد کرنی تھی۔ ہاشم خود کو اس سطح پر لے جانا چاہتا تھا جہاں ممانی رضیہ اور ماموں اسحاق اسے لیلیٰ کا ہاتھ دینے سے بالکل نہ ہچکچاتے۔

☆☆☆

''ماشاء اللہ ہماری لیلیٰ بھی اب جوان ہوگئی ہے اس کے بارے میں کچھ سوچا ہے؟'' وہ کمرے میں لیٹی ہوئی تھی جب ماسی صغراں کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ ماسی صغراں رضیہ کے ساتھ صحن میں چارپائی پر بیٹھی تھی۔

''کیوں نہیں صغراں، میری لیلیٰ ابھی سولہ کی ہوئی ہے مگر اٹھان ایسی ہے کہ فکر رہنے لگی ہے۔''

''سچ بتاؤں تو اپنی لیلیٰ چاند جیسی ہے اس کا بر بھی ایسا تلاش کرنا جو اس کے ساتھ کھڑا ہوا جچے۔'' ماسی صغراں نے چہکتے ہوئے مشورہ دیا۔ ''اور نہیں تو کیا میں ایسی نہیں کہ اپنی چندا کو آنکھیں بند کر کے ایسے ویسے کے ساتھ باندھ دوں۔ آخر کو ہماری اکلوتی اولاد ہے۔ اس کے لیے ایسا دولہا دیکھوں گی کہ پورا گاؤں دیکھتا رہ جائے گا۔ ایسے گھر بھیجوں گی جہاں وہ راج کرے گی راج۔'' رضیہ نے جذبات بتائے۔

''اری رضیہ، کوئی نظر میں ہے کہ نہیں؟'' صغراں نے بڑی دھیمی آواز میں دریافت کیا۔

لیلیٰ اٹھی اور کھڑکی سے کان لگا کے کھڑی ہوگئی۔

''سچ پوچھو تو ادھر اُدھر کافی نظر دوڑائی ہے مگر مجھے تو میری لیلیٰ کے جوڑ کا کوئی دکھتا ہی نہیں۔'' رضیہ نے ناک چڑاتے ہوئے کہا۔

لیلیٰ کھڑکی سے ہٹ گئی اس کے تصور میں ہاشم کا سراپا گھوم گیا مگر پھوپی منیرہ کے گھر کا ماحول یاد آیا تو چہرے پر فکر و تشویش کے سائے لہرانے لگے۔

رات کی سیاہی نے پورے گاؤں کو لپیٹ میں لے

رکھا تھا۔ ہر جانب خاموشی تھی۔ چاند وقفے وقفے سے بادلوں کی اوٹ سے جھانکتا تو دھندلے مناظر تھوڑے واضح ہوجاتے پھر وہی تاریکی چھا جاتی۔ پورا گاؤں خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا مگر دو وجود رات کے اس پہر گاؤں کے کنویں کے نزدیک لگے پیپل کے درخت تلے کھڑے تھے۔

ہاشم نے لیلیٰ کے دونوں ہاتھوں کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا اس کی آنکھوں میں محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

''بس چند برس اور میری تعلیم مکمل ہوجائے پھر لمحہ ضائع کیے بغیر میں تجھے دوہٹی بنا کر گھر لے آؤں گا۔'' ہاشم کی بات سن کر وہ سرخ ہوگئی۔

''چند برس کیا میں تو تیرے لیے عمر بھر انتظار کرسکتی ہوں مگر......'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔

''مگر کیا؟'' ہاشم نے تڑپ کر اس سے پوچھا۔

''مجھے اماں کی طرف سے خوف آرہا ہے، وہ مجھے ایسے گھر بیاہنا چاہتی ہیں جہاں میں راج کروں، نوکروں کی فوج آگے پیچھے پھرے۔'' لیلیٰ نے دھیرے سے کہا۔

''تو فکر کیوں کرتی ہے لیلیٰ۔'' ہاشم نے اس کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں مقید کرتے ہوئے کہا۔

''میں ممانی کی طبیعت سے واقف ہوں.. مگر جب اماں ماموں سے اس سلسلے میں بات کریں گی تو ماموں انکار نہیں کریں گے آخر کو میں اکلوتا بھانجا ہوں۔''

وہ ہاشم کے چہرے کو دیکھتی رہ گئی جہاں یقین اور عزم مصمم کے چراغ روشن تھے۔

☆☆☆

وقت کا پنچھی ایک لمبی اڑان بھر چکا تھا۔ ہاشم سے بڑی حلیمہ اور سکینہ پیا سنگ سدھار چکی تھیں۔ لیلیٰ اور ہاشم کی محبت کونپل سے اب تناور درخت کی صورت اختیار کرچکی تھی۔ دونوں فریقین ملن کے وعدوں اور قسموں کی ڈور سے خود کو باہم باندھ چکے تھے۔ میٹرک کے بعد ہاشم نے شہر میں کالج کا رخ کیا تھا۔ کالج کے ماحول نے اسے خاصہ بدل ڈالا تھا۔ خوش شکل تو تھا ہی خوش لباسی نے اس کی شخصیت کو مزید نکھار دیا تھا۔ وہ معمول کے مطابق کالج جاتا، واپسی کے بعد کھانا کر باپ کا ہاتھ بٹانے کھیتوں میں نکل جاتا۔ لیلیٰ بھی اسے آگے بڑھتے ہوئے دیکھ کر بہت خوش تھی۔ وہ بڑی شدت سے اس دن کی منتظر تھی جب ہاشم تعلیم مکمل کرکے برسر روزگار ہوجاتا اور اسے دلہن بنا کر اپنے سنگ لے جاتا۔

اس دوران لیلیٰ کے بہت سے رشتے آئے، کھاتے پیتے زمیندار گھرانوں کے بھی مگر رضیہ کو اپنی خوبصورت اور لاڈلی بیٹی کے لیے ان میں سے کوئی نہ بھایا۔ وہ شاید ریاست کے کسی شہزادے کی راہ دیکھ رہی تھی۔ پھر جلد ہی رضیہ کی مراد برآئی۔ دوسرے گاؤں سے چوہدری زمان کا رشتہ آیا تھا۔ رضیہ اور اسحاق پھولے نہیں سمارہے تھے۔ جس جس کو اس رشتے کا علم ہوا وہ لیلیٰ کی قسمت پر رشک کیے بنا نہ رہ سکا۔ چوہدری زمان رنڈوا تھا۔ گزشتہ برس ہی اس کی بیوی کا انتقال ہوا تھا۔ اس کی ایک 7 سالہ بیٹی اور 5 سال کا بیٹا تھا۔ حویلی میں ایک بوڑھی ماں اور دو بچوں کے علاوہ نوکروں کی فوج تھی۔ چوہدری زمان کی بہنیں اپنے اپنے گھروں کی ہوچکی تھیں۔ دولت کی ریل پیل تھی۔ اس کی ذاتی زمینیں اتنی زیادہ تھیں کہ آدھا گاؤں چوہدری زمان کی زمینوں پر کام کرتا تھا مگر لیلیٰ کی حالت کاٹو تو بدن میں لہو نہیں جیسی ہورہی تھی۔ وہ جو رشتے آنے پر اماں کا انکار سن کر پُرسکون ہوجاتی تھی مگر اس بار پریشان ہو اٹھی تھی۔ سب کچھ اس کی سوچ کے برعکس ہورہا تھا اس کی صلاح لینے کی کسی نے زحمت ہی نہ کی۔

''لیلیٰ کے ابا اپنی رانی کے تو بھاگ جاگ گئے یہ ہماری خوش بختی ہے کہ چوہدری زمان نے خود ہمارے گھر رشتہ بھیجا ہے۔'' رضیہ کی آنکھیں مرعوبیت کے باعث چمک رہی تھیں۔ بیٹی کے جذبات اس کے آگے کوئی معنی نہ رکھتے تھے۔ خوشی کے مارے اسحاق کا چہرہ بھی سرخ ہورہا تھا۔ وہ بیوی کی تائید میں سر ہلاتے ہوئے بولا:

''چوہدری زمان کا کوئی دوسرا بھائی بھی نہیں ہے اس لیے وہ اپنی زمینوں کا بلاشرکت غیرے مالک ہے۔ اپنی لیلیٰ چوہدرائن بن کر رہے گی۔'' لالچ نے ان دونوں کی عقلیں سلب کرلی تھیں۔ وہ بھول چکے تھے کہ چوہدری زمان لیلیٰ سے 20 سال بڑا ہے۔

☆☆☆

وہ اندھیرے راستوں کو عبور کرتی اپنی مخصوص جگہ پہنچ گئی۔ ہمیشہ کی طرح ہاشم محو انتظار تھا۔ پیپل کا درخت خاموش کھڑا تھا۔ لیلیٰ کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ قریب آنے پر جب اس کے خدوخال واضح ہوئے تو ہاشم اچنبھا ہوا، غیر معمولی طور شوخ دکھنے والی لیلیٰ فکر و تشویش میں مبتلا نظر آرہی تھی۔

''خیر تو ہے لیلیٰ تو پریشان کیوں لگ رہی ہے؟'' ہاشم نے فکرمندی سے پوچھا۔

''دوسرے گاؤں سے چوہدری زمان کا رشتہ آیا ہے۔'' لیلیٰ نے نظریں جھکاتے ہوئے آہستہ سے بتایا۔ ہاشم کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔ کچھ لمحے اسی خاموشی کی نذر ہوگئے۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں دوبارہ گویا ہوئی۔

''اماں ابا نے سوچنے کے لیے رسمی مہلت مانگی ہے۔ مجھے پتا ہے وہ اس بار انکار نہیں کریں گے کیونکہ چوہدری زمان ان کی نظروں میں ہر لحاظ سے بہتر ہے۔'' دو آنسوں خاموشی سے گالوں پر لڑکتے ہوئے گریبان میں جذب ہوگئے تھے۔ ہاشم سے جدائی کا تصور ہی اس کے لیے سوہانِ روح تھا۔

''نہ لیلیٰ ایسا نہ سوچ، تو صرف میری ہے بس۔'' ہاشم نے تڑپ کر کہا۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ لیلیٰ کو کس طرح دلاسا دے۔ وہ چار سال سے اس کے انتظار میں تھی جانے آنکھوں میں کتنے خواب سجائے تھی۔

''تو اب مزید تاخیر نہ کر ہاشم، کل ہی پھوپی کو گھر بھیج دے۔'' لیلیٰ نے کہا۔

''ٹھیک ہے میں کل ہی اماں کو تیرے گھر بھیجوں گا۔ تجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے سب اچھا ہی ہوگا۔'' اس نے لیلیٰ کے ہاتھ پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

گھر آنے کے بعد وہ کتنی ہی دیر آنکھیں موندے اپنے اور ہاشم کی ملن کی دعائیں مانگتی رہی۔

☆☆☆

''اماں تجھ سے کچھ بات کرنا تھی۔'' ناشتا کرنے کے بعد اس نے ہاتھ پونچھے اور ماں کی طرف دیکھا۔

''کیا بات ہے بیٹا؟'' منیرہ نے سوالیہ نگاہوں سے بیٹے کی طرف دیکھا۔

وہ ذہن میں الفاظ کو ترتیب دینے لگا کچھ دیر توقف کے بعد بولا:

''اماں تجھے ماموں اسحاق کے پاس جانا ہوگا لیلیٰ کا ہاتھ مانگنے۔ میں اسے پسند کرتا... ہوں اور لیلیٰ کی بھی یہی تمنا ہے۔''

بیٹے کی بات سن کر منیرہ مسکرادی اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ''بیٹا میری تو بہت پہلے کی خواہش ہے کہ لیلیٰ میرے گھر کی بہو بنے اور تیری آنکھوں میں بھی لیلیٰ کے لیے پسندیدگی مجھ سے چھپی ہوئی نہیں ہے مگر......''

وہ بات ادھوری چھوڑ کر سوچ میں پڑ گئی۔

''مگر کیا اماں؟'' ہاشم الجھن بھری نظروں سے ماں کو تکنے لگا۔

''اکیلے لیلیٰ کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوسکتا۔ تیری ممانی کی آنکھوں میں اونچے خواب ہیں۔ ہمارے غریب گھر میں بیٹی کو دینے کو آسانی سے نہیں مانے گی۔'' منیرہ نے تفصیل سے اپنے خدشات بتائے۔ ماں اور بیٹا سوچ میں پڑ گئے۔

''اماں تو ماموں اسحاق سے بات کر۔ بگی تو وہ مان جائیں گے۔'' ہاشم نے ماں کو آسان راہ دکھائی۔ اسے جیسے یقین تھا ماموں بہن کا مان ضرور رکھیں گے۔

''اچھا تو فکر نہ کر میں جاؤں گی بھائی کے پاس۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

''اماں تجھے آج ہی وہاں جانا ہوگا۔'' وہ فوراً بول پڑا۔ پھر ہاشم نے ماں کو چوہدری زمان کے رشتے کے بارے میں تفصیلاً آگاہ کیا۔

''اس سے پہلے ماموں اور ممانی چوہدری زمان کے رشتے کے لیے ہاں کہہ دیں تجھے وہاں جانا ہوگا۔'' اس نے بے چینی سے ماں کو دیکھا۔

''ٹھیک ہے بیٹا میں تیرے ابا سے بات کرلوں پھر دیکھتے ہیں اللہ خیر کرے گا۔'' منیرہ اٹھ کر باہر چلی گئی۔ ہاشم نے ایک لمبی سانس لی وہ پُرسکون نظر آنے لگا تھا۔

☆☆☆

شام ہوتے ہی منیرہ اپنے دوسرے بھائیوں مشتاق اور اشفاق کو ہمراہ لیے اسحاق کے گھر پہنچ گئی۔ لیلیٰ نے پھوپی اور چچاؤں کو دیکھا تو اس کی سانس میں سانس آئی۔ رضیہ کے لیے منیرہ کا اس طرح دونوں بھائیوں کے ساتھ آنا غیر متوقع تھا۔ اس کا ماتھا ٹھنکا چہرے پر ناگواری کے رنگ ابھر آئے۔ لیلیٰ نے سب کے لیے چائے بنائی اور دوسرے کمرے میں آگئی۔ چائے وغیرہ سے فراغت کے بعد منیرہ اپنے مقصد کی طرف آگئی۔ ''اسحاق بھائی میں بڑی آس لے کر آپ کے پاس آئی ہوں۔ اُمید ہے جو مانگوں گی انکار نہیں کریں گے۔''

منیرہ نے بھائی بھاوج کی طرف دیکھتے ہوئے انکساری سے کہا۔ رضیہ کے چہرے پر سلوٹوں کا جال نمایاں تھا۔ ''بہت برس سے دل میں ایک خواہش پنپ رہی ہے مگر زبان تک لانے کی کبھی ہمت نہیں پڑی۔'' منیرہ نے تمہید باندھنے کے انداز میں کہا۔

''منیرہ تجھے جو کہنا ہے صاف صاف کہہ دے اتنی لمبی تمہید باندھنے کی کیا ضرورت ہے۔'' اسحاق نے بڑے گمبھیر

لہجے میں بہن کو کہا۔ رضیہ نے سختی سے ہونٹ بھینچ رکھے تھے۔ شاید وہ منیرہ کے کہے ہوئے الفاظ میں پوشیدہ معنی تک پہنچ چکی تھی۔ منیرہ نے دوپٹے کی جھولی بنا کر ہاتھ آگے پھیلائے اور بولی:

''میں لیلیٰ کو اپنی بیٹی بنانا چاہتی ہوں، ہاشم کے لیے لیلیٰ کا ہاتھ مانگنے آئی ہوں۔'' رضیہ اور اسحاق کو گویا سانپ سونگھ گیا۔ دفعتاً رضیہ کو جیسے ہوش آ گیا۔

''معاف کرنا منیرہ یہ تو ناممکن ہے۔'' رضیہ نے رکھائی سے جواب دے دیا۔ منیرہ نے التجائیہ نگاہوں سے بھائی کو دیکھا مگر اسحاق کا چہرہ تاثر سے عاری، سپاٹ تھا۔

''مگر رضیہ لیلیٰ کی بھی یہی خواہش ہے، وہ اور ہاشم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ دونوں بچوں کی خوشی اور بھلائی اسی میں ہے۔'' منیرہ نے ہاشم اور لیلیٰ کے جذبات سے ان لوگوں کو آگاہ کیا۔

''لیلیٰ کے لیے کس بات میں بھلائی ہے۔ یہ سوچنے کے لیے ہم ابھی زندہ ہیں۔ لیلیٰ ابھی نادان ہے اس کے مستقبل کا فیصلہ ہم دونوں کریں گے۔'' اسحاق نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''اور ویسے بھی لیلیٰ کی پہلے ہی چوہدری زمان سے رشتے کی بات چل رہی ہے کل تک ہم وہاں بات پکی کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔'' رضیہ نے فخر سے کہا۔ چوہدری زمان کا نام سنتے ہی مشتاق اور اشفاق چونک گئے۔ اشفاق سے رہا نہ گیا۔ افسوس سے بھائی کی طرف دیکھ کر بولا:

''چوہدری زمان اپنی لیلیٰ سے 20 یا 22 سال بڑا ہے یہ تو کوئی جوڑ نہیں بنتا۔''

رضیہ نے حقارت سے اشفاق کی طرف دیکھا اور ترنت بولی: ''ہنہ عمر کا کیا ہے مرد کی خوبصورتی اس کی بھری ہوئی جیب اور دولت ہوتی ہے۔ لیلیٰ وہاں چوہدرائن بن کر عیش کرے گی۔ ہر ماں باپ کی طرح ہماری بھی دلی خواہش ہے کہ ہماری بیٹی خوشحال زندگی گزارے۔''

''اسحاق بھائی، ہاشم گھر کا بچہ ہے نیک اور اچھا ہے۔ تعلیم مکمل کرتے ہی روزگار بھی مل جائے گا اور پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ لیلیٰ بھی ہاشم کو اپنا جیون ساتھی بنانا چاہتی ہے۔ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے قبل لیلیٰ کے احساسات کو بھی مدِنظر رکھیے۔'' مشتاق نے پہلی دفعہ زبان کھولی اور ہاشم کے حق میں دلائل دیئے مگر سب بے سود تھا۔

''ہاشم کو برسرروزگار ہونے میں ابھی وقت ہے اور ویسے بھی چوہدری زمان جیسے رشتے کو ٹھکرانا کفرانِ نعمت ہوگا۔'' اسحاق نے بےزاری سے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔

اشفاق اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور گرج کر بولا۔ ''بس کریں مشتاق بھائی، یہاں اور ٹھہرنا بے کار ہے۔ بھائی بھاوج کی آنکھوں پر چوہدری زمان کی دولت کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔ ان کے آگے خونی رشتے اہمیت کھو چکے ہیں۔''

''اشفاق بکواس بند کر۔'' اسحاق غصے سے دہاڑا۔

اشفاق جواب میں کچھ بھی کہے بغیر پیر پٹختے ہوئے باہر نکل گیا۔ منیرہ اور مشتاق بھی کمرے سے نکل کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ دوسرے کمرے کی دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی لیلیٰ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

☆☆☆

پورے گاؤں نے یہ دیکھا تھا کہ ایسی روشنیوں والی برات شاید ہی کسی لڑکی کی آئی ہو۔ لیلیٰ کی بری دیکھ کر خواتین کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ چوہدری زمان نے اپنی ہونے والی زوجہ کے لیے سونے کے زیورات کے ڈھیر لگا دیئے تھے۔ اسحاق اور رضیہ نے بھی بیٹی کو دینے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ جہیز کا ایک پہاڑ صحن میں سجایا گیا۔ لیلیٰ روکھی روکھی نگاہوں سے سب کچھ دیکھتی رہی اس کا دماغ ماؤف تھا، دل کی بستی کے تمام موسم ویران ہو چکے تھے، وہ اپنے حق کے لیے احتجاج بھی نہ کر سکی تھی۔ رخصتی سے قبل وہ بہت دیر تک انوری کے گلے لگی دھاڑیں مار مار کر روئی تھی ایک وہی تو تھی اس کی غم خوار جو اس کے غموں کو دل سے محسوس کر سکتی تھی۔

☆☆☆

مہمانوں سے فراغت کے بعد چوہدری زمان نے اپنی خلوت خاص کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے تنی ہوئی مونچھوں کو مزید تاؤ دیا اور ایک شان سے اندر داخل ہوا۔ پورے کمرے میں گلاب کے پھولوں کی خوشبو محو رقص تھی اس نے آہستگی سے دروازے کی چٹخنی چڑھائی اور بیڈ کی طرف بڑھا۔ توقع کے برعکس بیڈ پر کوئی نہ تھا۔ حیرت تو ہوئی پھر ذہن میں خیال ابھرا کہ ہو سکتا ہے اس کی منکوحہ واش روم میں گئی ہو۔ دفعتاً اس کی نگاہ واش روم کی طرف اٹھی اور منجمد رہ گئیں۔ سرخ عروسی لباس میں لپٹا وجود زمین پر بے سدھ پڑا تھا۔ وہ سرعت سے اس کے قریب گیا اور لیلیٰ کا سر اپنی گود میں رکھ کر اس کا گال تھپتھپانے لگا۔

''لیلیٰ...... لیلیٰ کیا ہوا ہے تمہیں۔'' چوہدری زمان

کے چہرے پر پریشانی و تفکر کی لکیریں عیاں تھیں۔ لیلیٰ کے وجود میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے اسے بازوؤں میں اٹھا کر بیڈ پر لٹا دیا۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ حجلہ عروسی میں گھستے ہی اسے اس طرح کی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ چوہدری زمان نے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھے جگ کو اٹھایا اور لیلیٰ کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔ چہرے پر پانی کے چھینٹوں کا لمس پڑتے ہی اس کی پلکیں تھرتھرانے لگیں پھر دھیرے سے لیلیٰ نے آنکھیں کھول دیں۔ چوہدری زمان اس کے چہرے پر جھکا اور بے تابی سے بولا:

''کیا ہو گیا تھا تمہیں لیلیٰ تم ٹھیک تو ہو؟'' وہ پیار سے اس کے پیشانی کے بال سہلانے لگا۔ اس نے چونک کر چوہدری زمان کی طرف دیکھا۔ دونوں آنکھوں کو سکیڑ کر وہ جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔

''کون ہو تم؟'' یہ کہتے ہوئے لیلیٰ نے اچانک پھرتی سے دونوں ہاتھ چوہدری زمان کے سینے پر جما کر پوری قوت سے اسے پرے دھکیل دیا۔ وہ اس اچانک حملے کے لیے تیار نہ تھا اس لیے بمشکل خود کو سنبھالا۔

وہ حیرت سے ششدر رہ گیا۔ لیلیٰ کے منہ سے نکلنے والے الفاظ اسے الجھن میں مبتلا کر گئے تھے۔

''کون ہو تم؟ میرے کمرے میں کیسے آئے؟'' وہ ناگن کی طرح پھنکاری تھی۔ بیڈ سے ٹیک لگائے اس نے دونوں گھٹنوں کو سینے سے چپکا رکھا تھا اور مضبوطی سے ان کے گرد بازو حمائل کیے ہوئے تھے۔ چوہدری زمان کے ماتھے کی سلوٹیں مزید گہری ہو گئیں۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو؟ میں چوہدری زمان ہوں تمہارا شوہر۔'' اس نے لیلیٰ کے کندھوں کو زور سے جھنجھوڑا۔

اسے جیسے چوہدری زمان کے چھونے سے کرنٹ لگا اور اس نے فوراً اس کے دونوں ہاتھوں کو جھٹک دیا۔

''میرے پاس مت آؤ دفع ہو جاؤ...... ہاشم......'' وہ دروازے کی طرف منہ کر کے وحشیانہ انداز میں چیخنے لگی۔

چوہدری زمان کو اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہوا یا الٰہی آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ شادی کی پہلی شب ہی اس کی بیوی اپنے مجازی خدا کو پہچاننے سے انکاری تھی۔ اسے لیلیٰ کی ذہنی حالت پر شبہ ہونے لگا۔ ذلت کی احساس سے اس کی آنکھیں غصے سے لال ہو رہی تھیں۔ چوہدری زمان ایک جھٹکے سے اٹھا اور کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

☆☆☆

لیلیٰ پاگل ہو گئی ہے پورے گاؤں میں یہ بات پھیل چکی تھی شادی کے اگلے روز ہی چوہدری زمان اسے اس کے والدین کے پاس چھوڑ کر چلا گیا تھا اس کا کہنا تھا کہ اس کو دھوکے میں رکھ کر ایک پاگل لڑکی کو اس کے پلے باندھ دیا گیا ہے۔ اسحاق اور رضیہ اس الزام پر بوکھلا گئے مگر بیٹی کی ظاہری حالت اور اس کی زبان سے نکلنے والے بے ربط جملوں نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ لیلیٰ کی ذہنی روٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ وہ کسی کی کوئی بھی بات سمجھنے سے قاصر تھی۔ اس کی آنکھوں کے آگے اجنبیت کی ایسی چادر تن گئی تھی کہ وہ اپنے عزیز اور قریبی رشتوں کو پہچاننے کی صلاحیت کھو چکی تھی۔ گھر کے صحن میں گاؤں کی بہت سی عورتیں جمع تھیں۔ ہر کوئی اپنی بساط کے مطابق رضیہ سے اظہار ہمدردی کر رہی تھی۔ رضیہ کا رو رو کر برا حال تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی بیٹی کی خوشیوں کو کسی بدبخت کی نظر لگ گئی ہے۔ لیلیٰ خاموش نظروں سے سب کی طرف دیکھتی رہتی پھر ہذیانی انداز میں چیختی چلاتی اور ہاشم ہاشم پکارتی۔ انوری اپنی سہیلی کی حالت دیکھ کر ضبط کھو بیٹھتی اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ وہ جانتی تھی ہاشم کی جدائی نے لیلیٰ کی یادداشت کو چھین لیا تھا مگر وہ کچھ بھی کرنے سے قاصر تھی۔ ہاشم جب ماں کے ساتھ ماموں کے گھر پہنچا تو رضیہ انہیں بلاوجہ کوسنے لگی۔

''منیرہ اب کیا تو میری بیٹی کی بربادی کا تماشا دیکھنے آئی ہے۔'' منیرہ کو بھاوج کے زہر میں ڈوبے الفاظ دکھ و تالیف کی اتھاہ گہرائیوں میں لے گئے۔

''بھابی یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔''

''بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں میں نے جب تجھے رشتے سے انکار کر کے اپنی بیٹی کو چوہدری زمان کے ساتھ رخصت کر دیا تو تیرے سینے پر سانپ لوٹ گئے۔ تیرے اندر جو حسد کی آگ تھی اس نے میری لیلیٰ کو لپیٹ میں لے لیا۔''

منیرہ سے بھی چپ نہ رہا گیا وہ پھٹ پڑی۔ ''بھابی افسوس ہے تیری سوچ پر، لیلیٰ مجھے اپنی بیٹی کی طرح عزیز ہے اس بات کا میرا خدا گواہ ہے۔ لیلیٰ بیٹی میرے حسد کی نہیں بلکہ آپ کے لالچ کی بھینٹ چڑھ گئی ہے۔''

''لالچ......کون سا لالچ۔ ارے میں تو اپنی بیٹی کو محفوظ مستقبل دینا چاہتی تھی مگر تم جیسے حاسدین کو یہ کہاں گوارا تھا۔ راتوں رات پتا نہیں ایسے کون سے تعویذ چلائے کہ میری بیٹی دوسرے روز ہی میکے آ بیٹھی۔'' رضیہ تمام

حدوں کو چھوتی جہالت سے سینہ پیٹنے لگی۔
''ممانی آپ کے نزدیک بیٹی کے بہتر مستقبل کے لیے دھن دولت واحد شرط ہے۔'' ہاشم جو ابھی تک ماں اور ممانی کے درمیان ہونے والے جملوں کے تبادلے سن رہا تھا بول پڑا۔ ''چوہدری زمان سے رشتہ جوڑتے وقت کیا آپ لوگوں نے ایک بار بھی لیلیٰ کی مرضی جاننے کی کوشش کی اگر آپ نے لیلیٰ کے جذبات و احساسات کی ذرا بھی پروا کی ہوتی تو وہ آج اس حال کو نہ پہنچتی۔'' ہاشم کی آواز بھرا گئی تھی۔ اس نے آستین سے آنکھوں میں آئے آنسو پونچھے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر چلا گیا۔

☆☆☆

وقت دھیمے دھیمے سرکتا رہا۔ لیلیٰ میں کوئی تبدیلی نہ آئی اسے کھانے پینے کا کوئی ہوش و شعور نہ رہا تھا۔ رضیہ اس کے سامنے کھانا رکھتی تو وہ اٹھا کر پھینک دیتی اور مغلظات بکتی رہتی۔ جب پاگل پن کا شدید دورہ پڑتا تو وہ اپنے ہوش و حواس سے بالکل ہی بے گانہ ہو جاتی۔ اسحاق اور رضیہ بیٹی کی حالت پر کڑھتے رہتے۔ انہیں اس بات کا بھی غم و غصہ تھا کہ چوہدری زمان نے پلٹ کر خبر تک نہ لی تھی۔

ہاشم کی زندگی بھی بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کا اب پڑھائی میں دل نہ لگتا تھا وہ جیسے تیسے کالج جاتا اور گھر آ کر کمرے میں پڑا رہتا۔ اس نے بہت بار لیلیٰ کو دیکھنے کی کوشش کی مگر رضیہ اسے دیکھتے ہی دروازہ بند کر دیتی۔ منیرہ اپنے بیٹے کی دگرگوں حالت پر پریشان رہنے لگی تھی۔ ہاشم آتے جاتے جب بھی کنویں کے پاس لگے پیپل کے درخت کو دیکھتا تو بہت کچھ یاد آنے پر اس کا دم گھٹنے لگتا۔ وہ جس کسی سے بھی لیلیٰ کے دن بہ دن بگڑتے ذہنی توازن کے بارے میں سنتا تو بے چین ہو اٹھتا۔ وہ کچھ بھی کرنے سے قاصر تھا۔ ممانی کے ذہن میں پکنے والی بدگمانیوں نے دونوں گھرانوں کے تعلقات کو بگاڑ دیا تھا۔ پھر اس کا ایک دن انوری سے ٹکراؤ ہوا تو اس نے ہاشم کو بتایا کہ لیلیٰ کا پاگل پن اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ اب وہ ہر ایک پر حملہ کرنے کو دوڑتی ہے۔ خالہ رضیہ نے احتیاطاً بیٹی کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی ہیں۔ اس نے افسردگی سے ہاشم کو لیلیٰ کے حالات بتائے۔

وہ بڑے دکھی انداز سے انوری کی باتیں سنتا رہا۔ وہ مزید بتانے لگی کہ گزشتہ ہفتے خالہ رضیہ کو کسی عورت نے ایک ایسے پیر بابا کا پتا بتایا جو کالے علم کو توڑنے اور جن بھوتوں کو بھگانے میں دور دور تک شہرت رکھتا ہے۔ خالہ رضیہ اس عورت کی مدد سے پیر بابا کو گھر لے آئی تھی۔ لیلیٰ کو دیکھنے کے بعد پیر بابا کا کہنا تھا کہ وہ اپنی روحانی طاقت سے یہ جان چکا ہے لیلیٰ کے وجود پر کسی شریر جن نے اپنے پنجے گاڑ رکھے ہیں اس کے دماغ پر اسی شریر جن کا قبضہ ہے پھر اس نے اپنا گھناؤنا عمل شروع کر دیا اس کا طریقہ علاج بہت دردناک تھا۔ پیر بابا نے لیلیٰ کے ہاتھ اور پاؤں رسیوں سے جکڑ دیئے اس کے بعد گرم گرم کوئلے اس کے ہاتھوں پر رکھ کر اذیتیں دیتا رہا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس طرح وہ اس شریر جن کو تکلیف دے کر لیلیٰ کا جسم اس سے آزاد کروا دے گا۔ لیلیٰ کی کربناک چیخیں پورے محلے میں گونجتی رہیں بہت دیر تک یہ سلسلہ چلتا رہا پھر آخر کار لیلیٰ کی بے ہوشی پر جا کر ختم ہوا۔ پیر بابا چلا گیا مگر لیلیٰ اب بھی ویسی ہی ہے اس کی حالت میں تبدیلی نہیں آئی۔ انوری بتا کر رونے لگی۔

☆☆☆

انوری کے ذریعے لیلیٰ کے بارے میں جان کر اس سے رہا نہ گیا اس نے منیرہ کو ساتھ لیا اور ماموں کے ہاں پہنچ گیا۔ رضیہ سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا وہ ماموں اسحاق کو اس بات پر قائل کرنا چاہتا تھا کہ لیلیٰ کو شہر لے جا کر کسی دماغی اسپتال میں دکھایا جائے۔ رضیہ نے حسب توقع ان دونوں کو دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ ہاشم نے لیلیٰ کی زخمی ہتھیلیوں کو دیکھا تو اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔ وہ ممانی کی جہالت کی وجہ سے دوہری اذیت جھیل رہی تھی۔ ہاشم کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایک لمحہ کو شناسائی کی لہر دوڑی پھر معدوم ہو گئی۔ وہ دوبارہ خلاؤں میں تکنے لگی۔ جانے کیوں اسے یقین تھا کہ لیلیٰ کی آنکھوں کے آگے تنا اجنبیت کا پردہ چاک ہو جائے گا۔ وہ پُرامید تھا۔ وہاں سے اٹھنے سے قبل وہ اور منیرہ ممانی کو اس بات پر قائل کر چکے تھے کہ لیلیٰ کے علاج کے لیے اسے شہر کے اچھے معالج کو دکھایا جائے۔

اگلے دن ہاشم کی مدد سے لیلیٰ کو شہر کے ایک اچھے ذہنی امراض کے اسپتال لے جایا گیا۔ ڈاکٹروں کی تشخیص کے بعد اسے پاگل خانے منتقل کر دیا گیا۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ لیلیٰ کے پاگل ہونے کی وجہ کوئی گہرا صدمہ تھا جسے وہ برداشت نہ کر پائی اور اپنے حواس کھو بیٹھی۔ اس کے بعد کچھ اور کہنا قبل از وقت تھا البتہ اس کی یادداشت کسی بھی وقت واپس آ سکتی تھی۔ اسحاق اور ہاشم لیلیٰ کو اسپتال داخل کروا کر واپس

آ گئے۔

☆☆☆

لیلیٰ کو پاگل خانے آئے ہوئے چار ماہ ہو گئے تھے۔ اس عرصہ میں وہ وقتاً فوقتاً اسپتال کے چکر لگاتا رہا مگر ہر بار اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ ڈاکٹر نے ابھی تک لیلیٰ کے متعلق کوئی اچھی اور خوش آیند خبر نہیں سنائی تھی۔ وجاہت علی ایک ماہر اور قابل ڈاکٹر تھا۔ لیلیٰ اسی کی نگرانی میں زیرِ علاج تھی۔ وہ ہاشم اور اسحاق سے لیلیٰ کی زندگی کے بارے میں چیدہ چیدہ سوالات کرتا رہتا تھا۔ ایک بار ہاشم نے ڈاکٹر وجاہت کو اپنے اور لیلیٰ کی محبت کے بارے میں بتایا تو وہ چونک گیا۔ ڈاکٹر وجاہت کے لیے یہ نئی بات تھی جو اسے ایک الگ زاویے سے سوچنے پر مجبور کر گئی تھی۔ ایک دن ڈاکٹر وجاہت نے ہاشم کو بتایا کہ پہلے کے حقائق جاننے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ لیلیٰ کے دل و دماغ نے لاشعوری طور پر آپ کو ہی اپنا جیون ساتھی مان لیا ہو آپ کے علاوہ کسی اور مرد کے بارے میں سوچا تک نہیں اس لیے نکاح کے چند گھنٹوں بعد وہ حجلۂ عروسی میں اپنے شوہر کے روپ میں چوہدری زمان کو ذہنی طور پر قبول نہ کر پائی۔ ممکنہ طور پر اسی چیز کی وجہ سے اس پر پاگل پن کا دورہ پڑا۔

ڈاکٹر وجاہت اس کی طرف دیکھتے ہوئے پُرسوچ انداز میں کہہ رہا تھا وہ بس سن بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک ادھیڑ عمر نرس کے ساتھ لیلیٰ کو دیکھنے گیا تھا۔ پاگل خانے کے گھٹن زدہ ماحول میں وہ ہڈیوں کا ڈھانچا لگ رہی تھی۔ ہاشم دور کھڑا اس کا جائزہ لیتا رہا۔ آنکھوں کے نیچے حلقے تیز ہو گئے تھے کچھ عرصہ پہلے جن آنکھوں میں اس کی چاہت کے دیئے ٹمٹماتے تھے اب وہ ساحرانہ کٹورے زندگی کی رمق سے محروم تھے۔ پپڑی زدہ ہونٹ خاموشی کا پیرہن اوڑھے ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ ہاشم کچھ دیر وہاں کھڑا پانیوں سے لبریز دھندلائی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا پھر ایک سرد آہ بھر کر واپس مڑ گیا۔

☆☆☆

''میں تمہاری شادی کرنا چاہتی ہوں تیرے ابا بھی یہی چاہتے ہیں ہم اپنی زندگی میں ہی تجھے ہنستا بستا دیکھنا چاہتے ہیں۔'' منیرہ نے نرمی سے اسے کہا۔ وہ چاہتی تھی ہاشم لیلیٰ کو بھول کر اب نئی زندگی کا آغاز کرے۔

''میں اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتا ہوں، مجھے ابھی گھر بسانے کی کوئی تمنا نہیں ہے۔'' اس نے ماں کو ٹالنے کے لیے تعلیم کو دلیل کے طور پر پیش کیا۔ مگر اب وہ ہاشم کا کوئی بھی عذر سن کر ٹلنے والی نہیں تھی۔

''تجھے تعلیم پوری کرنے سے کس نے روکا ہے تو چاہے تو شادی کے بعد بھی پڑھ سکتا ہے تیرا اور تیری بیوی کا خیال رکھنے کے لیے ہم ہوں گے نا۔'' منیرہ نے ناصحانہ انداز میں بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''مگر لیلیٰ کے ہوتے ہوئے میں کیسے کسی لڑکی کو اپنی زندگی کا حصہ بنا سکتا ہوں۔ میں نے لیلیٰ سے وعدہ کیا تھا کہ اس کے علاوہ کسی کو اپنا شریکِ سفر نہیں بناؤں گا، میں آج بھی اپنے وعدے پر قائم ہوں۔'' ہاشم نے اٹل لہجے میں کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''لیلیٰ پاگل ہو چکی ہے بیٹا وہ تیرا گھر بسانے کے قابل نہیں ہے پورا گاؤں یہ بات جانتا ہے تجھے بھی یہ حقیقت تسلیم کر لینی چاہیے۔'' ماں کے الفاظ سماعت سے ٹکرائے تو دروازے کی طرف بڑھتے قدم رک گئے۔

''لیلیٰ پاگل ہوئی ہے ماں مر تو نہیں گئی اس کے جیتے جی کسی اور کو اپنی زندگی میں شامل کر لیا تو ساری عمر ضمیر مجھے ملامت کرتا رہے گا۔'' ہاشم نے گہری سنجیدگی سے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

☆☆☆

بارش چھما چھم برس رہی تھی۔ بجلی زوردار آواز کے ساتھ چمکتی اور ماحول کو روشن کر دیتی پھر وہی گھور اندھیرا چھا جاتا کروٹیں بدل بدل کر وہ اکتا گیا تو اٹھ کر بیٹھ گیا سردی کی وجہ سے ہلکی ہلکی کپکپی طاری تھی اسے بے چینی سی محسوس ہو رہی تھی دل گھبرا رہا تھا۔ سخت سردی کے باوجود اس کے ماتھے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے نمودار ہو گئے تھے۔ وہ دوبارہ لیٹ گیا اور خود کو پُرسکون کرنے کے لیے لمبے لمبے سانس بھرنے لگا۔

☆☆☆

''بھائی...... ہاشم بھائی۔'' اسے لگا کوئی اسے بری طرح جھنجوڑ رہا ہے۔ جیسے ہی اس کی آنکھ کھلی سامنے زرینہ کھڑی تھی۔ تین چار سیکنڈ کے بعد اس کے دماغ نے کام کرنا شروع کیا۔ فجر کی اذان ہونے پر اس کی آنکھ لگی تھی ساری رات جاگنے کے باعث آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے دیکھا زرینہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھی۔

''بھائی لیلیٰ مر گئی ہے۔'' زرینہ کی بات سن کر ہاشم کو ایک دھچکا سا لگا۔

''ماموں اسحاق رات کو اسپتال گئے تھے لیلیٰ کی موت کے بعد وہ وہاں کے عملے کے ساتھ لیلیٰ کی لاش کو اسپتال کی گاڑی میں علی الصبح ہی گھر لے آئے ہیں۔'' زرینہ تفصیلات بتا رہی تھی۔

ہاشم کو آنکھوں کے دھندلکے میں زرینہ کے بس لب ہلتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ مگر اس کے دماغ میں ایک ہی جملے کی بازگشت تھی۔ ''لیلیٰ مرگئی ہے۔'' اسے اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہوا اس کے تصور میں لیلیٰ کی ویران آنکھیں گھوم گئیں جو ہمیشہ کے لیے بند ہو چکی تھیں۔ پپڑی زدہ ہونٹ دائمی خاموشی اختیار کر چکے تھے۔ کنویں کے نزدیک پیپل کا درخت بھی مایوس و افسردہ کھڑا ماتم کناں تھا۔

☆☆☆

دادی کے چہرے پر کرب، اضطراب اور بے چینی کے رنگ نمایاں تھے لگتا تھا اس کے دل میں برسوں سے دفن شدہ غم پھر سے ہرے ہو گئے ہیں۔ انہیں دیکھ کر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے لیلیٰ کی جواں سالہ موت ابھی ابھی واقع ہوئی ہو اور اس جواں مرگی نے انہیں نڈھال کر دیا ہو۔ ماحول پر عجیب سی افسردگی طاری ہو گئی تھی۔

''لیلیٰ کی موت کے بعد ہاشم نے کبھی نہ گھر بسانے کا عہد کر لیا تھا۔'' دادی بتانے لگی۔ ''تعلیم مکمل ہونے کے بعد اسے شہر کے کسی سرکاری ادارے میں نوکری مل گئی اور پھر وہ شہر میں ہی رہنے لگا۔ وہ مہینے میں ایک بار گاؤں میں اپنے والدین سے ملنے آتا تھا کچھ عرصہ بعد اس نے شہر میں رہائش کا مستقل بندوبست کر لیا اور اپنے ماں باپ کو لے کر ہمیشہ کے لیے گاؤں کو خیرباد کہہ دیا۔ میری آنکھوں کو آج بھی وہ منظر یاد ہے۔'' کچھ دیر توقف کے بعد وہ مسکراتے ہوئے دوبارہ گویا ہوئیں۔ ''جب وہ لوگ گاؤں کو چھوڑنے سے قبل ہمارے گھر آئے تھے۔ خالہ منیرہ بہت رنجیدہ نظر آ رہی تھیں۔ میرا یہاں بچپن، لڑکپن اور جوانی گزری ہے، بڑھاپے میں داخل ہو گئی ہوں.. مگر گاؤں چھوڑنے کا بالکل دل نہیں چاہتا یہ مہینے میں صرف ایک بار آتا ہے اس کی دوری میرے بوڑھے وجود کو اب کھائے جا رہی ہے۔'' خالہ منیرہ نے قریب ہی بیٹھے ہاشم کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا۔ کچھ دیر بیٹھ کر وہ لوگ چلے گئے۔ وقت اپنے روایتی انداز میں چلتا رہا۔ مہینے سالوں میں بدل گئے۔ میرے بڑے بھائی زبیر کو ان دنوں کام کے سلسلے میں شہر جانا پڑا وہیں اتفاق سے ان کی ہاشم سے ملاقات ہو گئی۔ وہ زبیر بھائی کو اپنے بیوی بچوں سے ملوانے گھر لے گیا۔''

''بیوی بچوں سے ملوانے؟'' میں نے الجھ کر دادی کی طرف دیکھا۔

''کیا ہاشم نے شادی کر لی تھی؟'' میرے سوال کے جواب میں دادی بولی:

''ہاں، خالہ منیرہ کے دن رات زور دینے پر سمجھانے بجھانے پر ہاشم کو شادی کے لیے رضامند ہونا پڑا۔ جذبات میں آ کر ہم خود سے بہت سے ایسے عہد کر لیتے ہیں پھر اپنی ذات کو اس عہد کے خول میں بند کر لیتے ہیں۔ ہاشم نے بھی جذبات میں آ کر شادی نہ کرنے کا عہد کیا تھا۔ اپنی ذات کو ایسی پابندیوں میں جکڑ لیا تھا جو ہمارے شریعت اور فطرت انسانی کے خلاف ہیں لیلیٰ کے ساتھ گزرا اس کا ماضی تھا مگر وقت نے بھی اسے باور کروا دیا تھا کہ تن تنہا ایک انسان کا زندگی کا یہ طویل ترین سفر کس قدر دشوار ہے قسمت کے آگے کسی کی چلی ہے نہ چلے گی فطرت بھی اپنا آپ منوا کر رہتی ہے۔ ہاشم چونکہ ایک اچھے عہدے پر کام کر رہا تھا اس لیے اس کی ایک معزز اور اعلیٰ خاندان میں شادی ہوئی۔ قدرت مہربان ہوئی پیسے کی خوب ریل پیل تھی۔ وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ خوشحال زندگی بسر کر رہا تھا۔ دوسری طرف لیلیٰ کے مرنے کے چھ ماہ بعد ہی اسحاق نے کسی دوسری عورت سے شادی کر لی تھی اور رضیہ کو گھر سے نکال دیا تھا۔ بیس سالہ رفاقت میں رضیہ اسحاق کو لیلیٰ کے بعد مزید اولاد کا تحفہ نہ دے سکی تھی۔ لیلیٰ کی موت کے بعد اسحاق کے دل میں اولادِ نرینہ کی تمنا شدت سے ہونے لگی وہ چاہتا تھا اس کی نسلیں بھی پروان چڑھیں۔ دوسری بیوی سے اس کے دو بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئی، شوہر کی طرف سے دھتکارے جانے کے بعد رضیہ کا آخری ٹھکانا اس کا میکا تھا اس لیے وہ اپنے بھتیجوں کے پاس چلی آئی۔ جہاں دن رات کام کرنے اور گوبر تھاپنے کے بعد زندہ رہنے کے لیے دو وقت کی روٹی مل جاتی اس کی زندگی کے آخری برس بہت کسمپرسی میں گزرے تھے۔ ہاشم اور اس کے خاندان کے لیے روزِ اوّل سے ہی دل میں بے وجہ نفرت اس کی بیٹی کی خوشیاں نگل گئی تھیں۔ کچھ انسانوں کو ان کے اعمال کی سزا اس دنیا میں ہی مل جاتی ہے لیکن انسان ازل سے ہی نا سمجھ ہے سمجھتا نہیں ہے رضیہ کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا تھا۔

++

جناب ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم!
ایک چھوٹی سی سچ بیانی ارسالِ خدمت ہے۔ انسان کچھ بھی کرلے ہوتا وہی ہے جو قسمت چاہے۔ اگر پسند آجائے تو نزدیکی اشاعت میں شامل کرلیں کیونکہ اس وقت ملک میں ایک متنازعہ بل کی گونج سنائی دے رہی ہے۔ اس وجہ سے یہ سچ بیانی زیادہ پسند کی جائے گی۔

حفصہ محمد فیصل
(کراچی)

گاؤں کی فضا میں ہر طرف بہار کے جھونکے بہار پر تھے۔ موسم کی اٹکھیلیاں دیسی ماحول میں زیادہ لطیف محسوس ہو رہی تھیں.. مگر حویلی کے سناٹے کو اس دلفریب موسم سے دور دور کا واسطہ نہیں تھا۔ آقا جان کی بارعب شخصیت نے کسی موسم کو اس حویلی میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کرنے دی تھی۔ اس لیے حویلی کی فضا ہمہ وقت گرم گرم رہا کرتی تھی۔ حویلی کے دیگر نفوس آقا جان کی مخالفت کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

یوں تو ویسے بھی غصہ آقا جان کی ناک پر سوار رہتا، لیکن جرگے میں اگلے گاؤں کے زمیندار فضل علی کے ہاں پوتے کی ولادت کی خبر نے تو آقا جان کے تن بدن میں آگ لگادی تھی۔ وہ تن فن کرتے حویلی میں داخل ہوئے تھے۔

ان کی آمد کی آہٹ نے ہر ایک کو سہا دیا تھا۔ سب کے سب سہم گئے۔ وہ بڑے کمرے میں داخل ہوئے۔ نوکرانی سے کہا کہ سب کو بلاؤ تقریباً سبھی بھاگے ہوئے آئے تھے اور اب ہال نما کمرے میں کھڑے تھے۔ ان میں بی بی جان، نعیم جان اور ان کی بہو سمیہ دم سادھے کھڑے تھے۔ سب کے سر جھکے ہوئے تھے۔ وہ منتظر تھے کہ آقا جان کیا کہنے والے ہیں۔

”بہو! ہم نے کہہ دیا ہمیں اس سال ہر صورت میں پوتا چاہیے، ورنہ نتائج کی ذمہ دار تم خود ہوگی۔“ آقا جان نے گرج دار آواز میں سمیہ کو تنبیہی لہجہ میں کہا۔

☆☆☆

”اللہ جی! ایک بچہ دے دیجیے، میں پھر کچھ نہیں مانگوں گی۔“ سمیہ مصلے پہ بیٹھی گڑگڑا رہی تھی۔ نعیم بیوی کی بے بسی پہ

تڑپ رہا تھا، وہ جانتا تھا کہ سمیہ اس معاملے میں مکمل بے قصور ہے، سارا قصور تو اس کی ادھوری ذات کا ہے، اسی وجہ سے تو بی بی جان نے ایک نچلے گھرانے کی موٹی سی سمیہ کا اس کے لیے انتخاب کیا تھا۔ دراصل وہ بیٹے کی کمزوری سے واقف تھیں، جو اس کمی کا پیدائشی شکار تھا اور ماں سے بہتر بچوں کی کمزوری کو کون پرکھ سکتا ہے؟

☆☆☆

نعیم بچپن سے ہی ایک کمزور بچہ تھا۔ پیدائش کے وقت ہی بی بی جان اس حقیقت سے واقف ہوگئی تھیں اور اس راز میں ان کی شریک دائی عالیہ تھی جس کے ہاتھوں بی بی جان نے نعیم کو جنا تھا۔

بی بی جان نے دائی عالیہ کو ہمیشہ دے دلا کر خوش رکھا تاکہ وہ اپنا منہ بند رکھے اور اس راز کو کبھی فاش نہ کرے۔

بی بی جان نے نعیم کی تربیت میں جی جان لگا دیا، انہوں نے ایسے خطوط پر نعیم کی تربیت کی کہ اس کے اندر سے نسوانیت کا پہلو کم سے کم نمایاں ہوں، مگر زیرک آنکھیں اس عیب کو سمجھ جاتیں، گاؤں کے کمی کمین اور مزارع اس عیب کو نگاہیں پست کر کے نظر انداز کر دیتے۔

نعیم جان کھیتوں میں دوڑتا پھرتا، کبھی کبھی لڑکیوں بالیوں کو کھیلتا دیکھ کر اس کا دل ہمک جاتا اور ایک کشش اسے ان کی طرف مائل کرنے لگتی مگر چوہدری شفقت کا بیٹا زبیر ہر وقت سائے کی طرح نعیم جان کے ساتھ لگا رہتا، وہ نعیم کو کوئی بھی ایسا کام نہ کرنے دیتا جس سے کوئی اس کی کمی کو محسوس کر لے۔ بی بی جان زبیر کو اس ڈیوٹی کے اچھے خاصے پیسے دیتیں، اسی لیے زبیر خوشی خوشی بلکہ سختی کے ساتھ اپنا فرض انجام دیتا تھا۔ شروع شروع میں نعیم جان کو یہ پابندی، روک ٹوک اور سختی بہت گراں گزرتی مگر پھر اس نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا کہ دنیا کے سامنے اسے مرد بن کر جینا ہے چاہے اس کا باطن جتنا بھی اسے ستائے۔

آقا جان نے ایک دو بار بیٹے کو عورتوں والی نشست برخاست پر ٹوکا بھی لیکن بی بی جان نے لاڈ سے بیٹے کا دفاع کر کے بات کو دبا لیا۔ آقا جان مزید اولاد کی خواہش رکھتے تھے مگر قدرت کی طرف سے نعیم ہی ان کا مقدر تھا۔

☆☆☆

"بی بی جان! م، م، میری ش، ش، شادی۔" نعیم اس خبر کو سن کر ہکلا گیا تھا۔ "بی بی جان آپ کیا کرنے جا رہی ہیں؟ میں کیوں کر اس لڑکی کی ضرورت کو پورا کر سکوں گا؟"

نعیم جان بچوں کی طرح بلک پڑا۔ اسے اپنی کمزوری اور ادھورے پن کا شدت سے احساس تھا، مگر بی بی جان نے اس موقع پر کٹھور پن کا مظاہرہ کیا۔ وہ بھی ایک ارمانوں بھرا دل رکھنے والی ماں تھیں۔ اپنی خوشی کے لیے انہوں نے ایک عورت کی زندگی کو داؤ پر لگانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

وہ بھی کیا کرتی؟ آخر کو ماں تھی، ان کے بھی ارمان تھے لیکن ایک لڑکی کی زندگی سے ایسا کھلواڑ کرنا، کہاں کا انصاف تھا؟

اور پھر بی بی جان نے نعیم جان کی اجاڑ اور بنجر زندگی کے ساتھ رمضان مزارع کی سمیہ کو منسوب کروا ہی دیا۔

☆☆☆

نعیم کی حقیقت پہلی رات ہی سمیہ کو کچھ کچھ سمجھ آ گئی تھی۔ مگر وہ ٹھہری کمی کمین کی بیٹی، چپ کی گرہ منہ پر لگائے اسے اب یہ زندگی بتانی تھی۔ نعیم اپنی سمی کی جھیل آنکھوں میں اداسی دیکھ کر خود کو قصوروار ٹھہراتا مگر اس کے اختیار میں بھی کچھ نہ تھا۔ وہ سمی کو خوش رکھنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتا لیکن جس چیز سے اسے اصل خوشی ملنی تھی وہ نہیں دے سکتا تھا۔

☆☆☆

شادی کو پانچواں سال تھا، سمیہ تو اب تک کنواری ہی تھی، اس کو وہ لمس وہ آسودگی کہاں ملی تھی جو ایک شادی شدہ زندگی کی علامت ہوتی ہے، مگر وہ خاموشی سے سب کچھ سہہ رہی تھی، وہ جانتی تھی کہ اس کا باپ غریب مزارع ہے، اس کے کسی باغی قدم سے اس کی عزت اور جان دونوں جائیں گی۔

حالانکہ نعیم جان نے شادی کی پہلی رات ہی سمیہ پر اپنی حقیقت عیاں کردی تھی، جسے سمیہ مقدر کا لکھا سمجھ کر راضی برضا ہوگئی تھی۔

مگر آج، آقا جان کا حکم اور گرج سن کر وہ دہل گئی، آقا جان کا شمار ان متکبر مردوں میں سے ہوتا تھا جو عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھتے ہیں اور اولاد کا ہونا نہ ہونا عورت ہی کی کمزوری اور بد نصیبی گردانتے تھے۔

پانچ سال تو بی بی جان بھی ٹھنڈے آسے بیٹھی رہیں، مگر آج آقا جان کی خواہش نے ان کو بھی دہلا دیا، بیٹے کی اندھی محبت نے ان سے ایک لڑکی کی زندگی تو تباہ کروا ہی دی تھی مگر اب؟

☆☆☆

بی بی جان کے شیطانی دماغ میں بیٹے کی لاج رکھنے کے لیے ایک اور منصوبہ پنپ رہا تھا۔

”دیکھ رجو! کسی کو اس بات کی کانوں کان خبر نہ ہو، ورنہ اگلے دن کا سورج دیکھنا تیرا مقدر نہیں بنے گا۔“ بی بی جان سفاکی سے بولیں۔

”میری توبہ بی بی! جو میں کسی کو کچھ بولوں، یہ سینہ تو آپ کے رازوں کا قبرستان ہے۔“ رجو بے دردی سے سینے کو پیٹ کر بولی۔

”مبارک ہو۔ آقا جان! آپ کی بہو کا پاؤں بھاری ہے، ہم سوچ رہے ہیں بہو کو لے کر کسی پُرفضا پہاڑی مقام پر چند ماہ کے لیے منتقل ہو جائیں۔“ بی بی جان نے بات بناتے ہوئے آقا جان کو قائل کر لیا۔

☆☆☆

”دیکھ سمیہ! تو، تو سب کے سامنے اپنے آپ کو حاملہ ظاہر کرے گی، کسی کو بھنک بھی نہ پڑے کہ یہ سارا ڈھونگ رچایا جا رہا ہے......“ بی بی جان سمیہ سے کرخت لہجے میں بولیں۔

”مگر بی بی جان بچہ آئے گا، کہاں سے؟“ سمیہ سے یہ گتھی سلجھ نہیں رہی تھی اسی لیے بات زبان پر آ گئی۔

”یہ سوچنا تیرا مسئلہ نہیں۔ سمجھی......؟“ بی بی جان نخوت سے بولیں۔

☆☆☆

”بی بی جان! یہ سمیہ نے کیا سوانگ رچایا ہے؟“ نعیم جان ہاتھ نچا کر بولا۔

”نعیم۔ تم کیوں پریشان ہوتے ہو، جب تک تمہاری ماں زندہ ہے، تمہاری پشت پناہی کرتی رہے گی۔“ بی بی جان کی آنکھیں جھلملا گئیں۔

☆☆☆

”رجو! حمیدہ کو بتا دو، تیاری کر لے وہ ہمارے ساتھ شکر گڑھ کی پہاڑ والی کوٹھی پر چلے گی، وہاں اس کی زچگی کا انتظام کر دیا گیا ہے۔“ بی بی جان رجو سے بولیں۔

حمیدہ اور اس کے گھر والے کو اتنی بڑی رقم دی گئی تھی کہ اس کی سات پشتیں راج کر سکیں گی۔ انہیں یہ حکم بھی سنا دیا گیا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ پہاڑ والی کوٹھی سے سیدھے کراچی چلی جائے اور پھر کبھی لوٹ کر نہیں آئے گی۔

☆☆☆

پہاڑ والی کوٹھی کے بڑے کمرے میں بی بی جان، سمیہ اور رجو بے چینی سے ٹہل رہی تھیں۔

اوں آں، اوں آں۔ بچے کی آواز سن کر بی بی جان ایک فاتحانہ انداز سے مسکرائیں۔ ”یہ لیں بی بی جان......

”لڑکا ہے نا؟“ بی بی جان دائی کو مخاطب کر کے بولیں۔

دائی نظریں جھکا گئی۔

بی بی جان نے بے قراری سے بچے کا جائزہ لیا اور پھر......

”آہ! ایک مخنث کی گود میں ایک مخنث ہی پلنے کے لیے قدرت نے بھیج دیا تھا۔“

++

میزبان

محترم مدیر
سلامِ تہنیت!
ایک تازہ تخلیق ارسالِ خدمت ہے۔ گو کہ ایسے واقعات کو کہانی کے انداز میں پیش کرنا خاصہ مشکل کام ہے پھر بھی کوشش کرلی ہے، یہ بھی بتاتا چلوں کہ ایسے واقعات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنا ممکن نہیں لیکن کہیں نہ کہیں ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں۔ جس کی روداد ہے اس کا نام اور مقام بدل دیا ہے۔

میاں محمد احمد
(ڈیرا نواب، احمد پور شرقیہ)

کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں جن کو ہم حیرت انگیز، ناقابلِ یقین کہہ دیتے ہیں۔ اگر کوئی اور کہے تو ہم اس پر یقین کرنے سے انکار بھی کردیتے ہیں۔۔ کیونکہ ایسے واقعات کی توجیح مشکل ہے۔ میرے ساتھ بھی ایک ایسا واقعہ پیش آیا ہے جو عقل کی کسوٹی پر پرکھا نہیں جاسکتا۔ میں انہیں جھٹلا بھی نہیں سکتا کیونکہ اس واقعہ کا ایک کردار میں خود بھی ہوں۔ یہ واقعہ کافی پرانا ہے لیکن دلچسپ اور اسرار بھرا ہے اس لیے آپ بھی سن لیں۔ نئی نئی نوکری تھی اس لیے میں چھٹی لینے کے حق میں نہ تھا مگر عید ایسا تہوار ہے کہ ہر ایک کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ عید اپنوں کے ساتھ منائے۔ پھر امی کا بھی تقاضہ تھا کہ میں عید

پر ضرور آؤں۔ میں نے رات کی ٹرین پکڑی تھی تاکہ منہ اندھیرے پہنچ جاؤں۔ ٹرین میں سوار ہوئے دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ کمپارٹمنٹ کے تمام مسافر یا تو اونگھ رہے تھے یا خراٹے لے رہے تھے۔ میں بھی برتھ پر بے خبر سو رہا تھا کہ لوگوں کے بولنے کی آواز نے بیدار کر دیا۔ ٹرین کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ ہر طرف اندھیرے کا راج تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ گاڑی کسی جنگل میں کھڑی ہے۔ مسافر بھی ٹرین سے اتر کر کھلی فضا میں چہل قدمی کر رہے تھے۔ میں نے پاس سے گزرتے ہوئے ایک شخص سے پوچھا۔ ''بھائی جان یہ ہوا کیا ہے؟''

''انجن کا پانی راستے میں گر گیا۔ پانی بھرنے کے لیے انجن کھڑا ہے۔''

میں نے اتر کر دیکھا، بہت ہی چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔

خستہ حال پلیٹ فارم پر کھڑا گارڈ نظر آیا تو میں نے تصدیق کے لیے گارڈ سے پوچھا۔ ''ٹرین یہاں کیوں رکی ہے؟''

گارڈ نے جواب دیا۔ ''انجن میں پانی کافی کم ہو گیا تھا اس لیے یہاں پانی بھرنے کے لیے رک گئے ہیں۔''

''کتنی دیر لگے گی؟''

گارڈ نے بے اعتنائی سے جمائی لیتے ہوئے کہا۔ ''آدھا گھنٹا تو لگ جائے گا۔ اگر آپ باہر جانا چاہتے ہیں تو جلدی واپس آجایئے گا۔ یہ ویران اسٹیشن ہے۔ دھیان رکھیے گا۔''

میں فوراً ٹرین سے اترا اور اردگرد کا جائزہ لیا۔ یہ ایک انگریزی فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ تھا جو وقت گزرنے کے بعد بھی خوبصورت لگ رہا تھا۔ ایک طرف گارڈ اور اسٹیشن ماسٹر کے کمرے تھے اور ایک طرف پانی کی بڑی سے زنگ آلود ٹینکی تھی۔ اسٹیشن کے اردگرد گھنے درخت تھے۔ میں چہل قدمی کرتے ہوئے اسٹیشن سے باہر نکل آیا۔ آسمان پر چودھویں کا چاند بادلوں سے کھیل رہا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا سے درخت ہل رہے تھے۔ کچھ دور چلنے کے بعد مجھے چند بڑی اور پرانی طرز کی حویلیاں نظر آئیں۔ ایک حویلی کے باہر مجھے ایک بینچ نظر آئی میں اس پر بیٹھ گیا اور نا جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ ٹرین کی سیٹی بجنے سے میری آنکھ کھلی تو میں ہڑبڑا گیا اور اسٹیشن کی طرف بھاگا۔ وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ ٹرین جا چکی ہے۔ مجھے اپنے اوپر خوب غصہ آیا۔ اتنے میں اسٹیشن ماسٹر نے مجھے آواز دی۔ میں بادل ناخواستہ اس کے پاس گیا تو اس نے بڑی شفقت سے کہا۔ ''جناب لگتا ہے کہ ٹرین چھوٹ گئی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''جی ہاں میں چہل قدمی کرتے ہوئے ذرا دور نکل گیا تھا۔''

اس نے کہا۔ ''اب تو صبح دس گیارہ بجے سے پہلے کوئی دوسری ٹرین نہیں آئے گی۔''

میں نے پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھا تو اس کے قریب بیٹھے ہوئے اسسٹنٹ نے جو تقریباً اونگھ رہا تھا، بولا۔ ''بابو جی! یہ ہالٹ اسٹیشن ہے بہت کم ٹرین رکتی ہے اب صبح ایک ٹرین رکے گی۔ تب تک آپ یہاں رک جائیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''یہاں سے آدھ میل دور جو عالیشان حویلیاں نظر آرہی ہیں وہ کس کی ہیں؟''

اسٹیشن ماسٹر نے کہا۔ ''جناب وہ یہاں کے زمینداروں کی ہیں مگر چند ایک ہی آباد ہیں باقی عرصے سے ویران پڑی ہیں۔''

میں بے چینی کے عالم میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ اتنے میں میری نظر اسٹیشن کے بورڈ پر پڑی جہاں آدھ مٹے الفاظ میں حستی خان لکھا ہوا تھا۔ یہ نام پڑھتے ہی میرے ذہن میں ہل چل مچ گئی۔ ماضی کے اوراق پلٹنے شروع ہو گئے۔ ''فیروز خان۔'' ''فیروز اجمل'' یہ نام میرے ذہن میں آنے لگے۔ میں نے یاد کیا تو مزید یادیں بھی سامنے آگئیں۔ فیروز میرا کلاس فیلو تھا۔ ہم پورے تین سال اکٹھے پڑھتے رہے تھے۔ وہ میرے ساتھ ہاسٹل میں رہتا تھا۔ سال میں صرف عید کے موقع پر ہی وہ گھر جاتا تھا۔ لمبا قد اور معصوم چہرہ میرے ذہن کے کینوس پر ابھرا۔ پورے کالج میں اس کا صرف میں ہی دوست تھا۔ اس نے مجھے بارہا اپنے ہاں چلنے کے لیے اصرار کیا مگر کسی نہ کسی مجبوری کے باعث میں نہ جا پاتا۔ جب ہمارا کالج کا دورانیہ ختم ہوا اور ہم اپنے اپنے شہر واپس جانے لگے تو اس نے مجھ سے اپنے گاؤں ''حستی خان'' آنے کا وعدہ لیا۔ اب پورے ایک سال بعد میں اتفاقاً اس کے علاقے میں آپہنچا تھا مگر کیا اب بھی وہ یہیں رہتا ہے؟ یہ سوال میرے ذہن میں ابھرا۔ میں فوراً اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کی طرف گیا اور اس سے پوچھا۔ ''جناب یہاں ''فیروز اجمل'' نام کا کوئی شخص رہتا ہے؟''

میرے سوال پر اونگھتا ہوا اسسٹنٹ اٹھ بیٹھا اور بولا۔ ''چودھری اجمل کا بیٹا؟ ہاں مگر کیوں...... کیا کام ہے آپ کو؟ وہ آپ کا کیا لگتا ہے؟''

''وہ میرا ہم جماعت تھا ہم دونوں نے اکٹھے کالج میں

کافی عرصہ گزارا ہے۔"
"آپ کا نام میاں محمد احمد تو نہیں۔" اسٹیشن ماسٹر نے اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں سے میرا جائزہ لیا۔
"ہاں مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" میں نے استفسار کیا۔
اسٹیشن ماسٹر بولا۔ "جناب فیروز صاحب ہر ایک دو ہفتے بعد کسی کو بھیج کر معلوم کراتے ہیں کہ میاں محمد احمد نام کا کوئی آدمی تو ان سے ملنے نہیں آیا۔ ہمیں تو خاص طور تاکید کی ہوئی ہے کہ جب بھی اس نام کا کوئی بندہ آئے تو اسے میری حویلی پہنچا دینا۔" یہ کہہ کر وہ اسسٹنٹ سے مخاطب ہوا۔ "بابو صاحب کو چودھری جی کی حویلی چھوڑ آؤ۔"
میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں انہیں تکلیف نہ دیں۔ آپ مجھے پتا بتا دیں میں خود ہی چلا جاتا ہوں۔"
گارڈ نے بتایا۔ "دائیں طرف کی آخری سفید مرمر والی حویلی انہی کی ہے۔ انہیں ہمارا سلام کہیے گا۔"
میں ان کا شکریہ ادا کر کے باہر آ گیا اور بڑے بڑے قدم اٹھاتا ہوا حویلی کی طرف چل پڑا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ فیروز واقعی ایک بہترین دوست ہے جو مجھے اب تک نہیں بھولا اور میں ہوں کہ اس کی دعوت کو نظر انداز کرتا رہا۔ خیر اب میں معذرت کر لوں گا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد مجھے سفید مرمر کی تین منزلہ حویلی نظر آئی۔ بے تحاشا جنگلی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں اور بعض جگہوں سے مرمت کی اشد ضرورت ظاہر ہو رہی تھی۔ پھر بھی یہ حویلی بڑی اور خوبصورت تھی۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے بڑے دروازے پر لگے کنڈے کو زور سے بجایا۔ پوری حویلی اس کے شور سے گونج اٹھی۔ چند لمحوں بعد گڑگڑاہٹ کے ساتھ دروازہ کھلا اور فیروز نمودار ہوا۔ وہ پہلے کی نسبت کافی کمزور ہو چکا تھا۔ اس کا رنگ بھی زرد لگ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ پہچانا ہی نہ گیا۔ لالٹین کی روشنی جو اندر سے آ رہی تھی مجھ پر پڑی تو فیروز چونک کر بولا۔ "احمد! احمد!" اور فوراً مجھ سے لپٹ گیا۔ اس نے مجھے اندر آنے کا کہا اور بولا۔ "مجھے امید تھی کہ تم کبھی نہ کبھی ضرور آؤ گے۔ آؤ تمہیں اپنے والدین سے ملواتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ مسکراتا ہوا مجھے حویلی کے اندر لے گیا۔
نچلی منزل میں ایک وسیع ہال تھا۔ اس کے دائیں بائیں کمروں کے دروازے تھے۔ ہال کے وسط میں پرانے طرز کی میز اور کرسیاں پڑی تھیں۔ چھت سے دو بڑے بڑے فانوس لٹک رہے تھے۔ جن میں جلنے والی موم بتیاں پورے ہال کو روشنی پہنچانے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ عام طور سے ایسے فانوس اب کہیں نظر نہیں آتے۔ میں ابھی ہال کو بغور دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک طرف کا دروازہ کھلا اور ایک باوقار جوڑا نکل کر ہماری طرف بڑھا۔ قریب آنے پر فیروز نے چہکتے ہوئے کہا۔
"ابو جان! یہ ہے میرا دوست احمد جس کا میں آپ سے ذکر کرتا تھا۔"
اتنے میں ایک اور کمرے کا دروازہ کھلا اور دس بارہ سال کا لڑکا بھاگتا ہوا آیا اور اپنی ماں کے پاس کھڑا ہو گیا۔
"خوش آمدید بیٹا! فیروز اکثر تمہارا ذکر کیا کرتا تھا۔ اسے اپنا گھر سمجھو۔" فیروز کے والد نے بارعب آواز میں کہا۔
تبھی فیروز کی ماں بولیں۔ "بیٹا ہمیں بہت خوشی ہوئی کہ فیروز کا دوست اس سے ملنے یہاں تک آیا۔ اگر کوئی بھی مسئلہ ہو تو بلا جھجک ہمیں بتا دینا۔"
ان کے اس شاندار انداز میں مجھے خوش آمدید کہنے پر میں صرف شکریہ ہی کہہ سکا۔ پھر فیروز کی ماں نے کہا۔ "بیٹا انہیں ان کا کمرا دکھاؤ اور پھر نیچے لے آؤ۔ ہم اکٹھے کھانا کھائیں گے۔" یہ سن کر فیروز مجھے اوپر کی منزل پر لے گیا جہاں ایک بڑا کمرا میرے لیے مختص تھا۔
"تم آرام سے منہ ہاتھ دھو لو۔ میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر فیروز نیچے چلا گیا۔
کمرے میں ایک بڑا سا شیشہ لگا ہوا تھا۔ میں اس کے سامنے کھڑا ہو کر اپنا حلیہ درست کر رہا تھا کہ مجھے شیشہ میں سے دروازہ کھلتا ہوا نظر آیا جو کہ میری پشت پر تھا۔ مگر کوئی اندر آتا ہوا دکھائی نہ دیا۔ "کھانا لگ گیا ہے نیچے آ جائیے۔"
آواز سن کر میں پیچھے مڑا تو چونک گیا کیونکہ فیروز کا بھائی کھڑا مسکرا رہا تھا۔ میں نے پھر شیشے میں دیکھا تو وہاں صرف میرا عکس تھا جبکہ بچے کا نام و نشان نہ تھا۔ یہ دیکھ کر ایک سرد لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ اتنے میں دوبارہ دروازہ کھلا اور فیروز اندر آیا۔ اس کا عکس واضح نظر آ رہا تھا۔ اس نے آتے ہی کہا۔ "یار! یہ میرا چھوٹا بھائی باسط ہے۔ بہت شرارتی ہے۔ میں نے اسے تمہیں بلانے کے لیے بھیجا تھا۔ آؤ کھانا تیار ہے تم بھوکے لگ رہے تھے، اس لیے امی نے جلدی کھانا نکال دیا ہے، آؤ مل کر کھاتے ہیں۔"
میں اپنے آپ کو بڑی مشکل سے سنبھال کر نیچے آیا۔ میز پر بیٹھ کر بھی میں خیالات میں گم تھا کہ فیروز نے کہا۔ "کوئی پریشانی ہے کیا؟ ویسے بھی میں نے تمہارا سامان نہیں دیکھا۔"
میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "ہاں یار اسٹیشن پر

جہلم قدمی کے لیے اترا تھا کہ ٹرین چھوٹ گئی۔" اور پھر میں نے اپنی سرگزشت انہیں سنادی۔

فیروز کی ماں نے مجھے تسلی دی اور کہا۔ "بیٹا جب تک چاہو... یہاں رہ سکتے ہو۔ کوئی بھی چیز چاہیے ہو تو فیروز سے کہنا مل جائے گی۔ چلو اب کھانا کھالو۔"

فیروز کی ماں نے سب کو کھانا پلیٹ میں نکال کر دیا۔

کھانا نہایت لذیذ تھا۔ ایسا کھانا میں نے کہیں اور نہیں کھایا تھا۔ کھانا کھانے کے دوران میں نے ایک بات اور محسوس کی کہ میں اور فیروز رغبت سے کھا رہے تھے جبکہ باقی تینوں کھانے کو منہ تک لے جا کر بغیر کھائے واپس پلیٹ میں رکھ دیتے۔ میں نے سوچا شاید وہ پہلے ہی کھا چکے ہوں۔ اس لیے اب صرف میرا ساتھ دینے کے لیے میز پر بیٹھے ہیں۔

تبھی فیروز نے کہا۔ "یار میں اکثر رات کو کھانا نہیں کھاتا۔ آج بھی امی نے کھانا بنایا تھا مگر ہم میں سے کسی نے بھی نہیں کھایا۔ تمہاری وجہ سے میں بھی کھا رہا ہوں۔"

کچھ دیر بعد میں اور فیروز، اس کے والدین اور بھائی کو "شب بخیر" کہہ کر اوپر والے کمرے میں چلے آئے اور بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ فیروز مجھے کچھ عرصہ مزید رکنے پر مجبور کر رہا تھا۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے سمجھایا۔ "عید نزدیک ہے۔ امی کا تقاضا ہے اس لیے ابھی رک نہیں سکتا۔ واپسی پر دوبارہ تمہارے پاس رکوں گا۔"

اس نے مجھ سے وعدہ لیا اور کچھ دیر مزید باتیں کرنے کے بعد وہ بھی سونے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں بھی بستر پر لیٹ گیا۔

رات تین چار بجے کے قریب اچانک میری آنکھ کھلی۔ میں نے اٹھ کر دیکھا تو لالٹین جل رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ اسے بجھا دیتا ہوں۔ اتنے میں دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ پہلے تو میں گھبرایا کہ رات کے اس پہر کون ہو سکتا ہے؟ پھر بستر پر آدھی کھلی آنکھوں کے ساتھ لیٹ گیا تاکہ دیکھ سکوں کہ آخر دروازہ کھولنے والا کون ہے؟

دروازہ کھلا اور باسط اندر آیا، مجھے سوتا دیکھ کر وہ باہر گیا اور پھر چند لمحوں بعد اس کے والدین اس کے ہمراہ کمرے کے اندر آئے۔ فیروز کی والدہ کی ہاتھ میں لکڑی کا چھوٹا سا صندوق تھا جسے انہوں نے میرے پلنگ کے ساتھ قریب رکھے میز پر رکھ دیا اور پھر تینوں میرے سرہانے کھڑے ہو گئے اور آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ ان سب کے رنگ نہایت پیلے اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر مجھ پر دہشت طاری ہو رہی تھی اور میں بامشکل اپنی حالت پر قابو پا کر لیٹا رہا۔ اچانک باسط نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس کا ہاتھ برف سے بھی زیادہ ٹھنڈا اور بے وزن تھا۔ اتنا ٹھنڈا جیسے کہ کوئی مردہ ہو۔ پھر وہ پُراسرار مسکراہٹ چہرے پر سجائے چند قدم دور ہو گیا۔ پھر اس کے ماں باپ نے باری باری اپنے برفیلے ہاتھوں سے میرے سر پر پیار دیا اور کھڑکی کی طرف دیکھ کر فوراً کمرے سے باہر نکل گئے۔ میں خوف اور اضطراب کی حالت میں بستر پر لیٹا رہا پھر نجانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

جب آنکھ کھلی تو صبح کے نو بج رہے تھے، میرا پورا جسم پسینے سے بھگا ہوا تھا۔ میں اب تک ہونے والے واقعات کو بھلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا۔ میں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "جی آجائیے!"

دروازے سے فیروز نمودار ہوا۔ مجھے دیکھ کر وہ بولا۔

"میں پہلے بھی دو بار آیا تھا کر جواب نہیں ملا تو میں سمجھا شاید تم سو رہے ہو۔ خیر نہا دھو لو تمہارے لیے کپڑے رکھ دیئے ہیں اور پھر آجاؤ ناشتا کرتے ہیں۔" وہ یہ کہہ کر چلا گیا۔

نہا دھو کر میں نے کپڑے تبدیل کیے اور نیچے میز پر آ گیا جہاں فیروز میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کر ایک کرسی میرے لیے کھینچی۔ میں اس پر بیٹھ گیا اور پھر اس کے اصرار پا ناشتا کرنے لگا۔ ناشتے کے دوران وہ بولا۔ "امی جان کا تحفہ کیسا لگا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ جانے سے پہلے تمہیں تحفہ دے دیں گی؟"

میں نفی میں سر ہلانے والا تھا کہ مجھے لکڑی کا وہ صندوق یاد آیا جو میرے سرہانے رات کو رکھا گیا تھا۔ میں فوراً اٹھا اور اوپر والے کمرے میں گیا جہاں وہ چھوٹا سا صندوق ابھی بھی پڑا تھا۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے اسے اٹھایا اور نیچے فیروز کے پاس آ گیا۔ میں نے کہا۔ "میرے پلنگ کے ساتھ والی میز پر یہ پڑا تھا۔"

"ہاں یہی وہ تمہارے لیے چھوڑ کر گئی ہیں۔ اُمید ہے تمہیں پسند آئے گا۔" فیروز نے مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

میں نے ڈبے کا ڈھکن اٹھایا تو اس کے اندر ایک پرانے طرز کی نایاب گھڑی تھی۔

"شاندار۔ بہت خوبصورت ہے۔" یہ الفاظ بے اختیار میرے منہ سے نکل آئے۔

"مجھے اچھا لگا کہ یہ تمہیں پسند آئی۔"

میں نے پوچھا۔ "تمہاری امی جان کہاں ہیں، انہیں

بلاؤ تاکہ میں خود شکریہ ادا کرسکوں اور جانے سے پہلے ان سے مل سکوں۔"

یہ سن کر فیروز کا چہرہ پھر غم زدہ ہوگیا۔ اس نے ہلکی سی مرجھائی ہوئی آواز میں کہا۔ "وہ تو جاچکے ہیں، اب وہ شام کو ہی آئیں گے...... غروب آفتاب کے بعد......" اس کا لہجہ نہایت عجیب اور پُراسرار تھا۔

میں نے اس سے کہا۔ "جب وہ آئیں تو انہیں میری طرف سے شکریہ کہنا اور چھوٹے کو پیار دینا۔ میری ٹرین کا وقت ہونے والا ہے اب مجھے چلنا ہوگا۔"

فیروز نے اداس لہجے میں کہا۔ "دوبارہ کب آؤ گے؟"

"جلدی واپس آنے کی کوشش کروں گا۔" میں نے مجبوراً یہ جملہ کہا۔

فیروز نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "تنہائی...... اکیلا پن...... خیر میں تمہارا انتظار کروں گا۔ اُمید ہے تم جلد آؤ گے۔"

میں نے ہاں میں سر ہلایا اور پھر دعا سلام کے بعد اس سے رخصت چاہی تو اس نے بھی اسٹیشن تک میرا ساتھ دینے کا اصرار کیا مگر میں نے اسے مزید زحمت نہ دی اور اس سے الوداع کہہ کر اکیلا ہی اسٹیشن چلا آیا۔ ساڑھے دس کے قریب میں اسٹیشن پہنچا تو اسٹیشن ماسٹر مجھے دیکھتے ہی بلند آواز میں بولا۔ "جناب بس دس پندرہ منٹ میں ٹرین آنے والی ہے۔ آپ سنائیں رات کو کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا۔"

"نہیں۔ فیروز کے گھر آرام سے قیام کیا۔ انہوں نے میرا بہت خیال رکھا۔" میں نے جواب دیا۔

"ہاں! فیروز صاحب اب اکیلے جو رہتے ہیں۔ آپ کو دیکھ کر خوش ہوئے ہوں گے۔ کئی ماہ بعد ان کا کوئی عزیز ان سے ملنے آیا ہے۔" گارڈ نے چائے پیتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا۔ "اکیلے تو نہیں بلکہ ان کی پوری فیملی نے میرا بہت دھیان رکھا۔ بہت اچھے اور ملنسار لوگ ہیں۔"

میری اس بات پر گارڈ ایسے اچھلا جیسے اسے سانپ نے پھن مارا ہو۔ اس نے گھبرا کر کہا۔ "کیا مطلب آپ کا؟ آپ ان کے والدین اور بھائی سے بھی مل کر آئے ہیں!"

"ہاں مگر اس میں حیرانی کی کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

گارڈ اور اسٹیشن ماسٹر ایک دوسرے کی طرف ایسے دیکھنے لگے جیسے انہیں میری دماغی حالت پر شک ہو۔ چند لمحوں بعد ٹرین کی سیٹی کی آواز آئی تو گارڈ بھاگ کر پٹری کی طرف گیا تاکہ لال جھنڈی دکھا کر ٹرین کو روک سکے۔ اتنے میں اسٹیشن ماسٹر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "جناب آپ کو یقین ہے کہ آپ واقعی چودھری اجمل اور ان کے بیوی بچے سے بھی ملے تھے۔"

میں نے اس سوال پر ان کا پورا حلیہ بیان کردیا اور اپنے ساتھ ان کا رویّہ بھی تفصیلاً بتادیا۔ اتنے میں گارڈ ٹرین کو روک چکا تھا اور مجھے آواز دینے لگا۔ میں ٹرین کی طرف بڑھنے لگا کہ اسٹیشن ماسٹر اپنے کمرے سے باہر نکل کر میرے قریب آیا اور بولا۔ "جناب چودھری اجمل، ان کی گھر والی اور ان کا چھوٹا بیٹا آج سے کئی سال پہلے چیچک کی بیماری کے باعث فوت ہوچکے ہیں۔ فیروز صاحب اس وقت شہر پڑھنے گئے ہوئے تھے۔ چودھری صاحب نے اپنی بیماری کے دوران فیروز صاحب سے ملنے کی بڑی خواہش کی مگر وہ پوری نہ ہوسکی ان کی وفات کے بعد ان سب کو حویلی میں ہی دفن کردیا گیا کیونکہ یہ چودھری صاحب کی وصیت تھی۔ فیروز صاحب جب اپنی پڑھائی مکمل کرکے واپس آئے تو انہیں بہت صدمہ پہنچا۔ گاؤں کے لوگوں نے ان کے لیے نئی حویلی بنانے کا مشورہ دیا تو انہوں نے صاف انکار کردیا اور اپنی زمینیں اپنے باپ کے جاننے والے لوگوں کے حوالے کرکے خود اپنے آپ کو حویلی میں بند کرلیا۔ کبھی کبھار وہ اپنی زمینوں کا چکر لگالیتے ہیں اور کسی کو بھیج کر آپ کا پوچھتے رہتے ہیں۔"

گارڈ نے میرے قریب آکر زوردار آواز میں کہا۔ "صاحب جی ٹرین جانے کے لیے تیار کھڑی ہے...... آپ جائیں گے نا......"

میری حالت اس وقت ایسی تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ میں نے کہا۔ "ہاں میں آیا۔" اور پھر اسٹیشن ماسٹر کی طرف دیکھا جو مجھ سے زیادہ خوفزدہ دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "جناب آپ کا شکریہ...... فیروز صاحب کا دھیان رکھیے گا۔ میں چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں ٹرین میں سوار ہوگیا جبکہ گارڈ اور اسٹیشن ماسٹر حیرانی کے عالم میں مجھے دیکھ رہے تھے۔ اسٹیشن ماسٹر کی باتیں اور رات کو ہونے والے واقعات یاد کرکے مجھے خوف محسوس ہونے لگا۔ باقی کا سفر میرا کانپتے ہوئے طے ہوا۔ اس کے بعد سے جب بھی مجھے فیروز کے ہاں گزاری ہوئی رات یاد آجائے یا اس کی والدہ کا دیا ہوا تحفہ دیکھ لوں تو میری ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی سرد لہر دوڑ جاتی ہے اور میں یہی سوچتا رہا ہوں کہ آخر وہ کون تھے......؟

++

ہوس

جناب قابلِ احترام مدیر اعلیٰ
سلام شوق!
ہوس کا ناگ جب پھن پھیلاتا ہے تو تباہی لازمی ہوتی ہے۔ کاش ریشم کے دل میں ایسا جذبہ نہ جاگتا تو آج کہانی اور ہوتی۔ سوچیں کہ ایسا کیوں ہوا؟

ایم حسن نظامی
(قبولہ شریف)

اکلوتی اولاد غریب کی ہو یا امیر کی، خوش قسمت ہی تصور کی جاتی ہے۔ پیار و محبت کے کتنے ہی انمول رنگ اس کی جھولی میں سمٹ آتے ہیں۔ ریشم بھی اکلوتی تھی۔ ہوش سنبھالنے تک اسے قطعی یاد نہیں کہ وہ دکھ میں بھی رہی ہو۔ اس کے والدین غریب نہ تھے کھاتا پیتا گھرانا تھا مگر ریشم کے معیار کی فصیل اتنی بلند تھی کہ اس کے باپ کی محدود آمدنی اسے اونچا اڑانے سے قاصر تھی۔ بھلا ہو اس عمدہ تربیت کا جس کا رنگ اس پر چڑھ چکا تھا ورنہ اس کی حرص اسے کسی بھی انہونے راستے پہ لے جاسکتی تھی مگر...... جرم کی کوئی شاخ اس کی نفسیات میں کہیں پلتی رہی۔

جو ساز و سامان ان کے گھر میں نہیں تھا۔ سہیلیوں کے گھر ان سے بھرے پڑے تھے۔ جن کپڑوں کو اس کا وجود ترستا تھا۔ فیشن میگزین ان سے رنگین تھے۔ اس کی غلطی یہ تھی کہ وہ ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھ لیتی تھی۔ ہر شے کو دیکھ کر اسے خیال آتا کہ یہ اس کے پاس کیوں نہیں ہے۔ وہ دل میں فیصلہ کر چکی تھی کہ زندگی کے کسی بھی حصے میں ان چیزوں کو ضرور حاصل کرے گی۔

ابھی وہ اسکولی دور میں تھی مگر گھر کے پرانے فرنیچر کو دیکھ کر اس کا خون کھول اٹھتا۔ پہلے پہل تو وہ یہ سمجھتی تھی کہ یہ سب کچھ ماں کی بے پروائی کی وجہ سے ہے انہیں گھر کو سنوارنے کا شوق اور سلیقہ ہی نہیں۔ اس نے کئی بار ناک بھوں چڑھا کر ماں کی توجہ اس جانب مبذول کرائی۔ پہلے تو وہ ہوں ہاں کہہ کر اس کی بات کو ٹالتی رہیں پھر ایک دن اس کی یہ غلط فہمی دور کر دی۔

”ریشم، تو کیا سمجھتی ہے میں اس دنیا میں نہیں رہتی جو کچھ تم چاہتی ہو میں نہیں چاہتی؟ کیا مجھے معلوم نہیں میرے گھر میں کیا کچھ ہوتا ہے مگر تیرے باپ کی آمدنی اس قدر نہیں کہ قیمتی ڈیکوریشن کے لیے گنجائش نکل سکے۔ جتنا پس انداز کر سکتی ہوں کسی اچھے برے وقت کے لیے بچا کر رکھ لیتی ہوں۔ تو نہیں سمجھتی میری چاند۔ جس گھر میں اللہ بیٹی دیتا ہے۔ ماں باپ کو بہت کچھ سوچنا پڑتا ہے۔“

”ماں...... سبھی کے گھروں میں عمدہ فرنیچر، اعلیٰ ڈریس اور معیاری ساز و سامان بھرا ہے۔ شبنم کے ابو کے پاس اتنی لمبی کار ہے، وہ کپڑے بھی اعلیٰ اور نفیس پہنتی ہے۔ شہلا کے گھر فریج، ٹی وی اور جانے کیا کیا ہے۔ آسیہ کا گھر جیولری اور کراکری سے بھرا پڑا ہے۔ ایک ہم ہی ہیں جو مایوسی اور کمتری کی زندگی گزار رہے ہیں۔“ وہ حسرت و یاس سے کھڑکی کے پار دور افق پر ڈوبتے سورج کو دیکھنے لگی۔

”میرا دل بھی چاہتا ہے بیٹی! تجھے شہزادی بنا کر رکھوں لیکن میں مجبور ہوں۔“ ماں نے ایسی ٹھنڈی آہ بھری جس میں زمانے بھر کا غم چھپا ہوا تھا۔

”کیوں مجبور ہیں؟“

”بس تمہارے باپ پر ایمانداری کا بھوت سوار ہے۔ ایک دھیلا بھی رشوت لینے پر تیار نہیں۔ خالی خولی تنخواہ میں تو اتنا ہی ہو سکتا ہے۔“ وہ ایک دم ہی سخت غصے میں آگئیں اور ریشم نے اندازہ لگا لیا کہ وہ اس طرز زندگی سے
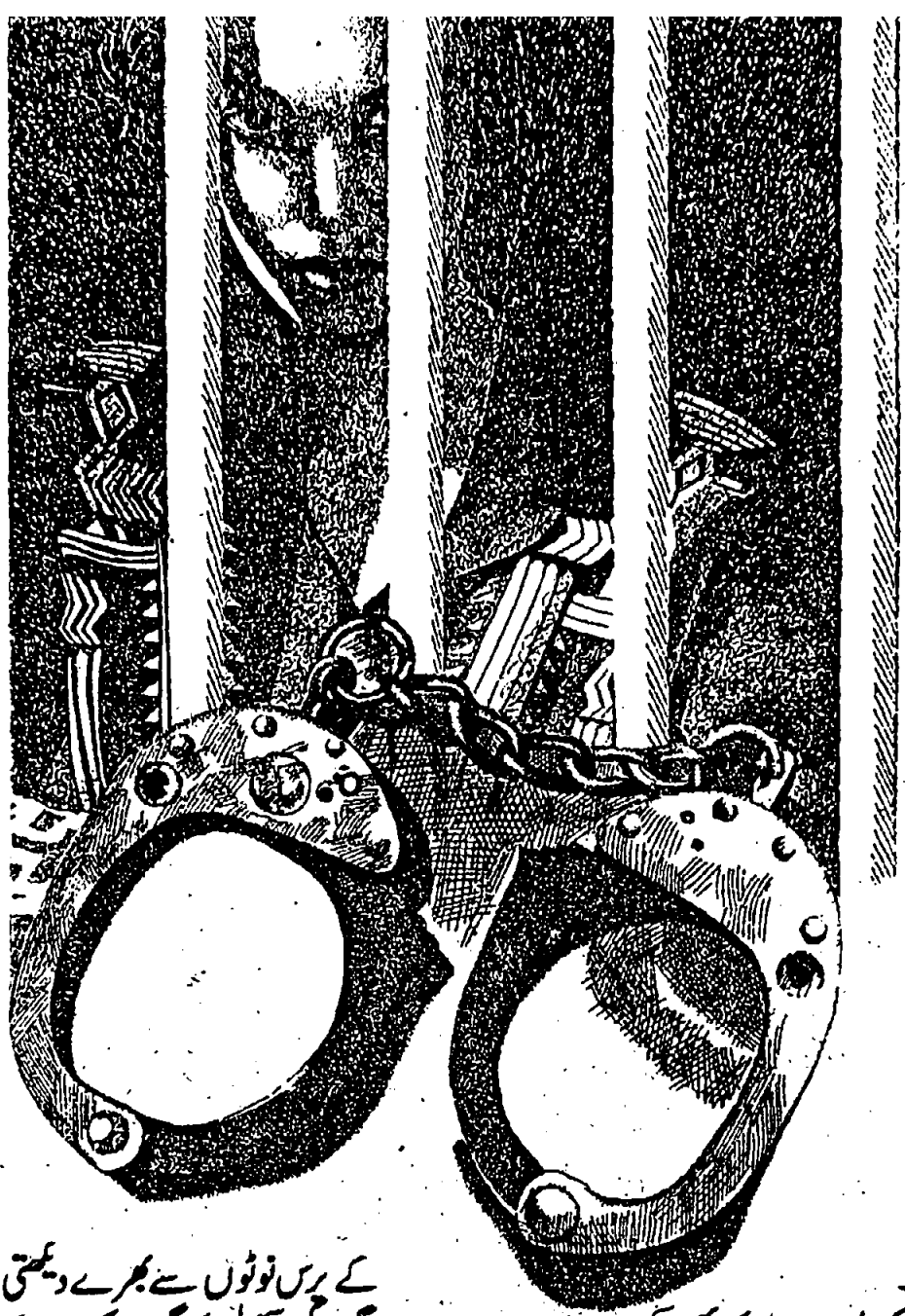
قطعی خوش نہیں۔

ہر عورت کی طرح ان کے بھی کچھ ارمان تھے جو بن کھلے ہی مرجھا گئے تھے۔ اس دن کے بعد وہ جیسے ریشم کی ہم خیال ہوگئیں۔ گھنٹوں بیٹھ کر ماں بیٹی چوہدری بختاور حسین کی کم آمدنی کا رونا روتی رہتیں اور انہیں کوستی رہتیں۔

بس انہی باتوں نے نفسیاتی طور پر ریشم کی آتش ہوس کو ہوا دی۔ باپ کی ایمانداری پر فخر کرنے کی بجائے اسے نفرت سی ہونے لگی۔ ماں کی مظلومیت اس کے دل پر نقش ہوتی چلی گئی اور اس نے تہیہ کرلیا کہ وہ ماں کی طرح ناکام زندگی بسر نہیں کرے گی۔ اس نے اپنے دل میں فیصلہ کیا کہ وہ کسی ایسے شخص سے شادی کرے گی جو ابو کی طرح بالکل نہ ہو۔ جس کے پاس بہت سے روپے ہوں۔ جو ایماندار نہ ہو مگر دولت مند ہو۔ اس دور میں وہ اس سے زیادہ سوچ بھی کیا سکتی تھی۔

جیسے تیسے اس نے انٹر کیا۔ باپ نے اسے سلائی کڑھائی سکھلانا چاہی مگر اسے اس سے ذرہ دلچسپی نہ تھی۔ وہ کالج، یونیورسٹی میں پڑھنا اور وہاں کے ماحول سے آگاہی چاہتی تھی مگر یہاں بھی محدود آمدنی آڑے آئی۔ سہیلیوں کے پرس نوٹوں سے بھرے دیکھتی تو اس کے دل پر گھونسا سا لگتا۔ کسی سہیلی کے گھر جا کر اس کے زیور پہنتی۔ گھنٹوں آئینے میں اپنا سراپا دیکھتی تو خوش ہونے کی بجائے اداس سی ہوجاتی۔ قناعت پسندی اس کی فطرت میں ذرہ برابر نہ رہی تھی۔ جوانی کے منہ زور جوش نے اسے اور ہی خودسر و اکھڑ بنا دیا تھا۔

اب اسے باپ ایسی ناکارہ مشین معلوم ہوتے جو کھوٹے سکے ڈھالتی ہو اور وہ بھی اتنی تعداد میں جس سے دو وقت کی روٹی بمشکل میسر آسکے۔ وہ جب دوسری سہیلیوں کے والدین کو دیکھتی تو اسے اپنے باپ پر اور زیادہ غصہ آنے لگتا۔ وہ سوچنے لگتی۔ بات بے ایمانی اور ایمانداری کی نہیں۔ دوسروں کے باپ کوئی چور تھوڑی ہوتے ہیں جو گھر بھر لیتے ہیں۔

اس کے باپ میں اتنی صلاحیت ہی نہیں ہے کہ وہ زیادہ کما سکیں۔ اپنی نااہلی کو ایمانداری کے غلاف میں چھپا کر انہیں مطمئن کردیتے ہیں۔ تھوڑے پر شکر ادا کرنے پر انہیں مجبور کرتے ہیں اور خود بھی خدا کا شکر ادا کرتے ہیں۔

ریشم کی سوچ کسی مرحلے پر پہنچ کر رک سکتی تھی لیکن

ماں اس کی برابر حوصلہ افزائی کرتی رہی۔ وہ اس کی ہر شکایت پر ٹھنڈی آہ بھر کر رہ جاتی اور ریشم کو ماں پر رحم آنے لگتا پھر وہ اپنے ساتھ ماں کو بھی اس جہنم نما گھر سے نکالنے کی ترکیبیں سوچنے لگتی۔

دھیرے دھیرے اس کی زبان باپ کے خلاف قینچی کی مانند چلنے لگی۔ وہ بے چارہ زچ ہو کر پُرامید نگاہوں سے بیوی کی طرف دیکھتا مگر اس کی آنکھوں میں بھی حقارت اور بیٹی کی حمایت کے سوا کچھ نظر نہ آتا۔ یہاں تک کہ وہ خاموشی سے سر جھکائے گھر سے نکل جاتا اور ماں بیٹی اپنی تقدیر کو برا بھلا کہہ کر خاموش ہو جاتیں۔

☆☆☆

چوہدری بختاور موجودہ صورتِ حال سے بے حد پریشان تھا۔ اٹھتے، بیٹھتے، سوتے جاگتے اسے جوان بیٹی اور اس کی موجودہ سوچ بے حال کیے دے رہی تھی۔ اس نے اس کا کالج جانا بند کر دیا اور اس کی شادی کا سوچنے لگا۔ ریشم نے احتجاج کیا۔ بھوک ہڑتال کی مگر باپ کا فیصلہ جیسے اٹل تھا۔ اسے اپنی ایمانداری اور قناعت پسندی پر فخر تھا۔ اس نے گناہوں سے پاک زندگی گزاری تھی۔ بیٹی کے طور اطوار اور نازنخرے اسے بالکل پسند نہ تھے اب تو وہ ماں کو بھی اس کے خلاف بدظن کر رہی تھی۔

انہوں نے اپنی بیوی کو کہہ دیا کہ وہ اپنی بیٹی کو سمجھائے، ہم نے اپنی زندگی بتادی ہے چاہے حسرتوں اور مایوسیوں میں سہی مگر حرام کی ایک پائی نہیں لی۔

''تم ریشم کو شادی پر رضامند کرو کہ خدا اس کی خواہش پوری کر دے اور اسے ایسا خاوند و گھر ملے جو مسرتوں کا گہوارہ ہو۔'' یوں ماں نے ریشم کو اعتماد میں لینے کے لیے بات چھیڑی۔

''بیٹی۔ ہر لڑکی کو ایک دن اپنے گھر جانا ہوتا ہے۔ یہ دن ماں باپ کے لیے سوہانِ روح بھی ہوتا ہے اور خوشیوں کا خزانہ بھی۔ میں بھی چاہتی ہوں کہ تجھے اچھا شوہر اور معیاری گھر ملے۔ جہاں تم شاد و آباد رہو۔ ہم نے جو لڑکا دیکھا ہے اس کا نام اسلم ہے اور وہ کسی دفتر میں کام کرتا ہے۔ تنخواہ معیاری ہے۔ گھر اس کا اپنا ہے۔''

''اچھا......! آپ چاہتی ہیں کہ آپ کی طرح میں بھی محرومیوں کے درمیان پوری زندگی گزار دوں۔'' ریشم نے زبان چلائی......!

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ وہ ایک تنخواہ دار ہے۔ اس کے پاس اپنی زمین بھی نہیں ہے۔''

ماں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور دور خلاؤں میں گھورتے ہوئے بولی۔ ''بیٹی......میں تمہارا دکھ سمجھتی ہوں اس لیے کہ میں بھی اس آگ میں جلتی رہی ہوں لیکن کچھ باتیں انسان کے اختیار میں نہیں ہوا کرتیں۔ غریب کے گھر غریب ہی کا رشتہ آتا ہے۔ یہ اوپر والے کے فیصلے ہیں اگر وہ چاہے تو ایک دم ہی بندے کے دن پھیر دے اور اسے چند ہی دنوں میں امیروں کی صف میں لا کھڑا کرے۔ اپنی قسمت پر شاکر ہو۔ تمہاری زندگی میں عیش ہوگا تو کوئی روک نہیں سکتا۔ کیا خبر شادی کے بعد اس کی آمدنی میں یکبارگی اضافہ ہو جائے۔ تم اپنے ہنر اور چابکدستی سے اسے زیادہ کمانے پر اکسانا۔ سب تمہارے باپ کی طرح تھوڑی ہوتے ہیں۔'' یوں اس نے ماں کے سمجھانے پر شادی کی ہامی بھر لی۔

☆☆☆

ریشم کی شادی سادگی سے کی گئی۔ وہ جس گھر میں بیاہ کر آئی تھی وہ دو کمروں پر مشتمل تھا۔ البتہ اس کا شوہر اس معمولی سے مکان کی دیواروں سے کہیں زیادہ عالی شان اور عظیم تھا۔ ابتدا میں تو وہ اس کی خوبصورتی پر نازاں ہوئی پھر آہستہ آہستہ اس کے پیار کرنے والے میزاج نے بھی اسے اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ خاوند کا ظاہر جس قدر خوبصورت تھا، باطن اس سے بھی زیادہ بہتر نکلا پھر سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اکیلی سبھی کچھ کی مالک تھی۔ اسلم کا کوئی قریبی عزیز اس دنیا میں موجود نہیں تھا۔ اس کی ماں نے اس کا انتخاب کرتے ہوئے اس پہلو کی طرف خاص توجہ دی تھی شاید......!

شادی کے شروع دن یکبارگی مسرتوں میں گزرے کبھی وہ کسی پارک میں ہوتے تو کبھی کسی ریسٹورنٹ میں۔ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو وہ ریشم کے لیے کوئی نہ کوئی تحفہ لاتا جو تنخواہ کے روپوؤں سے الگ ہوتا۔ اسے گھر، شوہر اور تنخواہ پر فخر کرتے ہوئے خداوند کریم کا شکر ادا کرنا چاہیے تھا مگر اسے تو اس سے بھی زیادہ چاہیے تھا۔ ریشم کے کہنے پر ہی اس نے شام کے وقت دو چار گھر پر ٹیوشن رکھ لیں جس سے ہر ماہ چند ہزار روپے جمع ہونے لگے۔

پھر ہوس نے ذرا اور سر ابھارا۔ چھ ہی ماہ بعد اسلم نے نئی جاپانی موٹر سائیکل خرید لی تو اس کے دل میں نیا مکان

خریدنے کی آرزو جاگی۔ اسلم نے دفتر ہی میں کمیٹی شروع کی ہوئی تھی وہ نکل آئی۔ مگر یہ روپے اس قدر نہ تھے مگر اسے احساس ہو چکا تھا کہ اسلم ایک روز اسے ضرور نیا مکان خرید دے گا۔

ریشم کے ماں باپ بے حد خوش تھے کہ ان کی بیٹی مسرتوں میں کھیل رہی ہے۔ اسے بھی ماں باپ پر بہت خوشی تھی کہ انہوں نے اس کے جیون ساتھی کا انتخاب درست کیا ہے۔

ایک روز اسلم کو خوش دیکھ کر اس نے تجویز پیش کی۔ سرتاج روپے کم ہیں تو کسی دوست سے قرض لے لو ہمارے ہی محلے کی مین روڈ پر خوبصورت مکان بیچا جا رہا ہے، ان لوگوں کو روپوؤں کی اشد ضرورت ہے شاید...... تبھی وہ دوگنی قیمت سے آدھی میں دے رہے ہیں۔ یوں وہ بھولا بھالا شخص بیوی کی باتوں میں آ گیا اور بینک سے قرض لے کر بقیہ رقم ملاتے ہوئے نیا مکان خرید لیا اور اپنا کوڑیوں کے دام فروخت کر دیا۔

گھر نیا تو اس میں سامان اور نئے فرنیچر کی بھی ضرورت محسوس ہوئی کیونکہ ان کا سامان ایک ہی کمرے میں بمشکل پورا ہوا تھا۔ اس نے اسلم سے اپنی نئی خواہش کا اظہار کیا۔ ''بیگم کچھ ماہ انتظار کرو پہلے ہم قرض اتاریں گے پھر فرنیچر اور دوسرا سامان بھی خرید لیا جائے گا۔''

اور پھر جب اگلی پہلی کو اسلم نے ریشم کے ہاتھ میں آدھی تنخواہ دی تو وہ بگڑ کر بولی۔ ''یہ...... یہ تو پندرہ تاریخ تک ہی بمشکل سے چل سکے گی اور اگلا آدھا ماہ فاقوں میں گزرے گا۔''

''کیسی باتیں کر رہی ہو۔ اگر ہاتھ روک کر خرچ کیا جائے تو آدھی تنخواہ بھی بہت ہے ریشم۔ بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ تمہارے ہی کہنے پر قرض لے کر مکان خریدا ہے۔'' اس نے اسے گویا سمجھایا۔

''اسلم...... یہ حساب کتاب مجھے نہیں آتا۔ اپنی آمدنی بڑھاؤ ورنہ مجھے میرے گھر چھوڑ آؤ۔ فاقے ہی کرنے ہیں تو میرا گھر برا نہیں ہے۔''

وہ سمجھ رہی تھی کہ اس کی یہ دھمکی کارگر ثابت ہوگی مگر...... یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گئی کہ اسلم اس کے سامنے کسی مجرم کی طرح ہاتھ باندھے کھڑے تھا اور اس کی صورت روہانسی تھی۔

''معاف کرنا ریشم...... میرے وسائل اس قدر زیادہ نہ تھے کہ میں قرض لیے بنا نیا مکان خرید سکتا۔'' وہ بے چارہ یہ سمجھ رہا تھا کہ ریشم اس کے ایسا کرنے پہ مشتعل ہے اور بات بھی سچ تھی۔ آدھی تنخواہ میں مہینا بھر گزارا ہو سکتا تھا عیاشی اور سیر سپاٹے ہرگز نہیں۔

ریشم نے بھی اس وقت یہی سمجھا کہ اس کے احساس جرم سے آزاد سمجھوتا کر لے تاکہ وہ اس سے دبا رہے۔ وہ احساس کمتری میں مبتلا رہے اور ریشم اس پر ہر طرح کا حکم چلاتے ہوئے اپنی من مانی کرتی رہے۔

''اچھا چلو کہیں باہر چلتے ہیں۔ کم از کم آج کا دن تو گھوم لیں۔'' ریشم نے چہرے پہ مصنوعی مسرت سجائی۔

''چلو......'' وہ بھی مسکرا اٹھا۔

☆☆☆

ریشم نے باقاعدہ پلاننگ کے تحت اس سے بے پناہ محبت کا اظہار شروع کر دیا۔ اپنے کسی رویے سے یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ اس تھوڑی سی تنخواہ پہ خوش ہے۔ وہ چہک چہک کر اپنی خواہشوں کو بیان کرتی رہی تاکہ اس کے دل میں ان خواہشوں کی تکمیل کا پودا جڑ پکڑ سکے اور وہ اسے خوش کرنے کے لیے اپنی آمدنی میں اضافے کے ذرائع تلاش کرنے میں مصروف ہو جائے لیکن وہ بھی بہت ذہین اور سمجھدار انسان تھا۔ ہر بات سن کر اڑا تا رہا اور گزارا آدھی تنخواہ میں ہوتا رہا۔

اگر انسان میں حرص نہ ہو تو کم آمدنی میں گزارا ہو سکتا ہے مگر اس وقت ریشم یہ بات ماننے کو قطعی تیار نہ تھی۔ اسے تو رئیسوں والے ٹھاٹ باٹ اپنانے تھے۔ وہ دو ہی مہینوں میں صبر رخصت کر بیٹھی۔ اشاروں کنایوں سے بات نہ چلی تو اس نے صاف کہنا شروع کر دیا۔ ''اب مجھ سے اور صبر نہیں ہوتا۔ تنگ آ گئی ہوں روکھی سوکھی کھاتے کھاتے۔'' وہ بگڑ کر بولی۔

''بس چند ماہ کی بات ہے پھر پوری تنخواہ گھر آیا کرے گی۔''

''پوری تنخواہ تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے لاکھوں روپے آیا کریں گے۔'' ریشم نے پھر چوٹ کی۔

''اللہ مالک ہے۔'' وہ کہتا اور بات آئی گئی ہو جاتی۔

بس پھر اسی بات پر روزانہ جھگڑا ہونے لگا۔ اسلم ہمیشہ نرمی کا مظاہرہ کرتا جبکہ ریشم آپے سے باہر ہو جاتی۔ آخر ایک روز اس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا۔

''اسلم...... ایمانداری سے کما کر تو آج کے زمانے

میں کوئی پیٹ نہیں بھر سکتا۔ تم اوپر کی آمدنی پر کیوں توجہ نہیں دیتے؟''

''میں...... میں ایسے محکمے میں ہوں جہاں ایسے کوئی مواقع نہیں۔'' اسلم نے کہا۔

''تو اپنا محکمہ بدل لو۔ کسی ایسی جگہ نوکری کرو جہاں پہ مواقع ہوں۔ روپیا ہوگا تو ہاتھ کھلے ہوں گے، ہاتھ کھلے ہوئے تو دن بدلیں گے ورنہ......''

''خدا سے ڈرو بیگم۔ اللہ تعالیٰ بہت کچھ دے رہا ہے اور میں...... میں رشوت وغیرہ پر ایمان نہیں رکھتا اور تم...... تم کیسی بیوی ہو جو مجھے ایسے کاموں کی طرف راغب کر رہی ہو۔ جانتی ہو، برے کاموں کے انجام اچھے قطعی نہیں ہوا کرتے۔''

''پھر تم یہاں بیٹھ کر بھلائی چاٹتے رہو۔ مجھے اجازت دو میں یہ سزا نہیں کاٹ سکتی۔ میں ماں باپ کے پاس چلی جاتی ہوں۔''

بس اسلم کی یہی کمزوری تھی جس کا وہ فائدہ اٹھا رہی تھی۔ اسے ریشم کی جدائی کسی حال میں بھی گوارا نہ تھی۔ وہ پگھل گیا۔ اس نے ریشم سے بہت سے وعدے وعید کیے۔ وہ مطمئن تو نہیں ہوئی اگرچہ یہ سوچ کر خاموش ہوگئی کہ دھیرے دھیرے اسلم اسی راہ پر آہی جائیں گے۔

☆☆☆

ایک دن ریشم اپنی پڑوسن کے ساتھ گئی اور بازار سے قسطوں پر فرنیچر لے آئی۔ اب دیکھتے ہیں قسطیں کیسے ادا نہیں کرتے، اس نے دل ہی دل میں کہا اور اسلم کا انتظار کرنے لگی۔ دفتر سے چھٹی پر اسلم گھر آیا تو گھر کی حالت ہی بدلی ہوئی تھی۔ اس نے حیرانی سے اِدھر اُدھر دیکھا اور ریشم سے پوچھا۔

''یہ سبھی کچھ......؟ کیسے لائی ہو...... اور......؟''

''قسطوں پر لائی ہوں جی...... اور...... کیسے۔'' وہ ہنس دی۔

''قسطیں کہاں سے ادا ہوں گی......'' وہ حیران سا ہوا۔

''یہ میرا مسئلہ نہیں...... آپ کا مسئلہ ہے۔''

''میرا مسئلہ ہوتا تو تم مجھ سے پوچھتیں......!''

''اس کا مطلب ہے میں اپنی مرضی سے کچھ کر ہی نہیں سکتی۔''

''مگر تم پاؤں پھیلانے سے پہلے چادر تو دیکھ لیتیں۔''

''چلو...... نہیں دیکھی۔ پلیز! اس کا تو انتظام کر دیجیے۔ آیندہ چادر دیکھ لیا کروں گی۔'' وہ ڈھٹائی سے بولی۔

''اچھا۔ اللہ مالک ہے۔'' اس نے ٹھنڈی آہ بھری اور بات ختم ہوگئی۔

پھر وہی ہوا...... مہینا پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ قسط کے پیسے ریشم کے ہاتھ آگئے۔ اسے اپنی ذہانت پہ ناز ہونے لگا۔ یہ اس کی ذہانت ہی تو تھی جس نے آمدنی میں اضافہ ممکن بنا دیا تھا۔ یہ اضافہ کیسے ہوا۔ اس سے اسے کچھ غرض نہ تھی۔ اسے تو خوشی تھی کہ ہر مہینے قسط کے روپے اسے مل رہے تھے۔ گویا اس نے اسلم کو صحیح راستے پر لگا دیا تھا۔

چند ماہ بعد ریشم کے دماغ میں پھر سے ہوس کا پرندہ پھڑ پھڑانے لگا۔ وہ سوچنے لگی جب اسلم زیادہ کما سکتا ہے تو اتنا کیوں نہیں کماتے کہ قسطیں بھی ادا ہو جائیں اور اچھی خاصی نقدی بھی ہاتھ آجائے۔

ایک دن اسلم کو بہت خوش دیکھ کر وہ چہکی۔ ''مرد کی کمائی جس قدر زیادہ ہو اتنا ہی وہ پیارا لگتا ہے سرتاج......!''

''بھئی! کما تو رہا ہوں اور کتنا کماؤں۔'' وہ نرمی سے بولے۔

''کیا خاک کما رہے ہو، اس میں تو صرف قسطیں ادا ہو رہی ہیں۔ میری حالت آپ کے سامنے ہے اور پھر دوسرے اخراجات بھی تنگی سے ہو رہے ہیں۔'' اس نے مایوسی ظاہر کی۔

''بیگم! تمہیں معلوم نہیں شاید...... میں نے پارٹ ٹائم کر لیا ہے۔ ایک ہزار ملتے ہیں وہاں سے اب لاکھ روپے تو رہے ملنے سے۔ اتنی تیز نہ دوڑو کہ اوندھے منہ گر پڑو۔ انتظار کرو۔ خداوند کریم بہتر کرے گا۔ وہ جسے چاہے ہر چیز سے نواز دے۔''

اب اسے معلوم ہوا کہ وہ پارٹ ٹائم کر رہے ہیں، وہ تو سمجھ رہی تھی کہ وہ اس راستے پر نکلے ہیں جس پر وہ چاہتی تھی۔ اسے اسلم اور اس کی ناقص سوچ پر غصہ آنے لگا۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ اسلم عقل سے کورے ہیں۔ ویسے فرماں بردار ہیں سمجھایا جائے، راہ دکھائی جائے تو عمل ضرور کریں گے۔ اس نے دل ہی دل میں نیا پلان ترتیب دینا شروع کیا۔

☆☆☆

اس روز اسلم ڈیوٹی سے واپس لوٹا تو کھانے کے بعد ریشم نے اپنا مدعا ظاہر کیا۔ ''اسلم، اس ملک میں کچھ نہیں رکھا۔ میں کہتی ہوں کہیں باہر نکل جاؤ۔ ہمارے پڑوسی کا لڑکا کچھ اتنا پڑھا لکھا بھی نہیں ہے مگر جدہ میں ہے، ہزاروں کے ڈرافٹ ہر مہینے بھیجتا ہے۔'' وہ مسکرائی۔

''ریشم...... بعض اوقات مجھے تم پر حیرت سی ہونے لگتی ہے۔ ہمارے ملک میں کیا نہیں ہے۔ جو تم مجھے باہر بھیجنے کی سوچ رہی ہو۔ کیا! انسان صرف روپے پیسے کمانے کے لیے دنیا میں آیا ہے۔ یہ تمہارے لیے کیا کم ہے کہ میں تمہارے پاس ہوں۔'' وہ حیران نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

''پاس رہنے کا مزہ بھی تبھی آتا ہے جب جیب میں روپے بھرے ہوں۔'' اس نے آنکھیں مٹکائیں۔

''کس شے کی کمی ہے تمہیں......؟''

''ہے کیا تمہارے پاس؟'' وہ دوبدو بولی۔

''کسی دن فاقہ ہوا ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

''بس اسی کی کمی رہ گئی ہے۔ تم اس پر خوش ہو کہ کھانے کو مل رہا ہے۔ دنیا کی لاکھوں آسائشیں بھی ہیں۔ ان کے متعلق بھی سوچو۔''

''سبھی آسائشیں تو باہر جا کر بھی نہیں مل سکتیں بیگم......!''

''کچھ تو مل جائیں گی...... یہاں کیا رکھا ہے۔''

''ریشم، خواہشوں اور حسرتوں کی کوئی انتہا نہیں۔ تم...... تم جو کھیل کھیلنے جا رہی ہو نہ یہ بہت خطرناک ہے اور اس کا انجام؟''

''کمال ہے۔ تم نہ جانے کیسے مرد ہو۔ بلکہ مرد ہو ہی نہیں ورنہ...... خطروں سے کھیلنا ہی تو زندگی ہے۔'' اس نے چہرہ اوپر کر کے کہا۔

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں خطرات سے کھیلنا مردوں کا کام ہے۔ عورتیں جب کھیلتی ہیں نقصان اٹھاتی ہیں۔ یہ بات سدا یاد رکھنا۔''

''پڑھے لکھے ہو کر مردوں کی برتری کے قائل ہو۔ کیسی دقیانوسی روح ہے تمہارے وجود میں؟''

''بیگم...... یہی دقیانوسی روحیں بھرم رکھے ہوئے ہیں ورنہ توازن بگڑ جاتا۔ برتری، کمتری کی بات ہرگز نہیں۔ جس کا جو کام ہے اسی پہ بجتا ہے۔ مجھے اپنے حساب دکتاب سے زندگی کا سفر طے کرنے دو۔ یہی وقت کا تقاضہ ہے......''

''یہ تو وہی بات ہوئی کہ میں آپ کی بہتری کا سوچ بھی نہیں سکتی۔'' اس نے ڈھٹائی سے کہا اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

''میری بہتری صرف باہر جانے میں رہ گئی ہے۔'' اسلم غمگین سا ہوا۔

''آپ کی نہ ہو۔ میری بہتری تو ہے۔ میری خاطر ہی چلے جاؤ۔'' اس نے اک اک لفظ پہ زور دے کر کہا۔

''کر ماں مار یئے۔ تمہاری بہتری اس میں ہے کہ میں تمہارے پاس ہوں۔ تمہیں بھی دکھ نہیں ہوگا کہ میں تم سے دور ہوں۔'' وہ کھڑکی پار دور کھڑے ٹنڈ منڈ پیڑ کو دیکھنے لگا جس پہ شاخ تھی اور نہ پتا......

''میں...... میں تم سے دور رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔'' اس نے ریشم کو تکتے ہوئے کہا۔

''اب تو تمہیں دور رہنا ہی پڑے گا۔'' اس نے آنکھیں گھمائیں۔

''کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''یہی کہ میں کل ہی امی کے گھر چلی جاؤں گی۔ قسطوں کے فرنیچر اور روکھی سوکھی روٹی پہ گزارا نہیں کر سکتی۔'' اس نے جیسے ڈھیٹ بن کر کہا۔ ''جب تم میری خواہش پوری کرنے کے قابل بن جاؤ تو مجھے آ کر لے آنا۔''

اس کی یہ دھمکی کارگر ہوتی تھی۔ اس وقت بھی اس کا چلایا ہوا تیر نشانے پہ لگا۔ اسلم نے اس کی دھمکی کو سنا۔ بے بسی و بے چارگی سے ریشم کی طرف دیکھا اور پھر موم کی طرح جیسے پگھل سا گیا۔

''سفر کے اخراجات کے لیے بھی تو میرے پاس کچھ نہیں!'' بہت دیر کی خاموشی کے بعد جیسے اس نے اپنے بچاؤ کی ترکیب ڈھونڈی۔

''اس کی آپ فکر نہ کریں وہ میں کر دوں گی۔'' وہ بولی۔

''تم کہاں سے کرو گی؟'' وہ حیران نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

''دو چار زیور ہیں بیچ دوں گی...... پھر بن جائیں گے۔'' اس نے انگلی نچا کر کہا۔

''بھلیئے لوکے۔ کیوں کرتی ہو ضد۔ زیور بھی بک جائیں گے اور...... میں بھی تم سے دور ہو جاؤں گا۔'' اس کی آواز گلے میں اٹک سی گئی اور چہرے پہ مایوسی کی فضا چھا گئی۔

''زیور بھی بن جائیں گے اور آپ بھی خیر سے لوٹ

ہی آئیں گے۔'' اس نے لوہا گرم پا کر چوٹ کی تو وہ جیسے پگھل گیا اور چپ ہو گیا۔

کاش! اس وقت اسلم مرد بن گیا ہوتا۔ اپنی بیوی کے منہ پر تھپڑ مار کر کہا ہوتا۔ ''بکتی کیا ہے۔ جا...... اپنی ماں کے پاس ہمیشہ کے لیے رہ۔ میرے لیے عورتوں کی کمی ہرگز نہیں ہے اور جو سکھ اور خوشی تم نے وہاں دیکھی ہے نا مجھے خبر ہے۔ میں! میں تمہاری ہر خواہش پہ جی جی کرتے ہوئے مر نہیں سکتا اور نہ ہی تمہارے کہنے پر حرام کی کما کر اپنی عاقبت خراب کر سکتا ہوں۔'' مگر وہ تو بھیگی بلی بن گیا۔ اس نے اسے خوش کرنے کے لیے بن باس گوارا کر لیا اور سر توڑ کوششوں کے بعد جاپان چلا گیا۔

☆☆☆

پہلے ہی ماہ ریشم کے ہاتھ دس ہزار کی رقم آ گئی۔ ڈرافٹ ہاتھ کیا آیا اسلم کی جدائی کا جو تھوڑا بہت غم تھا وہ بھی ڈھل گیا۔ ریشم وہ عورت تھی جسے شوہر کی نہیں روپوؤں کی ضرورت ہوا کرتی ہے اور ایک وہ ہی نہیں ہمارے معاشرے میں کتنی ہی ایسی عورتیں ہیں جو شوہر کے پردیس جانے پر ایسے خوشیاں مناتی ہیں جیسے کوئی بہت بڑی پریشانی تھی جو اب دور ہو رہی ہو۔

جب تین مہینے میں تیس ہزار روپے اس کی مٹھی میں آئے تو اسے گھر جیسے کاٹنے کو دوڑ رہا ہو۔ پہلے اس نے سوچا۔ ماں جی کے پاس جا کر رہ لے کچھ تنہائی دور ہو جائے گی پھر اس سوچ کو بھی اسے رد کرنا پڑا کہ وہ کون سا عالی شان مکان ہے جبکہ اسے عمدہ اور معیاری گھر میں رہنے کی آرزو تھی۔ بڑھتی ہوئی دولت نے اس کے سبھی حوصلے بڑھا دیئے۔

اس نے اپنا مکان کرائے پر دے دیا اور ایک عالی شان مکان لے کر یہاں چلی آئی۔ پانچ کمروں اور ایک وسیع لان پر مشتمل یہ مکان ہر لحاظ سے اس کی ضرورت سے کہیں بہتر تھا مگر اسلم کی واپسی تک وہ اپنے شوق کو دبا نہیں سکتی تھی۔

کمرے زیادہ ہونے کی وجہ سے سامان اور فرنیچر کم پڑ گیا۔ جو فرنیچر وہ ساتھ لائی تھی وہ تو ایک ہی کمرے میں سما گیا۔ اس مکان کی شان و شوکت کے اعتبار سے بھدا اور گھٹیا بھی تھا۔ آس پڑوس کے گھر ریشم گئی تو اس کی آنکھیں جیسے چندھیا سی گئیں۔ کیسی کیسی بہترین چیزیں ان گھروں میں موجود تھیں اور ریشم کا تو زیور تک بیچ کر اسلم جاپان چلا گیا تھا۔ اسے اپنی حالت پہ جیسے دکھ ہونے لگا۔

پھر ایک دن وہ پرانے مکان کی پڑوسن کے پاس پہنچ گئی جن کی معرفت اس نے قسطوں پر فرنیچر لیا تھا۔ اس نے سوچا پھر سے کچھ سامان خریدے مگر پڑوسن نے ایک نئی راہ دکھائی۔

''میری مانو تو قسطوں پر سامان کے بجائے سود پر قرض لے لو اور اپنی مرضی کا سامان خرید لو۔'' وہ معنی خیز انداز سے ذرا قریب ہو کر بولی۔

''مگر...... خالہ سود پر تو رقم بہت ہو جائے گی۔ کیسے اتاروں گی؟'' ریشم نے حیرانگی سے پوچھا۔

''جیسے پہلی قسطیں ادا کر رہی ہو اسی طرح قرض کی ادائیگی کے لیے بھی قسطیں طے کرا دوں گی اور پھر تمہارے میاں کو اللہ سلامت رکھے۔ آج دس بھیج رہے ہیں تو کل پندرہ بھیجیں گے۔ اس وقت تو اکٹھی رقم لے کر کام چلا لو۔ سبھی یہی کرتے ہیں۔ میرا بیٹا جب باہر گیا تھا تو میں نے بھی یہی کیا تھا۔ آج خیر سے قرض اتار بھی چکی ہوں۔''

''ٹھیک ہے خالہ۔ آپ میرے ساتھ چلیں ذرا۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

خالہ نے برقع سر پر رکھا اور اسے لے کر شہر کی نشیبی بستی میں چلی آئی۔ چلنے پھرنے والوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں بھی پٹھان بستے ہیں۔

''خالہ...... یہ تم مجھے کہاں لے آئیں؟'' ریشم نے حیران ہو کر پوچھا۔

''بیٹا...... یہیں تو رہتے ہیں گل خان۔ بس تم میرے ساتھ چلی آؤ۔''

چند گلیاں عبور کرنے کے بعد وہ گل خان کے دروازے پر تھیں۔ خالہ نے بیل بجائی اور پھر جلد ہی ایک موٹا تازہ جوان بڑی بڑی مونچھوں والا دروازے پر نمودار ہوا۔ دیکھنے میں روپے پیسے والا لگتا تھا۔ ریشم سمجھ گئی کہ گل خان یہی ہوگا۔ اس نے خالہ کو دیکھتے ہی مسکرا کر اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا اور خالہ نے بھی اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''اوے خالہ جان۔ میں قربان۔ آج گل خان کا یاد کیسے آ گیا۔ ام کو بولا ہوتا۔ ام خود حاضر ہو جاتا۔'' اس نے ایک اچٹتی نظر ریشم پر ڈالی اور انہیں لے کر اندر چلا آیا۔ گھر میں مکمل سناٹا تھا۔ مکان بہترین تھا مگر یہاں وہ اکیلا ہی رہتا تھا۔

”ابھی حکم کرو......“ اس نے پھر ریشم کی طرف دیکھا۔ ذرا ٹھہرو اس نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ ”پہلے یہ بتاؤ یہ زنانی کون ہے؟“

”اسی کے لیے تو آئی ہوں۔ یہ میری پڑوسن ریشم ہے۔ بے چاری نے مکان نیا خریدا ہے۔ سجانے کے لیے رقم چاہیے۔ اس کا میاں جاپان میں ہے۔ ہر مہینے رقم بھیجتا ہے۔ لوٹاتی رہے گی۔“ پڑوسن خالہ نے تفصیل بتائی۔

”قسم بہ خدا۔ اس کا آدمی جاپان میں ہے تو ہمیں کیا فکر اور پھر تم ضمانتی ہے کیسے کرے گی انکار۔ ابھی تم بولو۔ کتنا رقم درکار ہے۔ لاکھ۔ دو لاکھ۔ دس لاکھ۔ بھئی بولو۔“ اس نے ریشم کو براہِ راست مخاطب کیا۔

”بس خان صاحب۔ لاکھ میں کام چل جائے گا۔“ ریشم نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”ابھی ام سے شرماؤ نہیں۔“ زیادہ چاہیے تو بولو۔

”نہیں خان صاحب اتنا ٹھیک ہے۔“ اس بار پڑوسن خالہ بولی۔

”مگر ہمارا ایک اصول ہے ہم پیسا گھر جا کر پہنچاتی ہے۔“ خان بولا۔

”ٹھیک ہے یہ تو اور اچھا ہے۔“

”تو پھر اپنا پتا بولو۔“

ریشم نے پتا بتا دیا گل خان نے ایک کاپی پر پتا لکھا اور اٹھ کر چلا گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں دو کاغذ تھے۔ ”اور یہاں انگوٹھا لگاؤ۔“

”یہ کیا ہے خان صاحب۔“ ریشم نے پوچھا۔

”ہم نے تم کو ایک لاکھ روپے دیا۔ اس کا کاغذ ہے۔“

”اس پر انگوٹھا اس وقت لگے گا جب آپ رقم لے کر آئیں گے۔“

”تم ابھی گل خان کو جانتا نہیں ہے۔ اس واسطے بول رہا ہے۔ چلو ٹھیک ہے ہم کل پہنچیں گے!“

دوسرے دن گل خان روپے لے کر ریشم کے پاس پہنچا اس نے روپے اسے تھما دیئے اور پھر کاغذ نکال کر کہا۔ ”اب تو انگوٹھا لگائے گا نا۔“

ریشم نے کاغذ پر انگوٹھا لگایا اور رقم وصول کر لی۔ وہ شخص دستخط کا قائل نہیں تھا۔

☆☆☆

رقم ہاتھ آنے پر ریشم کی ہوس کو پھر سے ہوا لگی اور وہ

فدائیانِ اسلام

ایک نیم مذہبی اور نیم سیاسی دہشت پسند جماعت، جس کی سرگرمیوں کا مرکز تہران تھا اور جس پر بارہ سالہ تحریک 1943-1955ء کے دوران میں متعدد سیاست دانوں کے قتل کی ذمّہ داری آئی۔ فدائیان کی تنظیم اگرچہ خفیہ تھی لیکن ان کے اجتماع سرعام ہوتے تھے اور وہ اپنے اغراض ومقاصد کا کھلے بندوں اعلان کرتے تھے۔ ان کا نصب العین شریعت کامل نفاذ اور بے دینی کا استیصال تھا۔ فدائیوں کی بدنامی کا آغاز اس وقت ہوا جب ان کی جماعت کے بانی سید مجتبیٰ میرلوحی نے، جو آگے چل کر نواب صفوی کے نام سے مشہور ہوا۔ مارچ 1945ء میں مشہور عالم احمد کسروی پر ناکام قاتلانہ حملہ کیا اور پھر اگلے سال مقدمے کی کارروائی کے دوران فدائیوں نے کسروی کو قتل کردیا۔ شہادت نہ ہونے کے باعث وہ بری کردیے گئے۔ فدائیوں کے لیے آیت اللہ کاشانی کی حمایت کی، ان کے اثر ورسوخ اور روز افزوں انتقامی کارروائیوں کے خوف نے فدائیوں کی بریت میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اکتوبر 1949ء میں فدائیوں نے وزیر دربار عبدالحسین کو ہلاک کردیا۔ مارچ 1951ء میں نئے وزیراعظم جنرل رزم آرا کو قتل کیا گیا۔ اس کے بعد حسین علا وزیراعظم مقرر ہوا لیکن فدائیوں کی دھمکی کے پیشِ نظر اسے مستعفی ہونا پڑا۔ اور ڈاکٹر محمد مصدق نے وزارت عظمٰی کا منصب سنبھالا۔ ڈاکٹر مصدق کی معزولی کے بعد فدائیوں کی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں اور وہ کچھ عرصے تک نئی حکومت کے خلاف تیز وتند بیانات شائع کرتے رہے۔ اکتوبر 1955ء میں وزیراعظم حسین علا پر قاتلانہ حملہ ہوا، جو ناکام رہا۔ اس طرح سے حکومت کو فدائیوں کے خلاف مقدمہ چلانے کا موقع ہاتھ آیا۔ فدائیان، نواب صفوی، واحدی اور طہماسپی، ان کے رہنما گرفتار ہو کر تختہ دار پر لٹکا دیے گئے اور ان کی جماعت ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔

مرسلہ: راحیلہ نیاز، لاہور

الاؤ کی صورت شعلوں میں بھڑکنے لگی۔ وہ اس وقت خوشی سے اس قدر سرشار تھی جیسے یہ رقم اسے مفت میں ملی ہو۔ وہ فوراً اپنی ماں کے پاس پہنچی۔ انہیں بتایا کہ اسلم نے روپے بھیجے ہیں۔ مجھے کچھ سامان خریدنا ہے۔ ماں نے اسے سمجھایا۔ بیٹا۔ یہ روپے آڑے وقت کے لیے سنبھال لو۔ تم اکیلی رہتی ہو۔ کیوں دنیا کو دکھانے کی باتیں کر رہی ہو مگر اس پر تو حرص اور لالچ کا بھوت سوار تھا۔ وہ ماں کو زبردستی لیے بازار پہنچ گئی۔

فرنیچر۔ پردے۔ ڈیکوریشن پیس اور سیف الماری وہ جو کچھ خرید سکتی تھی خرید لیا۔ واپس لوٹی تو چند ہزار روپے بینک میں تھے۔

پورا گھر جگمگ کرنے لگا۔ ہر سو خوبصورتی عیاں تھی۔ سب کو پتا تھا کہ ریشم کا شوہر جاپان میں ہے۔ محلے کی جو عورت بھی اس کے گھر آئی اس کی قسمت پر رشک کرتی نظر آئی تو اس کا دماغ آسمان کی بلندیوں پر پرواز کرنے لگا۔

''آپ کے پاس گاڑی نہیں ہے؟'' ایک دن محلے کی ایک خاتون نے اس سے پوچھا۔

''ایک چھوڑ دو دو گاڑیاں تھیں ہمارے پاس۔'' اس نے چہک کر کہا۔

''میرے شوہر چونکہ مجھے بھی ساتھ لے جانا چاہتے تھے تبھی دونوں بیچ دیں... پھر بعد میں پروگرام تبدیل ہو گیا۔ وہ اکیلا ہی چلا گیا۔''

''گاڑی تو فی الحال تمہارے لیے بہت ضروری ہے۔ اس علاقے میں رکشا، ٹیکسی تو کبھی ملتا ہی نہیں اور پھر جس کے پاس گاڑی رہ چکی ہو وہ اس کا عادی ہو جاتا ہے۔''

''اور نہیں تو کیا۔ میں تو اب ڈرائیونگ بھی بھول گئی۔ سوچ رہی ہوں۔ خرید ہی لوں۔ ویسے وہ گاڑی اپنے ساتھ لے کر ہی آئیں گے۔'' وہ مسکرا مسکرا کر بتاتی رہی۔

''وہ تو خیر لائیں گے ہی۔ تم بھی خرید لو۔'' سیکنڈ ہینڈ ہی سہی۔

''لو۔ پرانی گاڑی بھی کوئی گاڑی ہوتی ہے۔'' اس نے حقارت سے کہا۔

''تمہیں کون سی روز روز استعمال کرنی ہے۔ کبھی کبھی تو تم کہیں جاتی ہو۔ کھڑی رہنے کے لیے کیا بری ہے۔'' اس نے ہنس کر کہا۔

''اچھا دیکھا جائے گا میں انہیں خط لکھتی ہوں۔'' اس نے ایک انداز بے نیازی سے آنکھیں گھما کر کہا۔

وہ عورت اٹھ کر چلی گئی لیکن ریشم کو ایک نئی راہ دکھا گئی۔ یہ خیال تو مجھے آیا ہی نہیں تھا کہ کار بھی خریدنی ہے۔ میں کچھ زیادہ ہی قرض لے لیتی۔ فرنیچر کے ساتھ ایک کار بھی خرید لیتی۔ چلو خیر۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔

☆☆☆

اس مہینے اسلم نے پندرہ ہزار کا ڈرافٹ بھیجا پتا نہیں ریشم نے انہیں کون سی الٹی سیدھی بات سنائی تھی اور جب گل خان قسط وصول کرنے آیا تو وہ اس کے ہاتھ پہ قسط رکھتے ہوئے ہنس کر کہنے لگی۔ ''خان صاحب۔ مجھے ایک لاکھ اور دے دو میں چار کی بجائے چھ ہزار روپے ماہوار ادا کرتی رہوں گی۔''

یوں گل خان نے راضی خوشی روپے دے دیے۔ اس نے اخبار میں گاڑی کے اشتہار دیکھنے شروع کر دیے۔ چند دنوں کی تگ و دو کے بعد اسے مرضی کی گاڑی مل گئی۔ کلاس فیلوز کے ساتھ رہ کر اس نے ڈرائیونگ تو سیکھ ہی لی تھی۔ لائسنس کا مسئلہ تھا وہ بھی آخر حل ہو گیا پھر اس کے پیر زمین پہ نہیں ٹکتے تھے کبھی اس سہیلی کے پاس تو کبھی دوسری کے۔

دراصل وہ بتانا چاہتی تھی کہ میرے میاں جاپان میں ہیں۔ میں نے بنگلا، گاڑی اور بہت کچھ خرید لیا ہے اور آج میں بھی امیروں کی صف میں شامل ہوں۔

پھر اس سے نہ رہا گیا تھا شاید۔ اپنی دوست صفیہ کے پاس جا کر اس نے چہک کر کہا۔ ''دیکھ لو صفیہ۔ تم نے ایک روز میری غربت کا مذاق اڑایا تھا۔ میری بے عزتی کی تھی۔ میرے والدین کے سامنے مجھے شرمسار کرتے ہوئے میرا سرنگوں کیا تھا...... مگر آج......!''

''اوہ...... سوری تم کون سی پرانی باتیں لے بیٹھیں آؤ اندر میں تم سے معافی مانگتی ہوں۔ میں تو آج تک اپنے کیے پر شرمندہ ہوں۔ اس روز مجھے نجانے کیا ہو گیا تھا یار......''

''نہیں...... میں اندر نہیں آؤں گی۔ میں صرف تمہیں یہ بتانے آئی ہوں کہ کبھی کسی کی غربت کا مذاق نہ اڑانا کیونکہ کبھی کبھی خدا غریب کی بھی سن لیا کرتا ہے اور اسے وہ بھی کچھ عطا کر دیتا ہے جس کی اسے خواہش ہوا کرتی ہے۔''

وہ اسے گھسیٹ کر زبردستی اندر لے گئی۔ چائے بھی زبردستی پلائی اور پھر اپنے زیور کا بکس اٹھائے اس کے سامنے رکھ دیا۔ کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد گلوگیر سی آواز میں بولی۔

''ریشم آج تم امیر ہو اور خداوند کریم نے مجھ سے بھی

کچھ چھین لیا۔ میرا خاوند اچانک حادثے میں دنیا چھوڑ گیا۔ والدین پہلے ہی وفات پا چکے تھے۔ دیور نے دھکے مار کر گھر سے نکال دیا۔ اور میں یہاں اپنی خالہ کے ہاں رہ رہی ہوں۔ یہ زیور اب میرے کسی کام کے نہیں شاید۔ تم جو چاہتی ہو لے لو...... مناسب دام میں دے دوں گی۔ بک تو کہیں بھی جائیں گے مگر تم خرید لو تو کبھی نہ کبھی آ کر دیکھ لیا کروں گی۔ یہ سمجھوں گی کہ میرے ہی پاس ہیں۔''

زیور دیکھتے ہی ریشم کے تیور جیسے بدل گئے اس کے اندر ہوس کے الاؤ جلنے لگے۔ وہ للچائی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''کتنے کے ہوں گے جی؟''

''سنار کو دکھائے تھے ستّر ہزار کہہ رہا تھا۔ تم کچھ کم دے دو۔'' اس نے حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''واہ...... کم کیوں دوں۔ میں اس سے زیادہ دوں گی۔ گاڑی لے چکی ہوں ورنہ تمہیں دوگنی قیمت دیتی۔'' اس نے سر کا اشارہ کیا۔

''ابھی لے جاؤ۔ روپے پہنچا دینا۔'' وہ بولی۔

''نہیں۔ جب روپے لے کر آؤں گی۔ لے جاؤں گی۔'' وہ اٹھ کر واپس چلی آئی۔ پچیس۔ تیس ہزار اس کے پاس تھے۔ وہ گاڑی لیے پھر سے خان صاحب کے پاس پہنچی۔ گل خان نے مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔

''جی...... بلبل...... اب بتاؤ کیا بات ہے؟''

''خان صاحب مجھے پچاس ہزار روپے فوراً چاہیے۔'' اس نے اس قدر اپنائیت سے کہا کہ گل خان کھل اٹھا۔

''ام حاضر اے ریشم بی بی۔'' وہ دوسرے کمرے میں گیا اور رقم لاکر اس کے ہاتھ پہ رکھ دی۔ ''ہم تمہارا خاطر اپنا قاعدہ توڑتی ہے۔ رقم اور دے رہا ہوں کہ بلبل جاں کو ضرورت ہے ئے۔''

''خان صاحب انگوٹھا۔'' وہ بولی۔

''وہ کارروائی گھر پر ہوگا۔'' اس نے کہا اور وہاں سے نکل کر سیدھی سہیلی کے پاس پہنچی۔ تمام زیور اس سے لیا۔ رقم ادا کی اور گھر چلی آئی۔

☆☆☆

اب وہ ڈھائی لاکھ کی قرض دار ہو گئی تھی۔ بلکہ سود شامل کرتے ہوئے کچھ زیادہ کی لیکن وہ مطمئن تھی کہ قسطیں ادا ہو رہی ہیں۔ شان و شوکت الگ قائم ہے۔ اس نے جس قدر خواب دیکھے تھے سبھی پورے ہو گئے۔ بس کبھی کبھی اس کا جی چاہتا کہ اسلم بھی ساتھ ہوتے تو...... مگر وہ ہوس پرست تھی۔ دل کی خواہشوں اور حسرتوں میں محبت جیسے پاکیزہ اور بے مول جذبے کو فراموش کرتے ہوئے بے لگام گھوڑے کی مانند سرپٹ دوڑتی رہی۔ اگر وہ اپنی خواہشوں کو زنجیر پہنا دیتی اور روکھی سوکھی میں محبت کے ساتھ قدم ملا کر چلتی تو پوری دنیا اس کے لیے جنت سے کم ہرگز نہ ہوتی۔ یہ سوچتے ہوئے اس کے آنسو نکل آئے مگر لالچ اور ہوس پرستی میں وہ انہیں ضبط کرتے ہوئے پھر سے آگے بڑھنے لگی۔ مگر سبھی کچھ پا کر بھی تنہائی اس کے لیے عذاب بننے لگی۔ گل خان بے باک چلا آتا اور کہتا۔

''ارے بلبل...... آج تو ام تمہارے ہاتھ کی چائے پیے گا۔'' اور وہ مسکرا کر اسے اندر بلانے پر مجبور تھی۔ اس نے چائے کیا پلائی۔ پھر تو وہ ہر ماہ ڈھیٹ بن کر چائے پینے لگا۔

آٹھ مہینے گزر گئے پھر ایک مہینے ڈرافٹ نہیں اسلم کا خط ملا اس نے لکھا تھا۔ ''ریشم مجھے نوکری سے نکال دیا گیا ہے لیکن جلد ہی کسی دوسری ملازمت کا بندوبست کرلوں گا۔ تم گھبرانا نہیں اور اب تک جو جمع کیا ہے اس سے خرچ چلا لو۔''

وہ اس سے آگے کچھ نہ پڑھ سکی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے دھوئیں کے بادل سے چھا گئے اور زمین جیسے گھومنے لگی۔ وہ دیوار کا سہارا لے کر وہیں پہ بیٹھتی چلی گئی۔

مکان اور اس کے در و دیوار سبھی اس کو کھانے کو دوڑ رہے تھے اور سب سے بڑی گل خان کی قسط کی ادائیگی۔ اسے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس ماہ کی چھ ہزار تو اگلے مہینے بارہ ہزار روپے......!

اب اسے احساس ہوا کہ وہ آنکھیں بند کرتے ہوئے کنویں میں چھلانگ لگا چکی ہے۔ دو تین ماہ تک روپے نہ آئے تو کیا ہوگا۔ اس کا دل بند سا ہونے لگا۔ وہ اٹھ کر بھی گھر کے اس حصے میں جاتی تو کبھی اس کمرا سے کوئی دلاسہ دینے والا نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک وہی ہمسفر تھا اسلم جسے اپنی خواہشوں کی تکمیل میں اس نے ہزاروں میل دور اپنی نگاہوں سے خود او جھل کر دیا تھا۔ اسے کسی پل چین نہیں آ رہا تھا۔ وہ سبھی قیمتی چیزوں کے درمیان تھی مگر...... آج سکون نام کی کوئی شے اسے میسر نہ تھی۔

اگلے روز گل خان اپنی قسط وصول کرنے آدھمکا۔ وہ اسے اندر بلانا مناسب نہیں سمجھتی تھی مگر وہ اسے اندر بلا لائی کیونکہ آج اسے مجبوری تھی۔ مطلب آپڑا تھا۔

''کیوں آج تم باہر نہیں جائے گا۔''

خان صاحب کیوں شرمندہ کرتے ہو۔ گل خان اندر داخل ہو رہا تھا مگر اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی بہت بڑا جرم کر رہی ہو اور اسلم اسے چھپ چھپ کر دیکھ رہا ہو۔ اسے پسینے آرہے تھے۔

''قسم بہ خدا۔ تمہارا گھر بہت خوبصورت ہے۔ ابھی ام سوچتا ہے پہلے تم نے اندر کیوں نہیں بلایا اور ام کیوں نہیں یہاں آیا۔ ہائے نصیب۔ آج قسمت کھل گیا......'' اس نے خود ہی کہا۔ خود ہی ہنسنے لگا۔

''ارے بلبل...... آج تو کچھ پریشان لگتا ہے۔ تمہارے چہرے پہ ہوائیاں سی اڑ رہی ہیں۔ کوئی خطرے والا بات تو نہیں......'' اس نے گھسیٹ کر کرسی قریب کر لی۔

''بات دراصل یہ ہے خان صاحب......! وہ ذرا ہچکچائی۔

''ہاں ابھی بولو...... کیا بات ہوا؟''

''اس مہینے اسلم کا ڈرافٹ نہیں آیا۔ میں آپ کی قسط نہیں دے سکوں گی اور اگلے مہینے ڈبل نہیں ایک ہی قسط دوں گی۔ آپ کی بڑی مہربانی اگر......''

''ارے یارا...... اتنا سا بات کو فسانہ کر دیا۔ اپنے ہاتھ کا میٹھا میٹھا چائے پلاؤ...... ہم چلے گا......'' اس نے ہنس کر کہا۔ ''ابھی چھوڑو اس خدائی خوار ذکر کو۔''

''چائے پلانے کے بعد اس کی فکر دور ہو گئی لہٰذا وہ بے خوفی سے باتیں کرتی رہی۔ وہ کچھ دیر ہنس بول کر گھر چلا گیا۔

☆☆☆

ایک مہینا پلک جھپکتے ہی گزر گیا۔ پہلی تاریخ آ گئی۔ پھر پانچ پر گئی۔ نہ ڈرافٹ آیا اور نہ خط۔ اب اسے احساس ہوا کہ وہ اپنی نادانی اور بے وقوفی سے کس قدر دلدل میں پھنس چکی ہے۔ وہ سبھی چیزیں بیچ کر بھی قرض نہیں اتار سکتی تھی۔ اگر وہ ایسی فضول خرچی نہ کرتی تو اس کے پاس بہت رقم جمع ہوتی اور گھر کا خرچ بہ آسانی چلتا رہتا۔

اس نے گھبرا کر اسلم کو خط لکھا۔ جواب آنے سے پہلے ہی گل خان آ گیا۔ اس مرتبہ پھر معذرت کے سوا اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ وہ سر جھکا کر چائے پیتا رہا پھر اس نے جاتے ہوئے نئی بات کی۔

''خو...... یہ دس ہزار روپیا ہے اس ماہ کا خرچ چلاؤ۔ ہر کوئی گل خان نہیں۔'' ریشم اس کا منہ دیکھتی رہ گئی اور وہ الٹے قدموں واپس چلا گیا۔

ابھی دو دن بھی نہیں گزرے تھے کہ گل خان چلا آیا۔ اس سے قبل کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ وہ مہینے سے پہلے آتا۔

وہ حیران نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

''ارے بلبل جاں۔ ام کو ایسے نہ دیکھو۔ بس آپ کے ہاتھ کی چائے یاد آیا۔ ہم چلے آئے۔''

پھر اسے یہ چائے روز یاد آنے لگی اب اس کی نگاہوں میں وہ سبھی کچھ واضح ظاہر ہونے لگا۔ جسے اک عورت بخوبی جانتی ہو مگر وہ اس خوف سے خاموش تھی کہ وہ اس کی قرض دار تھی اور وہ کسی وقت بھی رقم کا تقاضہ کر سکتا تھا اس لیے وہ ہنس کر باتیں کرنے پر مجبور تھی۔

وہ خط اور ڈرافٹ کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی مگر ڈرافٹ نہ مل سکا۔ اب انتظار فضول تھا اور طویل انتظار کی بیماری اور پٹھان کا روز روز آنا اسے پریشانیوں کے صحرا میں تڑپا رہا تھا۔

آخر ایک روز بات کھل کر سامنے آ گئی۔

''ابھی ریشم بی بی۔ ہم سے مزید صبر نہیں ہوتا۔ ہم تم سے شادی کرے گا۔'' اس نے بے فکری میں ایسے کہہ دیا جیسے یہ کوئی بات ہی نہ ہو۔

''خان صاحب......! آ...... آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے میں شادی شدہ ہوں۔'' اس نے حیرانگی سے کہا۔

''ہم کو اپنے میاں کا پتا دو۔ ہم تم کو بیوہ بنائے گی۔''

اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی اور پھر اسے جیسے زمین گھومتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ وہ گرتے گرتے بچی۔ یہ اس کی بے صبری اور حرص و لالچ نے اسے یہ دن بھی دکھایا تھا کہ وہ اپنے سہاگ۔ اپنے خاوند اور اپنے بکراں چاہنے والے کے قتل کی بات سن رہی تھی جو اس کی خوشیوں اور خواہشوں کی خاطر پردیس کی خاک چھان رہا تھا۔

''خان صاحب! آپ کو یہ بات کہتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔ میرے سامنے میرے میاں کے قتل کی بات کر رہے ہو۔''

''ریشم بی بی۔ ہمارا قرض لوٹا دو۔ نہیں تو ہم ضرور

شادی کرے گا۔"

"آپ پٹھان ہوتے ہوئے ایسی گری ہوئی بات کررہے ہیں۔"

"او یارا۔ ہم تمہارے عشق میں پاگل ہوگیا ہے۔ کچھ بھی کہہ سکتی ہے تم۔ کچھ بھی کرسکتی ہے!"

"ٹھیک ہے میں تمہاری رقم کا بندوبست کرتی ہوں۔" وہ بولی۔

"شاباش۔ کب؟"

"کل۔" اس نے روہانسی اور گلوگیر آواز میں کہا۔

"ٹھیک اے۔ پرسوں کا منہ ہم نہیں دیکھے گا۔" یہ کہہ کر وہ چلتا بنا۔

☆☆☆

ریشم نے الماری سے زیور نکالے اور گاڑی لے کر بازار پہنچ گئی۔ اس نے سوچا زیور بیچ کر دو تین قسطیں ادا کردوں پھر دیکھا جائے گا۔ اس نے زیورات کے ڈبے جیولر کے سامنے رکھے اور کہا۔ "یہ بیچنے ہیں......!"

"جی۔ شوق سے۔" جیولر نے کہا اور ڈبے کھول کر زیور دیکھنے لگا۔

یکایک اس کے چہرے کا رنگ تبدیل ہونے لگا۔ کبھی وہ ریشم کی طرف دیکھتا اور کبھی زیور کی طرف۔

"میڈم...... یہ زیور آپ نے کس سے لیے تھے؟"

"آپ کو اس سے کیا مطلب؟" وہ حیران ہو کر بولی۔

"سوری میڈم۔ یہ سبھی نقلی ہیں۔"

"کیا......!" اس نے گھبرا کر زیوروں کی طرف دیکھا۔ ایک سہیلی نے مجھے فروخت کیے تھے اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "اس نے دھوکا کیا ہے فوراً اسے پکڑیں۔"

وہ سیدھی اس سہیلی کے گھر پہنچی جس سے زیور خریدے تھے مگر وہ مکان فروخت کرکے کسی دوسرے شہر چلی گئی تھی۔ ریشم کے آنسو نکل کر گال بھگونے لگے۔ پھر اس نے سوچا گاڑی بیچ کر قرض لوٹا دے مگر ایسی چیزیں اتنی جلدی کب بکا کرتی ہیں۔ جبکہ پٹھان کہہ گیا تھا کہ کل سے پرسوں نہ ہونے پائے۔

پھر وہی ہوا۔ دوسرا دن آیا اور وہ چلا آیا۔ اب اکڑنے...... کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ کچھ وقت لے سکتی تھی اور وہ مصلحت ہی سے مل سکتا تھا۔ اس نے ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ سجا کر اس کا استقبال کیا۔

اس نے چائے بنا کر پلائی۔ اس دوران اس نے مکمل منصوبہ سوچ لیا تھا۔ جس پر عمل پیرا ہونا ضروری تھا مگر پٹھان بھی چالاک تھا شاید۔ اس نے چائے پی اور اٹھتے ہوئے بولا۔

"ارے یارا۔ آج بندوبست نہیں ہوا تو کوئی بات نہیں کل کو ہوجائے گا اور تم میری رقم واپس کردو گی۔ میں چلا جاتا ہوں مگر جب تک میری رقم تم نہیں لوٹائے گا۔ ہم تم سے روز چائے بھی پیے گا اور ساتھ میں دوپہر کا کھانا بھی۔ منظور اے......"

"ٹھیک ہے خان صاحب۔ میں رقم جلد لوٹانے کا وعدہ کرتی ہوں۔" وہ بولی۔

"اور کھانا۔"

"ہاں...... کھانا بھی دوں گی۔" اس نے ہاتھ اوپر لہرایا اور چلا گیا۔

اور پھر...... اس نے ریشم کے گھر کو جیسے اپنا گھر بنا لیا اور وہ اس کی باندی بن کر اس کی خدمت کرنے لگی۔ وہ صبح سویرے ہی چلا آتا اور شام ہونے پر اپنے گھر چلا جاتا۔

"اس طرح تو پورے محلے میں بدنام ہوجاؤں گی۔" ریشم نے سوچا۔

پھر وہ اپنے سوچے سمجھے منصوبے پر عمل کرنے لگی۔ گل خان آیا تو وہ ہنس ہنس کر اس سے باتیں کرنے لگی۔ وہ اپنی کامیابی پہ نازاں تھا جیسے۔ ریشم کا بدلا ہوا روپ دیکھ کر خوش ہونے لگا تھا۔ انہوں نے مل کر کھانا کھایا۔ پھر ریشم بولی۔

"خان صاحب! آپ رات کو نہیں آسکتے؟"

"کیوں نہیں...... مگر تنہائی تو اب بھی ہے۔" وہ کچھ سوچ کر بولا۔

"یہ بات نہیں ہے خان صاحب! دراصل دن کے وقت محلے دار آپ کو دیکھ کر باتیں بناتے ہیں یوں میں بدنام ہوجاؤں گی۔" وہ حسرت سے بولی۔

"او یارا...... ہم تو بھول ہی گیا تھا کہ ایک عورت کا عزت کا بات ہے۔ دن کی روشنی میں ام کو نہیں آنا چاہیے۔ اب ہم رات کو آیا کرے گا۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

رات کا اندھیرا جب اچھی طرح پھیل گیا تو وہ ریشم کے ہاں چلا آیا۔ وہ اسے ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ کچھ دیر پیار و محبت کی باتیں کرتی رہی پھر اسے لان میں لے آئی۔ وہ لان میں کرسی پر بیٹھ گیا تو وہ چائے بنانے چلی گئی۔ وہ اسے

دیکھتا رہا، ہنستا رہا اور چائے کی پیالی تھام کر بغور اسے دیکھتا رہا۔ چائے پینے کے کچھ ہی دیر بعد وہ کرسی پر جھول گیا۔ اس نے چائے میں نیند کی بہت سی گولیاں ملادی تھیں۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ پٹھان بے سدھ ہو چکا ہے تو وہ پھرتی سے اٹھی اور لان کے دوسری جانب کھودے ہوئے گڑھے کو دیکھنے لگی۔ پھر کدال لے کر اس میں اتری ذرا اور گہرا کیا اور پھر پھرتی سے پٹھان کو گھسیٹتی ہوئی گڑھے تک لے آئی اس کی سانس پھول گئی اور ہاتھ پاؤں کانپنے لگے مگر...... اپنی رسوائی اور شوہر کی زندگی کا خیال آتے ہی ہاتھوں میں پھر سے جان پڑ گئی۔ اس نے پورا زور لگا کر اسے گڑھے میں دھکیل دیا۔ گڑھے کو مٹی سے اچھی طرح ڈھانپ کر پانی چھڑک دیا۔ گل خان زندہ دفن ہو چکا تھا۔

اپنے کام کو پایۂ تکمیل پہنچا کر اس نے غسل کیا اور بیڈ روم میں جا کر اطمینان سے سوگئی۔

ایسے حالات و واقعات میں نیند بندے کے کبھی قریب نہیں بھٹکا کرتی مگر وہ نصیبو ماری سوچوں میں کتنی راتوں کے جگراتے، کتنی راتوں کے اندیشے لیے سو نہ سکی تھی۔ اسے ہر وقت پریشانیاں گھیرے رکھتی تھیں۔ تبھی آج اپنے سر سے بار گرا کر وہ میٹھی نیند سوتی رہی۔

کال بیل کی آواز پہ اس کی آنکھ کھلی تو کافی دن چڑھ آیا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ سامنے ایک تنومند آدمی کھڑا تھا۔ جسے ریشم نہیں جانتی تھی۔

"گل خان ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"دماغ خراب ہے تمہارا......؟ وہ یہاں قسط لینے آتے ہیں یا رات گزارنے۔"

وہ خاموشی سے واپس چلا گیا تو ریشم نے دروازہ بند کر دیا۔ مگر اس کے اندر ہلچل سی مچ گئی۔ دھڑکتے دل کی رفتار ذرا کم ہوئی تو اسے ذرا قرار آ گیا مگر......

پرانے وقتوں کے بزرگ کہا کرتے تھے۔ قتل کبھی فراموش نہیں کیے جاتے اور نہ ہی چھپ سکتے ہیں۔

سو...... اگلی صبح دروازہ پھر سے کھٹکایا گیا۔ ریشم نے آج کسی خطرے کو بہت قریب محسوس کیا۔ وہ دروازے پہ گئی۔

"جی فرمایئے۔" اس نے کہا اور ٹھٹک گئی۔ دروازے پہ بہت سے پولیس والے الرٹ تھے جیسے......!

"ہم آپ کے گھر کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔" وہ ذرا رعب سے بولے۔

"ہمیں شک ہے کہ آپ نے گل خان نامی پٹھان کو یہاں چھپایا ہوا ہے۔"

"میں نے کہا نا۔ وہ یہاں آیا ہی نہیں۔" ریشم نے جھوٹ بولا۔

"مگر...... وہ اس شخص کو بتا کر آیا تھا کہ وہ تمہارے گھر جا رہا ہے۔"

"انہوں نے جھوٹ کہا ہوگا۔ رات کے وقت وہ یہاں کیوں آتے۔ میں یہاں اکیلی رہتی ہوں۔ میرے میاں جاپان میں ہیں۔" وہ اکڑ کر بولی۔

"آپ نے ان سے قرض لیا تھا......"

"جی......"

"کتنا؟"

"ڈھائی لاکھ۔"

"مگر میں برابر قسطیں ادا کر رہی ہوں۔ وہ دن کے وقت قسط لے جایا کرتے ہیں۔ رات کے وقت نہیں۔"

"ہوں۔" پولیس والے نے کہا اور اسے لیے ڈرائنگ روم تک لے آیا۔

"آپ سگریٹ پیتی ہیں؟" اس نے سگریٹ کی خالی ڈبیا اٹھا کر پوچھا۔

"جی نہیں تو...... جی ہاں۔" وہ گھبرا سی گئی۔

"بہت سی عورتیں سگریٹ پیتی ہیں۔ آپ پیتی ہیں تو کیا ہوا۔ اتنی گھبرا کیوں رہی ہیں۔" پولیس افسر ہنسنے لگا۔

پولیس افسر بڑے غور سے ایک ایک چیز کو دیکھ رہا تھا لیکن اسے سگریٹ کے پیکٹ کے سوا کوئی قابل ذکر چیز نہ مل سکی تو وہ باہر نکل آیا۔ وہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ اچانک اس کی نظر لان کی طرف اٹھی۔ لان میں دو کرسیاں پڑی تھیں۔

"یہ...... یہ کئی دنوں سے پڑی ہیں۔"

اور پھر...... سامنے نرم مٹی دیکھ کر اس نے کھدائی کا حکم صادر فرمایا۔ ریشم کے چہرے پہ کئی رنگ آئے اور گزر گئے......!

پھر...... گل خان کی لاش برآمد ہوگئی۔ سبھی کچھ بتائے سنے بغیر ریشم کو جیل بھیج دیا گیا۔ یوں ہوس، لالچ اور جرم کا انجام بالآخر اپنے انجام کو پہنچا۔

کچھ روز بعد اسلم کو قتل کی خبر پہنچائی گئی مگر اس نے بھی یہی کہا کہ ہوس کا انجام بلاشبہ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔

++